اقبالؒ کے آخری دو سال

مرتبہ

عاشق حسین بٹالوی

نقش اول : 1960ء
نقش ثانی : 1969ء
قیمت : ۲۰ روپے

اقبال کے آخری دو سال

اس کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس کتاب کا کلی یا جزوی
حصّہ بھی شائع کرنے کا مجاز نہیں

اچھی
کتاب
کا
نکھار
ہمیشہ
قائم
رہتا
ہے

اقبال کے آخری دو سال

از

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

ناشر

اقبال اکادمی (پاکستان) کراچی

بار : دوم ۱۹۶۹ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : بیس روپے

اہتمام

م ۔ ع ۔ سلام

آئینۂ ادب

چوک مینار، انار کلی ۔ لاہور

فون نمبر

کیمبرج پریس لاہور

فہرست

۱ - مُقدمہ - طبعِ اوّل

۲ - مُقدمہ - طبعِ ثانی

حِصّۂ اوّل

پس منظر

۳ - پہلا باب — سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت

۴ - دوسرا باب — میثاقِ لکھنؤ کے بعد

۵ - تیسرا باب — اِصلاحات کا نفاذ

۶ - چوتھا باب — پہلی وزارت کا دور

۷ - پانچواں باب — یونینسٹ پارٹی کا قیام

۸ - چھٹا باب — تجاویزِ دہلی

۹ - ساتواں باب — سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک

حصہ دوم

اقبال کے آخری دو سال

۱۰- آٹھواں باب — مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

۱۱- نواں باب — ۱۹۳۷ء کا انتخاب

۱۲- دسواں باب — "مسلم رابطۂ عوام" کی تحریک

۱۳- گیارھواں باب — کانگرسی راج

۱۴- بارھواں باب — سکندر جناح پیکٹ ۱

۱۵- تیرھواں باب — سکندر جناح پیکٹ ۲

۱۶- چودھواں باب — مسجد شہید گنج کا قضیہ

۱۷- پندرھواں باب — خاتمہ

۱۸- ضمیمہ ۱

۱۹- ضمیمہ ۲

۲۰- ضمیمہ ۳

۲۱- ضمیمہ ۴

۲۲- ضمیمہ ۵

انتساب

میں اس کتاب کو ، اپنے مرحوم و مغفور دوست ملک برکت علی کے نام منسوب کرتا ہوں - جن کے انتقال پرملال پر ۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے فرمایا تھا :

"...He was, from the very beginning, a true and loyal member of the Muslim League, and on all occasions he rendered the greatest service to Muslim India. His advice and his staunch support on all critical occasions were of the greatest value to the League and myself. Muslim India has lost in him a great man, and I have lost in him not only a colleague and a collaborator but also a friend."

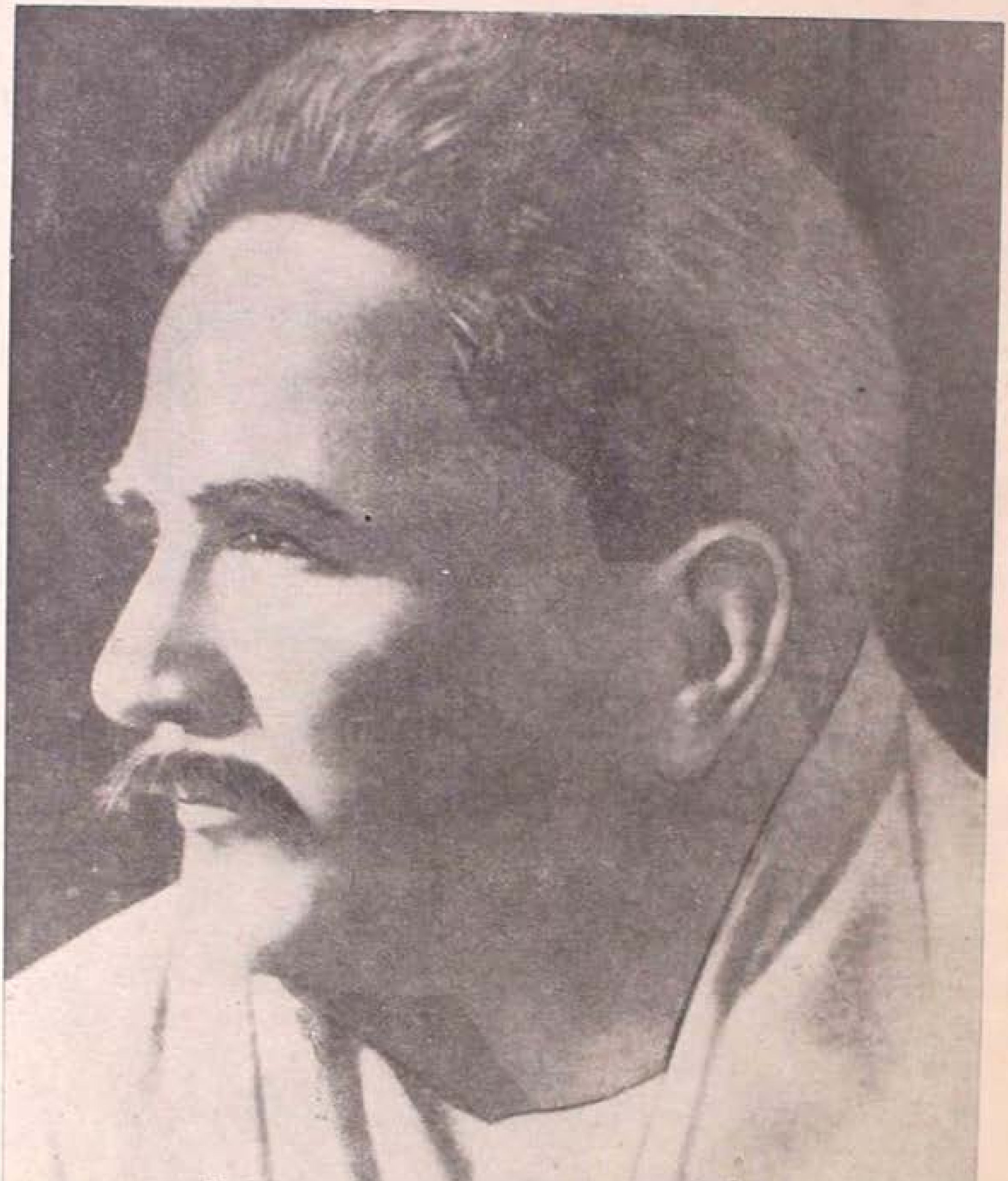

پیدائش ۱۸۷۵ء   ڈاکٹر محمد اقبال   وفات ۱۹۳۶ء

مُقدّمہ

اپریل ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ میرے دوست مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم روزنامہ امروز کے ایڈیٹر تھے۔ اور اپنے اخبار کا اقبال نمبر نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے مجھ سے بھی مضمون کی فرمائش کی۔ میں نے عرض کیا۔ کہ "اقبال کی شاعری کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کہ اب کسی مزید اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کوئی نیا عنوان بتائیں تو شاید میں اُس پر کچھ لکھنے کی کوشش کروں"

حسرت صاحب خاموش ہو گئے۔ اور چند منٹ سوچ کر کہنے لگے۔ کہ "اقبال کے آخری دو برسوں کی سرگذشت آپ کیوں نہیں لکھ ڈالتے؟ اُس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور آپ بھی لیگ میں کام کرتے تھے"

حسرت صاحب کے اِن الفاظ نے اقبال کی زندگی کا ایک ایسا پہلو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو اُس وقت تک، بعض وجوہ سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن گھر آ کر جب میں نے اپنی کتابوں کی الماری میں سے اُس دور کی تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادداشتیں نکالیں۔ اور اُن کو ترتیب وار دیکھنا شروع کیا۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ اس موضوع پر، کسی روزنامے کے لیے سیر حاصل مضمون لکھنا ممکن نہیں۔ داستان

بہت طویل تھی۔ جسے اگر بے حد اختصار سے بیان کیا جاتا۔ تو بھی ایک روزنامہ اخبار کی تنگ دامانی۔ اُس کی طوالت و تفصیل کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹیلیفون پر حسرت صاحب سے یہ مشکل بیان کی۔ تو انھوں نے دوبارہ اصرار کیا۔ کہ خواہ مختصر ہی سہی۔ لیکن مضمون ضرور لکھنا ہوگا۔

بہرحال میں نے تعمیلِ ارشاد میں مضمون لکھ دیا۔ جو اپنے اختصار کے باوجود امروز کے پورے دو صفحوں پر پھیل گیا۔ چونکہ نیا عنوان تھا۔ اور اس سے قبل کسی نے اِس موضوع پر کچھ لکھا نہیں تھا۔ اس لیے مضمون بہت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اور اکثر اخبارات و رسائل نے۔ اُسے اپنے ہاں نقل بھی کیا۔

اِس واقعہ کے بعد۔ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آئے۔ کہ میں اقبال کی زندگی کے اِس پہلو کو۔ پوری تفصیل سے۔ ایک کتاب کی صورت میں پیش کروں۔ میں کام کی نوعیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں، اقبال کے اِن آخری دو برسوں کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا۔ کہ اگر اُس دور کی روئداد کو ضبطِ تحریر میں لا کر محفوظ نہ کیا گیا۔ تو آئندہ نسلوں تک معتبر و مستند حالات پہنچنے کی قطعاً کوئی صورت باقی نہیں رہے گی۔ اِن احساسات کے باوجود۔ میں بعض مجبوریوں کے باعث۔ اِس کام کی تکمیل کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں میں انگلستان آ گیا۔ اور یہاں روزمرہ زندگی کی مصروفیتیں کچھ اس طرح عناں گیر ہوئیں۔ کہ اس کتاب کا خاکہ۔ ذہن میں آہستہ آہستہ دھندلا ہوتا گیا۔ تاہم مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ میں اس کام سے کلیتہً کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اور اکثر سوچتا تھا۔ کہ جونہی حالات ساز گار ہوئے اس فرض کی بجا آوری کی کوشش کروں گا۔

اس دوران میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ میرے عزیز دوست اے۔ ڈی اظہر بھی لندن تشریف لے آئے۔ وہ پاکستان ہائی کمیشن میں وزیر اقتصادیات تھے لیکن میرے لیے تو اُن کی ذات۔ ایک ایسے ہمدرد و غمخوار مشیر کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کے گراں قدر مشوروں کی مجھے قدم قدم پر ضرورت تھی۔ اظہر صاحب کا علمی و ادبی ذوق۔ اُن کی سخن سنجی و سخن فہمی۔ اور سب سے بڑھ کر اُن کی دوست داری و محفل آرائی میرے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ وہ جب تک لندن میں رہے۔ اُن کی سدا بہار شخصیت کے طفیل مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں وطن سے چھ ہزار میل دور پردیس میں بیٹھا ہوں۔

ہمارے درمیان اکثر اقبالؔ پر گفتگو چھڑ جاتی تھی۔ جو بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتی۔ اسی قسم کی ایک گفتگو کے دوران میں اظہر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ کہ میں اقبالؔ کے آخری دو برسوں کی سرگذشت کیوں نہیں لکھتا۔ میں نے جواب میں ایک عذر تو یہ پیش کیا۔ کہ کتاب کے لیے جس قدر مواد درکار ہے۔ وہ یہاں نہیں بلکہ لاہور میں پڑا ہے۔ اور وہاں سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دستاویزوں اور مسودوں کا یہ انبار منگوانا بے حد مشکل ہے۔ دوسرا عذر یہ تھا۔ کہ جب تک کوئی پبلشر کتاب شائع کرنے کی ہامی نہ بھرے میرے لیے قلم اُٹھانا ممکن نہیں۔ اظہر صاحب نے دونوں کاموں کا ذمہ لے لیا۔ چنانچہ اُن کی ہمت و مستعدی سے۔ یہ مشکلیں رفع ہو گئی ہیں۔ کتاب کے مواد کا بیشتر حصّہ بھی لاہور سے لندن پہنچ گیا۔ اور کتاب کی اشاعت کا بار اُٹھانے کے لیے

اقبال اکیڈیمی بھی آمادہ ہوگئی - اب میرے لیے کوئی راہِ فرار نہیں تھی - لہٰذا مجھے کتاب کی تحریر و تسوید کی طرف متوجہ ہونا پڑا - آج مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں - کہ اگر اظہر صاحب لندن نہ آتے - اور ان کا دوستانہ اصرار مجھے اس کام پر آمادہ نہ کرتا - تو اس کتاب کا ایک لفظ بھی نہ لکھا جاتا - اور یہ سارا ذخیرہ میرے سینے ہی میں دفن رہتا -

مجھے علامہ اقبال کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہونے کا شرف اُس وقت حاصل ہُوا تھا - جب وہ میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے - میں اُس زمانے میں کالج میں پڑھتا تھا - مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی چند روز کے لیے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے - اُن سے میرا دیرینہ رشتہ تھا - وہ میرے اُستاد تھے اور دوست بھی تھے - مولانا کا قاعدہ تھا - کہ جتنے روز لاہور میں قیام فرماتے - بلاناغہ شام کو ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچتے تھے - ایک روز مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے - اور یُوں ڈاکٹر صاحب سے میری نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہُوا -

ڈاکٹر صاحب مولانا اکبر شاہ خاں کے علم و فضل اور تاریخ دانی کے بڑے قدر دان تھے - اور مولانا کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب تک ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں موجود رہتے - خود بہت کم بولتے تھے - صرف ڈاکٹر صاحب کی باتیں سُنتے تھے - مولانا کا مشہور تاریخی رسالہ عبرت باقاعدہ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ سے گذرتا تھا - اور وہ کبھی کبھی خط لکھ کر - مولانا کے کسی مضمون کی داد بھی دیتے تھے - مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مخدومی - السلام علیکم

امسال عارضۂ نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی۔ اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ امیر خاں[1] پر آپ نے خوب مضمون لکھا۔ خدائے تعالےٰ اُس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے۔ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش ہو جائیں۔ صدیق رضی اللہ عنہ پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے۔ میں نے اُن کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیئے تھے۔

ہمتِ اُو کشتِ ملّت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

اُمید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

محمد اقبال"

اِدھر مولانا کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جب لاہور سے واپس نجیب آباد گئے۔ تو اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے عبرت میں لکھا۔

"...... بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور۔ کہ اُس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھ دار اور روشن دماغ شخص اقبال موجود ہے اور بڑا ہی بدنصیب ہے لاہور کہ اُس کے باشندوں نے اقبال کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھانے اور فیض یاب ہونے کی کما حقہٗ

---

[1] نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک - ہندوستان۔

کوشش نہیں کی۔ ایک زمانہ ضرور ایسا آنے والا ہے۔ کہ ہندوستان کی تاریخ میں پنجاب کے موجباتِ عظمت جب لکھے جائیں گے۔ تو ان میں ڈاکٹر اقبال کا نام نمایاں حروف میں نظر آئے گا۔ اور ہر سیالکوٹی و لاہوری اقبال کا نام لے لے کر فخر کرے گا۔ لیکن اس کا یہ فخر ندامت و شرمندگی سے تبدیل ہو جائے گا۔ جب اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ روہیلکھنڈ کا ایک شخص۔ صرف۔ ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں چند گھنٹے گذارنے۔ اور بعض مسائلِ علمیہ سمجھنے کے لیے گنگا، جمنا ستلج۔ بیاس وغیرہ دریاؤں کو عبور کر کے راوی کے کنارے لاہور میں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن لاہور میں رہنے والوں کو کبھی برسوں بھی اس امر کی خواہش نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر اقبال سے کچھ سنیں اور پوچھیں"

میری رائے میں ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر۔ ایک مفکر۔ ایک فلسفی اور ایک شاعر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے ہمہ گیر فکر کی پہنائی میں سیاستِ اسلامی کو بھی بڑا نمایاں مقام حاصل تھا۔ خود انھوں نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:-

"میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ۔ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے ، جیسا کہ مختلف زمانوں میں اس کا اظہار ہوا

ہے، دیا ہے۔ میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت
پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام
کی حیثیت کیا ہے"

بایں ہمہ یہ کہنا پڑے گا۔ کہ ڈاکٹر صاحب ایک سیاسی مفکر تھے۔ عملی سیاست دان نہ تھے۔ کم از کم اُن عام اور مروجہ معنوں میں سیاست دان نہ تھے جن میں مثلاً مسٹر جناح، سر فضل حسین اور مولانا محمد علی تھے۔ عملی سیاسیات میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے۔ کہ بسا اوقات موقع و محل کا خیال کرتے ہوئے، اور اپنے نظریے میں ترمیم و تغیر کر کے۔ فریقِ مخالف سے مفاہمت کر لینا پڑتی ہے یا پھر جب غنیم طاقت ور ہو۔ تو ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ اور اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی خاطر اُس سے سمجھوتہ کر لینے میں بھی عار محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی وقتی سیاسیات سے چنداں واسطہ نہ تھا۔ یوں کہنا چاہیے۔ کہ انہیں ایک ہنگامی لیڈر یا عملی کارکن کی بجائے۔ ایک مثالیت پسند یعنی "آئیڈیلسٹ" کا مرتبہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے برسوں پہلے اپنی بصیرت سے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ برِ عظیم ہند کے مسلمانوں کی نجات کا راز صرف یہ ہے۔ کہ اس خطۂ ارضی کے اُن علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے علیحدہ کر کے ایک جداگانہ مملکت قائم کر دی جائے۔ لیکن جب اس تصور کو معرضِ عمل میں لانے کا وقت آیا۔ تو انہوں نے یہ سارا کام مسٹر جناح کے سپرد کر دیا تھا۔

ایک عملی سیاست دان کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو دو مختلف موقعوں

پر کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پہلا موقع اُس وقت پیش آیا جب وہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور دوسرا موقع وہ تھا جب اُنھیں ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں مرتبہ بڑی شدّت سے محسوس کیا تھا۔ کہ قدرت نے اُن کو اس قسم کے ادنے اور معمولی کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کونسل کی سہ سالہ میعاد ختم ہوئی۔ تو اُنھوں نے دوبارہ ممبر بننے کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور گول میز کانفرنس سے تو وہ اِس قدر برگشتہ خاطر ہوئے تھے۔ کہ کانفرنس ختم ہونے سے پہلے ہی واپس چلے آئے۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں کامیاب ترین آدمی سر فضلِ حسین تھے۔ اور گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین میں سب سے زیادہ کامیاب آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خاں ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ اور فضلِ حسین یا اقبالؔ اور آغا خاں یا اقبالؔ اور ظفر اللہ خاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور ایسا ہونا کچھ تعجب انگیز بھی نہ تھا۔

جس شخص کی ساری عمر اس طرح بسر ہوئی ہو۔ کہ ؎

اِسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

اور جس شخص کا اپنے متعلق یہ دعوےٰ ہو کہ ؎

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اُس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

اُس سے یہ توقع رکھنا کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت قائم کی

ہوئی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی مضحکہ خیز فضا میں - جہاں قبائلی عصبیت کا زور شور تھا - اور جہاں طاقت و اقتدار کا سرچشمہ - ایک طرف گورنر اور دوسری طرف دیہات کے چند بڑے بڑے ناخواندہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھا - کوئی انقلاب برپا کر دے گا - گویا جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کرنے اور اپنے نفس کو فریب دینے کے مترادف تھا -

اقبال کا یہ دعوےٰ حرف بہ حرف صحیح ہے - کہ ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

لیکن اسی اقبال کو - جب ہم نے گول میز کانفرنس میں بھیجا تو ہم یہ پیشِ پا افتادہ حقیقت نظر انداز کر گئے - کہ اس قسم کی کانفرنس میں سازش ریشہ دوانی، خوشامد - اور منافقت کا دَور دورہ ہوتا ہے - وہاں بلا وجہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے - اور بوقتِ ضرورت جھوٹ بول دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا - یہی وجہ ہے کہ اقبال اُس ماحول میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا - اور واپس آگیا -

اقبال کو ہم نے ترجمانِ حقیقت بھی کہہ کر پکارا - اُسے ہم نے حکیم الامت کا لقب بھی دیا - اور اُسے شاعرِ مشرق کے نام سے بھی یاد کیا - لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ جس دور میں اقبال پیدا ہوا - اور جس معاشرے میں اُس نے آنکھ کھولی - وہاں زندگی کی راہیں اتنی محدود ہو چکی تھیں - کہ اُسے محض کسبِ معیشت کے لیے اپنی عمر کا بیشتر حصہ عدالتوں کی خاک چھاننے میں گذار دینا پڑا - یہ اقبال کا

قصور نہ تھا۔ اُس معاشرے کا قصور تھا جو ہمارے دورِ زوال میں بدیشی حکومت نے ہم پر مسلط کر دیا تھا۔ اقبالؔ کے دل میں ہمیشہ یہ کسک رہی۔ کہ جو کام اُسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ نہیں کر سکا۔ اور آخری عمر میں تو یہ احساس بہت قوی ہو گیا تھا کلامِ اقبالؔ کا ایک ذہین طالبِ علم۔ اقبالؔ کی شاعری میں جگہ جگہ یہ کسک محسوس کرتا ہے جو بعض اوقات نغمہ و آہنگ کے پردوں کو چیر کر۔ ایک نالۂ دل دوز کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اقبالؔ کے جن آخری دو برسوں کی سرگذشت۔ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اُن میں اقبالؔ کا زاویۂ نگاہ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے اندر رہ کر پنجاب کے مسلمانوں کی قبائلی عصبیت کا نقشہ دیکھ چکے تھے خود غرض رہنماؤں نے پنجاب کے مسلمانوں کو جس بے دردی سے شہری اور دیہاتی طبقوں میں تقسیم کر کے۔ ملی مفاد کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ بھی اقبالؔ کی چشمِ بصیرت کے سامنے تھا۔ اِدھر انگریز کی ہوسِ ملوکیت اور انڈین نیشنل کانگرس کی ہوسِ ملک گیری بھی اقبالؔ کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اِن حالات میں۔ اقبالؔ کی طبیعت میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ اُس وقت ایک طویل اور خطرناک بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ اِس نازک موقع پر قوم کو اُن کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ اِسی جذبے نے اُنھیں مئی ۱۹۳۶ء میں پنجاب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ اور اسی جذبے نے

انھیں قائدِ اعظم جناح کا ایک سپاہی" بن جانے پر مجبور کیا۔[1]

پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک تین ادوار میں سے گذری ہے۔ پہلا دور مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر اقبال کی وفات یعنی اپریل ۱۹۳۸ء میں ختم ہو گیا۔ دوسرا دور اقبال کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ اور سر سکندر حیات خاں کے انتقال یعنی دسمبر ۱۹۴۲ء میں ختم ہوا۔ اور تیسرا دور سر سکندر کی وفات سے شروع ہو کر اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ میری پختہ رائے ہے کہ جب تک ان تینوں ادوار کی مفصل تاریخ نہ سمجھ لی جائے۔ ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ قطعاً سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پہلے دور کی تاریخ تو میں نے اپنے ناچیز فہم کے مطابق مرتب کر دی ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور معاش کی مجبوریوں نے دم لینے کی مہلت دی تو شاید دوسرے اور تیسرے دور کی تاریخ بھی اسی طرح مرتب ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام حکومت کا تھا۔ جس کے بے اندازہ وسائل سے گذشتہ بارہ سال سے پاکستان کے بہت سے اہلِ دانش و بینش متمتع ہوتے رہے ہیں نہ کہ مجھ ایسے فقیر بے نوا کا۔ جسے محض جان و جسم کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے انگلستان میں صبح و شام مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اور جو بڑی حد تک فراغت و اطمینان کی دولت سے بھی محروم ہے۔

مدت ہوئی سنا تھا۔ کہ حکومت نے حصولِ پاکستان کی جد و جہد کی ایک جامع تاریخ لکھنے کے لیے علماء و فضلا کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس دوران

---

[1] اس کتاب کے تیرھویں باب میں اقبال کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔"

میں بار بار حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کمیٹی کا کیا حشر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کمیٹی کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور زرخیز ہوں گے۔ اور اس کے راستہ میں وہ مالی دشواریاں بھی حائل نہیں ہوں گی۔ جن کا شکار تصنیف و تالیف کا شغل رکھنے والے لوگ بالعموم ہوتے ہیں۔ مجھے اس کمیٹی کے اراکین سے ہمسری کا حاشا وکلا کوئی دعویٰ نہیں۔ اور نہ میں اس قسم کی گستاخی کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ لیکن اتنا عرض کرنا تو شاید سوءِ ادب میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ کہ اب تک اس کمیٹی کی کوششوں کا کوئی قابلِ ذکر نتیجہ کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔

مجھے اندیشہ ہے۔ کہ شاید اس کتاب کے نام سے۔ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ کہ میں نے اقبالؔ کی زندگی کے آخری دو برسوں کی تمام جزئیات کا احاطہ کیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں۔ کہ اس قسم کی غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا جائے گذارش ہے کہ میں نے اقبالؔ کی بیماری یا اُن کی شاعری یا اُن کی خانگی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے آخری دو برسوں میں پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو فروغ دینے۔ اور مسٹر جناح کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ اس کی ایک جامع اور مستند روئداد مرتب کر دی جائے۔

مسٹر جناح، جب ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ تو یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں نے اُن کی بات ماننے اور اُن کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس

کے بعد مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر امداد و اعانت کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے ہر ممکن مدد دینے کا بہ طیبِ خاطر وعدہ کیا۔ چنانچہ یکم مئی ۱۹۳۶ء سے لے کر اپنے یومِ وفات یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک اقبال نے اپنی صحت کی درماندگی کے باوجود، جس گرم جوشی، انہماک اور جرأت سے مسٹر جناح کی مدد کی۔ اور جس خلوص و صداقت سے پنجاب میں مسلم لیگ کو فروغ دینے کی سعی فرمائی۔ یہ کتاب اُس جدّ و جہد کی ایک دلچسپ اور سبق آموز تاریخ ہے۔

۱۹۴۳ء میں لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف نے اقبال کے تیرہ خطوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا۔ یہ خطوط ڈاکٹر صاحب نے ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء تک مختلف اوقات میں مسٹر جناح کو لکھے تھے۔ اِس مختصر مجموعے کے دیباچے میں قائدِ اعظم فرماتے ہیں کہ

"...... مسلم لیگ کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ کہ اُس کی قیادت کو مسلمانوں کی اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے قبول کر لیا۔ لیگ کو اِس منزلِ کامرانی تک پہنچانے میں سر محمد اقبال کی کوششوں کا بہت بڑا حصّہ تھا۔ اگرچہ عوام کو اُس وقت اِن کوششوں کا علم نہیں ہو سکا ...... میرے نزدیک یہ خطوط بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص وہ خطوط۔ جن میں اقبال نے اسلامی ہند کے مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا نہایت واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اظہار کیا ہے"

میری اس کتاب کو اقبال کی اُن کوششوں کا، جن کی طرف قائدِ اعظم نے سطورِ بالا میں ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ ایک مفصّل اور مبسوط تذکرہ سمجھنا چاہیئے۔

میں نے جب اس کتاب کا خاکہ مرتّب کیا۔ تو مجھے محسوس ہوا۔ کہ اگر اس داستان کو یک لخت مئی ۱۹۳۶ء سے بیان کرنا شروع کیا۔ تو بحث کے متعدد پہلو تشنہ رہ جائیں گے۔ بہت سے نکتے صاف نہیں ہو سکیں گے۔ اور بہت سی اُلجھنیں جُوں کی تُوں قائم رہیں گی۔ مثلاً اگر ہم ماضی کے اہم گوشوں سے نقاب اُٹھائے بغیر ایک دم یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ مئی ۱۹۳۶ء میں یونینسٹ پارٹی نے مسٹر جناح سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو لامحالہ دورِ حاضر کا ایک نوجوان، جو حال ہی میں اپنی تعلیم ختم کر کے کالج سے نکلا ہے سوال کریگا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی؟ یہ جماعت کب اور کیونکر بنی تھی؟ اس پارٹی کے کیا اصُول تھے؟ اس پارٹی نے پنجاب کی سیاسیات میں کیا حِصّہ لیا تھا؟ یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے سے کس بنا پر انکار کیا تھا؟ اقبالؔ اور جناحؔ کو یونینسٹ پارٹی سے کیا اختلاف تھا؟ غرض اس نوع کے بے شمار شکوک و شبہات ہی نہیں۔ بلکہ اہم سوال دل میں پیدا ہوں گے۔ جن کا تشفّی بخش جواب دیئے بغیر ہم اس داستان کو ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

وقت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور سیاسی حالات میں جس سُرعت سے تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر کل کی بات آج گویا برسوں کی پُرانی بات معلوم ہونے لگتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جو بچے شیرخوار تھے وہ آج جوانِ رعنا بن چکے ہیں۔ جو لوگ اُس وقت جوان تھے وہ آج پیری

کی سرحدوں کو چھو رہے ہیں۔ اور جو کہ سن سال تھے۔ وہ مدت ہوئی اس رباطِ

کہنہ سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لیے آج کے نوجوان کو کچھ معلوم نہیں کہ

یونینسٹ پارٹی کیا چیز تھی ــــ کب اور کیونکر بنی تھی۔ اور مسلم لیگ سے اس کا

تصادم کن اسباب کی بنا پر ہوا تھا۔ اس نوجوان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پنجاب کے

مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تقسیم کس نے پیدا کی تھی۔ اس تقسیم کا ہماری

سیاست پر کیا اثر پڑا تھا۔ اور انجام کار اس تقسیم کے ہاتھوں ہم کن مشکلات

کا شکار ہو گئے تھے۔

ان تمام امور کی وضاحت اور ان تمام عقدوں کی گرہ کشائی کے لیے یہ

ضروری ہے کہ میں یونینسٹ پارٹی کی ہیئت ترکیبی اور شہری، دیہاتی تفرقے کی

داستان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کروں۔ تاکہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان جو

اقبال کے آخری دو برسوں کی اس سرگذشت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس

پس منظر سے بھی کماحقہٗ واقف ہو سکیں۔ جس نے ان تمام قومی فتنوں کو

جنم دیا تھا۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے ؎

خلق را فتنۂ ایں شہر فراموش شدہ

زخم پنہاں بنمائیم و خبر تازہ کنیم

چنانچہ انہی خیالات و احساسات کے زیر اثر میں نے اس کتاب کو دو

حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ جس کا عنوان پس منظر ہے۔ گویا اسباب و

علل کی وہ کڑی ہے۔ جس کے طبعی نتائج آگے چل کر رونما ہوئے۔ اور جن سے

عہدہ برآ ہونے کے لیے قدرت نے اقبال اور جناح کے درمیان ذوق و نظر

کی یگانگت اور فکر و عمل کی وحدت پیدا کر دی۔ جب تک اِس پسِ منظر کا بغور مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ آنے والے دَور کی ماہیت یا تفصیل کا سمجھنا محال ہے۔

اقبالؔ کے اِن آخری دو برسوں میں، جن کا مرقع آپ کو اِس کتاب کے اوراق پر نظر آئے گا، جن اصحاب عزم و ہمت نے اقبالؔ کے زیرِ ہدایت ملک و ملّت کی خدمات سرانجام دیں، اُن میں ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین اور ملک زمان مہدی خاں کے اسمائے گرامی بڑی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ اِن لوگوں نے حد درجہ نامساعد حالات کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا۔ اور پھر اُس پرچم کو، ایک لمحہ کے لیے بھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر فخر رہے گا۔ کہ اپنے علم و عمل کی بے مائگی کے باوجود، میں بھی اُس پرخطر دَور میں۔ ان واجب الاحترام دوستوں کا شریکِ کار تھا۔ میں عمر میں اِن سب سے چھوٹا تھا۔ قابلیت، تجربے اور سیاسی فہم و فراست میں بھی ان سب سے فروتر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اِن دوستوں نے مجھے اپنے برابر مسند پر جگہ دی۔ بڑی سے بڑی ذمہ داری کا کام میرے سپرد کیا اور اکثر موقعوں پر۔ میری رائے کو اپنی رائے پر فوقیت عطا کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر آج ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین اور غلام رسول خاں زندہ ہوتے۔ تو یہ کتاب لکھنے کا فالتو حق اُنھی کا تھا! افسوس کہ اِن لوگوں کے اُٹھ جانے کے بعد، اس فرض کی بجا آوری مجھ ہیچمدان کے کندھوں پر آپڑی ہے۔ حالیؔ نے یہ کہہ کر شاید میرے ہی جذبات کی ترجمانی کی ہے ؎

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

میں نے جب ابتدا میں غلام رسول خاں کی معیت میں لیگ کے جائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ تو مجھے اُن کے مزاج کی تیزی سے ڈر لگتا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ ہم زیادہ دیر تک اکٹھے کام نہیں کر سکیں گے۔ لیکن تھوڑی مدت گزرنے پائی تھی کہ ہم بالکل شیر و شکر ہو گئے۔ غلام رسول خاں دل کے صاف۔ زبان کے کھرے اور عمل کے بے لوث تھے۔ انھیں اپنے الفاظ کا بے حد پاس تھا۔ چنانچہ جو کچھ کہتے اُس پہ چٹان کی طرح جم کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اُن کی اسی ادا نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ علامہ اقبال جب ۱۹۳۳ء میں افغانستان تشریف لے گئے تھے تو غلام رسول خاں اُن کے سیکرٹری کی حیثیت سے ساتھ گئے تھے۔

پیر تاج الدین کی باغ و بہار شخصیت تمام دوستوں کے لیے ایک نعمت تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے تو اُن کی بڑی پرانی یاری تھی اور بے تکلفی بھی غایت درجہ تھی۔ قائدِ اعظم سے بھری محفل میں مذاق کرنے اور اُن پہ فقرہ چست کرنے کا حوصلہ بھی پیر صاحب ہی کو تھا۔ قائد اعظم اُن کے مزاج سے واقف تھے۔ اس لیے ہمیشہ ایسے موقع پر ہنس کر ٹال جاتے۔

ملک برکت علی کی محبت اِستماد شفقت آفریں یاد ہے۔ آج بھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک پیکرِ صدق و صفا اور مجسّمۂ خلوص و محبت تھے۔ پنجاب کا کیا ذکر ہے۔ ہندوستان بھر میں اُن کے پائے کے بہت کم آدمی پیدا ہوئے ہیں

اُنھیں جناح سے عشق تھا۔ ملک برکت علی کی عظیم الشان شخصیت سے ہٹ کر پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں۔ بلکہ ناممکن ہے وہ تن تنہا ایک انجمن کا کام کرتے تھے۔ مجھے طبعاً سیاست گردی سے کوئی رغبت نہیں۔ لیکن یہ ملک برکت علی کے اصرار کا نتیجہ تھا۔ کہ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دس بارہ سال سیاست کی غوغا آرائیوں کی نذر کر دیئے۔

شروع میں خیال تھا کہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی جائے گی۔ اس طرح سب سے بڑی سہولت یہ پیش نظر تھی۔ کہ کتاب کی ترتیب تدوین کے لیے جس قدر مواد میسر آ سکا۔ تمام تر انگریزی میں تھا۔ اگر کتاب انگریزی میں لکھی جاتی تو میں اس سارے مواد کا اُردو میں ترجمہ کی زحمت سے بچ جاتا لیکن بعد میں چند دوستوں نے اُردو کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور فرمایا۔ کہ اگر ہم لوگوں نے بھی اپنی قومی زبان سے غفلت برتی۔ تو پھر اس ضمن میں اغیار سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ شاید آگے چل کر۔ اس کتاب کا ایک انگریزی ایڈیشن بھی تیار کرنے کی نوبت آئے گی۔

کتاب کا مواد فراہم کرنے میں جس چیز نے زیادہ پریشان کیا۔ وہ لاہور دہلی۔ کلکتہ وغیرہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کے بیس پچیس سال قبل کے پرانے پرچے تھے۔ بعض پرچے تو میرے کاغذات میں پہلے سے موجود تھے اور جو موجود نہیں تھے۔ اُن کے لیے خاصی دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ بہرکیف خدا کا شکر ہے۔ کہ جن پرچوں کی ضرورت پیش آئی۔ وہ سعی بسیار کے بعد۔ عین وقت پر مل گئے۔ البتہ اس سلسلے میں سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ قائد اعظم کے

بعض بے حد اہم خطوط جو انھوں نے ملک برکت علی کو لکھے تھے دستیاب ہو سکے ملک صاحب کا قاعدہ تھا۔ کہ ضروری کاغذات کا ایک ایک پرزہ بڑی احتیاط سے محفوظ رکھتے تھے۔ قائداعظم کے اِن خطوں کو بھی۔ اُنھوں نے ایک بہت بڑے لفافے میں بند کر کے اپنی کتابوں کی الماری میں مقفّل کر رکھا تھا میں نے یہ خطوط ملک صاحب کی زندگی میں کئی بار دیکھے تھے۔ اب اِس کتاب کے لکھنے کی نوبت آئی۔ تو اُن خطوں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میں نے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ تمام خطوط ضائع ہو گئے ہیں۔ اِس متاعِ گراں مایہ کے تلف ہو جانے کی جو مختلف روایتیں پیش کی گئی ہیں۔ خدا شاہد ہے مجھے اُن میں سے ایک روایت بھی قابلِ اعتبار معلوم نہیں ہوتی۔

غلام رسول خاں کے پاس بھی۔ بعض اہم دستاویزیں موجود تھیں۔ جو آج مل جاتیں تو اِس کتاب کی معنوی حیثیت زیادہ بلند ہو جاتی۔ لیکن افسوس کہ یہ ذخیرہ بھی اُن کی وفات کے بعد ضائع ہو گیا۔ غلام رسول خاں کا انتقال مارچ ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ میں لاہور سے باہر تھا۔ جب واپس آیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اُن کی لائبریری کی قانونی کتابیں تو بعض وکلا نے قیمت ادا کر کے خرید لیں۔ اور کاغذات کے انبار کو بے کار سمجھ کر جلا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اُسی انبار میں بعض ایسے نوادر بھی تھے۔ جو آج میرے لیے چاندی اور سونے سے بڑھ کر قیمتی ثابت ہوتے۔

یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک کتاب کی طباعت و اشاعت کا تعلق ہے۔ اُس کی ذمہ داری اقبال اکیڈیمی پر عائد ہوتی

ہے۔ لیکن کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ کا میں ذمّہ دار ہوں۔

لندن کی مصروف دگرانبار زندگی کے جھمیلوں اور نان و نمک کے دھندوں سے بصد مشکل فرصت کے چند گھنٹے نکالنا۔ اور پھر اُن چند گھنٹوں کو برٹش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس طرح خرچ کرنا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کتابوں اور اخباروں کو کھنگالا جا سکے ایک ایسا ٹیڑھا کام تھا۔ جس سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کا سلیقہ مجھے کبھی نہ آیا۔ یوں بھی فراغِ خاطر و جمعیّتِ قلب کی وہ آسائش جو تصنیفی کام کے لیے سب سے ضروری چیز ہے۔ اس تمام عرصے میں مجھے ایک روز بھی میسّر نہ آسکی۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيْمِ ؁

خاطر مسلسل است و پریشاں چو زلفِ یار
عیبم مکُن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ام

لندن
۱۵ر مئی ۱۹۵۹ء

عاشق حسین بٹالوی

مقدمہ

طبعِ ثانی

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جلد فروخت ہو گیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض ناگزیر مجبوریوں کے باعث دوسرے ایڈیشن کی اشاعت میں بہت تاخیر ہو گئی۔

میں نے اس مرتبہ چند نئی چیزوں کا اضافہ کیا ہے، مثلاً دو ضمیمے بڑھا دیئے گئے ہیں جن سے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے دستور اور طریق کار کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ بحث سکندر جناح پیکٹ کے بعد ۱۹۳۷ء ہی میں شروع ہو گئی تھی کہ کیا یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی ہے یا محض اُس کولیشن کا نام ہے جو اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی اور چودھری چھوٹو رام کے گروپ کے تعاون سے رونما ہوئی ہے۔ اس سوال کا شافی جواب دینے کی واحد صورت مجھے یہی نظر آئی کہ یونینسٹ پارٹی کا آئین درج کر دوں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ پارٹی تھی۔ کولیشن نہ تھی۔

آج پاکستان، ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی مورخوں کا اِس

بات پہ اتفاق ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں جس قدر مغائرت اور اختلاف پیدا ہوا اُس کی ابتدا جولائی ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی جب کانگرس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ اور یہیں سے وہ جھگڑا شروع ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ایسی خوفناک صورت اختیار کر لی کہ انجام کار ہندوستان کو تقسیم کرنا پڑا۔ کانگرس کا دعوے تھا کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ ہر چند کہ واقعات و حقائق اس دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن کانگرسی لیڈر آخر تک اپنی ضد پر قائم رہے۔ اور بالآخر یہی ضد تقسیم ہند کا موجب بنی۔

میں نے اسی موضوع سے متعلق کچھ نیا مواد درج کیا ہے جو اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اگر کانگرسی لیڈر ۱۹۳۷ء میں دُور اندیشی اور تدبر سے کام لیتے اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کولیشن وزارتیں بنا لیتے تو حالات میں ابتری پیدا نہ ہوتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں اس بے تدبیری اور خودسری کی ذمہ داری پنڈت جواہرلال نہرو پر ڈال دی ہے۔ حالانکہ یہ نہرو نہیں بلکہ خود مولانا ابوالکلام تھے جنھوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ کانگرس پورے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ اور اگر مسلم لیگ والے حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر کانگرس میں جذب ہو جائیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی مورخوں کے لیے یہ موضوع ایک مشترکہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے دونوں طرف سے اس باب میں جو کچھ لکھا جائے گا، اُس سے حالات پر مزید روشنی پڑنے کی توقع ہو سکتی ہے واقعات سے انکار کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ تاویل و تعبیر میں اختلاف ہمیشہ ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

لندن
۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء

عاشق حسین بٹالوی

پہلا باب

پس منظر

سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت

۱۹۱۹ء کا جلیانوالا باغ ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا اہم موڑ ہے۔ جس کے بعد اس برِ عظیم کی سیاسیات نے یکسر نیا رخ اختیار کر لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب سے ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تھی۔ یہاں صحیح معنی میں صرف دو انقلاب آفریں واقعات پیش آئے۔ ایک ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم۔ اور دوسرا جلیانوالے باغ کا حادثہ۔ تو اسے مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ دونوں مرتبہ تاریخ کے دو بالکل نئے باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھلے گئے اور دونوں بار ہمیں سیاسیات کے ایسے عقدوں کی گرہ کشائی کرنا پڑی جن کے دُور رس نتائج کا پہلے سے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد آزاد و خود مختار ہندوستان کی وہ مدھم سی شمع جو لال قلعہ کے در و دیوار پر روشنی ڈال رہی تھی ہمیشہ کے لیئے بجھ گئی۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اس ملک میں مضبوط سے مضبوط تر ہو گئیں اس کے بالکل برعکس باسٹھ ۶۲ سال کے بعد جلیانوالے باغ کے حادثہ نے جس قومی تحریک کو جنم دیا تھا۔ اسی تحریک نے آگے چل کر ہندوستان میں برطانوی

حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اور اسی تحریک نے ایسے برگ و بار پیدا کئے جن کی آب و تاب سے آج برِّ عظیم کے دونوں ملک یعنی بھارت اور پاکستان جگمگا رہے ہیں۔

جلیانوالے باغ کے حادثۂ خونیں کا صرف ایک شخص ذمہ دار تھا۔ سر مائیکل اوڈوائر۔ جس نے مئی ۱۹۱۳ء سے مئی ۱۹۱۹ء تک پنجاب پر حکومت کی۔ قدرت کی یہ بہت بڑی ستم ظریفی تھی کہ اس نے سر مائیکل کو بیسویں صدی کے ربع اول میں پنجاب کا حکمران بنایا۔ حالانکہ وہ ذہنی فطرت اور مزاج کے لحاظ سے اس قدر شوریدہ سر مطلق العنان اور بے لگام شخص تھا کہ اسے انیسویں صدی کے ربع اول میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ مائیکل اوڈوائر جب ۱۹۱۳ء میں پنجاب کا لفٹنٹ گورنر بن کر آیا تو اس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس صوبے کی تعلیم یافتہ جماعت کو ایسا کچل کر رکھ دے کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔ اوڈوائر کا خیال تھا کہ پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ جن میں مسلمان، ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے۔ صبح و شام انگریزی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اخبارات میں انگریزوں کا تختہ الٹ دینے والے مضامین چھپتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر، سکولوں کے مدرس، عدالتوں کے وکلاء اور جرائد و رسائل کے ایڈیٹر باہم مل کر ایسی انجمنیں بناتے ہیں۔ جن میں برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں۔ اسی قسم کے بے سروپا اور دور از کار اوہام نے اوڈوائر کے ذہن کو اس قدر مضطرب اور پریشان کر دیا تھا کہ وہ پنجاب کی کسی معمولی اور بے ضرر سی آئینی تحریک کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب میں آنے کے فوراً بعد جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"مجھے صوبائی حکومت کی باگ دوڑ سنبھالے ہوئے ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا کہ میرے پاس بعض لوگوں نے ایسی تجاویز بھیجنا شروع کر دی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہے کہ آئندہ اِس صوبے کے نظم و نسق میں کیا کیا اصلاحات ہونی چاہئیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے حصول کے لیے عوام جو اُمیدیں اور آرزوئیں قائم کیے بیٹھے ہیں۔ مجھے اُن کی پذیرائی کیونکر کرنا چاہیے۔ عدالتی اور انتظامی اُمور کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے کی بھی تحریک ہو رہی ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اِس قسم کی خیالی اور غیر حقیقی باتیں اپنی جگہ کتنی ہی دلکش اور جاذبِ نظر کیوں نہ ہوں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ اگر یہ مختلف تجویزیں بھیجنے والے لوگ مجھے یہ بتلاتے کہ حکومت کو اپنے اِس اصل مقصد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سے بہتر ذرائع اختیار کرنا چاہئیں۔ تو وہ اپنی قوم اور اپنے صوبے پر زیادہ احسان کرتے۔ نیز میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کا یہ بنیادی مقصد (جان و مال کی حفاظت) دیگر تمام اُمور پر، خواہ اُن کا تعلق حکومت کے نظم و نسق کی اصلاح یا حکومتِ خود اختیاری کی تحریک سے ہو، بہرصورت مقدم ہے۔"

نظر بظاہر اوڈوائر کا خیال تھا کہ پنجاب میں انگریزی راج قائم ہونے کے چونسٹھ سال بعد بھی یہاں لوگوں کا جان و مال قطعاً محفوظ نہ تھا۔ اور اُسے اپنی

حکومت کے دوران میں جو سب سے بڑا کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ اس صوبے کے لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے - اور اُن کا مال بھی اغیار کی دستبرد سے بچ جائے اگر اوڈوائر نے ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں آ کر عمالِ حکومت کی بے بسی اور اربابِ حل و عقد کی نااہلی کا یہ دل خراش نظارہ دیکھا تھا کہ یہاں نہ کسی کا مال محفوظ ہے اور نہ کسی کی جان و آبرو محفوظ - تو انگریزی حکومت کا جس قدر ماتم کیا جائے تھوڑا ہے - کہ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں بھی اپنی مظلوم و مقہور رعایا کو امن و عافیت کی اُس ابتدائی نعمت سے بھی بہرہ ور نہ کر سکی جس کے بغیر روئے زمین پر کوئی حکومت چار دن زندہ رہنے کا استحقاق نہیں رکھتی -

ہم جان لارنس سے لے کر لوئی ڈین تک اُن متعدد انگریز مدبّروں کے متعلق کیا رائے قائم کریں - جو ۱۸۴۹ء سے ۱۹۱۳ء تک پنجاب کے لفٹننٹ گورنر رہ چکے تھے ؟ کیا یہ سب کے سب اس قدر نااہل اور بے تدبیر لوگ تھے کہ اس صوبے کے عوام کو جان و مال کی حفاظت کا بھی اطمینان نہ دلا سکے ؟ کیا ان میں سے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جس پر یہ نکتہ منکشف ہوا ہو کہ حکومت کا اصل مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کی جائے ؟ ایچیسن، لائل، فٹز پیٹرک، ینگ - ریواز - ایٹسن، لوئی ڈین - یہ چند نام پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے - اور بہت سے لوگ اب بھی اِن ناموں کا احترام کرتے ہیں - لیکن سر مائیکل اوڈوائر کا خیال تھا کہ اُس کا کوئی پیش رو نہ تو حکومت کے حقیقی مقصد سے آگاہ تھا - اور نہ عوام کی بنیادی ضروریات سے اس کو واقفیت تھی -

۱۹۱۳ء میں بھی آئینی اصلاحات کے اعتبار سے پنجاب ہندوستان کے اکثر صوبوں سے پیچھے تھا۔ بعض صوبوں میں لفٹنٹ گورنر کی مدد کے لیے ایگزیکٹو کونسل موجود تھی۔ جس میں اگرچہ نامزدگی کا اصول کارفرما تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں کے مقامی باشندوں کا ایک آدھ نمائندہ صوبہ کے حاکم اعلیٰ کی اعانت کے لیے کام کرتا تھا ۱۹۱۴ء میں پنجاب میں بھی یہ تحریک اٹھی کہ لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا نظم و نسق بہتر طریق پر چلانے کے لیے ایگزیکٹو کونسل قائم کرنا چاہیئے۔ سر مائیکل اوڈوائر اس تحریک پر سخت ناراض ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اوّل تو صوبے کے لوگوں کو حکومت کے کاموں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دوم اُن کی اپنی ذات پورے پنجاب کے امن و عافیت اور اس کی ترقی و کامرانی کے لیے کافی ہے۔ اوڈوائر سمجھتا تھا کہ اس تحریک کے پیچھے بھی پنجاب کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ عنصر کام کر رہا ہے۔ جو بباطن باغیانہ خیالات رکھتا ہے۔ لیکن بظاہر آئینی اور دستوری تحریکوں کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اُس نے ایگزیکٹو کونسل کے قیام کی تجویز کے جواب میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۴ء کو جو تقریر کی۔ وہ اُس کی انانیت کی بڑی حد تک عکاسی کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"مجھے یہ تجویز سن کر بے حد تعجب ہوا ہے اس صوبے کے لوگ ابتدا سے لفٹنٹ گورنر کو صوبے کا تنہا حاکم اعلیٰ اور یہاں کے نظم و نسق کا بلاشرکت غیرے واحد ذمہ دار سمجھنے کے عادی ہیں اس نظام کے تحت پنجاب نے خوب ترقی کی ہے۔ اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ضمن میں پنجاب ہندوستان کے کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا۔

پھر بتایئے کہ ایگزیکٹو کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ یہاں کے نظم ونسق میں بعض ایسی خرابیاں ہیں جن کا تدارک ایگزیکٹو کونسل کے بغیر نہیں ہو سکتا تو میں شاید اس تجویز پر غور کر سکوں گا۔"

بظاہر اوڈوائر کا مطلب یہ تھا کہ "جو کچھ مابدولت تم کو دیتے ہیں اُسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ جو کچھ سرکار تمہارے لیے سوچتی ہے۔ اُسی میں تمہاری بہتری ہے اور پنجاب کے حال اور مستقبل کے بارے میں جو تجویز لاٹ صاحب کے ذہن میں آتی ہے اُسی میں تمہاری خیر وعافیت ہے۔ اس لیے کسی ایگزیکٹو کونسل یا کسی ایسی جماعت کی جس میں جمہور کے نمائندے شریک ہو کر نظم ونسق میں حصّہ لے سکیں قطعاً ضرورت نہیں۔ نہ اِس قسم کی کونسل یا نمائندہ جماعت سے صوبے کے انتظام وانصرام کو کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔"

اگر اوڈوائر کے اس نظریے کو تسلیم کر لیا جاتا تو ہندوستان میں آئینی اور دستوری اصلاحات ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوڈوائر ذہنی طور پر اُس معمولی اور بے حقیقت سی نمائندہ حکومت کا بھی حامی نہیں تھا جو منٹو مارلے اصلاحات کے تحت ۱۹۱۳ء میں پنجاب میں قائم تھی۔ مسلمانوں کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ اُن کا تعلیم یافتہ شہری طبقہ ترکی اور افغانستان کے ساتھ مل کر ہندوستان میں شورش بپا کرنا چاہتا ہے۔ اِس سلسلہ میں اُس نے ظفر علی خاں۔ محمد علی۔ انصاری۔ عبید اللہ سندھی اور برکت اللہ بھوپالی وغیرہ کو نام لے کر مطعون کیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ترکی۔ افغانستان اور جرمنی سے ہندوستان

کے شورش پسند مسلمانوں کو بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں۔ اور اس روپے کو برطانیہ کا تختہ الٹ دینے کے لیے بے دریغ ہندوستان میں خرچ کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے بارے میں اوڈوائر کی رائے تھی کہ ان کا تعلیم یافتہ شہری طبقہ بھی برطانیہ کے دشمن ممالک سے ساز باز کر کے ہندوستان میں باغیانہ خیالات پھیلانے اور مسلح شورش برپا کرنے میں دن رات مصروف رہتا ہے۔ لاجپت رائے۔ پرمانند۔ اجیت سنگھ۔ ہردیال۔ مہندر پرتاپ وغیرہ اس سازش کے سرغنہ ہیں۔ اور ان کے توسل سے ہندوستان میں انقلاب برپا کرنے کی تیاریاں بڑی گرم جوشی سے ہو رہی ہیں۔

اوڈوائر نے لفٹننٹ گورنر کی کرسی پر بیٹھتے ہی اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جائز و ناجائز، ہر ممکن طریقے سے پنجاب کے تعلیم یافتہ طبقے کی ان سازشوں کو، جن کا وجود حقیقتاً اس کے نہاں خانۂ دماغ سے باہر کہیں نہیں تھا۔ ختم کر کے چین لے گا۔ مصیبت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے اکثر و بیشتر انگریز حکام ذہنی طور پر اس قدر خوف زدہ ہو چکے تھے کہ انہیں عوام کے معمولی اور بے ضرر قسم کے سیاسی اختلاف سے بھی بغاوت اور غدر کی چنگاریاں چھوٹتی نظر آتی تھیں۔ اوڈوائر یقیناً اسی قبیل کا ماؤف ذہن رکھنے والا انسان تھا۔

اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے جو تجویز اسے سب سے آسان اور مفید نظر آئی وہ یہ تھی کہ پنجاب کی دیہاتی آبادی کو کسی نہ کسی طرح شہری آبادی کا حریف بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ دیہاتی آبادی کی کثرت اور دیہات میں بسنے والے لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر سیاسی تحریکوں کو کچل سکے۔ اوڈوائر لونہ تو گاؤں کے لوگوں سے

مجبت نہ تھی - اور نہ شہر کے باشندے اُس کو عزیز تھے - وہ تو محض ایک سیاسی
چال سوچ رہا تھا جس سے بیک وقت دو فائدے مدِ نظر تھے ایک یہ کہ دیہاتیوں
کو ممنونِ احسان بنا کر انہیں یقین دلا دیا جائے کہ شہری باشندے اُن کے دشمن ہیں۔
اور حکومتِ خود اختیاری یا آئینی اصلاحات کے لیے شہروں میں جو شور اُٹھ رہا ہے
وہ محض مٹھی بھر تعلیم یافتہ لوگوں کی شرارت ہے۔ جس سے وہ خود آگے بڑھنا اور فائدہ
حاصل کرنا چاہتے ہیں - دوم یہ کہ دیہاتی آبادی کو شہر کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بدگمان
کرنے کے بعد وہ نہایت آسانی سے آئینی اصلاحات کی تحریکوں کو ختم کر سکے گا۔
اور یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ پنجاب کی اسّی فیصد آبادی مروّجہ آئین و دستور
میں کسی تبدیلی کی خواہاں نہیں - لہٰذا کم از کم پنجاب کو مزید اصلاحات سے مستثنےٰ
رکھا جائے -

اوڈوائر کی یہ تجویز بڑی خطرناک تھی - اور اُس نے ایک ہوشیار شاطر کی
طرح اس تجویز کو بروئے کار لانے میں شطرنج کے ہر مہرے کو نہایت احتیاط سے
حرکت دی - لیکن ایک طرف تو اُس کی بد قسمتی سے خود برطانیہ میں بعض اِس قسم
کے عناصر کار فرما ہونے لگے - اور وہاں ایسے افراد برسرِ اقتدار آ گئے جن کے سامنے
اوڈوائر کی پیش نہ جا سکی - اور دوسری طرف اُس کا جوش اور غلو خود اس کے لیے
دو دھاری تلوار ثابت ہوا - مسٹر مانٹیگو کے وزیرِ ہند بننے کے بعد اوڈوائر کی سوچی
سمجھی ہوئی تجویزیں اس لیے حسبِ منشا نتائج پیدا نہ کر سکیں کہ وزیرِ ہند موصوف
اور لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے دونوں ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے حامی
تھے - ادھر اُس نے پنجاب میں مارشل لا جاری کر کے اور جلیانوالہ باغ کی

زمین کو محبانِ وطن کے خون سے رنگین کر کے خود اپنے لیے ایک ایسی آزمائش کھڑی کر لی تھی جو انجامِ کار اُس کی ساحت موعودہ اور طاقتہ الکبریٰ سے ثابت ہوئی۔

تاہم اِس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اوڈوائر نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری آبادی میں باہمی تفرقہ کا جو بیج بو دیا تھا، وہ خوب رنگ لایا۔ اور اس بیج سے جو خاردار جھاڑیاں اُگیں۔ اُنھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست و معاشرت کو مسلسل تیس ۳۰ سال تک رنج و محن میں مبتلا کیے رکھا۔ اس تفرقے نے مسلمانوں کے قومی مفاد کو سراسر مصنوعی اور غیر حقیقی رشتوں میں تقسیم کر دیا۔ اِسی تقسیم کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں کی مجموعی طاقت، جس سے مستفید ہونے کے وہ ہر اعتبار سے مستحق تھے، کبھی متحد ہو کر غنیم کے مقابلہ میں صف آرا نہ ہو سکی۔ اسی تقسیم کے ہاتھوں سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کا وہ بے کار عنصر داخل ہو گیا جو ہمارے اُس وقت کے برادرانِ وطن کے عنصر کے مقابلے میں بے حد کمزور اور فروتر تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری قوم پر نالائقی اور نا اہلی کا دھبہ لگ گیا اور آخر میں یہ کہنا پڑے گا کہ اسی تقسیم نے وہ گل کھلائے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے پنجاب میں اسلامی وحدت کے بنیادی اور عالمگیر اصولوں کو بے دردی سے قبائلی عصبیت کے بتوں پر قربان ہوتے ہوئے دیکھا۔

جاٹوں کی الگ انجمنیں قائم ہو گئیں۔ راجپوتوں نے اپنی علیحدہ انجمنیں کھڑی کر لیں۔ اعوانوں کے اڈے الگ قائم ہو گئے۔ مغلوں، پٹھانوں اور ارائیوں نے اپنی اپنی الگ ٹولیاں بنا لیں۔ اور ستم یہ ہوا کہ یہ تمام انجمنیں اس غرض سے قائم نہیں کی گئی تھیں کہ مسلمانوں کی مختلف برادریوں کے سرکردہ ارکان اپنے اپنے

بجائے بندوں کی تعلیم کا بہتر انتظام کریں - یا اپنی معاشرت کی اصلاح فرمائیں یا غیر ضروری اور مسرفانہ رسوم کا ازالہ کر کے قوم کی اقتصادی حالت کو درست کریں -
ان انجمنوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ سیاسی حقوق کے بٹوارے میں جاٹوں کا کتنا حصہ نکلے گا اور راجپوتوں کے پلے کیا کچھ پڑے گا - مجلسِ قانون ساز میں مغل اور پٹھان کتنی نشستوں پر قبضہ کر سکیں گے - اور راعوانوں اور ٹوانوں کو کتنی وزارتیں ملیں گی -

اس نفسا نفسی میں پڑ کر ہم یہ بھول گئے کہ ۱۹۰۶ء میں جب مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے کے لیے ہندوستان کے پینتیس ۳۵ منتخب مسلمانوں کا وفد شملہ گیا تھا - تو اس کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ مسلمان من حیث القوم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بن سکیں - اور اغیار کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں اپنی مجموعی قوت کو منظم کر کے اس ملک میں عزت مندانہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہو جائیں وفد کے اراکین کو شاید خواب میں بھی یہ بات نظر نہ آئی ہو گی کہ اس جداگانہ نیابت کے طفیل پنجاب کے مسلمانوں کو جو مراعات حاصل ہوں گی - اُن سے متمتع ہونے کے لیے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھیں گے - بلکہ جاٹوں - راجپوتوں - پٹھانوں، مغلوں اور راعوانوں کی الگ الگ ٹولیاں بن جائیں گی اور یہ ٹولیاں اپنے اپنے قبیلے کے جھنڈے اٹھا کر اور اپنے اپنے قبیلے کی عزت و ناموس کا واسطہ دے کر اپنے نمائندے منتخب کریں گی - سر مائیکل اوڈوائر پہلا شخص تھا جس نے حد درجہ ہوشیاری اور چالاکی سے پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کو شہری مسلمانوں کا حریف بنا کر اس صوبے میں مسلمانوں کی قومی وحدت کو سخت نقصان

پہنچایا۔

ایک بات مجھے بہت آگے چل کر کہنی چاہیے لیکن شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی مصنوعی تقسیم کے مضر اثرات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اور اوڈوائر کی اُن مذموم کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے جن سے اس نے اس تفریق کو خوب ہوا دی۔ مجھے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے اقتصادی مفاد کی حفاظت کا سب سے مؤثر، سب سے اہم، سب سے نتیجہ خیز اور سب سے زبردست حربہ جو انگریزی راج میں ایجاد ہوا۔ وہ ایک قانون تھا جسے عرفِ عام میں قانونِ انتقالِ اراضی کہا جاتا ہے۔

اس قانون کی رُو سے پنجاب کے ہر ضلع کی آبادی زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ غیر زراعت پیشہ لوگ زراعت پیشہ قوم کے افراد کی اراضی نہ تو خرید سکتے تھے اور نہ قرض کے بدلے نیلام کرا سکتے تھے۔ یہ قانون لارڈ کرزن کے عہدِ حکومت میں منظور ہوا تھا جس سے بلا امتیازِ مذہب و ملّت پنجاب کے تمام ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے جو زراعت پیشہ قرار دیے گئے تھے۔ یکساں فائدہ اُٹھایا۔ اس قانون کے نافذ ہونے سے پہلے پنجاب کے زراعت پیشہ لوگوں کی زمینیں قرض اور سود در سود کے چکّر میں پڑ کر دھڑا دھڑ ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں جا رہی تھیں اور اگر یہ قانون عین وقت پر منظور نہ ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب کے تمام کاشتکار اور زمیندار اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے اور خود حکومت کو اس قسم کے لاکھوں بے کار اور خانہ بدوش لوگوں کا مسئلہ حل کرنا پڑتا، جو اپنی زندگی سے تنگ آکر اپنے ہر قسم کے سیاسی [illegible] کو

خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو جاتے۔

قانونِ انتقالِ اراضی کی سب سے زیادہ مخالفت ہندو ساہوکاروں نے کی۔ ان کے بعد اس قانون کی مخالفت کرنے والوں میں شہروں کے وہ ہندو تھے جنھوں نے تجارت اور صنعت و حرفت سے لاکھوں، کروڑوں روپے کمائے تھے اور جنھیں اب اس بات کی ہوس تھی کہ زمیندار کہلائیں اور بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بھی بنیں۔ یہ صحیح ہے کہ وسطی اور مغربی پنجاب میں مسلمان کاشتکاروں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ اور اُن کی معاش کا دارومدار تمام تر زرعی اراضی پر تھا لیکن اگر قرض اور سود کے چکر میں پڑ کر اُن کی زمینیں فروخت ہونا شروع ہوتیں تو سیدھی ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جاتیں۔ یا شہری ہندوؤں کا وہ تجارت پیشہ طبقہ اُن کا مالک بن جاتا جو صنعت و حرفت کے ذریعہ سے اور متعدد بنک اور بیمہ کمپنیاں قائم کر کے لاکھوں، کروڑوں کا سرمایہ پیدا کر چکا تھا۔ اس پوری لوٹ کھسوٹ، اس تمام لین دین اور اس سارے بیع و شرا میں شہری مسلمانوں کا نہ کہیں وجود تھا اور نہ کہیں اُن کا ذکر آ سکتا تھا۔

شہری مسلمان جانتے تھے کہ اُن کے اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد حقیقتاً مشترک ہیں۔ شہری مسلمان نسبتاً تعلیم یافتہ تھے۔ اور اُن کی روزی کا انحصار زیادہ تر دفتروں کی ملازمت پر تھا۔ اور جو کسی قدر زیادہ پڑھ لکھ گئے تھے اُن کو مدرسی، ڈاکٹری اور وکالت میں قسمت آزمائی کرنا پڑتی تھی۔ لیکن اِن تمام پیشوں میں اُنھیں ہندوؤں سے مقابلہ درپیش تھا۔ جن کے وسائل و ذرائع مسلمانوں سے کہیں وسیع اور جن کی جتھہ بندیاں مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر مضبوط

تھیں۔ صنعت و حرفت یا تجارت میں تو یوں کہنا چاہیے کہ شہری مسلمانوں کو ہندوؤں کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے وہ مسلمان جو غیر زراعت پیشہ تھے۔ اور شہروں میں رہتے تھے اس حقیقت سے واقف تھے کہ قانونِ انتقالِ اراضی کی حفاظت کے بغیر اُن کے دیہاتی بھائیوں کی زمینیں یقیناً ہندو سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی چنانچہ اس قانون کے نفاذ سے لے کر ۱۹۴۷ء تک شہری مسلمانوں نے کبھی قانونِ انتقالِ اراضی کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ سر شادی لال نے لاہور ہائی کورٹ کی چیف جج کے زمانے میں جب بعض ایسے فیصلے صادر کیے جن سے اس قانون کے اثر و نفوذ میں ضعف پیدا ہوتا تھا۔ تو پنجاب کی مجلس قانون ساز کے تمام مسلمان ممبروں نے جن میں دیہاتی اور شہری دونوں شامل تھے فوراً ان فیصلوں کے جواب میں قانونِ انتقالِ اراضی کے اُن تمام پہلوؤں کو پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کر دیا جن کی کمزوری سے ہائی کورٹ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۲۷ء میں لالہ لاجپت رائے کی کوشش سے لاہور میں اگروال کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ تو ایجنڈے پر ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ قانونِ انتقالِ اراضی کو منسوخ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ کانفرنس کے منتظمین نے پنجاب کے تمام شہروں کے ذی اثر مسلمانوں کو، جو اتفاق سے غیر زراعت پیشہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اس کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ قانونِ انتقالِ اراضی کا معاملہ ایک سراسر اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس کا اثر صوبے کی تمام غیر زراعت پیشہ آبادی پر یکساں پڑتا ہے۔ جس طرح مجلس قانون ساز کی

یونینسٹ پارٹی میں زراعت پیشہ مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہو کر محض اقتصادی اصولوں پر اپنے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے تمام غیر زراعت پیشہ شہری مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔

بات بظاہر بالکل درست معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جن مسلمان اکابر کو دعوتی خطوط بھیجے گئے تھے انھوں نے اپنے مشترکہ دستخطوں سے اعلان شائع کیا کہ انھیں اس مجوزہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں۔ اور وہ ہر صورت اور ہر حال میں قانونِ انتقالِ اراضی کی حمایت کریں گے۔

اندریں حالات دیہاتی مسلمانوں کو بھڑکا دے کر اور غلط قسم کا اشتعال دلا کر شہری مسلمانوں کا حریف بنا دینا ایک ایسی قبیح حرکت تھی جس کو کوئی ذی ہوش اور درد مند انسان معاف نہیں کر سکتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر اوڈوائر کے خیال کے مطابق پنجاب کے مسلمانوں کی شہری آبادی دیہاتی مسلمانوں کی بدخواہ اور حریف تھی۔ اور شہری مسلمان اپنے دیہاتی بھائیوں کے حقوق غصب کر کے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ تو خود اوڈوائر نے بطور لفٹنٹ گورنر کے دیہاتی مسلمانوں کے لیے کیا کیا؟ کیا اس نے پنجاب کے دیہات میں سکول قائم کیے تاکہ وہاں کی بے زبان آبادی اپنے بچوں کو کم از کم ابتدائی تعلیم ہی سے بہرہ ور کر سکے؟ کیا اس نے دیہات میں شفاخانے قائم کیے۔ تاکہ ہر سال ہیضہ، بخار، پیچش اور طاعون سے ہزاروں کی تعداد میں جو خلقت ڈھور ڈنگر کی طرح مرتی تھی اس کے علاج معالجے کی نہایت ادنیٰ سہولتیں میسر آ جائیں؟ کیا اس نے دیہات میں مویشیوں

کی بیماری کی روک تھام کے لیے ہسپتال قائم کئے تاکہ دیہاتیوں کی یہ سب سے بڑی متاع جس کے سہارے وہ قوتِ لایموت حاصل کرتے تھے موت کے ناگہانی حملوں سے محفوظ ہو سکے؟ کیا اُس نے اُس تشدد اور اُن مظالم کا سدِ باب کیا جو آئے دن سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں دیہات کے باشندوں کو برداشت کرنا پڑتے تھے۔ اور جن کی کہیں باز پرس نہ ہو سکتی تھی؟ کیا اُس نے دیہات کے لوگوں میں اتنا شعور پیدا کیا کہ وہ اپنے ملک کے نظم و نسق کو سمجھ سکیں اور اس بات کا اندازہ کرنے کے قابل ہو جائیں کہ ہندوستان کی بھلائی اور بُرائی کا انحصار کن اُمور پر ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے اُن چھ برسوں کی روئداد پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔ جو پنجاب نے سر مائیکل اوڈوائر کے سایۂ عاطفت میں بسر کئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس نے پنجاب کے ہر ضلع سے اپنے حسبِ منشائ اور اپنی پسند کے مطابق دو دو، چار چار آدمی منتخب کر لیے تھے۔ اور اُن پر انعام و اکرام کی بارشیں شروع کر دی تھیں۔ یہ لوگ اوڈوائر کے نمائندے تھے اوڈوائر کی تجویزوں کے ہر حال میں مؤید اور حامی تھے۔ اور اوڈوائر ہی کی مدح و ستائش کے گیت گاتے تھے۔ اوڈوائر نے انھیں خطابات سے سربلند کیا۔ جاگیریں بخشیں۔ نقد انعامات دیئے۔ سرکار دربار میں کرسیاں عطا کیں۔ اور جب کبھی پنجاب میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہوئے۔ یا تعلیم یافتہ جماعت نے سیاسی مراعات کے حصول کی جدوجہد کی۔ یا حکومتِ خود اختیاری کی تائید میں تحریک چلی تو اوڈوائر نے بے دریغ اِن دیہاتی آقاؤں کو اپنے مقصد کے لیے

استعمال کیا۔ اور اُن سے لمبے چوڑے محضر نامے اور اشتہار جاری کرائے کہ پنجاب بالکل مطمئن اور خوشحال ہے۔ اُسے اِن گنتی کے چند شورش پسندوں سے کوئی تعلق نہیں جو محض اپنی ذاتی منفعت کے لیے حکومتِ خود اختیاری یا ہوم رُول کا شور مچا رہے ہیں۔

چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں ہندوستان بھر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے اور مذہب و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر ہر طبقے نے اصلاحات کا مطالبہ شروع کیا تو اوڈوائر نے فوراً اِن دیہاتی آقاؤں کے وفد مرتب کیے۔ جنھوں نے لاٹ صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے شہریوں کے شورش پسندوں کو مطعون کرنے سے دریغ نہ کیا اور بار بار اعلان کیا کہ انھیں مسلم لیگ اور کانگرس کی اس متحدہ تحریک سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو شہری باشندوں نے شروع کر رکھی ہے اور جس سے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

میں سر مائیکل اوڈوائر کے شش سالہ عہدِ حکومت کی تفصیلات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اور نہ یہ تفصیلات اس کتاب کا جزو بن سکتی ہیں لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۶ء تک پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی مصنوعی اور غیر حقیقی تقسیم تھی اور از بس کہ اوڈوائر اس تقسیم کا سب سے بڑا مبلغ اور خالق تھا اس لیے جب تک اُس کے اعمال و افعال کا تجزیہ نہ کر لیا جائے اس تقسیم کا صحیح مقام اور اس کے اصلی خدوخال سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اسی تقسیم نے پنجاب کی سیاسیات میں یونینسٹ پارٹی کو جنم دیا۔ اسی تقسیم نے ۱۹۳۶ء کی نشاۃِ ثانیہ

ہی جناح اور اقبال کی آواز کو بے اثر بنایا۔ اور اسی تقسیم نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کو اس فریب میں مبتلا کیے رکھا کہ مسلم لیگ شہری لوگوں کی جماعت ہے جس سے دیہاتیوں کو کوئی تعلق نہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اور یوں کہنا چاہیے کہ سر مائیکل اوڈوائر کی فطرت کے اُس حصے کو جو بعض وجوہ سے دبا ہوا تھا اب اُن غیر معمولی حالات نے جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے اُبھرنے کا خوب موقع دیا۔ سب سے پہلے اُس نے شہروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ جس کے متعلق اُس کا اندیشہ تھا کہ یہ لوگ سیاسی تحریکوں کے پشت پناہ ہیں۔ قانونِ تحفظ ہند کے اجرا و نفوذ کی سب سے زیادہ خواہش اور کوشش اوڈوائر ہی نے کی تھی۔ اور جب یہ قانون منظور ہو گیا تو اس کی آڑ میں اُس نے پنجاب کی رائے عامہ کو جس طرح کچلا اُس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اردو اخبارات کو ضمانت طلبی اور ضمانت ضبطی کے بارِ گراں کے نیچے لا کر ختم کر دیا گیا۔ چھاپے خانے ضبط کر لیے گئے۔ ہر قسم کے سیاسی جلسوں کا انعقاد روک دیا گیا۔ دوسرے صوبوں سے جو آزاد خیال اخبار پنجاب میں آتے تھے اُن کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ باہر کے لیڈروں کو بھی پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے سے منع کر دیا گیا۔ سیاسی ملزموں کی پیروی کے لیے پنجاب کے جو وکلا عدالتوں میں پیش ہونا چاہتے تھے انھیں ڈرا دھمکا کر اس قدر خوف زدہ کیا گیا کہ اُنھوں نے تنگ آ کر مقدمات کی پیروی سے انکار کر دیا۔

مظالمِ پنجاب کی تحقیقات کے لیے کانگریس کی قائم کردہ کمیٹی نے اس بارے

ہیں اپنی رپورٹ میں جو لکھا ہے۔ اُس کا ایک اقتباس یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔¹

---

¹ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا میں پنجاب پر جو خوفناک مظالم ہوئے تھے۔ اُن کی تحقیقات کے لیے دو مختلف کمیٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ ایک کمیٹی پارلیمنٹ کے منشورے سے حکومتِ ہند نے قائم کی تھی جس کے صدر لارڈ ہنٹر تھے۔ جو انگلستان کے سالسٹر جنرل رہ چکے تھے ممبروں میں جسٹس رینکن جج ہائی کورٹ کلکتہ مسٹر رائس ایڈیشنل ہوم سیکرٹری حکومتِ ہند میجر جنرل سر جارج بیرو۔ آفیسر کمانڈنگ پشاور۔ پنڈت جگت نرائن ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔پی۔ مسٹر ٹامس سمتھ ممبر لیجسلیٹو کونسل یو۔پی۔ سر چمن لال سیتلواڈ وکیل ہائی کورٹ بمبئی اور صاحبزادہ سلطان احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا جج عدالتِ عالیہ گوالیار شامل تھے۔

دوسری کمیٹی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مقرر کی تھی جس کے ابتدا میں پانچ ممبر تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مہاتما گاندھی۔ عباس طیب جی۔ سی آر داس۔ اور مولوی فضل الحق۔ پنڈت کے سنتانم اس کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو جب کانگریس کے اجلاس امرتسر کے صدر منتخب ہوگئے تو ان کی جگہ کسی نئے آدمی کا تقرر نہیں کیا گیا۔ مولوی فضل الحق بعض ضروری مصروفیتوں کی وجہ سے تحقیقات کے کام میں شریک نہ ہو سکے تو ان کی جگہ بمبئی کے مشہور بیرسٹر ایم۔ آر۔ جیکر کو نامزد کیا گیا تھا۔

"اوڈوائر نے قانونِ تحفظِ ہند سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر تلک اور پال ایسے رہنماؤں کو بھی پنجاب میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس نے حد درجہ معمولی اور بیشتر بے بنیاد عذر تراش کر سیکڑوں آدمیوں کو جیل میں بند کر دیا۔ اُردو اخبارات کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی کمی باقی نہ رکھی۔ اور بیرونِ پنجاب چھپنے والے قوم پرست اخباروں کی پنجاب میں درآمد روک دی گئی۔ مثلاً نیو انڈیا، امرت بازار پتریکا اور انڈی پنڈنٹ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اُردو کے وہ اخبار جو چھپنے سے پہلے حکومت کے ہاتھوں باقاعدہ سنسر کئے جاتے تھے۔ اُن کی اشاعت بھی بند کر دی گئی۔ اس قسم کے حالات پیدا کر کے اوڈوائر نے پنجاب کے باشندوں کو باہمی تبادلۂ خیال۔ اور ایک دوسرے کا رنج و غم معلوم کرنے کے ذرائع سے عملاً محروم کر دیا۔ اب پنجاب میں نہ تقریر کی آزادی باقی تھی۔ اور نہ تحریر کی آزادی کا وجود تھا۔ اس قسم کا سکوتِ مرگ طاری کر کے اور اس طرح لوگوں کے قلم اور زبان پر پہرے بٹھا دینے کے بعد اوڈوائر نے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ پنجاب کے باشندے اس کے زیرِ سایہ بالکل مطمئن و خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور یہی تاثرات وہ پنجاب سے باہر ہندوستان کے دوسرے لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

"تنہا یہی نہیں بلکہ اس نے ہنگامی قوانین کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر

پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں اور آرزوؤں کو کچل دیا۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اُس نے یہ حرکت شروع کی کہ وقتاً فوقتاً صوبے کے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو بلا کر بالمشافہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ لالہ دُنی چند جو پنجاب کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ہیں اِس قسم کے ناروا سلوک کا شکار ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں خود اُنہی کی شہادت کا وہ ضروری حصّہ درج کر دیں جو اسی صورتِ حال پر نہایت اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔

(لالہ دُنی چند کی شہادت)

" انڈین ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے اکثر پبلک جلسوں کا اہتمام اور انعقاد کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جلسے کا اعلان کرنے کے بعد ہر بار لازماً مجھے حکومتِ پنجاب کا چیف سیکرٹری یا لاہور کا کمشنر اپنے دفتر میں طلب کرتا تھا اور میرے راستے میں ایسی مشکلات کھڑی کی جاتی تھیں اور مجھے خواہ مخواہ اس قدر پریشان کیا جاتا تھا کہ میری جگہ کوئی اور شخص ہوتا۔ تو مدّت ہوئی اس کام سے علیحدہ ہو گیا ہوتا۔ چیف سیکرٹری اور کمشنر دونوں مجھ کو تنبیہہ کرتے تھے کہ میں بیرونِ پنجاب کے لیڈروں میں سے فلاں فلاں شخص کو تقریر کے لیے بلاؤں اور فلاں فلاں کو ہرگز دعوت نامہ نہ بھیجوں۔ ظاہر ہے کہ اُن کی یہ ہدایات سرمائیکل اوڈوائر ہی کے ایماء سے ہوتی تھیں۔ تنہا یہی نہیں جب پنجاب کی مجلس

قانون ساز کے بعض معزز ممبروں نے گذشتہ پراونشل کانفرنس
ہیں۔ جو لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ شرکت کی تو چیف سیکرٹری نے انھیں
اپنے دفتر میں بلا کر اس بری طرح ڈانٹا کہ آئندہ اُن کو بریڈ لا ہال کے
کسی پبلک جلسہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی"

سر فضلِ حسین نے ۲۰ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہنٹر کمیٹی کے سامنے جو شہادت دی
اُس کے ایک حصّہ کا اقتباس بھی اگر یہاں درج کر دیا جائے تو اس مسئلہ پر خاصی
روشنی پڑ سکتی ہے۔

کمیٹی کے ایک ممبر سر چمن لال ستیلواد میاں فضل حسین سے یوں سوال کرتے
ہیں "آپ نے مقامی گورنمنٹ کے اُس رویّہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اُس
نے سیاسی تحریکوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق اختیار کر رکھا تھا۔ اس سے
آپ کی کیا مراد ہے؟ وہ کون سا رویّہ تھا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے؟"

جواب :- مثال کے طور پر کانگرس اور مسلم لیگ کی پیش کردہ اصلاحات
کو لیجئے۔ جب ان مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں لاہور میں
چند جلسے ہوئے۔ تو صوبائی حکومت نے یا پنجاب نے آ کر فوراً
ایسا اعلان جاری کیا کہ جن لوگوں نے ان اصلاحات کا خاکہ
تیار کیا ہے وہ اُن باغیوں سے کم نہیں جنھوں نے امریکہ سے
واپس آ کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے"

سوال :- یعنی غدر پارٹی؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- یہ واقعہ کب ہوا تھا؟

جواب :- دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے بعد۔

سوال :- کیا یہ اس وقت کی بات نہیں جب امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے انیس[19] ممبروں کا مشہور میمورنڈم شائع ہو چکا تھا؟[1]

جواب :- مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میمورنڈم کب شائع ہوا تھا۔

سوال :- ۱۹۱۶ء میں!

جواب :- جی ہاں! پنجاب کی صوبائی حکومت کا اعلان جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ۱۹۱۷ء میں جاری ہوا تھا۔ میمورنڈم پر دسمبر ۱۹۱۶ء میں غور و خوض اور بحث مباحثہ ہوا تھا۔

---

[1] اس وقت ہندوستان کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ستائیس غیر سرکاری ارکان تھے۔ جن میں دو اینگلو انڈین تھے اور باقی ہندوستان کی دوسری قوموں کے نمائندے تھے۔ ان میں سے انیس ممبروں نے مشترکہ دستخطوں سے ۱۹۱۶ء میں وائسرائے کو ایک یادداشت بھیجی تھی۔ جس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں یہ درج تھا کہ ہندوستان اس عالمگیر معارکۂ عظیم میں اسی خلوص اور تن دہی سے حصہ لے رہا ہے جس طرح برطانیہ کے لوگ اس جنگ میں شامل ہیں۔ ہندوستان نے جنگی امداد میں کروڑوں روپے دینے اور لاکھوں جوان فوج میں بھرتی کرانے سے دریغ نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے اختتام پر اگر برطانیہ کو فتح ہوئی تو ہندوستانی بجا طور پر اس بات کے متوقع ہوں گے کہ ان کی سرفروشانہ خدمات کے بدلے میں حکومت ان کو

سوال :- جب یہ میمورنڈم شائع ہوا تو کیا اُس کی تائید میں لاہور میں کوئی
جلسہ بھی ہوا تھا؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- کیا اِس جلسے کے بعد حکومت نے اپنا اعلان جاری کیا تھا؟

جواب :- جی ہاں - اصلاحات کی سکیم اور اُس کی حمایت میں جو جلسے یہاں ہوئے
اُن کے بارے میں صوبائی حکومت نے اپنے غصے کا اظہار نہایت تلخ
اور تند لہجے میں کیا تھا - اِسی سکیم کے سلسلے میں یہاں ایک پراونشل کانفرنس
بھی منعقد ہوئی تھی -

سوال :- یہ پراونشل کانفرنس لاہور میں ہوئی تھی؟

اپنے ملک کے نظم و نسق میں مزید اختیارات عطا کرے : تاکہ وہ زیادہ خلوص اور عقیدت کے
ساتھ برطانیہ سے وابستہ رہیں -

مذکورہ بالا یادداشت کے دوسرے حصے میں اُن آئینی اور دستوری اصلاحات
کا ایک سرسری سا خاکہ درج کیا گیا تھا جو اُن انیس ممبروں کے خیال میں جنگ کے بعد
ہندوستان کو عطا ہونی چاہئیں تھیں - یہی یادداشت آئندہ ......
THE MEMORANDUM OF THE NINETEEN کے نام سے مشہور ہوئی -
جن اصلاحات کی اس یادداشت میں درخواست کی گئی تھی - کم و بیش اُنہی
خطوط پر دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنی مشترکہ سکیم تیار کی -
اور کسی قدر رد و بدل کے ساتھ یہی سکیم آگے چل کر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی بنیاد

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

جواب :- جی ہاں!

سوال :- اُنہیں ممبروں کے میمورنڈم کے بعد؟

جواب :- جی ہاں!

سوال :- پھر کیا ہوا؟

قرار پائی۔ میمورنڈم پر دستخط کرنے والے اصحاب کے نام یہ ہیں :-

(۱) مہندر چندر رنندی (راجہ قاسم آباد)۔ (۲) سر ڈنشا واچہ (۳) بھوپندر ناتھ باسو۔ (۴) رائے کشن دت شنکلا (۵) پنڈت مدن موہن مالویہ (۶) سی۔ وی۔ رنگا سوامی آئینگر (۷) مسٹر مظہر الحق (۸) وی۔ ایس۔ سری نواس شاستری (۹) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو۔ (۱۰) سر ابراہیم رحمت اللہ (۱۱) مسٹر بی۔ این۔ سرما (۱۲) خان بہادر میر اسد علی (۱۳) راجہ کامنی کمار چند (۱۴) رائے کرشنا سہائے (۱۵) آر۔ این۔ منج ودیہ (۱۶) ایم۔ بی۔ دادابھائی (۱۷) رائے سنتیاناتھ رائے (۱۸) محمد علی محمد خاں (راجہ محمود آباد)۔ (۱۹) مسٹر محمد علی جناح۔

تعجب ہے کہ سر مائیکل اوڈوائر ان لوگوں کو باغیوں میں شمار کرتا تھا اور میمورنڈم کو بغاوت اور بدامنی پھیلانے کا پروانہ قرار دیتا تھا۔ جن لوگوں کے نام اوپر درج ہیں ان سے زیادہ امن پسند اور عافیت کیش لیڈر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ لوگ قانون کی حدود سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اوڈوائر ان کو پنجاب میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور نہ میمورنڈم ایسی بے ضرر تحریک کی حمایت میں کسی پبلک جلسہ کا انعقاد گوارا کرتا تھا۔

جواب :- ظاہر ہے کہ کانفرنس کے منتظمین ......

سوال :- کیا آپ منتظمین میں شامل تھے؟

جواب :- میں کانفرنس کا صدر تھا۔

سوال :- پھر کیا ہوا؟

جواب :- ہندوستان کے متعدد لیڈروں کو دعوت نامے ارسال کئے گئے۔
لیکن حکومت کا اصرار تھا کہ یہ لیڈر ہرگز لاہور نہ آنے پائیں۔
بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ہماری حکومت کا رویّہ کیا تھا۔

سوال :- جب آپ حکومت کے اس رویّے کا ذکر کرتے ہیں۔ تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں حکومت کے کسی رکن سے آپ کی خط و کتابت ہوئی تھی؟

جواب :- جی ہاں۔ میری خط و کتابت ہوئی تھی۔

سوال :- کس سے؟

جواب :- چیف سیکرٹری سے۔

سوال :- مسٹر ٹامسن سے؟

جواب :- جی ہاں۔

سوال :- کیا آپ اس کام کے لیے خود اُن کے پاس گئے تھے یا انہوں نے آپ کو طلب کیا تھا؟

جواب :- اُنھوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ باہر کے ان لیڈروں کو لاہور آنے کی

دعوت دی جائے ۔

سوال :- اُن کا اشارہ کن لیڈروں کی طرف تھا ؟

جواب :- راجہ محمود آباد ۔ مسٹر چھاگلہ ۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ۔ مسٹر شاستری وغیرہ
بعد میں مسٹر شاستری کے متعلق انھوں نے اپنا اعتراض واپس
لے لیا تھا اور اُنھیں یہاں آنے کی اجازت دے دی تھی ۔

سوال :- گویا مسٹر شاستری کے علاوہ باقی تمام لیڈروں کے یہاں آنے
پر اُنھیں اعتراض تھا ؟

جواب :- جی ہاں !

سوال :- پھر کیا ہوا ؟

جواب :- وہ لوگ یہاں نہیں آسکے ۔

سوال :- جب آپ نے ہندوستان کے لیڈروں کے بارے میں صوبائی
حکومت کے رویے کا ذکر کیا تھا تو کیا یہی واقعہ آپ کے ذہن
میں تھا ؟

جواب :- یہ صرف ایک مثال میں نے پیش کی ہے اس کے علاوہ حکومت کے
متعدد ایسے احکام ہیں ۔ جن کی رو سے لوگوں کو صوبے سے
خارج کر دیا گیا تھا ۔ بہت سے اور واقعات بھی ہیں ۔

سر مائیکل او ڈوائر نے پنجاب میں جو حد درجہ قابلِ اعتراض رویہ اختیار کر رکھا
تھا ۔ اس کے جواز میں اس کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی ۔ کہ آئینی اصلاحات کا مطالبہ بے
جا اس لیے بے محل اور غیر ضروری ہے کہ اس سے جنگی کوششوں میں خلل پڑتا ہے

اور شہروں کے شورش پسند دیہات کے لوگوں کو بہکا کر فوج میں بھرتی ہونے سے روکتے ہیں۔ یہ اعتراض سراسر لغو اور بے بنیاد تھا۔ بات اصل میں وہی تھی کہ وہ دیہات کی آبادی کو چھوئی موئی کے پودے کی طرح شہر والوں کی ہوا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے فوجی بھرتی میں دیہاتیوں پر جس طرح جبر و تشدد کیا۔ اور گاؤں کے غریب دبے زبان باشندوں کو جس ظالمانہ طریق سے کھینچ کھینچ کر فوج میں بھرتی کیا۔ اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کے سامنے اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ ہندوستان کی دولت اور ہندوستان کے خون سے برطانوی شہنشاہیت کی بنیادیں اُستوار کی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی مقصد تھا جو کلائیو۔ وارن ہیسٹنگز اور ولزلی سے کر ہندوستان آتے تھے۔

مارشل لا کے مظالم کے بعد جب اوڈوائر نے اپنے آپ کو جملہ الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کے لیے لمبے چوڑے بیان جاری کرنا شروع کئے تھے۔ تو وہ بار بار کہتا تھا کہ میں نے فوجی بھرتی میں کوئی تشدد نہیں کیا۔ لوگ اپنی خوشی سے بھرتی ہوتے تھے۔ اس ضمن میں کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے :-

"جو شہادت ہم لوگوں نے جمع کی ہے۔ اور جو عدالتی دستاویزیں ہم نے ملاحظہ کی ہیں۔ اُن سے یہ بات غیر مشتبہ طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ رنگروٹ بھرتی کرنے۔ اور جنگی فنڈ کے لیے روپیہ جمع کرنے میں حکومت نے جو ذرائع اختیار کئے تھے۔ وہ اخلاقی یا معاشرتی دباؤ

سے کہیں تجاوز کر گئے تھے۔ سر مائیکل اوڈوائر کو ان تمام حالات کا علم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بار بار جبری بھرتی شروع کرنے کی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ اس نام نہاد رضاکارانہ بھرتی سے تو یقیناً جبری بھرتی بہتر رہتی کیونکہ اس نام نہاد رضاکارانہ بھرتی کی آڑ میں لوگوں پر زیادہ تشدد ہوا ہے اس طرح دیہات کے ذی ثروت اور ذی اثر لوگ تو بچ گئے اور سارا عذاب بے والی ولاوارث غریبوں پر پڑ گیا۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ شروع ہونے سے لے کر اس کے اختتام تک ہندوستان میں جس قدر فوجی بھرتی ہوئی ہم اس کا ایک نہایت سرسری جائزہ لے لیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ یورپ کے اس بین الاقوامی معرکے میں پنجاب کے کتنے نوجوانوں کو آگ میں جھونکا گیا۔ ۱۹۱۴ء کے آخری چار مہینوں میں ہندوستان بھر میں اٹھائیس ہزار جوان بھرتی کئے گئے جن میں سے چودہ ہزار پنجابی تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ترانوے ہزار رنگروٹ بھرتی ہوئے جن میں سے چھیالیس ہزار پنجابی تھے ۱۹۱۶ء میں ایک لاکھ چار ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں سے پچاس ہزار پنجابی تھے۔ گویا ۱۹۱۶ء کے آخر تک ہندوستان میں جتنی بھرتی ہوئی اس کی کل تعداد دو لاکھ پچیس ہزار تھی اور اس میں ایک لاکھ دس ہزار فرزندانِ پنجاب تھے۔

مئی ۱۹۱۷ء میں جب جنگ بہت نازک صورت اختیار کر گئی تھی حکومتِ ہند نے فوجی بھرتی کا ایک مرکزی بورڈ بنا کر فیصلہ کیا کہ چار لاکھ اسی ہزار جوان اور بھرتی کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد ۱۹۱۷ء کے سات مہینوں میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار

رنگروٹ بھرتی ہوئے۔ جن میں پچانوے ہزار پنجابی تھے۔ اور ۱۹۱۸ء میں تین لاکھ سترہ ہزار جوان بھرتی ہوئے جن میں ایک لاکھ چونتیس ہزار پنجابی تھے[1]

مذکورہ بالا اعداد و شمار دیکھ کر ہر پنجابی کا دل فخر و مباہات کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہوگا کہ اس کے صوبے کے من چلوں اور بہادروں نے معرکہ کارزار اور حرصۂ پیکار میں پورے ہندوستان سے بازی جیت لی۔ لیکن اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کیا یہ لاکھوں نوجوان بخوشی بھرتی ہوئے تھے یا بہ جبر و اکراہ۔ کیا مادرِ وطن کے ان سپوتوں نے بہ طیبِ خاطر آگ اور خون کے سمندر میں کودنا گوارا کیا تھا۔ یا زبردستی ان کو اس عذاب میں جھونک دیا گیا تھا۔ تو بہت سے امور صاف ہو جاتے ہیں۔ کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مائیکل اوڈوائر جو آئے دن پنجاب کے مظلوم اور بے کس دیہاتیوں کی خیر خواہی میں خون کے آنسو روتا تھا اپنے اس ہمدردی اور خیر خواہی کے دعوے میں کہاں تک سچا تھا۔

اس ضمن میں بے شمار شہادتیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ اوڈوائر کی تقریریں اعلےٰ عدالتوں کے فیصلے۔ صوبے کے مختلف علاقوں کے معززین کے بیان مجموعی طور پر یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ فوجی بھرتی میں ہر ممکن تشدد اور ہر نوع کا جبر روا رکھا گیا تھا۔ اوڈوائر اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر یکایک ایک نادر شاہی حکم جاری کر دیتا تھا کہ فلاں فلاں ضلع یا فلاں فلاں گاؤں سے اتنے جوان فوراً مہیا کیے جائیں۔ یہ حکم صادر ہوتے ہی صوبے کی پوری حکومت کے پرزے حرکت میں آجاتے تھے۔

---

[1] یہ اعداد سابق حکومت ہند کی سرکاری رپورٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

ضلع کا ڈپٹی کمشنر افسر مال کے سر پر۔ افسر مال تحصیلدار کے سر پر اور تحصیلدار نمبر دار کے سر پر تلوار بے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد، جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو، مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہل کار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اٹھ جاتی تھی اُسے پا بجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اور وہ رضاکارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔

حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے پنجاب میں بے شمار فساد ہوئے۔ دیہات کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے بلوے ہونا شروع ہو گئے اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا۔

ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں جب بھرتی کے افسروں نے لوگوں پر بہت زیادہ تشدد کیا۔ تو مشتعل ہجوم نے نائب تحصیلدار اور اُس کے عملہ پر حملہ کر دیا بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ جن میں سے باون ملزموں پر زیر دفعہ ۱۴۷ تعزیراتِ ہند مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالت نے اُن کو سزا دے دی لیکن سشن جج مسٹر کولڈسٹریم نے (جو چند سال بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے) سب کو بری کر دیا۔ مسٹر کولڈسٹریم نے جو فیصلہ لکھا اُس کے چند فقرے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے :-

"لوگوں کو سرکار کے خلاف سچی اور حقیقی شکایات ہیں ۔ اور وہ ابھی

تکلیفوں کا اظہار کرنے پر مجبور رہیں۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ضلع مظفر گڑھ کے ماتحت افسروں نے رنگروٹوں کی بھرتی۔ اور جنگی فنڈ کے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں نمبرداروں اور ذیلداروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا ہے۔ چنانچہ ان نمبرداروں اور ذیلداروں کو مجبوراً ایسے قابلِ اعتراض طریقے اختیار کرنا پڑے۔ جن سے ضلع کے اکثر مقامات پر فسادات رونما ہوئے۔ یہ بہرصورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ قابلِ اعتراض طریقے جو حد درجہ تشدد آمیز بھی تھے حکومت کے ایما اور منشا کے خلاف تھے۔ تاہم ضلع کے دور دراز مقامات پر یہ تشدد ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔"

ضلع شاہ پور میں جب فساد برپا ہوا اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کیے۔ تو بے شمار لوگوں پر مقدمات چلائے گئے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں عجیب و غریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کرتے تھے تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے میں تین یا چار بھائی تھے۔ اُن میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ بیویوں کو خاوندوں سے جدا کر کے دور کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اور جب تک اُن کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے عورتوں کو واپس گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔

کرنال کے ایک گاؤں میں جب زبردستی بھرتی شروع ہوئی۔ تو ایک شخص نے

مجسٹریٹ کی منتیں کیں کہ اُس کا اکلوتا بچہ ہے۔ رحم کیجئے۔ اور بھرتی نہ کیجئے۔ لیکن مجسٹریٹ نہ مانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گاؤں میں سخت فساد ہوا۔ اور بے شمار آدمیوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ جن میں سے پانچ کو عدالت نے سزا دی۔ اپیل میں وہ بری ہو گئے۔ عدالتِ اپیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:-

"ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے وقتاً فوقتاً جو احکام صادر کئے۔ اُن سے یہ بات قطعی ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر یہ اپیل کنندگان اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوج میں بھرتی کرا دیتے۔ یا خود بھرتی ہو جاتے تو اُن سے بآسانی درگذر جاتی"

اِسی طرح پنجاب کے مختلف اضلاع میں دیہاتیوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اور جبر و تشدد سے تنگ آئے ہوئے لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے، جونہی خبر اُڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے۔ گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لوٹ لیتے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔

اسی سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر کی ایک تقریر کا حوالہ دینے پر مجبور ہوں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ بھرتی کے بارے میں اُس کا اپنا رویہ کیا تھا۔

۴ مئی ۱۹۱۸ء کو اُس نے تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ درکار ہیں۔ اگر لوگ خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے۔ بعض علاقوں میں لوگ بھرتی ہونے سے جی چُراتے ہیں۔ ہم اِس صورتِ حال کا اچھی

طرح مقابلہ کرنے کو تیار رہیں۔ ہم پنجاب سے رنگروٹوں کی ایک مقررہ تعداد مہیا کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہذا اس وعدے کا ایفا ضروری ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ اب کم از کم پنجاب میں اکثر لوگ جبری بھرتی کے حامی بنتے جا رہے ہیں۔ مثلاً اگر ہر دس پندرہ بالغ جوان آدمیوں میں سے ایک آدمی بھرتی کر لیا جائے۔ تو یہ شرح بُری نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت نے ہندوستان کے ہر صوبے کے ذمّے رنگروٹوں کی ایک خاص تعداد مقرر کر دی ہے۔ میری رائے ہے کہ اگر یہ تعداد رضاکارانہ بھرتی سے مہیّا نہ ہوئی۔ تو پھر اور قسم کے ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے۔"

یہ اور قسم کے ذرائع کیا تھے؟ — ان میں سے کچھ تو سطور بالا میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ دو ایک مزید واقعات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ داستان طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اُس شخص کے اعمال کا تجزیہ بے حد ضروری ہے۔ جو اپنے آپ کو دیہاتیوں کا ہمدرد اور خیر خواہ کہتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔ اور جس نے اپنی مذموم کوششوں سے پنجاب کی مسلمان آبادی کو اس طرح دو مخالف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ اُس کے اثرات نے ربع صدی تک اُنہیں مبتلائے رنج و محن کئے رکھا۔

گوجرانوالہ کے ایک معزز مسلمان زمیندار نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ :-

"بیساکھی کے مہینے میں تحصیلدار ہمارے گاؤں میں آیا۔ اور

رات ہی رات میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ صبح تمام لوگ ڈیرے پر حاضر ہوں۔ ایک تو فصلوں کی کٹائی کے دن تھے۔ دوسرا یوں بھی لوگ ڈرتے تھے۔ کہ انھیں زبردستی بھرتی کر لیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بہت کم آدمی ڈیرے پر حاضر ہوئے۔ چنانچہ تحصیلدار سخت ناراض ہوا اور اُس نے ساٹھ ستر آدمیوں کو جرمانہ کر دیا۔ جس کی مجموعی رقم سولہ سو روپیہ تھی۔ پھر تحصیلدار نے حکم دیا کہ گاؤں کے لوگ ضلع کے صدر مقام گوجرانوالہ میں حاضر ہوں جو ہمارے گاؤں سے اٹھارہ میل دور ہے جب مقررہ تاریخ کو لوگ وہاں گئے۔ تو سب کو قطار میں کھڑا کر کے سات جوانوں کو فوجی بھرتی کے لیے چن لیا۔ اور باقی آدمیوں کو مارا اور گالیاں دیں۔ اور کہا کہ بھرتی کے لیے اور جوان لے کر آؤ۔"

اگر ہم پنجاب کے مختلف اضلاع میں فوجی بھرتی کے مد و جزر کے نقشے کا بغور مطالعہ کریں تو ایک عجیب بات ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی ضلع میں آج بھرتی معمول کے مطابق ہے تو چند مہینوں کے اندر وہاں بھرتی ایک دم اس قدر تیز ہو جاتی کہ معلوم ہوتا ہے گویا لوگ دیوانہ وار فوج کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی سبب تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر ضلع کا حاکم ناجائز ذرائع استعمال کرنے اور جبر و تشدد کو روا رکھنے کا حامی نہ ہوتا تھا تو اوڈوائر اس کو فوراً تبدیل کر کے وہاں کسی ایسے آدمی کو متعین کر دیتا تھا جو اُس کے ایما کے مطابق بھرتی میں بُرے بھلے طریقوں میں امتیاز کرنے کا قائل نہ تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۷ء کے آخر میں ضلع ملتان کے رنگروٹوں کی تعداد ۷۵۹ تھی

گویا ضلع کی آبادی کے ۵۸۶۲ مردوں میں سے ایک رنگروٹ بھرتی ہوا۔ لیکن سال بھر کے اندر یعنی نومبر ۱۹۱۶ء میں رنگروٹوں کی کل تعداد ۴۳۴۶ ہوگئی، گویا ہر ۹۳ مردوں میں سے ایک رنگروٹ لیا گیا۔ اِسی طرح اوڈوائر نے دیکھا کہ گوجرانوالہ کے لوگ رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے میں تامل کرتے ہیں۔ تو اُس نے اپنے خاص آدمی کرنل اوبرائن کو وہاں ڈپٹی کمشنر مقرر کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء تک تو گوجرانوالہ کے رنگروٹوں کی تعداد ۳۳۸۸ تھی۔ لیکن اگست ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد یکایک ۱۱۷۶۵ تک پہنچ گئی۔ گویا ایک ہی سال میں ساڑھے آٹھ ہزار رنگروٹ بھرتی ہوگئے۔

دیہات کے معززین کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی۔ نمبرداروں اور ذیلداروں پر آئے دن سرکار کا تازیانہ برستا تھا کہ اور رنگروٹ لاؤ۔ جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا۔ اُن کی نمبرداریاں ضبط کرلی گئیں پولیس حفظِ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی۔ اور مجسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انھیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے۔ اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ نہ کرتے۔ انھیں رہا نہیں کیا جاتا تھا۔

اوڈوائر نے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک آہنی پردہ ڈال دینے کی کوشش کی تھی۔ تاکہ دیہات میں جو کچھ ہو رہا تھا اُس کی ہوا شہروں میں نہ پہنچنے پائے لیکن جب دیہاتیوں پر پیہم سختیاں ہونا شروع ہوئیں اور جگہ جگہ فساد پھوٹ پڑے تو صوبے میں ہلچل سی مچ گئی۔ بلوے کے ایک ایک مقدمے میں پولیس نے بیک وقت سو سو، دو دو سو آدمیوں کا چالان کردیا تھا۔ جب یہ مقدمات ابتدائی عدالتوں

سے ہوتے ہوئے صوبے کی عدالتِ عالیہ تک پہنچے، اور صفائی کی طرف سے قابل وکلاء پیش ہوئے تو رازہائے درونِ پردہ کھلنا شروع ہوئے۔

سر فضلِ حسین نے، جو دو مقدموں میں ملزموں کی طرف سے پیش ہوئے تھے ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا:۔

سوال:۔ "جن مقدمات میں آپ پیش ہوئے تھے، اُن کی ابتدا کیونکر ہوئی تھی؟"

جواب:۔ "یہ دونوں مقدمات ضلع شاہ پور سے آئے تھے۔ ایک مقدمے میں ملزموں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انھوں نے جبری بھرتی کی مخالفت کی ہے؟"

سوال:۔ "کیا بلوے کے ایک مقدمے میں ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان کر دیا گیا تھا؟"

جواب:۔ "جی ہاں!"

سوال:۔ "واقعات کیا تھے؟"

جواب:۔ مجھے اس وقت گاؤں کا نام یاد نہیں۔ یہ گاؤں ضلع شاہ پور میں ہے اور غالباً سرگودھا سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ان ڈیڑھ سو ملزموں میں سے ایک بھی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا اور جب سے پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ہے اس گاؤں کا صرف ایک آدمی سرکاری ملازمت میں گیا ہے۔ ملزموں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا تھا۔ لیکن وہ بھرتی پر آمادہ نہ ہوئے"

سوال :- "کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خود ان ڈیڑھ سو ملزموں کو بھرتی ہونے کے لیے کہا گیا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں، گاؤں کے تمام باشندوں پر جن کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے، دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔"

سوال :- "کیا رنگروٹوں کی کوئی خاص تعداد طلب کی جا رہی تھی؟"

جواب :- "جی نہیں! کوئی خاص تعداد مقرر نہیں تھی۔ چونکہ اس گاؤں سے کوئی آدمی بھرتی نہیں ہوا تھا۔ اور حکومت زبردستی بھرتی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اور لوگ بھرتی سے بار بار انکار کرتے تھے اس لیے حکومت نے یہ خیال کیا کہ گاؤں کے لوگوں نے سازش کر لی ہے۔ چنانچہ حکومت نے قانون تحفظ ہند کے تحت یہ قدم اٹھایا۔"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ قدم گاؤں کی پوری آبادی کے خلاف اٹھایا تھا؟"

جواب :- "جی نہیں! گاؤں کے چند آدمیوں کے خلاف۔"

سوال :- "کیا حکومت نے یہ اقدام اس بنا پر کیا تھا کہ یہ چند آدمی بھرتی کی مخالفت کر رہے ہیں؟"

جواب :- "جی ہاں! ان چند آدمیوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ لیکن گاؤں والوں نے انھیں پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر فوج بھیجی گئی۔ اور جب فوج نے گاؤں میں جا کر اودھم مچایا تو بلوہ ہو گیا۔"

سوال :- "تو کیا اس بلوے میں ان ڈیڑھ سو آدمیوں کا چالان ہوا تھا؟"

جواب :- "جی ہاں"

سوال :- "پھر کیا ہوا؟"

جواب :- اپیل میں اکثر بری ہو گئے اور چند ایک کو سزا مل گئی"

انہی دنوں لاہور، امرتسر اور جالندھر میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہو رہے تھے جہاں مسلم لیگ اور کانگرس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں قراردادیں منظور کی جاتی تھیں۔ ان جلسوں میں بعض مقررین نے بھرتی کے تشدد آمیز طریقوں پر بھی اظہار خیال کیا۔ اور دیہاتی آبادی کے تہہ در تہہ مظالم سے پردے اٹھائے۔ اوڈوائر کے لیے یہ صورت حالی قطعاً ناقابل برداشت تھی۔ وہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ شہر کے چند تعلیم یافتہ شورش پسند دیہات کے معاملات میں دخل دے کر اس حصار خود فریبی میں رخنہ ڈال دیں جو اس نے حد درجہ ہوشیاری سے تیار کیا تھا۔ چنانچہ عالم سراسیمگی میں اس سے بعض عجیب و غریب حرکات سرزد ہونا شروع ہوئیں۔

مثلاً دسمبر ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اس کا داخلہ بغیر کسی معقول وجہ کے پنجاب میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پنجاب کے بعض معززین اور ذی اثر زمینداروں کو بلا کر تنبیہہ کی گئی کہ کوئی شخص لیگ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے دہلی نہ جائے۔ دیہات میں مسلم لیگ کی تحریک کو دبانے کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ اگر کوئی شخص گاؤں میں مسلم لیگ کا چرچا کرتا ہوا نظر آئے

تو فوراً اُسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن اوڈوائر کی اِن تمام کوششوں کے باوجود ظلمت اور تشدد کے بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ رائے عامہ بیدار ہو رہی تھی۔ لوگوں کو سود و زیاں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہو چکی تھی۔ اور شہروں کی تعلیم یافتہ آبادی کا وہ بے قرار عنصر جس کو وہ شکنجے میں دبا دبا کر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ہی جست میں زنجیروں کو توڑ کر رہا ہو گیا تھا۔ اوڈوائر کی آنکھوں کے سامنے امرتسر کے ایک بہادر فرزند نے جس کا نام ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کو ۱۹۱۹ء کے سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد کرنے کی دعوت دے دی۔ اور دونوں قومی انجمنوں نے اِس دعوت کو بخوشی منظور کر لیا۔

اب اوڈوائر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جس مسلم لیگ اور کانگرس کی مجوزہ اصلاحات کو وہ بغاوت سے تعبیر کرتا تھا۔ اب اُن کے سالانہ اجلاس اُس کی آنکھوں کے سامنے پنجاب میں منعقد ہوں۔ ہندوستان کے جن چوٹی کے لیڈروں کو وہ پنجاب کے حدود میں قدم رکھنے کا روادار نہ تھا۔ اب وہی لیڈر اُس کے سامنے اپنی آتش بیانیوں کے جوہر دکھائیں۔ سیاسی بیداری کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بچنے کے لیے اُس نے پنجاب کے چاروں طرف جو بند باندھ رکھا تھا۔ اب اُس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اور کوئی دن کی بات تھی کہ عوام کی بیداری کے ایک زبردست ریلے کے سامنے وہ بند اپنی جگہ سے ہل جائے گا۔ اِس یاس انگیز حالات میں اوڈوائر کے دل و دماغ کی کیفیت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ ایک طرف غصے اور انتقام کی آگ

میں جل رہا تھا۔ اور اُن لوگوں کو جی کھول کر سزا دینا چاہتا تھا جنھوں نے اُس کی تمام مخالفانہ کوششوں کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری طرف اُس پر ایک حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔ جو شکست خوردگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے! اس عالم اضطرار میں اُس نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا۔ اور ۱۵ر اپریل ۱۹۱۹ء کو مارشل لاء کا اعلان کر کے اُس نے پنجاب کو آگ اور خون کے ایک ایسے سیلاب میں غوطہ دیا جس کے سحر آفریں اور انقلاب انگیز اثر سے ایک نیا ملک اور نئی قوم پیدا ہوئی۔

دوسرا باب

میثاقِ لکھنؤ کے بعد

مسٹر جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی ربط وضبط تو سنہ ۱۹۱۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اُن کی اتحاد پرور کوششوں کا حقیقی ثمر دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں حاصل ہوا جب کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بیک وقت لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ اور ہندوستان کی اِن دو نمائندہ انجمنوں نے مل کر اصلاحات کی ایک سکیم تیار کر کے حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ اس سکیم کی تفصیلات بیان کرنے یا اُس کے معائب و محاسن پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔ تاہم اجمالی طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خدشات کو جائز تصور کرتے ہوئے کہ مخلوط انتخاب میں اُن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اُن کے لیے مجالسِ قانون ساز میں جداگانہ نیابت منظور کر لی اور مسلمانوں نے اپنے حقِ نمائندگی سے مطمئن ہو کر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا وعدہ کر لیا۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کا یہ معاہدہ جسے عرفِ عام میں لکھنؤ پیکٹ یا میثاقِ لکھنؤ کہا جاتا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مصالحت...

کا ایک یادگار واقعہ ہونے کے علاوہ ہندوستان کی آئینی اور دستوری تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر جناح اس تمام کارروائی میں بطلِ جلیل یعنی ہیرو کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اسی موقع پر مسز سروجنی نائیڈو نے اُنھیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

میثاقِ لکھنؤ کی دیگر تفصیلات سے قطع نظر اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی ملے گی اور اس طرح اِن دو صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت کو جو نقصان پہنچے گا۔ اُس کے معاوضے میں اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اُن کی آبادی سے زیادہ نمائندگی عطا ہوگی۔ یو۔ پی۔ بہار۔ مدراس وغیرہ کے مسلمانوں کو اس طریقے سے جو مراعات حاصل ہوئیں۔ اُن کے لیے ایک انگریزی اصطلاح ویٹیج استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ جداگانہ انتخاب کی رُو سے ہندوستان کی صوبائی کونسلوں کے نمائندوں کی جو تعداد مقرر ہوئی اُس کی شرح حسبِ ذیل ہے:۔

پنجاب	منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کا	نصف
بنگال	〃 〃 〃 〃	چالیس فیصد
یو پی	〃 〃 〃 〃 〃	تیس فیصد
بہار	〃 〃 〃 〃 〃	پچیس فیصد
صوبۂ متوسط	〃 〃 〃 〃	پندرہ فیصد
مدراس	〃 〃 〃 〃 〃	پندرہ فیصد
بمبئی	〃 〃 〃 〃 〃	$\frac{1}{3}$

اِس فیصلے کے ساتھ یہ شرط بھی طے ہوئی کہ عام حلقہ ہائے انتخاب میں کوئی مسلمان امیدوار کھڑا نہیں ہو سکے گا اور کوئی مسودہ قانون یا اُس کا کوئی جزو یا کوئی تجویز جو کسی غیر سرکاری ممبر کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ اگر اُس مسودہ قانون یا اُس کے کسی جزو یا کسی تجویز کی متعلقہ جماعت کے ¾ ممبر مخالفت کریں گے۔ تو وہ مسودہ یا اُس کا کوئی جزو یا تجویز کونسل میں پیش نہیں ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ جس طرح صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کا انتخاب جداگانہ ہوگا۔ اسی طریقے سے مرکزی قانون ساز مجلس میں بھی ہونا چاہیئے۔ اور وہاں منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی مسلمان ہوں گے۔

میثاقِ لکھنؤ کے بعد پورے ہندوستان میں ایک طرف تو صلح و آشتی کی خوشگوار ہوائیں چلنا شروع ہوئیں۔ اور دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے باہم مل کر فیصلہ کیا کہ اب کانگریس اور لیگ کے جھنڈے کے نیچے جگہ جگہ جلسے منعقد ہونے چاہئیں۔ تاکہ مجوزہ اصلاحات کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ چنانچہ ہر صوبے میں نہایت پُرامن طریقے سے جلسوں کا انعقاد ہونے لگا۔ اور عوام نے بڑی گرم جوشی سے میثاقِ لکھنؤ کی حمایت کی۔

جیسا کہ اِس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر اِس تحریک کا بدترین مخالف تھا۔ اُس نے میثاقِ لکھنؤ کو بغاوت کا اعلان اور اصلاحات کی سکیم کو بغاوت کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہ کیا تھا۔

لیکن اوڈوائر کی بدقسمتی سے اب مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند تھے۔ جن کی بلند خیالی اور وسیع المشربی کا اُن کے دشمنوں تک کو بھی اعتراف ہے۔ مانٹیگو کا دورہ یہ ابتدا

سے ہمدردانہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی دُور اندیشی سے محسوس کر لیا تھا کہ جب تک اہلِ ہند کو یقین نہ ہو جائے کہ اختتامِ جنگ کے بعد اُنھیں اپنے ملک کے نظم و نسق میں برابر کا حصّہ ملے گا، موجودہ بے چینی رفع نہیں ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اِس بے چینی کا اثر حکومتِ ہند کی اُن تمام کوششوں پر بُری طرح پڑے گا۔ جو رنگروٹوں کی بھرتی اور سامانِ جنگ کی فراہمی کے سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو نے اپنا وہ مشہور اعلان جاری کیا جس کے متعلق بعض سیاسی نقّادوں کی رائے ہے کہ جب سے برِّ عظیم ہند میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی ایسا اہم اور نتیجہ خیز منشور اب تک جاری نہیں ہوا تھا۔

مسٹر مانٹیگو نے صاف الفاظ میں کہا کہ "ملکِ معظّم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کو بتدریج ترقی دی جائے تاکہ انجام کار ہندوستان کامل ذمہ دارانہ حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن سکے۔" آخر میں مسٹر مانٹیگو نے کہا "ملکِ معظّم کی رضامندی سے اُن کی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو وائسرائے کی یہ دعوت قبول کر لینا چاہیئے کہ میں ہندوستان جا کر اِن معاملات کے متعلق وائسرائے اور حکومتِ ہند سے بالمشافہ گفتگو کروں، تاکہ ایک طرف اس ملک کے وائسرائے اور وہاں کی مقامی حکومتوں کے خیالات معلوم کئے جا سکیں اور دوسری طرف ہندوستان کی نمائندہ جماعتوں کے مشوروں سے بھی بہرہ

مستفید ہو سکوں۔"

اِس اعلان کے ساتھ ہندوستان میں اُمیدوں کے چراغ روشن ہونا شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ حالاتِ نامساعد کی پروانہ کرتے ہوئے وزیرِ ہند خود ہندوستان آ رہے تھے۔ تاکہ اِس ملک کے اہل الرائے لیڈروں سے مل کر ذمہ دارانہ حکومت کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اوڈوائر حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ کیا وائسرائے (لارڈ چیمسفورڈ) اور وزیرِ ہند مانٹیگو دیوانے ہو گئے ہیں کہ عین اُس وقت جب یورپ کے محاربۂ عظیم میں برطانیہ کی تقدیر ڈانواں ڈول ہو رہی ہے۔ یہ لوگ ہندوستانی اِصلاحات ایسے بے کار اور بے مصرف کام میں وقت ضائع کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ بات بھی اُس کے فہم سے بالاتر تھی کہ جن لوگوں کو اُس نے باغی اور مفسد قرار دے کر پنجاب کے حدود میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔ اب اُنہی فتنہ پردازوں کے مشورے سے مستفید ہونے کے لیے وزیرِ ہند یہاں تشریف لا رہے تھے۔

اوڈوائر نے اِس صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب[1] میں جگہ جگہ ایسے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جن میں ایک طرف بُغض و عناد اور دوسری طرف رنج و غم کے علاوہ بے بسی کا اِظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ستمبر ۱۹۱۶ء میں مسز بسنٹ نے ہوم رُول لیگ قائم کی اِس

لے۔ "INDIA AS I KNEW IT" BY SIR MICHAEL O' DWYER (1925)

کے چند ہفتے بعد مرکزی مجلسِ قانون ساز کے اُنیس (۱۹) ممبروں نے اپنا اعلان شائع کیا۔ جس میں ایسی انقلاب انگیز سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جن سے پوری صورتِ حال کے بدل جانے کا اندیشہ تھا۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ نے ایک متحدہ سکیم منظور کی جس میں ہوم رُول تحریک کی حمایت کی گئی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اِن مطالبات کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے تھے۔ اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت چونکہ اس وقت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس لیے جو کچھ اُس سے منوایا جا سکتا ہے ابھی منوا لیا جائے۔ دوسرا محرک یہ تھا کہ برطانوی حکومت نے امریکی صدر ولسن کے اِس نظریہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ محکوم اور غلام قوموں کو اُن کے حقِ خود ارادیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ تیسرا محرک یہ تھا کہ خود برطانیہ میں ایسے سیاستدانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد موجود ہے جنھیں حکومت کے نظم و نسق کا نہ علم ہے اور نہ تجربہ۔ لیکن جو محض کتابی مطالعہ کی بنا پر سیاست کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندوستانی لیڈروں کو اِن تخیل پسند لوگوں کی مدد پر پورا بھروسہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اِس تمام عرصے میں اربابِ حکومت شملہ کی چوٹیوں پر بیٹھ کر اِس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے۔ کہ ہندوستان کے ترقی پسند سیاسی رہنماؤں کے مطالبات کو تسلیم کرنے کی بہتر

صورت کیا ہو سکتی ہے ۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اربابِ حکومت یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہندوستان کے یہ چند ترقی پسند سیاستدان ہی گویا سارے عوام کی نمائندگی کرتے ہیں ۔"

پھر آگے چل کر لکھتا ہے :-

" تقریباً انہی دنوں کے لگ بھگ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو نے جو مسٹر آسٹن چیمبرلین کی جگہ وزیرِ ہند مقرر ہوئے تھے ہندوستانی اصلاحات کے متعلق دارالعوام میں اپنا وہ تاریخی اعلان کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ہر شعبہ میں اہلِ ہند کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیئے ۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں حکومت خود اختیاری کے اداروں کو بتدریج ترقی دی جائے تاکہ انجامِ کار ہندوستان ایک کامل ذمہ دارانہ حکومت کا مالک بن کر برطانوی سلطنت کا ایک جزو بن سکے ۔

" برطانوی اہلِ سیاست کا یہ پیغام جو اصل میں ہندوستانی لیڈروں کے نام بھیجا گیا تھا کسی مخالفانہ تبصرے کا محتاج نہیں ۔ بشرطیکہ ایک حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے ۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو اس ملک کی آبادی میں اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی آٹے میں نمک کو ہوتی ہے ۔ بدقسمتی سے لارڈ چیمسفورڈ اور مسٹر مانٹیگو نے

اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کی تجاویز پر عمل کرتے وقت اس بنیادی حقیقت کو آسانی سے نظرانداز کر دیا تھا۔"

اوڈوائر چونکہ فطرتاً شہنشاہیت پسند اور آمرانہ مزاج کا آدمی تھا۔ اس لیے اُس کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ مسٹر مانٹیگو نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو دارالعوام میں کیوں اعلان کیا۔ اُس کے نزدیک رعیت کی تالیفِ قلب کرنے کا منصب صرف اعلیٰ حضرت ملکِ معظم کو حاصل ہے کہ وہ ازراہِ کرم گستری ایک منشورِ خسروانہ جاری کر کے اپنی ہندوستانی رعایا کے قلوب کو مسخر کرتے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے منشور کی طرح یہ اہم اعلان بھی ملکِ معظم ہی کی ذاتِ شاہانہ کی طرف سے صادر ہونا چاہیے تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اُس کا روئے سخن ہندوستان کے سیاست دانوں کی طرف نہ ہوتا۔ بلکہ ملکہ وکٹوریہ کے منشور کی مانند اُس کی مخاطب ہندوستان کی وفادار و اطاعت گزار رعایا ہوتی۔ ذمّہ دارانہ حکومت جس کا ذکر مسٹر مانٹیگو نے اپنے اعلان میں کیا تھا۔ ایک ایسا لفظ ہے جو ہندوستان میں ترجمۂ معنی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس لفظ کا کوئی مترادف ہندوستان کی کسی زبان میں موجود ہے۔ باقی رہے حکومتِ خود اختیاری کے ادارے۔ یہ گورکھ دھندہ بھی ہندوستانی عوام کے فہم سے بالاتر ہے۔ انھوں نے حکومتِ خود اختیاری سے جو مطلب اخذ کیا وہ یہ تھا کہ برطانیہ اپنی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ

ہوئے بغیر اس ملک سے اپنا بوریہ بستر اٹھا رہا ہے۔ ہندوستان کے لوگ بادشاہِ وقت کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کے عادی ہیں۔ وہ اس غیر مرئی اور غیر شخصی چیز سے قطعاً واقف نہیں جسے برطانوی حکومت کہا جاتا ہے اُن کی تمام تر عقیدت و نیاز مندی صرف بادشاہ سلامت کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ جو اُن کے نزدیک گویا ظلِ سبحانی ہیں۔ افسوس کہ برطانیہ کے سیاست دانوں نے اپنی کوتاہ فہمی سے اس جذبۂ عقیدت سے فائدہ نہ اُٹھایا۔"

نومبر ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو ہندوستان تشریف لائے۔ اور آئندہ اصلاحات کے بارے میں انھوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں سے گفت و شنید شروع کی۔ مانٹیگو کا رویہ نہایت ہمدردانہ اور سلوک بے حد شریفانہ تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ نزاع اور لڑائی جھگڑے کے جملہ امور کا تصفیہ ہو جائے۔ اور حکومت اور عوام کے درمیان خوش دلی، مفاہمت اور خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے وزیرِ ہند سے ملاقات کر کے انھیں اپنے قومی معاملات سے آگاہ کیا اُن میں وہ تمام اکابر شریک تھے جن کے شانوں پر اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا بارِ گراں عائد ہوتا تھا مثلاً مسٹر جناح۔ سر محمد شفیع۔ سر فضل حسین۔ سر وزیر حسن۔ سید حسن امام۔ مسٹر مظہر الحق۔ راجہ محمود آباد۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولوی فضل الحق وغیرہ۔ محمد علی اور شوکت علی چونکہ نظر بند تھے۔ اس لیے مسٹر مانٹیگو اُن کی ملاقات سے

محروم رہے۔

اوڈوائر نے اِس پوری بد ردائی کا حال قلم بند کرتے وقت اپنے قلم سے جس طرح بغض و عناد کا زہر ٹپکایا ہے۔ اُس سے یہ بات تو قطعی عیاں ہو جاتی ہے کہ اُسے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے سے سخت دشمنی تھی۔ لیکن ستم یہ ہے کہ وہ اِس سلسلے میں مانٹیگو اور چیمسفورڈ کو بھی معاف نہیں کرتا۔ اُس کے خیال میں وزیرِ ہند اور وائسرائے کا یہ قصور ہرگز قابلِ درگذر نہیں کہ انھوں نے ہندوستان کے اُن لوگوں کو منہ لگانا پسند کیا جن کو وہ حدودِ پنجاب میں قدم رکھنے کی بھی اجازت دینے کو تیار نہ تھا۔ لکھتا ہے :-

"یہ لوگ (وزیرِ ہند اور اُس کے رفقاء) مہینوں دہلی میں بیٹھے وائسرائے اور اُس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے گفت و شنید کرتے رہے۔ اُن کے صبر و تحمل کی داد دینا چاہیئے کہ انھوں نے تجویزوں کے اُس پورے انبار کا مطالعہ کیا جو ہندوستان کی مختلف انجمنوں کی طرف سے اُن کو موصول ہوئی تھیں۔ اور پھر اُنہی تجویزوں کے حق میں لوگوں کے دلائل بھی سُنے۔ ہندوستان کے سیاستدانوں کو بھلا اپنی زندگی میں اِس سے پہلے کہاں ایسا موقع میسر آیا ہو گا کہ ایک ہمدرد و خیر خواہ وزیرِ ہند اور متحمل و بردبار وائسرائے کے رُوبرو پیش ہو کر دفتری حکومت کے نقائص بیان کر سکیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا سکیں کہ خود اُن کے نزدیک ہندوستان کی وسیع سلطنت کو بہتر نہج پر چلانے کی کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں نیز نئے

کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ ایک سکول یا ایک اخبار بھی کامیابی سے نہ چلا سکتے تھے۔ اور جن کو ایک میونسپل کمیٹی کے انتظام کا بھی سلیقہ نہ تھا اب وہ بڑھ بڑھ کر ایک عظیم الشان سلطنت چلانے کی تجویزیں پیش کرنے میں مصروف تھے۔[1] بعض کو تو اپنی ہمہ گیر حیثیت جتانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک روز وہ ہندو سبھا کے نمائندے کے طور پر حاضر ہو کر ایک تجویز پیش کرتے۔ اور دوسرے ہی روز زمینداروں کے وفد کے ممبر بن کر بالکل اُلٹ مشورہ دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اِس تمام کارروائی میں شرکت کرنے کے بعد یہ لوگ اپنے آپ کو بہت اہم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اور خود فریبی اور غلط فہمی کی انتہا ہے کہ مسٹر مانٹیگو اور اُن کے رفیق بھی اُن کی اہمیت کے قائل ہوتے جاتے تھے۔

---

[1] ہندوستانی لیڈروں کے متعلق او ڈوائر نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا مقابلہ مسٹر مانٹیگو کی رائے سے کرنا چاہیئے۔ دہلی میں مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کے بعد مانٹیگیو نے اپنی ڈائری میں جو تاثرات درج کئے تھے۔ اُن میں لکھا ہے "۔۔۔۔ ان لوگوں کے بعد جناح آیا جو ایک رعب دار شخصیت اور نہایت مہذب اطوار کا مالک ہونے کے علاوہ بحث و تمحیص کے فن کا بہت بڑا ماہر ہے ۔۔۔۔ چیمسفورڈ نے اُس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کے سامنے اُس کی پیش نہ جا سکی۔ جناح یقیناً بڑا قابل اور ہوشیار آدمی ہے اور یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایسے شخص کو اپنے ملک کے نظم و نسق میں کوئی دخل نہیں۔"

صوبوں کے لفٹننٹ گورنروں اور گورنروں کو بھی اکثر مشورے کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ہم لوگ اِس سیاسی تماشے سے جو دہلی میں ہو رہا تھا کہیں ضروری کاموں میں مصروف تھے۔ ہمارے سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا۔ اور جب ہمیں ایسے ضروری کام کو چھوڑ کر دہلی جانا پڑتا تھا۔ تو ہم لوگ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے کہ برطانوی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نازک وقت میں اُس نے اصلاحات کا ڈھونگ رچا دیا ہے۔

دہلی میں جو معاملات طے کیے جا رہے تھے اُن کے متعلق دیہاتی عوام سے مشورہ لینے کا نہ والسرائے کو خیال آیا اور نہ وزیرِ ہند کو۔ اوّل تو وقت اِس قدر قلیل اور مہلت اتنی مختصر تھی کہ مجوزہ اصلاحات کے بارے میں دیہات کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ حالانکہ یہ امر بے حد ضروری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے دو، تین بار دہلی میں وزیرِ ہند اور اُن کے ساتھیوں سے کہا بھی کہ محض ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے بیانات پر اعتماد کر لینا قرینِ مصلحت نہیں۔ میرے ساتھ کسی اتوار کو پنجاب کے دیہات میں چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ کہ حکومت کا نظم و نسق کس قابلِ رشک خوبی سے چل رہا ہے۔ وہاں لوگوں سے خود بات چیت کر کے دریافت کریں کہ آیا اُن کو حکومت سے کوئی شکایت ہے۔ لیکن وزیرِ ہند کو دہلی میں چاروں طرف سے ہندوستان

کے لیڈروں نے گھیر رکھا تھا۔ انھیں میرے ساتھ پنجاب کے دیہات میں جانے کی کہاں فرصت تھی۔

"یہ تحقیقاتی کارروائی نومبر ۱۹۱۷ء سے کہ اپریل ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اور اول تا آخر کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ دیہات کے ان بدنصیب باشندوں سے بھی پوچھ گچھ کر لی جائے جن کی زندگیاں صرف ہل جوتنے اور فصل بونے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ میں نے جب دو ایک مرتبہ اس قسم کی کوشش کی تو مجھے ہندوستان کے مقبول اور ہردلعزیز قومی لیڈروں کا بدخواہ اور تعلیم یافتہ جماعت کی امنگوں اور آرزوؤں کا دشمن تصور کیا گیا۔

"...... ۱۹۱۹ء میں جب تلک اور ان کے رفیقوں کو ہندوستان سے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ تو یہ لوگ بھاگے بھاگے انگلستان پہنچے۔ تاکہ اصلاحات کو اور زیادہ اپنے حسب منشا رنگ دینے کی کوشش کر سکیں۔ لندن میں انڈیا آفس کے دروازے ان لوگوں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ اپنے اثر و رسوخ اور کچھ لیبر پارٹی کے بعض ممبروں کی اعانت سے ان لوگوں نے خاصی کامیابی حاصل کی۔ اور اصلاحات کی سکیم میں بہت کچھ اپنے منشا کے مطابق اضافہ کرا لیا۔

"یہ لوگ بارسوخ اور منظم تھے۔ روپے کی بھی ان کو کمی نہ تھی۔ پھر طرفہ یہ کہ پراپاگنڈے کے فن کے بھی ماہر تھے اس لیے اپنی اغراض

میں کامیابی حاصل کر لینا اُن کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ مصیبت تو بیچارے پنجاب کے دیہاتیوں کے لیے تھی جن کے پاس نہ تنظیم تھی۔ نہ سرمایہ اور جو پراپیگنڈے کے طور طریقوں سے بھی واقف نہ تھے۔ اُنھیں رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ اعلیٰ حکام کے اس طرح کے ڈھنگ میں اُن کے مفاد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے چنانچہ انھوں نے حکومتِ ہند سے درخواست کی کہ اُن کو بھی اپنے نمائندوں کا ایک مختصر وفد انگلستان بھیجنے کی اجازت دی جائے جو انڈیا آفس اور پارلیمنٹ کے سامنے اُن کے مطالبات کو بطریقِ احسن پیش کر سکے لیکن حکومتِ ہند نے انتہائی بے رُخی سے یہ مطالبہ رد کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے دوبارہ التجا کی کہ اگر ہمارے وفد کو پارلیمنٹ یا انڈیا آفس شرفِ باریابی بخشنے کو تیار نہیں تو کم از کم اُن فوجی افسروں ہی سے جو ہمارے ہاں سے خود وہاں اور ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھنے والے مسائل کے متعلق استفسار کر لیا جائے۔ جو اس وقت جشنِ فتح کی تقریب کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم تھے لیکن حکومت نے اس گذارش کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

''نتیجہ یہ ہوا کہ اس سارے کھیل کے دوران میں پنجاب کی دیہاتی آبادی کا ایک نمائندہ بھی انڈیا آفس تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ اور نہ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے شہادت دے سکا۔ اسے سیاست دانوں کی شاطرانہ چال یا اُن کی ہوشیاری سے تو بہرحال تعبیر کیا جا سکتا ہے

لیکن یہ طرزِ عمل یقیناً برطانوی قوم کی دیانت و امانت کے دامن پر
ایک سیاہ دھبے کی حیثیت رکھتا ہے "

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس اس لیے درج کیا ہے کہ اس سے اوڈوائر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو سکے اور اس کے نہاں خانہ دماغ میں پرورش پانے والی بعض سازشوں کا حال بھی عیاں ہو جائے۔ اوڈوائر کے نزدیک ہندوستان کا وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ اور وزیرِ ہند مانٹیگو دونوں نہ صرف عقل و ہوش سے عاری اور مصلحت و دور بینی سے محروم تھے بلکہ برطانیہ کے بڑے بدخواہ اور دشمن بھی تھے۔ کیونکہ عین اس وقت جب ہندوستان کے سامنے اہم ترین مسئلہ فوجی بھرتی کا تھا انھوں نے دہلی میں بیٹھ کر اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی کا ڈھونگ رچا دیا۔

مانٹیگو اور چیمسفورڈ کے علاوہ برطانیہ کی پوری پارلیمنٹ اور کیبنٹ کو بھی وہ موردِ الزام اور لائقِ تعزیر قرار دینے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ حیران ہے کہ انگریزی حکومت کو کیا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے چند شورش پسند لیڈروں سے مرعوب ہو کر اِس ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام اور حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کو فروغ دینے کے وعدہ و پیمان کر رہی ہے۔ وہ انڈیا آفس کو بھی لعن طعن کرنے سے باز نہیں آتا کہ اس نے اپنے دروازے کیوں ہندوستانی لیڈروں کے لیے کھول رکھے ہیں۔ وہ برطانیہ کی کولیشن وزارت کو بھی قابلِ الزام گردانتا ہے کہ اس نے مانٹیگو ایسے شخص کو جو ہندوستان کے حقیقی مسائل سے قطعاً بے خبر ہے کیوں وزیرِ ہند کی کرسی پر بٹھا رکھا ہے۔

غرض ملک معظم کی ذاتِ والا صفات سے قطع نظر جو اُس کے نزدیک ہندوستانیوں کے لیے ظلِ سبحانی، جہاں پناہ اور منبع جود و سخا تھی - وہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے لے کر ہندوستان کے وائسرائے تک ہر شخص کو "برٹش ایمپائر" کا بدخواہ سمجھتا ہے اور اُس کے خیال میں اگر کوئی شخص برطانیہ کا سچا ہمدرد، بہی خواہ معاون اور خیر اندیش تھا تو وہ خود سرمائیکل اوڈوائر تھا -

بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی - جب اصلاحات کے مسودے پر لندن میں غور و خوض شروع ہوا - تو اوڈوائر نے اُس وقت بھی اپنی فتنہ انگیز کوششوں کو ترک نہیں کیا - اُس نے پنجاب کے چند بڑے بڑے زمینداروں کو جو حقیقتاً اُس کے اپنے آدمی تھے - اور جن پر اُس نے دورانِ جنگ میں ہر بہانے سے دولت و حشمت اور انعام و اکرام کی بے دریغ بارش کی تھی - اِس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان جا کر پنجاب کی دیہاتی آبادی کی طرف سے اصلاحات کی مخالفت کریں - اوڈوائر کس دردمندی سے کہتا ہے کہ "دیہات کے اُن باشندوں سے جن کی زندگیاں صرف ہل جوتنے اور فصل بونے کی نذر ہو جاتی ہیں کسی نے نہ پوچھا کہ مجوزہ اصلاحات کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے"

اِنہی ہل جوتنے اور فصل بونے والے مظلوم انسانوں کی آڑ لے کر وہ چند ایسے متمول اور خود غرض زمینداروں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا تھا جن کی ساری زندگیاں اہلِ دول کی آستاں بوسی، کاسہ لیسی اور تملق و خوشامد میں گذری تھیں - اور جن کے نزدیک لاٹ صاحب کا گوشۂ چشمِ التفات حقیقی کی تمام نعمتوں سے زیادہ قیمتی تھا اور جب وائسرائے نے اس قسم کے وفد کو غیر ضروری اور نقصان رساں سمجھ کر یہ

درخواست رد کر دی تو اوڈوائر غم و غصہ کے آنسو بہا بہا کر اپنے دامن اور صفحۂ قرطاس

دونوں کو داغدار کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ چیمسفورڈ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اوڈوائر نے پنجاب

میں ہر قسم کی سیاسی تحریکوں کو ختم کرنے کے لیے دیہاتی اور شہری آبادی میں اختلاف

کا بیج بو رکھا ہے۔ چنانچہ جب اس نے ۱۳ ستمبر ۱۹۱۷ء کو مرکزی مجلس قانون ساز

کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کو برا بھلا کہا۔

اور تعلیم یافتہ طبقہ پر بلا وجہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے۔ تو ایوان میں کھلبلی مچ

گئی۔ اور آخر لارڈ چیمسفورڈ کے اصرار پر اوڈوائر کو اپنے الفاظ واپس لینا پڑے

اور ایوان کے تمام ممبروں سے معافی بھی مانگنا پڑی۔

جس بات پر یہ جھگڑا ہوا وہ بالکل معمولی تھی۔ سر محمد شفیع نے ایک تجویز پیش کی تھی

کہ صوبۂ بہار اڑیسہ کی طرح پنجاب میں بھی قانون سازی (لیجسلیٹو) اور انتظامی

(ایڈمنسٹریٹو) امور کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کے بجائے آپس میں ملا دینا

چاہیئے۔

اس تجویز پر تقریر کرتے ہوئے بلا وجہ اور بغیر کسی موقع و محل کے اوڈوائر نے

کہنا شروع کر دیا کہ:-

"آج کل یہ عالم ہے کہ چاروں طرف سے سیاسی تقریروں کا شور

سن سن کر ہمارے کان بہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور سیاسی مسودوں

اور یادداشتوں کی بھرمار دیکھ دیکھ ہماری آنکھیں چندھیائی جا رہی

ہیں۔ کیا اس شور و شغب میں میرا یہ کہنا مناسب نہیں کہ اس طوفانِ

بے تمیزی کو ختم کر کے ہمیں اپنے دل و دماغ کو لایعنی تصورات اور بے مصرف توہمات سے پاک کر دینا چاہیئے اور لمحہ بھر کے لیے سوچنا چاہیئے کہ آخر اس ساری سیاسی شعبدہ بازی کا اُن غریب دیہاتیوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جن کی زندگیاں ہل چلانے، فصلیں بونے اور پھر اُن فصلوں کو آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کے لیے وقف ہو چکی ہیں ؟"

اوڈوائر کی یہ تقریر خاصی طویل تھی۔ جس کے دوران ہی میں کونسل کے ہندوستانی ممبروں نے جن پر وہ بے طرح برس رہا تھا۔ اُسے بار بار ٹوکا۔ جب وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو مسٹر مظہر الحق۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح ازراہِ احتجاج اُٹھ کر ایوان سے چلے گئے۔ وائسرائے نے خود اوڈوائر کی اس بدمذاقی کو محسوس کیا۔ اور اُسے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کو بمشکل ایک مہینہ گذرا ہو گا کہ اُس نے ۳۰ اکتوبر کو پنجاب کی صوبائی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے پھر اپنی خیالات و جذبات کا اعادہ کیا۔

اوڈوائر کے اس سارے ہذیان اور اُس کی تمام مخالفانہ سازشوں کے باوجود مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور اصلاحات کا ایک خاکہ تیار ہو گیا۔ حکومتِ ہند نے اِن اصلاحات کی حمایت میں ۲۵ مارچ ۱۹۱۹ء کو اپنا اعلان شائع کیا۔ تو اُس کے ساتھ اوڈوائر نے اپنا ایک اختلافی نوٹ بھی لکھ ڈالا۔ یُوں کہنا چاہیئے کہ یہ نوٹ گویا اُس کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ واقعات کی لگام اُس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اور اب وہ کسی صورت سے

حالات کے دھارے کا رُخ نہیں بدل سکتا تو اُس نے ایک پٹے ہوئے کھلاڑی کی طرح چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینے۔ اور اس طرح اپنی حسِ انتقام کو تسکین بخشنے کی کوشش کی۔

اِس اختلافی نوٹ میں اڈوائر نے نام لے لے کر مسٹر جناح۔ مسز اینی بسنٹ لوکمانیہ تلک۔ پنڈت مالوی اور راجہ محمود آباد کو بُرا بھلا کہا۔ اُس نے اِن لیڈروں کی نیتوں پر حملہ کر کے اُنھیں خود غرض اور شورش پسند قرار دیا۔ اُس نے تحریک ہوم رُول کی جی کھول کر مذمت کی۔ اور ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو عوام کا بدخواہ ظاہر کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو اُس نے ایک نہایت غیر نمائندہ جماعت قرار دے کر حکومت کو متنبہ کیا کہ لیگ نے مسلمان عوام کی نمائندگی کا جو دعوے کیا ہے۔ وہ سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اور آخر میں لکھا کہ :-

"یہ امر بالکل واضح ہے کہ اصلاحات کا تقاضا ملک کے عوام نے بالکل نہیں کیا۔ حالانکہ عوام ہی کے مفاد کی نگہداشت حکومت کا فرضِ اوّلیں ہونا چاہیے۔ یہ مطالبہ ہندوستان کے باشندوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کی طرف سے پیش ہوا ہے جو محض اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اقتدار کی خواہاں اور عہدوں کی بھوکی ہے اگر ہمیں اپنے اُس عہد کا کچھ پاس ہے جو ہم نے ہندوستان کی بے زبان مخلوق کی حفاظت کے لیے کیا تھا۔ تو لا محالہ ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہم اس بے زبان رعایا کے مفاد کو مقدم درجہ عطا کریں اور سیاسی لیڈروں کے شور و شغب کی کچھ پروا نہ کریں۔ خواہ وہ اِس شور سے

قیامت ہی کیوں نہ برپا کر دیں۔ میں یہاں برک کے وہ یادگار الفاظ درج کرنے پر مجبور ہوں۔ کہ اگر میدان کے کسی گوشے میں جھاڑی کے نیچے نصف درجن ٹڈے جمع ہو کر اپنی ٹیں ٹیں کے مکروہ شور سے آسمان سر پر اٹھا لیں اور اُسی میدان میں شاہ بلوط کے اونچے اونچے سایہ دار درختوں کے نیچے سیکڑوں گلے بھینسیں اطمینان سے بیٹھی جگالی کر رہی ہوں۔ تو ہمیں اس غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ میدان میں صرف چیخ پکار کرنے والے ٹڈے ہی آباد ہیں۔

" میں دوبارہ اِس امر کی یاد دہانی کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے محض یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مطالبات کی تسکین کیوں کر کی جائے۔ بلکہ سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اِس ملک کے عوام کی بھلائی کی صورت کیا ہونی چاہیئے۔ میں عوام کی بھلائی پر بار بار اس لیے زور دے رہا ہوں کہ مجھے حکومتِ ہند کی موجودہ تجاویز میں اُن کی سود و بہبود کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ غالباً حکومت نے عمداً اس طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

" ہمیں اپنے اُس عہد کو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر ہم بہ فرضِ محال اُس عہد سے چشم پوشی بھی کر لیں۔ تو اس سارے قضیے میں جو چیز بالکل عیاں اور واضح ہوتی ہے۔ یہ ہے کہ ان مجوزہ

اصلاحات کا خاکہ تیار کرتے ہیں ہمارے سامنے صرف تعلیم یافتہ جماعت کے ایک محدود طبقے کی خوشنودی تھی۔ کیا ہمارا یہ فعل کسی اعتبار سے عقلمندی یا دانائی کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے؟ تعلیم یافتہ جماعت کا یہ محدود طبقہ، جس کی خوشنودی کو ہم نے ہر حال میں مقدم سمجھ رکھا ہے، دیہات کے عوام کی نمائندگی کا بھی دعوے دار ہے حالانکہ یہ دعوے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ گذشتہ چند مہینوں کے واقعات میرے اس بیان کی تصدیق و تائید کے لیے کافی ہیں۔

"میرے اس قول کی صداقت آزمانے کے لیے آپ جو معیار چاہیں استعمال کریں۔ مذہبی فسادات کی روک تھام کا سوال ہو یا فرقہ وارانہ اختلافات کو مٹانے کا مسئلہ درپیش ہو۔ فوجی بھرتی کے لیے رنگروٹوں کی فراہمی کا معاملہ ہو یا ملک کے دفاع کا سوال پیشِ نظر ہو۔ ہر حال اور ہر صورت میں شہروں کے تعلیم یافتہ سیاسی لیڈر آگے آنے کی بجائے گھروں میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ملک و ملت کے لیے مفید اور نفع بخش تحریکوں میں شرکت کرنا یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ ہاں جہاں فتنہ و فساد برپا کرنے یا شر انگیزی کی آگ بھڑکانے کی گنجائش ہوگی۔ آپ ان کو ہمیشہ ہمیشہ آگے آگے پائیں گے۔"

اوڈوائر کی مندرجہ بالا تحریر پڑھ کر ایک عام حالات سے ناواقف شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر واقعی شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ دیہاتی آبادی کے دشمن اور بدخواہ تھے۔ تو حکومتِ ہند کو کیا ہو گیا تھا کہ سب کچھ دیکھتے بھالتے

ہوئے اُس نے ہندوستان کی اصل آبادی کو چند درندوں اور بھیڑیوں کے سامنے پھینک دینے سے دریغ نہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوڈوائر کے خیال میں لارڈ چیمسفورڈ اور اُن کی ایگزیکٹو کونسل کے تمام ممبر جن میں صرف ایک ہندوستانی (سر سنکرن نائر) تھا اور باقی چھ انگریز تھے۔ وزیرِ ہند مانٹیگو اور اُن کی کونسل کے تمام ممبر۔ جن میں صرف دو ہندوستانی (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور بھوپندر ناتھ باسو) تھے اور باقی آٹھ انگریز تھے۔ سب کے سب اِس سازش میں شریک اور معاون تھے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے دو درجن لیڈروں کو خوش کرنے کے لیے ہندوستان کے کروڑوں بے زبان باشندوں کو قربان کر دینا چاہیے۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ میں اُن اصلاحات کی وضاحت کر سکوں جن کی مذمت میں اوڈوائر نے تحریر و تقریر کے تمام حربے استعمال کر ڈالے ہیں۔ آئندہ چند صفحات میں چونکہ اس موضوع پر مفصل بحث ہونے والی ہے اس لیے سردست اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ جن اصلاحات کو اوڈوائر دیہات کے باشندوں کی تباہی و بربادی اور شہروں کے شورش پسند لیڈروں کی نفع اندوزی کی دستاویز سے تعبیر کرتا ہے۔ اُن اصلاحات کی رُو سے جب پنجاب میں پہلی مجلسِ قانون ساز قائم ہوئی تو اُس کے انتخاب شدہ مسلمان ارکان کی کل تعداد چونتیس ۳۴ تھی۔ جن میں سے انتیس ۲۹ دیہاتی اور صرف پانچ شہری حلقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے۔

ممکن ہے بعض لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ وزیرِ ہند مانٹیگو اور

اُن کے رفقائے کار چونکہ ہندوستان میں نووارد تھے اور اُنھوں نے اصلاحات کے متعلق اپنی تحقیقات کا پورا دور دہلی میں بیٹھ کر ختم کیا تھا۔ جہاں بقول اڈوائر "اُن کو چاروں طرف سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں نے گھیر رکھا تھا"۔ اِس لیے اُن تک دیہات کے باشندوں کی آواز نہ پہنچ سکی ہو گی۔ یا دیہاتی آبادی کی تکالیف کی صحیح تصویر وہ ملاحظہ نہ کر سکے ہوں گے۔

آئیے! اِس بارے میں اُس رپورٹ کا جو ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو وزیر ہند اور وائسرائے کے مشترکہ دستخطوں سے شائع ہوئی تھی ایک ٹکڑا مطالعہ کریں:۔

"...... سب سے پہلے ہم دیہاتی آبادی کی ضروریات اور تکالیف کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ شہروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ جوں جوں لوکل باڈیز کی قسم کے ادارے قائم ہوں گے اور گاؤں کے لوگوں کو اپنے ووٹ سے مقامی معاملات طے کرنے کا موقع ملے گا۔ اُن کی سیاسی تربیت کا گویا آغاز ہو جائے گا۔ جب کسی گاؤں کے باشندے یہ محسوس کریں گے کہ اُن کے بچوں کی تعلیم کے لیے وہاں کوئی سکول نہیں۔ یا شہر کی منڈی تک جانے کے لیے کوئی سڑک موجود نہیں۔ تو وہ اِن تکلیفوں کے ازالے کے لیے حسبِ سابق ضلع کے کلکٹر کے پاس عرضداشت لے کر نہیں جایا کریں گے بلکہ اُس امیدوار کو ووٹ دیں گے جو اس بات کا وعدہ کرے گا کہ وہ سکول کے قیام اور سڑک کی تعمیر میں اُن کی پوری مدد کرے گا ہم جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ اِس کے لیے وقت درکار ہے

اور بہت ممکن ہے کہ شروع میں حسب منشا نتائج بر آمد نہ ہوں۔ لیکن صبر اور ہمّت سے کام آسان ہو جائے گا۔

" یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں سادہ لوح دیہاتیوں کو بہلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر اُن سے ووٹ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن انجام کار اُن پر اس حقیقت کا انکشاف یقیناً ہو کر رہے گا کہ اِس زمانے میں ووٹ بہت بڑی طاقت اور قومی امانت ہے۔ جس کے صحیح استعمال سے اُن کو بے حد فائدہ پہنچنے کا امکان ہے اور جس کے غلط استعمال سے اُن کی مصیبتوں میں اضافہ ہو جانے کا اندیشہ ہے دُنیا میں جہاں جہاں دیہاتی آبادی کو ووٹ کا حق عطا ہوا ہے۔ ابتدا میں اِسی قسم کی دشواریاں پیش آئی ہیں۔

جوں جوں ان کی سیاسی تربیت کے ابتدائی مراحل طے ہوں گے اور دیہاتی اپنے ووٹ کے صحیح استعمال کی طاقت سے آشنا ہوں گے وہ حکومت کی تعمیر و تشکیل پر بھی اثر انداز ہو سکیں گے۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ مالک اراضی یا بڑے بڑے زمیندار اپنے مزارعین پر تشدّد کرتے ہیں۔ یا ساہو کار سُود در سُود کا چکّر چلا کر انھیں ان کی زمینوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ یا تحصیل کے سرکاری کارندے بے جا سختی سے پیش آتے ہیں۔ تو وہ لاٹھی یا کلہاڑی کی ضرب سے اپنے دشمن کا سر کچل دینے کی بجائے اپنے ووٹ سے ایسا آدمی منتخب کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو اِن مشکلات کو رفع کرنے

ہیں اُن کی مدد کر سکے ۔ وہ آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگ جائیں گے کہ اگرچہ حکومت کا صدر مقام اُن کے گاؤں سے بہت دُور ہے۔ لیکن حکومت کی مشین جن پُرزوں سے چلتی ہے ۔ اُن میں سے دو ایک پُرزے وہ خود بھی مہیا کرتے ہیں ۔ اِسی طرح اگر تمام اچھے اور کار آمد پُرزے جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ مشین پہلے سے بہتر چلنے لگ جائے گی ۔

لیکن اِس ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ دیہاتیوں کی ذہنی اور سیاسی تربیت خود بخود نہیں ہو سکتی ۔ اِس کے لیے بعض خارجی عناصر کی مدد درکار ہے ۔

ہمیں اُمید ہے کہ سرکاری حکام اور وہ لوگ جو دیہاتیوں کے ووٹ سے نیابتی اداروں میں جانا چاہتے ہیں اِس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے ۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب گاؤں کے لوگ دیکھیں گے کہ جو شخص اُن کے ووٹ حاصل کرکے کونسل کا ممبر بنتا اور عزّت و توقیر حاصل کرتا ہے ۔ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے ۔ تو وہ یقیناً اپنے بچّوں کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں گے ۔ تاکہ وہ بھی آئندہ اسی قسم کے اعزاز کے مالک بن سکیں ۔ آج تک دیہاتیوں نے اپنے بچّوں کو اِس خوف سے تعلیم سے محروم رکھا ہے کہ مبادا وہ پڑھ لکھ کر ہل چلانا اور کاشتکاری کا کام کرنا چھوڑ دیں ۔ اور اس طرح انھیں

مالی اور اقتصادی نقصان برداشت کرنا پڑے لیکن اب اُن کے سامنے اُنہی کے بھائی بندوں میں سے ایک شخص نے تعلیم کا نیا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ گاؤں ہی کا رہنے والا ہے اور گاؤں کے لوگوں کے ووٹ حاصل کر کے اُنہی کا نمائندہ بن کر صوبے کی کونسل میں جا کر حکمرانی اور قانون سازی کے کاموں میں شریک ہوتا ہے۔ یہ قابلِ تقلید مثال اُنھیں تعلیم کے فوائد سمجھانے اور علم کی خوبیاں ذہن نشین کرانے میں باقی تمام مثالوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔

"ہم یہاں ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی دو، ایک باتیں کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کے خلاف بعض لوگوں کی طرف سے یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اُنھوں نے اب تک صرف اپنی اغراض کی پاسداری کی ہے۔ اور دیہاتیوں کے مفاد کو بہت کم درخورِ اعتناء خیال کیا ہے اِس الزام کی صحت یا عدمِ صحت سے بحث نہیں لیکن اب یقیناً اُن کے لیے موقع ہے کہ وہ اپنے پس ماندہ بھائیوں کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔ دیہات میں کام کرنے کی بے حد گنجائش ہے۔ جہالت اور توہمات کی تاریکی کو دور کرنا۔ قبیلوں اور برادریوں کی خانہ جنگی کو رفع کر کے قومیت کا صحیح تصور پیدا کرنا۔ زندگی اور معیشت کی معمولی آسائشیں جو شہروں میں عام ہیں اور دیہات میں عنقا، اُنھیں گاؤں کے لوگوں تک پہنچانا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صدیوں کی

دبی ہوئی مخلوق کو عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے جوہر سے مالا مال کرنا۔ یہ اتنا عظیم الشان اور محنت طلب کام ہے کہ ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگوں کو فوراً اِس طرف توجہ کرنا چاہیے۔"

اوڈوائر کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران میں اصلاحات کا ذکر چھیڑ دینا وزیرِ ہند اور وائسرائے کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اُس کے نزدیک حکومت کا فرض تھا کہ اصلاحات کا مطالبہ کرنے والوں کو، خواہ وہ کانگرس کے ممبر تھے یا مسلم لیگ کے، فوراً جیل میں بند کر دیا جائے۔ لیکن اِس ضمن میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے اپنی مشترکہ رپورٹ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ بکسر مختلف تھے۔ مثلاً :-

"........ جنگ اور جنگ کی وجہ سے بیدار ہونے والے جذبات نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کے مسئلہ کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اہلِ ہند نے جب دیکھا کہ جنگ کی تمام ہولناکیوں کے باوجود پارلیمنٹ کو اِس بات کی مہلت مل سکتی ہے کہ آئرلینڈ کی گتھی کو سلجھا سکے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان کو اصلاحات سے محروم رکھنے کے لیے جنگ کو کیوں بہانہ بنایا جارہا ہے ...... ہم بخوشی یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ہندوستان نے بہرصورت اپنے آپ کو مزید اعتماد اور بہتر طرزِ حکومت کا اہل ثابت کر دکھایا ہے آئندہ ہندوستان کی حکومت میں جو تبدیلیاں کی جائیں گی۔ اُن کو

ہندوستان کی جنگی خدمات کا معاوضہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہ تبدیلیاں صرف اس لیے کی جائیں گی کہ ہندوستان اب اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اُسے اِن مراعات سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔"

او ڈوائر ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کا دشمن۔ اور تحریکِ ہوم رول کا بدترین مخالف تھا۔ اس نے امپیریل کونسل کے ۱۹ انیس ممبروں کے میمورنڈم کو شورش اور بدامنی کی دستاویز قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کے سامنے جب مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے ۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو اپنی مشترکہ رپورٹ مرتب کی۔ تو اس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے:۔

"۔۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ موجودہ جنگ گویا حریت اور استبداد کی جنگ ہے جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طاقتور قوموں کی طرح کمزور قوموں کو بھی اپنی خود مختاری اور آزادی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دُنیا کے مختلف ممالک کے باشندوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے پر قادر ہو سکیں۔

اور جب ہم بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ برطانیہ محض حریت اور آزادی کے اصولوں کو برقرار رکھنے کے لیے اِس جنگ میں شامل ہوا ہے تو لامحالہ ہندوستان کے لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو آزادی کی نعمت سے کیوں محروم کر رکھا ہے؟ ۔۔۔۔۔ اس تحریک کا نتیجہ

یہ ہوا کہ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مدراس میں باقاعدہ ہوم رول تحریک کا قیام عمل میں آیا اور مہینہ بھر کے بعد ہندوستان کی مرکزی کونسل کے انیس انتخاب شدہ ارکان نے اصلاحات کے بارے میں اپنی تجاویز ایک میمورنڈم کی صورت میں مرتب کر کے حکومتِ ہند کو ارسال کر دیں۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنے یادگار جلسوں کے بعد سیاسی اصلاحات کا ایک مشترکہ خاکہ تیار کیا جو اپنی تجاویز کے اعتبار سے انیس ممبروں کے میمورنڈم کی گویا شرح و تفصیل تھی۔ ...... کانگرس اور لیگ کے اس اشتراکِ عمل کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور ان دونوں قوموں کے مشترک نصب العین سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کا ہر بہی خواہ اس صورتِ حال سے خوش ہو کر میثاقِ لکھنؤ کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہے۔ اور یہ میثاق یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جس کی اہمیت سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔"

اوڈوائر اور اس کی پالیسی اور طریقِ حکومت کے متعلق خود وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو نے جو رائے قائم کی تھی وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مانٹیگو نے ۱۴ جولائی ۱۹۲۰ء کو ایک خط میں لارڈ چیمسفورڈ کو لکھا تھا:-

"جب میں ماضی پر ایک نظر ڈالتا ہوں تو جس بات کا مجھے سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں اوڈوائر سے نسبتاً بہت سختی کا سلوک کرنا چاہیئے تھا۔ اب کہ میں اس شخص کو خوب جان پہچان

گویا ہمیں میرا یہ افسوس بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہندوستان میں جو ہمارا خراب حال ہوا ہے۔ اُس کی من جملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ وجہ بھی ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال ہوتا ہے کہ میں نے اِس سلسلہ میں اپنے فرض کی کماحقہٗ ادائیگی میں غفلت برتی ہے۔ آپ کی پریشانیوں کے خیال نے مجھے اِس راستے پر گامزن رکھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اوڈوائر نے چونکہ بہت نمایاں جنگی خدمات ادا کی ہیں۔ لہٰذا اُس کے دیگر عیوب سے چشم پوشی کر لینی چاہیئے۔ یہی ایک خیال تھا جس کی وجہ سے مجھ پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ میں نے اُس شخص کے ساتھ مناسب سختی کا سلوک نہیں کیا جو اپنے اُن ہم خیال لوگوں کا ہیرو ہے جو ہماری اُس پالیسی کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ جنھیں آپ اور میں نافذ کرنا چاہتے ہیں"۔

ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کے بعد مانٹیگو نے لارڈ چیمسفورڈ کو جو خط لکھا تھا۔ اُس کا ایک ٹکڑا درج ذیل ہے:۔

"ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کے بعد میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ کمیٹی نے سر مائیکل اوڈوائر کو بری الذمہ قرار نہیں دیا۔ اگرچہ میرے نزدیک اُنھوں نے بڑے محتاط انداز میں صرف اِتنا کہا ہے کہ اوڈوائر کس قسم کی حکومت کا ذمہ دار تھا۔

اوڈوائر کے دور کا بیشتر وقت میں وزیر ہند نہیں تھا۔ میرے پاس وہ مواد موجود نہیں جس کی بنا پر میں یہ فیصلہ کرنے کا مجاز بن

سکوں کہ جس قسم کی پالیسی نافذ کرنے کا وہ ایک حد تک ذمے دار تھا وہ ضروری تھی یا نہیں لیکن یہ بات تمام لوگوں کو ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جب ہم ایسے احکام نافذ کرتے ہیں جن سے لوگوں کو ملک بدر کیا جائے، اخباروں کو بند کر دیا جائے، پبلک جلسوں کا انعقاد روک دیا جائے۔ عوام کی نقل و حرکت پر پابندیاں عاید کی جائیں، تو زود یا بدیر ان کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ ممکن ہے ان باتوں سے وقتی طور پر کچھ عارضی سکون ہو جائے۔ لیکن بالآخر ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ مکافاتِ عمل سے ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ سب سے بڑا منتظم اور سب سے بڑا گورنر وہ ہے جو اپنے صوبے کا امن و امان اس طرح بحال رکھے کہ ان اختیارات کے استعمال کرنے کی نوبت ہی نہ آئے جو اسے حاصل ہیں۔ اور اگر اس سلسلہ میں ضرورت پیش آئے بھی تو ان اختیارات کو کم سے کم استعمال کیا جائے۔"

۲۹۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو مانٹیگو نے ایک اور خط میں وائسرائے کو لکھا کہ:۔

"یا ہم ہندوستان پر اس طرح حکومت کریں جس طرح اوڈوائر نے پنجاب میں کی تھی یا پھر اور طریقہ اختیار کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اوڈوائر کے ڈھنگ میں حکومت کی تو ہزاروں مصیبتیں اور تکلیفیں پیدا ہوں گی ۔۔۔۔۔۔ میری پختہ رائے ہے کہ ہم جس پالیسی پر عمل پیرا ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلے گا

کہ ایک دن کا امن قائم رکھنے کی خاطر دس سال کے لیے فتنہ وفساد
کا دروازہ کھول دیا جائے۔ میں ذاتی طور پر اس پالیسی کی حمایت
نہیں کر سکتا۔[1]

اوڈوائر کی ملازمت کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ لیکن رخصت ہونے سے
پہلے اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ آزادی کی جس تڑپ کو مٹانے
کے لیے اُس نے ہر ممکن حربہ استعمال کر ڈالا تھا۔ وہ تڑپ مٹ نہ سکی۔ اُس نے
لوگوں کی آنکھوں پر مہریں اور کانوں پر تالے لگا دینے کی کوشش کی تھی تاکہ حریت
اور آزادی کے جو نئے نغمے بلند ہو رہے تھے۔ وہ کانوں کی راہ سے دل میں جگہ
نہ پا سکیں۔ اور جوشِ عمل کی جو زندہ جاوید تصویریں فضا میں جگمگا رہی تھیں، وہ
آنکھوں کے اندر اُتر کر روح کو مجلّا و منوّر نہ کر دیں۔ اُس نے لاہور، قصور، امرتسر
گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور وغیرہ میں مارشل لاء جاری کر کے مظالم
کی وہ آگ برسائی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف ۱۸۵۷ء کا کشت وخون
ہی پیش کر سکتا ہے۔

ان مظالم کے ذکر سے سیکڑوں نہیں ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں چودہ
چودہ برس کے بچوں کو ٹکٹکی میں باندھ کر کوڑوں سے پیٹا گیا۔ کم از کم بیس کوڑوں
کی سزا مقرر تھی۔ حالانکہ بڑے سے بڑے سخت جان کی کھال بھی چھ کوڑوں کے
بعد اُدھڑ جاتی ہے۔ اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہر محلے سے چُن چُن کر معزز بن

---

1. "EDWIN MONTAGU" BY S.D. WALEY (1964)
PAGES 229 - 234

کو گھروں سے نکالا گیا اور برہنہ سر برہنہ پا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر بازاروں میں پھرایا گیا۔ تاکہ کھلے بندوں اُن کی تذلیل ہو۔ جو لوگ اپنی قابلیت کی بنا پر آئندہ ہائی کورٹ کے جج اور صوبے کے وزیر بننے والے تھے انھیں گورہ فوج کے سپاہیوں سے پٹوا کر پھانسی کے مجرموں کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ مئی کی گرمی میں لاہور کے کالجوں کے طلبہ کو حکم دیا گیا کہ اپنے سروں پر اپنے بستر اُٹھا کر دن میں چار مرتبہ سولہ میل کا فاصلہ طے کر کے آئیں اور یونین جیک کو سلامی دیں۔ لاہور کے تمام باشندوں کو حکم مل گیا کہ اپنی موٹر کاریں، سائیکلیں، بجلی کے پنکھے اور بجلی کے لیمپ فوج کے حوالے کر دیں۔ سکول کے بچوں کو ہر روز دھوپ میں کھڑے ہو کر، ایک فوجی افسر کے سامنے، یہ کہنا پڑتا تھا "حضور! ہم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ ہماری توبہ۔ آئندہ بھی ہم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہو گی۔"

ایک پوری برات کو جس میں دولھا بھی شامل تھا بلا وجہ پکڑ کر کوڑوں سے پٹوا ڈالا گیا۔ ریل گاڑیوں پر سفر کی ممانعت کر دی گئی اور سوائے اُن لوگوں کے جن کو فوجی حکام پاس عنایت کرتے تھے، اور کوئی شخص سفر نہیں کر سکتا تھا۔ عورتوں کی کھلے منہ بے حرمتی کی گئی۔ ایک گلی مقرر کی گئی۔ جس میں سے ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گذرنا پڑتا تھا۔ اور یہ گورہ فوج کا سپاہی ہاتھ میں بندوق تھام کر کھڑا رہتا تھا، اور اگر رینگنے والا شخص ذرا دم لیتا تو سپاہی بندوق کا کندا اس کی پشت پر مارتا تھا۔ شہر کے بعض معزز اور سربرآوردہ لوگوں کے مکانوں پر مارشل لا کے احکام کے اشتہار چسپاں کر دیئے جاتے تھے۔ اور حکم تھا کہ اگر کسی نے اس اشتہار کو پھاڑ دیا تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ چنانچہ

صاحب خانہ کو محض اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کے لیے دن بھر اپنے مکان سے باہر دیوار کے قریب کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ تاکہ کوئی شخص اشتہار کو ہاتھ نہ لگائے۔ لاہور میں سر فضلِ حسین، خلیفہ شجاع الدین اور پیر تاج الدین جیسے اصحاب کے مکانوں پر بھی اِس قسم کے اشتہار چسپاں کیے جاتے تھے۔ اور انھیں تمام دن مکان کے باہر کھڑے رہنے کی ذِلّت برداشت کرنا پڑتی تھی۔

دیال سنگھ کالج کی بیرونی دیوار پر کسی نامعلوم شخص نے ایک اشتہار لگا دیا۔ جس کا مضمون فوجی حکام کے نزدیک قابلِ اعتراض تھا۔ اس جرم کی پاداش میں کالج کے پرنسپل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور آخر اُس غریب کو ڈھائی سو روپے جرمانہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنا پڑی۔

حکم صادر ہو گیا کہ جونہی کوئی انگریز نظر آئے۔ مقامی باشندوں کا فرض ہے کہ فوراً تانگے سے اُتر کر کھڑے ہو جائیں۔ اور جھک کر سلام کریں۔ ایک پچیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے کے اندر مئی کے مہینے میں پچاس آدمیوں کو بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ ہفتہ بھر مقیّد رہے۔ اور بول و براز کے لیے بھی انھیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ قصور میں منادی کر دی گئی کہ جو لوگ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ء سے پہلے یا اس تاریخ کے بعد شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ اگر چار روز کے اندر واپس نہ آئے تو اُن کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔

جب فوجی عدالتوں کے سامنے مقدمات پیش ہونے لگے تو صفائی کی طرف سے کسی وکیل کو پیروی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور ملزموں کو پھانسی اور عمر قید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور سزا ملتی تھی۔ قصور میں ستائیس آدمیوں کو پھانسی اور

تیرہ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ گوجرانوالہ میں محض اس جرم میں کہ پٹوار خانہ کو آگ لگا دی گئی تھی پانچ آدمیوں کو پھانسی اور دس کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ حافظ آباد میں چار کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کی سزا ملی۔ نظام آباد میں چار کو پھانسی اور آٹھ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ امرتسر میں چوبیس کو پھانسی اور پندرہ کو حبس دوام کی سزا ملی۔ اسی طرح لاہور اور امرتسر جیسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں سزاؤں کی وہ بھرمار ہوئی کہ اس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ ایک شخص کو محض اس جرم میں کہ اس نے ایک پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم تمھارے بھائی ہیں۔ آؤ ہمارے ساتھ مل جاؤ" حبس دوام کی سزا ملی۔[1]

یہ سب کچھ مائیکل اوڈوائر کی آنکھوں کے سامنے، اس کی منظوری اور رضامندی سے ہوتا رہا۔ چنانچہ جب وہ ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو لاہور سے رخصت ہوا۔ تو دل ہی دل میں خوش تھا کہ اس نے پنجاب کی شہری آبادی اور یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ایسا سبق سکھایا ہے۔ جس کو وہ کئی پشتوں تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔ مارشل لا جاری کرنے سے صرف چار روز قبل اس نے لاہور کے منٹگمری ہال میں فوجی جماعتوں کے نمائندوں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ پنجاب کی دیہاتی اور شہری آبادی میں باہمی منافرت پھیلانے کے لیے اس کی سب سے آخری اور سب سے خطرناک کوشش تھی۔

---

[1] مظالم پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ (سنہ ۱۹۱۹ء)

اس تقریر میں اُس نے فوجی جماعتوں کے نمائندوں کو جو تمام تر دیہات سے آئے تھے۔ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُن کے اور شہری باشندوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ بلکہ دونوں طبقوں کے مفاد ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ باہمی تصادم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اِس اشتعال انگیز تقریر کا کچھ حصّہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

آپ نے گذشتہ چند ہفتوں کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں کہ ایک ایسے قانون کو جو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اور جس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ بدامنی اور بغاوت کے طوفان کا سدّ باب کیا جائے۔ کیوں کہ توڑ مروڑ کر اور مسخ شدہ صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ کذب و افترا کے اِن ہتھکنڈوں سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں آسانی ہو۔ یہ سب کچھ ایک ایسے طبقے کے افراد کر رہے ہیں جن کی تعداد بے حد قلیل ہے۔ لیکن جو شور مچانے اور چیخ پکار کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ یہ لوگ اس قانون کو ایک خطرناک ہوّا بنا کر عوام کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اِس قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ غیر معمولی حالات میں عوام کے جان و مال کی حفاظت کیونکر کی جا سکے گی۔

"آپ میں سے جن لوگوں نے اِس قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ موجودہ تحریک کس قدر بے معنی اور غلط ہے ......

"تحریک چلانے والوں کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے خلاف بددلی پھیلائی

جائے - اور سرکار کے نمک خواروں کو ذلیل کیا جائے۔ حکومت کے وفادار باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اس شرانگیز تحریک کا مقابلہ کریں۔ لہذا میں آپ سے کہتا ہوں کہ عوام کے پاس جائیے۔ اور انہیں حکومت کی خیرسگالی سے آگاہ کر کے اس قانون کے فوائد ان کے ذہن نشین کیجئے صوبے کا شورش پسند عنصر عوام کو گمراہ کرنے۔ اور شہروں کے غنڈوں کو فساد پر آمادہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آپ ان کی کوششوں کو ناکام بنا کر دم لیں۔[1]

"حکومت کی نگاہیں آپ ایسے وفاداروں پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کے سیاسی خیالات چاہے کچھ ہوں۔ آپ کا فرض ہے کہ حکومت کے دست و بازو بن کر موجودہ تحریک کو کچلنے میں ہماری مدد کریں۔ اس ابتلا کا مقابلہ کرنے میں حکومت آپ کے اشتراک و تعاون۔ اور آپ کی امداد و اعانت

---

[1] سر مائیکل اوڈوائر نے اس تقریر میں بالواسطہ جس قانون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ رولٹ ایکٹ تھا۔ جس کے خلاف بطور احتجاج ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو پشاور سے لے کر راس کماری تک ایسی مکمل اور زبردست ہڑتال ہوئی تھی کہ اس برعظیم کے باشندوں نے اس کی نظیر پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اوڈوائر کے خیال میں یہ قانون نہایت بے ضرر معقول اور ملک کے امن و عافیت کے لیے ناگزیر تھا۔ اور صرف شہروں کے چند شورش پسند آدمی اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

آئیے واقعات پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ قانون

 (بقیہ صفحہ ۱۱۲ پر)

کی اُسی طرح شکر گزار ہوگی - جس طرح اُس نے جنگ فتح کرنے میں آپ کی خدمات کو ہمیشہ بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، اور فوری اقدام کے محتاج ہیں۔ اب آپ مزید تامّل نہ کیجئے - اور فوراً کمر ہمت باندھ لیجئے۔ حکومت نے نرم گو کی پالیسی ترک کر دی ہے - آپ بھی اُٹھ کھڑے ہوں۔ حکومت اِس مہم میں ہر لمحہ آپکے پشت پناہ ثابت ہوگی۔ حکومت نے قانون کے نفاذ کا مصمّم ارادہ کر لیا ہے - خواہ اس کام میں خون کی ندیاں کیوں نہ

ملک بھر کی مخالفت کے باوجود ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو ہندوستان کی مرکزی مجلسِ قانون ساز نے منظور کیا۔ اُس وقت مرکزی کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی مجموعی تعداد تیئیس تھی۔ جن میں ایک سر سنکرن نائر بھی تھے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن تھے۔ اس کے مقابل انگریز ممبروں کی تعداد چونتیس تھی جب رولٹ بل پر ایوان میں رائے شماری ہوئی۔ تو سوائے سر سنکرن نائر کے (جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حکومت کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور تھے) بائیس کے بائیس ہندوستانی ممبروں نے بل کے خلاف ووٹ دیئے۔ مسلمان ممبروں میں راجہ محمود آباد، میر اسد علی، مسٹر جناح، سر فضل بھائی کریم بھائی، مسٹر مظہر الحق، سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خان شامل تھے۔ حد یہ ہے کہ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خان ایسے اصحاب نے بھی جو عام طور پر حکومت کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے اس موقع پر بے دریغ حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ مسٹر جناح نے رولٹ بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مرکزی کونسل میں کہا تھا:-

(بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر)

بہہ جائیں۔ لیکن اگر ایسا ہُوا تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس تمام خون خرابے کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ بلکہ اُن لوگوں پر عائد ہو گی جو قانون شکنی کی تلقین کر رہے ہیں۔

آپ لوگوں کو میری یہ آخری نصیحت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہ الفاظ رائیگاں نہیں جائیں گے۔ اور آپ بلا تامل اس نصیحت کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کریں گے تاکہ رخصت ہونے سے قبل میں پنجاب میں امن و امان کی بحالی کا نظارہ دیکھ لوں موجودہ شورش بلا شبہ خطرناک ہے۔ لیکن شکر ہے کہ صوبے کے طول و عرض میں ابھی نہیں پھیلی۔ اگر آپنے بروقت مدد کی تو میں اس فتنے کو بآسانی دبا سکوں گا۔

"...... میرا فرض ہے کہ حکومت کو آگاہ کر دوں کہ اگر یہ قانون منظور ہو گیا تو آپ کے اِس فعل سے تمام ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایسی خطرناک شورش اور بدامنی پھیل جائے گی جس کی مثال آپ نے آج تک نہیں دیکھی۔ اور یقین کیجئے کہ یہ شورش اُن خوشگوار تعلقات کو تباہ کر دے گی جو اس وقت حکومت اور عوام کے درمیان قائم ہیں "

جب ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو انتہائی مخالفت کے علی الرغم حکومت نے یہ قانون منظور کر دیا۔ تو مسٹر جناح اور مسٹر مظہر الحق نے بطور احتجاج مجلسِ قانون ساز کی رکنیت سے استعفا دیدیا۔

"میں ہمیشہ اِس بات کو فخر سے یاد رکھوں گا کہ عالمگیر جنگ فتح کرنے میں کیا - اور ملک کو اندرونی شورش سے نجات دلانے میں کیا - میں نے جب بھی آپ لوگوں سے امداد و اعانت کی درخواست کی آپ نے کبھی تخلّف نہیں کیا - مجھے پختہ اُمید ہے کہ آئندہ چند ہفتوں میں آپ جو کچھ کریں گے - اُس سے آپ مجھے اور حکومت کو اور زیادہ ممنونِ احسان بنادیں گے"[1]

مائیکل اوڈوائر پنجاب سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا - لیکن اپنے پیچھے جو چیزیں یادگار چھوڑ گیا - اُن میں ایک شہری اور دیہاتی آبادی کی باہمی رقابت بھی تھی - جس نے ربع صدی سے زیادہ عرصے تک پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست کو نہ صرف قسم قسم کے مخمصوں میں اُلجھائے رکھا - بلکہ جس نے مسلمانوں کی اکثریت کو غیر مسلم اقلیت کے سامنے کبھی سر بلند و گردن افراز ہونے کا موقع نہ دیا -

سر فضلِ حسین نے ۲۰ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اِس موضوع پر کہا تھا -

جواب :- " پنجاب میں اس سے قبل شہری اور دیہاتی طبقوں کے درمیان نہ تو کوئی رقابت تھی - اور نہ عداوت - یہ تفریق حال ہی کی پیدا وار ہے - آپ نے اصلاحات کی سکیم میں ملاحظہ فرمایا ہو گا - کہ جہاں تک ہمارے صوبے کا تعلق ہے

---

[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی اخباری رپورٹ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء -

اِس تفریق کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اور اُسے بہت نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے ؟

سوال :- " میں ٹھیک طرح آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادی میں پہلے کوئی تمیز نہ تھی ؟

جواب :- "میرا مطلب یہ ہے کہ شہری اور دیہاتی باشندوں کے مفاد قطعاً ایک دوسرے سے مخالف یا متصادم نہیں تھے۔ دونوں طبقوں کے درمیان نہ تو کسی قسم کی مخالفت تھی۔ اور نہ ایک طبقہ دوسرے کو اپنا بدخواہ سمجھتا تھا ؟

سوال :- " بعد میں کیا ہوا ؟

جواب :- جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ یہ تفریق گذشتہ تین، چار سال کے دوران میں عمداً پیدا کی گئی ہے۔ آہستہ آہستہ بڑی کوشش سے اِس خیال کو تقویت دی گئی ہے کہ دیہاتی آبادی ہی اصل میں حکومت کی توجہ اور سرپرستی کی مستحق ہے۔ اور صرف گاؤں کے لوگ عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے کے مجاز ہیں۔ اس لیے حکومت کو چاہیئے کہ اُن کے مفاد کو ہر لحظہ پیشِ نظر رکھے نظر بظاہر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی اصل آبادی دیہات میں بستی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ حکومت نے اپنی اس حکمتِ عملی پر اس طریقے اور ایسے انداز سے عمل کیا کہ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری باشندوں کو نظر انداز کر کے پیچھے پھینک دیا گیا ہے ؟

سوال :- "کیونکر پیچھے پھینک دیا گیا ہے ؟ کیا آپ کوئی مثال پیش کر سکتے ہیں ؟"

جواب :- مثال کے طور پر صوبائی مجلسِ قانون ساز کے انتخابی حلقوں کو دیکھ لیجئے۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ شہر کا کوئی باشندہ دیہاتی حلقے سے امیدوار کھڑا نہیں ہو سکے گا۔"

سوال :- "آپ غالباً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت کی اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے جائیں جن سے شہری آبادی کی اہمیت ختم ہو جائے۔ کیا یہی مطلب ہے آپ کا ؟"

جواب :- "جی ہاں ! آپ نے بالکل درست فرمایا۔"

سر فضلِ حسین نے اپنی شہادت میں جس باہمی رقابت کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور یہ تقسیم اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ ملازمتوں اور کونسل کی نشستوں سے نکل کر کالج اور سکول کے کمروں تک میں پہنچ گئی تھی۔ چھ برس کے بچے کو مدرسے میں داخل کراتے وقت چھپی ہوئی درخواست کے ایک خانے میں لکھنا پڑتا تھا کہ بچہ شہری ہے یا دیہاتی زراعت پیشہ ہے یا غیر زراعت پیشہ۔ غرض مند لوگ اس تقسیم سے فائدہ اٹھانے میں آگے آگے تھے۔ خود انگریز نے اپنی شہنشاہیت کی گرتی ہوئی دیوار کو پشتہ دینے کے لیے آخر تک اِس تقسیم کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے خوں چکاں واقعات

نے یہ حقیقت اَلَم نشرح کردی کہ دشمن کی تلوار جب مسلمان پر وار کرتی ہے تو شہری اور دیہاتی میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتی ۔ تاہم اس تلخ حقیقت کے پہچاننے اور حقائق کی خار دار وادی میں سے گذر کر تحفظِ قومی کی منزل تک پہنچنے میں ہمیں اٹھائیس سال لگ گئے ۔ اور ستم ہے کہ اس طویل مدّت میں ہم مسلسل اپنوں اور بیگانوں کی فریب کاریوں کا شکار ہوتے رہے ہیں ۔

تیسرا باب

اصلاحات کا نفاذ

دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگرس ۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوئے ۔ ہندوستان کی ان تینوں نمائندہ انجمنوں نے بالاتفاق جدید اصلاحات کو رد کر کے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا ۔ اِس پروگرام کے نکات پنجگانہ میں یہ چیزیں شامل تھیں ۔

کونسلوں کا مقاطعہ

بدیشی کپڑے کا مقاطعہ

سرکاری خطابات کا مقاطعہ

حکومت سے زر امداد لینے والے سکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ

عدالتوں کا مقاطعہ

کانگرس کا وہ طبقہ جسے عرفِ عام میں اعتدال پسند (ماڈریٹ) کہا جاتا تھا دسمبر ۱۹۱۹ء ہی میں اجلاسِ امرتسر کے بعد کانگرس سے قطع تعلق کر چکا تھا ۔ اِس

طبقہ میں جو لوگ شامل تھے اُن میں سر تیج بہادر سپرو - سی - وائی - چنتامنی - سر چمن لال سیتلواد - پنڈت ہردے ناتھ کنزرو - سری نواس شاستری - سر ندرا ناتھ بینرجی - ڈاکٹر پرانجپے - پنڈت جگت نرائن - ڈاکٹر جیکر - این - سی کیلکر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں - اِن لوگوں نے کانگرس سے علیحدہ ہو کر فوراً لبرل کانفرنس کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کر لیا - اِن کا خیال تھا کہ نئی اصلاحات کو قبول کر کے، جہاں تک ممکن ہو سکے فائدہ اٹھانا چاہیئے. اور آئندہ ترقی کے لیے آئینی جد و جہد جاری رکھنی چاہیئے -

کانگرس کے اجلاسِ ناگپور میں ہندوستان کے تمام حصوں سے ۱۴۵۸۲ مندوبین شامل ہوئے - جن میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۵۰ تھی - ناگپور سے پہلے اور ناگپور کے بعد کانگرس کے کسی اجلاس میں مسلمان مندوبین کی اتنی بڑی تعداد شامل نہیں ہوئی تھی۔ مسئلہ خلافت نے ہندوستان کے مسلمانوں میں آگ لگا رکھی تھی - اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کے اشتراک سے ترکِ موالات کا لائحہ عمل اختیار کرنے کا مُصمّم ارادہ کر لیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں اِدھر کانگرس اور خلافت نے ڈنکے پر چوٹ لگائی - اور کونسلوں کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا - اُدھر حکومت نے ہندوستان کے تمام صوبوں میں انتخابات کرا کے جدید اصلاحات کے تحت مجالسِ قانون ساز مرتب کر ڈالیں - مسٹر مانٹیگو اِس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے - وہ ہندوستانی کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے - انھوں نے جس جرأت سے برطانیہ کے رجعت پسند عنصر کا مقابلہ کر کے کانگرس اور مسلم لیگ کی متحدہ سکیم کو

قبول کر لیا تھا۔ وہ اُن کے حسنِ نیت کا ثبوت تھا۔ مانٹیگو دل سے چاہتے تھے کہ اہلِ ہند کم از کم ایک مرتبہ تو نئی اصلاحات پر عمل کر کے دیکھیں۔ اگر آزمانے کے بعد یہ نظامِ حکومت بے کار ثابت ہوا۔ تو آئندہ اصلاحات کی جو نئی قسط تیار ہو گی اُس میں جملہ نقائص رفع کر دیئے جائیں گے۔ لیکن مانٹیگو کے اِن قابلِ تعریف عزائم کے باوجود ہندوستان کا انتہا پسند طبقہ بیک آواز اصلاحات کو مردود و مقہور قرار دے چکا تھا۔

جب مانٹیگو نے دیکھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے وہ اعتدال پسند افراد، جو ترکِ موالات کے حامی نہیں تھے۔ اپنی جماعتوں سے کٹ کر کونسلوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور اصلاحات پر عمل کرنے کو آمادہ ہیں تو انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ انھوں نے فوراً وائسرائے کو لکھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے صوبائی وزارتیں انہی لوگوں کے حوالے کی جائیں۔ اِس طرح دو فائدے پیشِ نظر تھے۔ ایک یہ کہ کانگرس کے انتہا پسند طبقہ کو دکھا دیا جائے کہ اصلاحات اِس قدر حقیر و بے معنی نہیں جیسا کہ انھوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے سے ملک کو بہت کچھ فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ برطانیہ کے رجعت پسند عناصر پر یہ امر واضح ہو جائے کہ خود کانگرس کا ایک طبقہ ایسا ہے جو اصلاحات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا اور اُن سے استفادہ کرنے کا خواہاں ہے۔

مانٹیگو کی اِس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جن لوگوں کو وزارتوں کے منصب پر فائز کیا گیا ۔ اُن میں

سرندرا ناتھ بینرجی (بنگال)۔ پنڈت جگت نرائن اور سی۔ وائی چنتا منی (یو۔پی)۔ سر چمن لال ستیلواد اور ڈاکٹر پرانجپے (بمبئی)۔ سید فخر الدین اور مدھوسودن (بہار) این۔ سی۔ کیلکر (سی۔پی)۔ میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال (پنجاب) تھے۔

میاں فضل حسین کونسل میں داخل ہونے سے پہلے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری۔ اور پنجاب صوبائی کانگرس کے صدر تھے۔ انھوں نے میثاق لکھنؤ پر پنجاب کے مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ کانگرس اور لیگ کی متحدہ سکیم کو مقبول بنانے اور پنجاب کی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انھوں نے پنجاب پراونشل کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا وہ سر مائیکل اوڈوائر کے نزدیک گویا سراسر باغیانہ خیالات سے لبریز تھا۔ قطع نظر اس سیاسی حیثیت سے میاں صاحب انجمن حمایت اسلام۔ پنجاب یونیورسٹی اور ہائی کورٹ کے مقتدر ترین ارکان میں شمار ہوتے تھے۔

لالہ ہرکشن لال کیمبرج کے فارغ التحصیل بیرسٹر تھے۔ لیکن چند سال کی پریکٹس کے بعد اُنھوں نے وکالت ترک کر کے صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اب اسی پیشے میں وہ ہندوستان کے کامیاب ترین آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے بھارت انشورنس کمپنی کے نام سے ہندوستان میں پہلی بیمہ کمپنی قائم کی۔ پیپلز بنک کے نام سے پنجاب میں پہلا دیسی بنک قائم کیا لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی قائم کر کے لاہور کو پہلی مرتبہ برقی روشنی سے منور کیا

اس کے علاوہ بے شمار کارخانوں، صنعتی اداروں اور درآمد برآمد کرنے والی تجارتی فرموں کے مالک بھی تھے۔ سیاسیات میں بھی اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ ۱۹۰۹ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تو ہرکشن لال مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۱۶ء میں وہ انگلستان جانے والے کانگرسی وفد کے رُکن منتخب ہوئے تھے۔ مارشل لا میں اُن کو حبسِ دوام کی سزا ملی تھی۔ اور اُن کی تمام جائیداد جس کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی ضبط کیے جانے کا حکم صادر ہوا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو نے انھیں ترکِ موالات پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن انجامِ کار انھوں نے کونسل میں داخل ہو کر وزارت قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔

اُس وقت پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلگن تھے۔ جو اپنی عافیت پسند طبیعت اور صلح کیشی کے اعتبار سے اپنے پیش رو سے بالکل مختلف انسان تھے میاں فضلِ حسین اور لالہ ہرکشن لال کو وزارت پر آمادہ کر لینے کے لیے اُنھیں مستحق مبارکباد قرار دیا گیا تھا۔ پنجاب کے یہ دونوں وزیر قابلیت، مستقل مزاجی سیاسی فہم و فراست اور کردار کی مضبوطی کے لحاظ سے صوبے کا بہترین انتخاب تھے۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگرس کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ دونوں نے سرا سر ذاتی کوشش اور محنت سے دنیوی عروج حاصل کیا تھا۔ اور دونوں ہی یقیناً اتنا حوصلہ رکھتے تھے کہ آزمائش کے وقت برطانوی حکومت کے دبدبے سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ وزارت کی تشکیل ہوتے ہی پنجاب کے

بعض انگریز افسروں نے فضا کی ناسازگاری کو محسوس کیا۔ اور مستعفی ہو کر چلے گئے۔ ان میں دو آدمی زیادہ نمایاں تھے۔ ایک سر مائیکل اوڈوائر کے زمانے کے چیف سیکرٹری جے۔ پی۔ ٹامسن اور دوسرے ہائی کورٹ کے جج لیزلی جونز۔

پنجاب کی اس پہلی لیجسلیٹو کونسل میں تئیس سرکاری وغیر سرکاری نامزد ارکان اور اکہتر انتخاب شدہ ممبر تھے۔ انتخاب شدہ ممبروں میں پینتیس مسلمان، پندرہ سکھ اور اکیس ہندو تھے۔ پینتیس مسلمانوں میں سے پانچ شہری اور تیس دیہاتی حلقوں سے آئے تھے۔ یہ لوگ کسی نوع کی سیاسی جماعت، کسی قسم کے سیاسی نظام یا کسی انداز کے سیاسی پروگرام کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص صرف اپنی ذات کا ذمہ دار تھا۔ دیہاتی حلقوں سے منتخب ہونے والے ممبر اچھے خوشحال اور بڑے بڑے زمیندار تھے۔ جن کی ذہنی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی جو سر مائیکل اوڈوائر نے اپنے شش سالہ عہدِ حکومت میں قائم کر دیا تھا۔ یہ لوگ سیاسیات میں رجعت پسند، تعلیم میں پس ماندہ قبائلی عصبیت کی فضا کے پروردہ۔ انگریزی اقتدار کے دل و جان سے حامی اور شہری آبادی کو حریف سمجھ کر اس سے خائف اور کسی قدر متنفر بھی تھے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کونسل کی حقیقی طاقت کا سرچشمہ ان تیس۳۰ دیہاتی ممبروں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر یہ تیس ممبر متفق ہو کر کسی شخص کو اپنا لیڈر منتخب کر لیتے تو انجام کار وہی پنجاب کا وزیر بننے کا مستحق قرار دیا جاتا۔

۱۹۲۱ء میں پنجاب میں قطعاً کسی قسم کی دستوری یا آئینی روایات موجود نہیں

تھیں۔ کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ وزیر کیونکر مقرر کئے جائیں گے! اصلاحات کے مسودے میں صرف اتنا درج تھا کہ صوبے کے وزیر مجلسِ قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اور صرف اُس شخص کو وزیر مقرر کیا جائے گا جو کونسل کے انتخاب شدہ ارکان کی اکثریت کے اعتماد کا حامل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب کونسل میں کوئی معین اور واضح پارٹی موجود نہیں تھی تو پھر یہ کیونکر طے کیا جاتا کہ اکثریت کس کو اپنا سربراہ یا لیڈر بنانا چاہتی ہے۔ اس کا آسان طریق یہ تھا کہ پینتیس [۳۵] مسلمان اور اکیس [۲۱] ہندو ممبروں سے کہہ دیا جاتا کہ علیحدہ علیحدہ جلسہ کر کے اپنا اپنا لیڈر منتخب کر لیں۔ اور گورنر ان دونوں فرقوں کے انتخاب شدہ لیڈروں کو قلمدانِ وزارت سونپ دے۔

یہ طریقہ سراسر جمہوری اور عین قاعدے کے مطابق ثابت ہوتا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب کا گورنر اپنے دونوں وزیر اس طرح منتخب کرتا تو کیا میاں فضلِ حسین اور لالہ ہرکشن لال کے وزیر بننے کا کوئی امکان تھا؟ آج سینتیس [۳۷] سال گذر جانے کے بعد اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ تاہم میری حتمی رائے ہے کہ لالہ ہرکشن لال تو شاید وزیر بن جاتے۔ لیکن میاں فضلِ حسین کے وزیر بننے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

میاں فضلِ حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد خان بہادر میاں حسین بخش سرکاری ملازمت میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ فضلِ حسین نے ۱۸۹۳ء میں گورداسپور کے ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔ بی۔ اے

میں وہ علامہ اقبال کے ہم جماعت تھے۔ اور دونوں نے سر ٹامس آرنلڈ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں فضل حسین انگلستان چلے گئے۔ جہاں دو مرتبہ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ لیکن ناکام رہے۔ آخر کیمبرج سے بی۔اے کر کے اور لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۱ء میں واپس ہندوستان آ گئے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک انھوں نے سیالکوٹ میں پریکٹس کی۔ اور ۱۹۰۵ء میں لاہور تشریف لے گئے۔ جہاں اُن کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

اُس زمانے میں پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو پبلک زندگی سے روشناس کرنے۔ اور اُن میں قومی خدمت کا جذبہ بیدار کرنے کا صرف ایک ادارہ تھا۔ یعنی انجمن حمایتِ اسلام۔ فضلِ حسین نے لاہور پہنچتے ہی انجمن کے کاموں سے دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اور آہستہ آہستہ انجمن کی جنرل کونسل کے ممبر اور اسلامیہ کالج کمیٹی کے سیکرٹری ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور چند سال بعد سنڈیکیٹ کے ممبر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ اُنھیں یونیورسٹی کی بہت سی تعلیمی اور انتظامی سب کمیٹیوں میں بھی کام کرنے کا موقع ملنے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے حلقے سے اُمیدوار کھڑے ہوئے۔ یونیورسٹی کا حلقۂ انتخاب کلیتہً ہندوؤں کے لیے وقف تھا۔ میدانِ انتخاب میں اُس وقت تین اُمیدوار تھے۔ لالہ دوارکا داس۔ راجہ سر ہرنام سنگھ اور میاں فضلِ حسین۔ راجہ سر ہرنام سنگھ مہاراجہ کپورتھلہ کے بھائی تھے۔ اور مدت سے مسیحی مذہب اختیار

کر چکے تھے۔

ان تینوں امیدواروں میں قابلیت، سیاسی بیداری اور قومی خدمات کے اعتبار سے فضل حسین کا پلّہ یقیناً بھاری تھا۔ لیکن جب وہ اپنے ہندو دوستوں سے مدد کے خواہاں ہوئے تو سب نے معذوری کا اظہار کیا۔ اور کھلے بندوں اعتراف کیا کہ اگرچہ ذاتی طور پر وہ فضل حسین کو ہر اعتبار سے یونیورسٹی کا بہترین نمائندہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک ہندو امیدوار کے مقابلہ میں کسی مسلمان کو ووٹ دینا قومی غداری خیال کرتے ہیں۔ یہ واقعہ فضل حسین کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوا۔ چنانچہ بعد میں انھوں نے ایک مرتبہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"ایک ہندوستانی مسلمان چاہے کتنا ہی قوم پرست بنے۔ اور فرقہ وارانہ جذبہ سے مبرا ہونے کا دعوےٰ کرے۔ قول و فعل کے علاوہ تمام دیگر امور میں بھی وہ پکا نیشنلسٹ کیوں نہ بن جائے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اس کی زندگی کا ایک گوشہ بھی ایسا نہ دکھا سکے۔ جس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہو۔ لیکن جب امتحان کا موقع آئے گا تو ہندو لیڈر اور ہندو عوام اس کے خلاف ووٹ دیں گے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ مسلمان کسی قدر قابل اور دلیر بھی واقع ہوا ہے۔"

جب انتخاب کی تاریخ قریب آئی۔ تو ہندو لیڈروں نے محسوس کیا کہ اگر مقابلہ تین امیدواروں کے درمیان ہوا تو عیسائی اور انگریز اپنے ووٹ سر ہر نام سنگھ کو دیں گے اور اس صورت میں ممکن ہے کہ فضل حسین تمام مسلمانوں اور کچھ ہندوؤں کے ووٹ لے کر کامیاب ہو جائیں۔ اس لیے انھوں نے لالہ ورگا داس کو بیٹھ جانے پر مجبور کیا

تاکہ تمام ہندو، عیسائی اور انگریز متحد ہو کر سر ہرنام سنگھ کے حق میں ووٹ ڈال سکیں مقصد صرف یہ تھا کہ ہر حال اور ہر صورت میں فضلِ حسین کو ناکام بنایا جائے لیکن عین موقع پر میاں فضلِ حسین کو معلوم ہو گیا کہ راجہ سر ہرنام سنگھ برطانوی ہند کے باشندے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی قومیت بدستور ریاست کپورتھلہ کی ہے۔ جب کاغذاتِ نامزدگی داخل ہو چکے۔ تو فضلِ حسین نے اپنے حریف کے خلاف یہ اعتراض کیا۔ جو سراسر آئینی اور جائز اعتراض تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہرنام سنگھ کا نام خارج ہو گیا اور فضلِ حسین بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

میاں فضلِ حسین ابتدا سے کانگرس اور مسلم لیگ کے ممبر تھے اور انھوں نے لیگ اور کانگرس کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے۔ اور دونوں جماعتوں کو متحد العمل بنانے میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ بیرونِ پنجاب سے مسٹر جناح، مسٹر مظہر الحق، سیّد حسن امام اور راجہ محمود آباد اِن کوششوں کے حامی تھے۔ سر محمد شفیع چونکہ اس نوع کی ترقی پسند سیاست کے خلاف تھے۔ اِس لیے فضلِ حسین اور شفیع کے درمیان اختلافات کا رُونما ہونا ایک لازمی امر تھا۔ میاں محمد شفیع پنجاب صوبائی لیگ کے صدر تھے اور سر مائیکل اوڈوائر نے اس جھگڑے میں میاں محمد شفیع کا ساتھ دیا۔ فضلِ حسین نے بڑِ مقابل بن کر اور خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ پیر تاج الدین اور غلام رسول خاں کو ساتھ ملا کر پنجاب میں نئی صوبائی لیگ کی بنیاد رکھ دی جب جنگِ عظیم میں شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو شفیع لیگ نے سکوتِ مصلحت آمیز اختیار کر لیا۔ لیکن نئی لیگ نے فضلِ حسین کے زیرِ صدارت ایک پبلک جلسہ میں شریف حسین کی مذمت کی۔ مائیکل اوڈوائر تو فضلِ حسین

کا یہ فعل بھی ناگوار گذرا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں جب کانگرس اور لیگ کے درمیان میثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تو سر محمد شفیع بطور احتجاج لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ اور پنجاب مسلم لیگ کلیۃً میاں فضلِ حسین اور اُن کے رفقاء کے قبضے میں چلی گئی۔ اب فضلِ حسین پنجاب کانگرس کے صدر اور پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور اس حیثیت سے وہ اپنے صوبے کی سیاسیات میں سب سے اہم اور بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند کے سامنے جب کانگرس اور مسلم لیگ کا متحدہ وفد جدید اصلاحات کی تجاویز کا مسودہ لے کر پیش ہوا تو فضلِ حسین اس وفد کے رُکن تھے۔ پیشہ وکالت میں بھی اُن کو چوٹی کا آدمی سمجھا جاتا تھا اور جب سر محمد شفیع وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رُکن مقرر ہو گئے تو فضلِ حسین کو لاہور ہائی کورٹ بار کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ جنگِ عظیم کے اختتام پر اُنھوں نے ترکوں کی کھلم کھلا حمایت کی۔ اور تحریکِ خلافت کے ابتدائی مراحل میں بعض بڑے بڑے پبلک جلسوں کی صدارت بھی کی۔ اس کے علاوہ رولٹ بل کی مذمت کرنے میں بھی وہ پیش پیش تھے۔

سر مائیکل اوڈوائر کی مذموم کوششوں سے پنجاب کی آبادی میں شہری اور دیہاتی کی جو تقسیم پیدا ہو گئی تھی۔ میاں فضلِ حسین اُس کے سخت خلاف تھے۔ اوڈوائر کی موجودگی ہی میں جب چودھری لال چند نے، جو رہتک کے جاٹوں کے ایک مقتدر لیڈر تھے، پنجاب کونسل میں یہ قرارداد پیش کی کہ جدید اصلاحات میں شہری اور دیہاتی آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے قائم کیے جائیں اور شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب ہی سے کونسل میں نشستوں کی تعداد مقرر ہونی چاہیے۔ تو میاں فضلِ حسین نے اِس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آپ اِس وقت پنجاب کے تمام انتخابی حلقوں کو شہری اور دیہاتی کے نام سے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کا یہ نظریہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ اِن دونوں حصوں کے مفاد ایک دوسرے کے مخالف یا متضاد ہیں۔ جب آپ شہری اور دیہاتی کے نام سے پوری آبادی کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں تو معاف فرمایئے گا، آپ اُس تعلیم یافتہ طبقے کو جو اب تک صوبے میں فضیلت و برتری کا مالک خیال کیا جاتا تھا ایک ایسی ادنٰے بلکہ غلامانہ حیثیت قبول کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس کا وہ عادی نہیں۔ اور جس کا وہ اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے مستحق بھی قرار نہیں دیا جا سکتا..... میرے نزدیک یہ بات سرے ہی سے مذموم و ناروا ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادیوں میں تفرقے کی دیوار اس طرح کھڑی کر دی جائے کہ بالآخر گاؤں کے لوگ شہری باشندوں پر غلبہ پا جائیں..... جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جوں جوں وقت گذرے گا آپ دیکھیں گے کہ شہری اور دیہاتی حلقوں کا یہ باہمی امتیاز مٹتا چلا جائے گا۔"

چودھری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی۔ تو دیہات کے انتخابی حلقوں سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانونِ انتقالِ اراضی کی رو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ فضلِ حسین نے اِس قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا :۔

"پنجاب کی دیہاتی آبادی ایک کروڑ اسّی لاکھ ہے۔ جس میں سے ایک کروڑ سے کچھ زیادہ زراعت پیشہ لوگ ہیں۔ وہ لوگ جو بدقسمتی سے زراعت پیشگی کے سنہرے سرٹیفکیٹ سے محروم ہیں۔ اب دیہاتی ہونے کے باوجود بھی دیہاتی حلقے سے نہیں کھڑے ہو سکیں گے۔ یہ کس قدر لایعنی اور ظالمانہ تجویز ہے۔ مانا کہ زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مان لیا کہ غیر زراعت پیشہ دیہاتی لوگ اراضی کے مالک نہیں ہیں۔ یہ بھی مان لیا کہ انھوں نے فوجی بھرتی میں حصّہ نہیں لیا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ وہ کاشتکاری کا پیشہ نہیں رکھتے۔ لیکن یہ تمام امور تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ بات کیونکر قبول کی جا سکتی ہے کہ اب یہ بدقسمت لوگ دیہاتی ہوتے ہوئے بھی محض اس بنا پر دیہات کی نمائندگی نہیں کر سکتے کہ انھیں زراعت پیشگی کا زرّیں پروانہ حاصل نہیں ہوا اگر یہ تجویز منظور کر لی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زراعت پیشہ اقوام کے لوگ اپنے دیہاتی بھائیوں سے بھی خائف ہیں کہ مبادا میدانِ انتخاب میں اُن کے ہاتھوں مات کھا جائیں۔ میری رائے میں یہ تجویز نہ تو مجموعی طور پر دیہات کے باشندوں کو فائدہ پہنچائے گی اور نہ زراعت پیشہ اقوام کے لیے مفید ہوگی۔"[1]

آگے چل کر میاں فضلِ حسین نے کہا:۔

---

[1] کارروائی پنجاب لیجسلیٹو کونسل نومبر ۱۹۱۶ء۔

"کونسل کی رکنیت کا اہل بننے کے لیے صرف ایک معیار ہے۔ اور وہ ہے علمی قابلیت اور ذہنی برتری کا معیار۔ جب ایک شخص کونسل کا ممبر منتخب ہوتا ہے۔ تو وہ اِس قابل ہونا چاہیئے کہ ایوان میں آکر بآوازِ بلند کہہ سکے کہ میں دماغی صلاحیت کے اعتبار سے بہترین شخص ہوں میں نظم و نسق کو خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ اِس لیے آپ قواعد و ضوابط اِس ڈھنگ سے وضع کیجئے کہ مجھے کونسل میں داخل ہو کر اپنے ملک کے نظامِ حکومت میں حصّہ لینے کا موقع مل سکے۔

"اگر آپ دیہاتی ووٹروں کو متعدد اُمیدواروں میں سے بہترین آدمی منتخب کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو ظاہر ہے کونسل اعلیٰ درجے کے ممبروں سے محروم رہ جائے گی۔ ہم بطورِ دلیل مان لیتے ہیں کہ شہری اور دیہاتی حلقے الگ الگ ہیں لیکن اس تقسیم کے باوجود کوشش کرنا چاہیئے کہ اِن حلقوں کو ایسی آزادی اور سہولت میسّر آئے کہ وہ اپنے اپنے ہاں سے بہترین اور لائق ترین امیدوار منتخب کر سکیں۔"[1]

خاندان، وطنیت، طولِ قیام، روزگار، تعلیم و تربیت، بود و باش، عادات و اطوار، معیشت و معاشرت، تعلقات و مراسم غرضیکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو سے فضلِ حسین دیہاتی نہیں بلکہ شہری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اور لالہ ہرکشن لال وزیر مقرر ہوئے۔ تو دیہاتیوں کو سخت رنج ہُوا کہ پنجاب کے دونوں وزیر شہری طبقے

---

[1] کارروائی پنجاب لیجسلیٹو کونسل۔ مارچ ۱۹۲۰ء

سے کیوں منتخب کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جاٹ برادری کے ایک اخبار جاٹ گزٹ نے اپنی ۱۲ جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:-

"دونوں وزیر شہری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں مخصوص انتخابی حلقوں سے منتخب ہوکر آئے ہیں۔ اس کے برعکس نئی کونسل میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو دیہاتی حلقوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک اِن وزیروں کو دیہاتی ممبروں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ یہ لوگ سرکاری اور نامزد ارکان کی مجموعی تعداد سے بھی اپنی وزارت کی گدیاں سلامت نہیں رکھ سکیں گے۔ شہر کے دو آدمیوں کو وزارت کے منصب پر فائز کر دینا پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں کی کھلم کھلا توہین کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟"

گورنر نے میاں فضلِ حسین کو اِس لیے وزیر منتخب نہیں کیا تھا کہ پنجاب کونسل کے انتخاب شدہ مسلمان ممبروں کی اکثریت اُن کی پشت پر تھی حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کو تو اپنا لیڈر منتخب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا تھا منصبِ وزارت کے لیے میاں صاحب کا سب سے بڑا دعویٰ یا استحقاق اُن کی بلند و بالا سیاسی حیثیت تھی۔ وہ پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری۔ صوبائی کانگرس کے صدر۔ ہائی کورٹ بار کے لیڈر۔ یونیورسٹی کے سب سے ذی اثر رکن۔ انجمن حمایتِ اسلام کی کالج کمیٹی کے سیکرٹری اور پنجاب کے مسلمانوں کے سب سے باوقار اور ترقی پسند رہنما تھے اِن تمام خوبیوں نے مل کر میاں صاحب کو ایک ایسا جامع حیثیات شخص بنا دیا تھا

کہ گورنر کو، ایسے حالات میں جبکہ ترکِ موالات کی تحریک نے آگ لگا رکھی تھی، عوام کے اشتعال پذیر سیاسی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فضلِ حسین سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ لاہور کے سب سے بڑے کانگرسی اخبار ٹریبون نے اپنی ۴ جنوری ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا:-

"سر ایڈورڈ میکلگن اس بات پر مستحقِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جدید اصلاحات کے تحت بہترین وزیر منتخب کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔"

انھی دنوں مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند کے مشورے سے کرنل ویجووڈ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے تھے۔ کرنل ویجووڈ پارلیمنٹ کی لیبر پارٹی کے مشہور اور ذمہ دار رکن تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُن کے اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ کانگرس کے ہندو اور مسلمان لیڈروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ ترکِ موالات کی تحریک اختیار کرنے کی بجائے نئی اصلاحات پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے مہاتما گاندھی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے لیڈر تک ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانے کی جدوجہد کی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں وہ ناگپور جا کر کانگرس کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ چونکہ کرنل ویجووڈ پارلیمنٹ میں ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرتے تھے اور اہلِ ہند اُن کو اپنا ہمدرد و خیر خواہ سمجھتے تھے۔ اس لیے کانگرس کی مجلسِ انتخابِ مضامین میں جب ترکِ موالات کی قرارداد پیش ہوئی۔ تو مہاتما گاندھی کے ایمائے کرنل ویجووڈ کو بھی اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ ویجووڈ نے قرارداد

کی مخالفت کرتے ہوئے کہا :-

"آپ آزادی ہند کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں، جونہی آپ نے خلافِ آئین تحریک شروع کی۔ پولیس خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرنا شروع کر دے گی۔ آپ عدالتوں کا مقاطعہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہر وکیل کو پریکٹس کا لائسنس لیتے وقت ملکِ معظم کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ اندریں حالات تنخیص کے وکلا کیونکر خلافِ قانون تحریک میں شرکت کر سکیں گے۔ ترکِ موالات اختیار کر کے آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کو چاہیئے کہ اس قسم کے تخریبی کام کی بجائے قومی تعمیر کا پروگرام وضع کریں۔"

کرنل ویجوڈ کی تقریر کا لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ جب انھوں نے دورانِ تقریر میں کہا کہ "آپ ہم لوگوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے" تو حاضرین میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے جواب دیا: "آپ اطمینان رکھیئے ہندوستان سے باہر ہمارا کوئی ہمدرد نہیں۔"

کرنل ویجوڈ نے پنجاب آکر ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے بھی ملاقات کی۔ ڈاکٹر کچلو جلیانوالہ باغ کے ہیرو۔ اور مارشل لاء کے دور کی ممتاز ترین شخصیت تھے اس لیے کرنل ویجوڈ کا خیال تھا کہ اگر وہ انھیں کسی طرح کونسل کی ممبری پر رضامند کر سکیں تو پنجاب کی وزارت کے لیے کچلو سے بہتر آدمی ملنا محال ہے چنانچہ انھوں نے سر ایڈورڈ میکلگن کے مشورے سے ڈاکٹر کچلو کو کونسل کی ممبری پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس دام میں پاؤں رکھنے سے انکار کر دیا۔

ظاہر ہے ڈاکٹر کچلو امرت سر کے رہنے والے اور غیر زراعت پیشہ طبقہ کے آدمی تھے۔ انھیں زراعت پیشہ دیہاتی ممبروں کی رہنمائی کا فخر کیونکر حاصل ہو سکتا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں وزیر ہند۔ وائسرائے اور گورنروں کی متفقہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُن لوگوں کو صوبائی وزارتیں دی جائیں جو کانگرسی تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ تاکہ ترک موالات کے پُر شور طوفان میں جدید اصلاحات کی ناؤ ڈانواں ڈول نہ ہونے پائے۔

پنجاب کونسل کے تیس دیہاتی مسلمان ممبروں میں صرف دو آدمی ایسے تھے جو تعلیمی قابلیت اور قانونی صلاحیت کے اعتبار سے میاں فضلِ حسین کے حریف بن سکتے تھے۔ ایک میاں شاہنواز بی اے (کینٹب) بیرسٹر ایٹ لاء۔ دوسرے ملک فیروز خان نون بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ میاں شاہنواز سن و سال میں فضلِ حسین کے برابر تھے۔ وہ باغبانپورہ کے مشہور میاں خاندان کے رُکن ضلع لاہور کے دیہاتی حلقے کے نمائندہ اور سر محمد شفیع کے داماد تھے۔ لیکن اُن میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اُن کے نامۂ اعمال میں سیاسیات کا خانہ بالکل خالی تھا۔ ملک فیروز خاں نون کا اثر و رسوخ میاں شاہنواز سے بھی زیادہ تھا۔ وہ شاہ پور کے متمول ترین زمیندار گھرانے کے نورِ نظر تھے۔ اور اگر کبھی رائے شماری کی نوبت آجاتی۔ تو مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبر جن کی مجموعی تعداد تئیس تھی فضلِ حسین اور شاہنواز دونوں کو چھوڑ کر فیروز خاں نون کے پیچھے ہاتھ کھڑے کرتے لیکن فیروز خاں نون کا کمزور ترین پہلو بھی یہی تھا کہ سیاسی دنیا میں کوئی شخص اُن کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ یوں بھی وہ بالکل نو عمر تھے۔ سکندر حیات خاں جو چند سال بعد میاں فضلِ حسین کے

سب سے بڑے اور سب سے کامیاب حریف ثابت ہونے والے تھے۔ ۱۹۲۱ء کے انتخاب میں ضلع اٹک سے منتخب ہو کر آئے تو تھے۔ لیکن اُن کے خلاف انتخابی عذرداری منظور ہو گئی۔ اور وہ کونسل کی رکنیت سے برطرف کر دیئے گئے۔

پنجاب کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کو اُس وقت یہ راز معلوم نہیں تھا کہ وزارت سازی کی اصل طاقت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُن میں سے اکثر انگریزی نہیں جانتے تھے۔ سیاسیات میں اُن کا مبلغ علم بمنزلہ صفر تھا۔ سرکار کا ہَوّا ہر وقت اُن کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ صوبے کا گورنر تو بہت بڑی چیز ہے۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر اُن کا کعبۂ مقصود و قبلۂ حاجات تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ لاٹ صاحب بہادر نے اظہارِ خوشنودی فرما کر میاں فضلِ حسین کے سر پر تاجِ وزارت رکھ دیا ہے۔ تو انھوں نے بھی پوری عقیدت سے اِس آستانِ عالیہ پر اپنی جبینِ نیاز جھکا دی۔

میاں فضلِ حسین کو اپنی اس بنیادی کمزوری کا احساس تھا۔ وہ مشرقی پنجاب کے شہری مسلمان تھے۔ درحالیکہ کونسل مغربی پنجاب کے دیہاتی ممبروں سے بھری ہوئی تھی جن کے اور فضلِ حسین کے درمیان سوائے "اسلام" کے اور کوئی چیز وجہ اشتراک نہ بن سکتی تھی۔ سالہا سال کے معاندانہ پراپاگنڈے نے شہری اور دیہاتی کی تمیز اِس قدر راسخ کر دی تھی کہ دیہاتی ممبر اپنی تقدیر کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینے پر کبھی تیار نہ ہو سکتے تھے۔ جو مشرقی پنجاب کے ایک شہر کا رہنے والا۔ اور پیشے کے اعتبار سے بیرسٹر ہو۔ پھر یہی کافی نہیں۔ میاں فضلِ حسین ہمیشہ شہری اور دیہاتی آبادی کی تفریق کو بُرا سمجھتے آئے تھے۔ انھوں نے سابقہ پنجاب کونسل کے ایوان میں اور ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے بار بار اس تفریق کی مذمت کی تھی۔ اور یوں

بالواسطہ تعلیم یافتہ شہری آبادی کے تفوق کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے دیہاتی ممبروں کو یہ سب حال معلوم تھا۔ لیکن گورنر نے جب فضلِ حسین کو وزارت کی مسند پر بٹھا دیا تو وفاداری کی قدیم روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام زمیندار ممبروں نے اسی میں عافیت دیکھی کہ اب اپنے نئے آقا کے سامنے گردنیں خم کر دی جائیں۔

چوتھا باب

پہلی وزارت کا دَور

میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال پرانے رفیقِ کار تھے۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگرسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اور اب دونوں کانگرس سے کٹ کر کونسل میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لیے دونوں کو مل جل کر کام کرنے میں کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لالہ ہرکشن لال بڑے دل گُردے کے، زبردست اور باحوصلہ انسان تھے۔ وزارت کا پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ اُن کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اُن کے گھر کا خرچ دس ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھا۔ میاں فضل حسین بڑے زیرک، معاملہ فہم، دُور اندیش اور باتدبیر آدمی تھے۔ اُنھوں نے بہت جلد اُن مشکلات پر قابو پا لیا۔ جو نئی اصلاحات کی دوعملی حکومت میں وزرا کے راستے میں حائل ہو سکتی تھیں تاہم اُن پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہو گئی تھی کہ آئندہ پنجاب کی حکومت اِس صوبے کے دیہاتی ممبروں کی خوشنودی اور صوابدید کے بغیر نہ چل سکے گی۔

فضل حسین کے پاس تعلیمات اور ہرکشن لال کے پاس زراعت کا قلمدانِ وزارت تھا۔ کانگرس اگرچہ ترکِ موالات کا پروگرام اختیار کر کے میثاقِ لکھنؤ سے عملاً دست کش

ہو چکی تھی - لیکن ایک پرانے کانگرسی اور مسلم لیگی کی حیثیت سے میاں فضل حسین اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اِس میثاق کی تمام شقوں پر حتی الامکان عمل کیا جائے - چنانچہ اس جانب قدم اٹھاتے ہوئے انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ لاہور کے میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کے لیے چالیس فی صد نشستیں مخصوص کر دیں۔ میونسپل کمیٹیوں میں جہاں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں حاصل تھیں - اُن کی نمائندگی تناسبِ آبادی کے مطابق بڑھا دی - اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا چالیس فی صد حصّہ مقرر کر دیا۔

ہندوؤں کو یہ تینوں فیصلے سخت ناگوار گذرے - ہندو کے نزدیک قوم پرستی کا مفہوم یہ تھا کہ اُس کی ہر قسم کی اجارہ داری میں، خواہ وہ سراسر بے انصافی پر مبنی ہو، خلل نہیں پڑنا چاہیے - میاں صاحب کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا - ہندو اخباروں، ہندو انجمنوں اور ہندوؤں کی نجی محفلوں میں فضلِ حسین کو فرقہ پرستی کا بانی، ہندو مسلم اتحاد کا دشمن، ہندوؤں کا قاتل اور ہندوستان کا بدخواہ قرار دیا جانے لگا۔ میاں فضلِ حسین نے بار بار کانگرسی لیڈروں کو پکارا کہ وہ چونکہ میثاقِ لکھنؤ کی ترتیب میں باقاعدہ ایک فریق کی حیثیت رکھتے تھے - اس لیے اُن کا فرض ہے کہ اس جھگڑے میں حکم بن کر فیصلہ کریں کہ آیا پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ جو تھوڑا سا انصاف کیا جا رہا ہے وہ میثاق کے مطابق ہے، یا مخالف۔ میاں صاحب نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ اگر اس بارے میں کانگرس کا فیصلہ اُن کے خلاف صادر ہوا تو وہ وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے۔ لیکن کانگرسی لیڈروں

نے جواب دیا کہ کیا میثاقِ لکھنؤ اور کیا کونسل کی ممبری - وہ دونوں پر لعنت بھیج چکے ہیں - اب ترکِ موالات کا دور دورہ ہے - اِس لیے اُنھیں آئینی اصلاحات سے کوئی دلچسپی نہیں -

جہاں تک میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کے داخلے کا سوال تھا - یہ جھگڑا میاں فضل حسین کی وزارت سے بہت پہلے سے چلا آرہا تھا - ۱۹۱۶ء تک تو یہ کیفیت تھی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی - سال بہ سال جتنے مسلمان لڑکے ایف - ایس - سی کا امتحان پاس کرکے داخلے کے لیے جاتے - کم و بیش سبھی کو جگہ مل جاتی - ۱۹۱۷ء میں پہلی بار مسلمان طلبہ کو مایوسی ہوئی - اور بہت سے اُمیدوار جگہ حاصل نہ کر سکے - چنانچہ اُسی سال میاں فضلِ حسین نے پنجاب کونسل میں یہ سوال اُٹھایا کہ مسلمان طلبہ کی اچھی خاصی تعداد کو میڈیکل کالج میں کیوں داخل نہیں کیا گیا -

اگلے سال یعنی ۱۹۱۸ء میں خلیفہ شجاع الدین - ملک برکت علی - سیّد محسن شاہ اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے ایک وفد کی صورت میں ہسپتالوں کے انسپکٹر جنرل کے پاس جا کر یہ شکایت کی کہ مسلمان طلبہ کو میڈیکل کالج کے داخلے میں بہت سی مشکلات پیش آرہی ہیں - حکومت کا فرض ہے کہ اِن کا ازالہ کیا جائے - اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ایک اور وفد نے لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر بھی مسئلہ اٹھایا اور میڈیکل کالج میں مسلمان طلبہ کی ایک معین تعداد کے لیے نشستیں محفوظ کر دینے کا مطالبہ کیا - لفٹننٹ گورنر نے وفد کے دلائل سے اتفاق کر کے وعدہ کیا کہ بہت جلد اِس مطالبہ پر غور کر کے نشستوں کی ایک خاص تعداد

متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہی حال گورنمنٹ کالج کا تھا۔ وہاں بھی مسلمان طلبہ کی تعداد گویا آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ۱۹۱۴ء میں پنجاب کے مقتدر مسلمانوں نے جن میں کم از کم بیس مختلف انجمنوں کے نمائندے شامل تھے، حکومت سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں مسلمان طلبہ کو سہولتیں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسئلہ حکومت کے سامنے تھا۔ اور مسلمان تقریباً ہر سال اِس مطالبے کی تجدید کرتے تھے۔

باقی رہا سرکاری ملازمتوں کے تناسب کا سوال۔ اِس ضمن میں مسلمانوں کی پسماندگی کا خیال کرتے ہوئے ۱۹۱۰ء میں حکومتِ پنجاب نے فیصلہ کیا تھا کہ ماتحت ملازمتوں میں کم از کم تیس فیصد اسامیاں مسلمانوں کو ملنی چاہئیں۔ لیکن بدقسمتی سے اِس فیصلے پر کبھی عمل نہ ہو سکا۔ اور سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ مایوس کن حد تک قلیل رہی۔ میاں فضلِ حسین نے ملازمتوں میں چالیس فی صد مسلمانوں۔ چالیس فیصد ہندوؤں اور بیس فی صد سکھوں کا حصّہ مقرر کر دیا۔ لیکن اِس فیصلے پر عملدر آمد کرتے وقت یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ یہ تناسب صرف نئے آدمیوں کا تقرر کرتے وقت ملحوظ رکھا جائے گا۔ پرانی اسامیاں جہاں مسلمانوں کی تعداد بے حد مختصر تھی جُوں کی توُں قائم رہیں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں فضلِ حسین ایک زور دار وزیر ثابت ہوئے اُن میں یقیناً اتنی جرأت تھی کہ بوقتِ ضرورت آئی۔ سی۔ ایس کے انگریز افسروں کو بیک جنبشِ قلم اپنا فیصلہ منوانے پر مجبور کر سکتے تھے۔ اُن دنوں تمام محکموں کے سیکرٹری انگریز تھے۔ جو بالا بالا گورنر کے پاس جا کر وزیروں کے خلاف کان بھر

آتے تھے۔ میاں فضلِ حسین کو اس صورتِ حال کا علم تھا۔ لیکن اُنھوں نے ایک باوفا انسان کی طرح اِن باتوں سے چشم پوشی ہی نہیں بے اعتنائی برتی۔ تاہم جہاں اُن کی طے شدہ پالیسی یا جاری کردہ احکام کی تعمیل کا سوال آتا تھا وہ کسی قسم کی چوں وچرا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اِس سلسلہ میں بڑے بڑے فرعون صفت انگریزوں سے اُن کا واسطہ پڑا۔ لیکن انھوں نے ہر فرعون کی اکڑی ہوئی گردن کو جھک جانے پر مجبور کر دیا۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سدرلینڈ نے چالیس فیصد مسلمان طلبہ کو اپنے ہاں داخل کرنے میں تامّل کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ وہ اِس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ فضلِ حسین نے فوراً انھیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ گوجرانوالہ میں میاں فضلِ حسین نے ایک دربار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور قسمتِ لاہور کے کمشنر ایف۔ ڈبلیو۔ کینوے کو حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوں۔ کینوے نے یہ خفت گوارا نہ کی ایک ہندوستانی وزیر تو دربار کی مسند پر رونق افروز ہو۔ اور وہ خود ایک معمولی ماتحت کی طرح جلسے کا انتظام کرنے پر مامور کئے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ فضلِ حسین نے اِس گستاخی اور نافرمانی کی یہ سزا دی کہ کینوے سے فوراً استعفےٰ طلب کیا اور انھیں ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

یہ اُس دَور کی باتیں ہیں جب انگریز کا اقتدار ابرِ محیط کی طرح ہندوستان پر چھایا ہوا تھا۔ اور جدید اصلاحات نے ہندوستانی وزراء کو بہت ہی محدود و مختصر اختیارات عطا کئے تھے۔ اُس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ خود اِن وزیروں کو اپنے

محدود اختیارات استعمال کرنے کا نہ سلیقہ آتا تھا اور نہ حوصلہ تھا۔ اگر ۱۹۲۱ء میں فضل حسین کی جگہ کوئی دیہاتی مسلمان وزیر بن جاتا تو صوبے کی روایات یکسر بگڑ جاتیں۔ عزم و حوصلہ کی یہ بے باکی، اور قول و عمل کی یہ بے خوفی جس کا فضلِ حسین نے بار بار مظاہرہ کیا، کبھی ظہور میں نہ آتی، دلیرانہ کردار کی اِن خوبیوں کی بجائے تملّق و خوشامد اور آستاں بوسی و ناصیہ فرسائی کا سِکّہ چل نکلتا۔ اور خود صوبے کا وزیر معمولی باتوں کے لیے گورنر کی بارگاہ میں سربسجود ہونے سے دریغ نہ کرتا۔

اصلاحات کے نفاذ کے بعد پہلے چار سال تک پنجاب کونسل کا صدر گورنر کا نامزد کیا ہوا ایک آئی۔ سی۔ ایس انگریز افسر تھا۔ جب یہ چار سال کی میعاد ختم ہو گئی تو کونسل کو آئینی طور پر حق حاصل تھا کہ خود اپنا غیر سرکاری صدر منتخب کرے۔ لیکن گورنر نے سر توڑ کوشش کی کہ وہی انگریز افسر (ہربرٹ کیسن) جس کو پہلے نامزد کیا گیا تھا۔ اب منتخب کر لیا جائے۔ فضلِ حسین نے گورنر کی اِس کوشش کی کھُلے بندوں مخالفت کی اور کونسل کے تمام ممبروں کو اِس بات پر آمادہ کیا کہ خواہ کچھ ہو کسی پنجابی ہی کو منصبِ صدارت کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ کونسل کے اکثر ارکان گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر کیسن کو منتخب کر لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن جب فضلِ حسین نے میدان میں اُتر کر گورنر کے ارادوں کی مزاحمت کی۔ تو دیہاتی ممبروں کا حوصلہ بھی بلند ہو گیا۔ اور آخر انھوں نے سر عبدالقادر کو صدر منتخب کر لیا۔

یہ تمام امور اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں کہ میاں فضلِ حسین نے

اپنی اُس سیاسی تربیت سے پورا فائدہ اُٹھایا جو انھیں کانگریس اور مسلم لیگ ایسی جماعتوں میں کام کرنے سے حاصل ہو چکی تھی۔ فضلِ حسین کا یہ کمال تھا کہ ایک طرف انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور ارادے کی مضبوطی سے گورنر کو مرعوب کر لیا اور دوسری طرف کونسل کے دیہاتی ممبروں کو عملاً یقین دلا دیا کہ وہ جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں۔ گورنر اُن کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ پنجاب کے دیہاتی زمیندار جنھیں انگریز کی عظمت و جبروت کے سامنے کبھی دم مارنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ فضلِ حسین کے اِن کارناموں سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ کچھ میاں صاحب کے اثر و رسوخ سے مرعوب ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ ایک مسلمان نے پوری قوم کا نام روشن کر دیا ہے۔ تمام دیہاتی مسلمان ممبر دل و جان سے فضلِ حسین کے حامی بن گئے۔

جوں جوں ہندو اخبار اور ہندو لیڈر فضلِ حسین کے خلاف شور و غوغا کر رہے تھے وہ مسلمانوں میں روز بروز مقبول ہوتے جا رہے تھے۔ میاں صاحب کی پالیسی کی حمایت کے لیے لاہور سے مسلمانوں کا پہلا انگریزی روزنامہ مسلم آؤٹ لک نکلنا شروع ہوا۔ اسلامی انجمنوں نے قراردادیں منظور کر کے برملا اُن کی تائید کی۔ مسلمانوں کے متعدد وفود نے گورنر کے پاس جا جا کر اُن کی پالیسی کی اعانت کی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں فضلِ حسین کی تندرستی اور درازیِ عمر کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اپنی قوم میں فضلِ حسین کی مقبولیت و محبوبیت کا یہ عالم تھا

۱۳ مارچ ۱۹۲۳ء کو راجہ نرندر ناتھ نے پنجاب کونسل میں اُن کے خلاف عدمِ اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ یہ قرارداد پانچ شقوں پر مشتمل تھی:-

اول: پنچایت ایکٹ میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا۔

دوم:- سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی داخل کر دی گئی ہے۔

سوم:- میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں طلبہ کا داخلہ فرقہ وارانہ اصول پر مقرر کیا گیا ہے۔

چہارم بعض میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول رائج کر دیا گیا ہے۔

پنجم:- گوردوارہ ایکٹ منظور کر کے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تفریق پیدا کی گئی ہے۔

کے۔ ایل۔ گابا بیرسٹر ایٹ لا نے اپنے والد لالہ ہرکشن لال کی سوانح عمری میں اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"مجھے وہ دن خوب یاد ہے۔ جب پنجاب کونسل میں عدم اعتماد کی اس قرارداد پر بحث جاری تھی۔ تو ترازو کے دونوں پلڑے کس طرح متوازی کھڑے تھے۔ لوگوں میں اس سوال پر بڑی سرگرمی سے بے دے ہو رہی تھی کہ اگر میاں فضل حسین کو شکست ہو گئی تو کیا اُن کی صحت اس قابل ہے کہ وہ دوبارہ وکالت جیسا غیر یقینی اور صبر آزما پیشہ اختیار کر کے روزی کما سکیں گے۔ جب تمام دلائل بے کار ثابت ہوئے تو میاں صاحب نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا جو بعد میں بہت سی مشکلات کا شافی علاج ثابت ہوا۔ انھوں نے تبادلۂ خیالات کی غرض سے کونسل کے

دیہاتی ممبروں کو اپنے مکان پر مدعو کیا اور یہیں اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں پر آئس کریم نہایت اچھے اثرات پیدا کرتی ہے (یہ انکشاف اب ایک مجرب نسخہ سمجھ کر اختیار کر لیا گیا ہے) میاں صاحب نے اپنی تمام زندگی میں اس سے بہتر کام پر کبھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز جب قرار داد پر رائے شماری ہوئی تو اس کے نتائج نمایاں اور خوشگوار تھے۔"[1]

ہم کے۔ ایل۔ گابا کے اِن الفاظ کو سخن طرازی سمجھ کر محظوظ ہوں یا انھیں محض پیرایۂ بیان کی ایک ندرت تصور کر کے لطف اٹھائیں۔ امر واقع یہ ہے کہ عدمِ اعتماد کی یہ قرار داد میاں فضل حسین کی سیاسی زندگی میں ایک ایسے انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بعد اُن کے غور و فکر نے نئی راہیں اور اُن کی حکمتِ عملی نے نئے زاویے تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ اِس قرار داد کی آزمائش میں میاں فضلِ حسین کو یقیناً کامیابی ہوئی۔ اور اُن کے حریف ناکام و نامُراد رہے لیکن اس معرکے میں اُنھوں نے حالات کی تبدیلی کو جس انداز سے دیکھا تھا۔ اُس نے یہ نکتہ اُن کو سمجھا دیا تھا کہ اگر مسندِ وزارت کو محفوظ رکھنا منظور ہے تو اپنی پالیسی میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

راجہ نرندر ناتھ نے قرار داد پیش کرتے وقت بڑی طویل تقریر کی۔ جو مسلسل کئی گھنٹے جاری رہی۔ اُنھوں نے میاں فضلِ حسین کو فرقہ پرستی کا بانی۔

---

[1] "REBEL MINISTER" BY K. L. GAUBA

ہندو مسلم اتحاد کا دشمن اور ہندوؤں کا بدخواہ قرار دیا۔ آخر میں انھوں نے میاں صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"اورنگ زیب مت بنو۔ اکبر بننے کی کوشش کرو۔"

راجہ صاحب کی تقریر کے جواب میں مسلمان ممبروں میں سے میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ ملک فیروز خاں نون اور پیر اکبر علی نے تقریریں کیں۔ بہر صورت احمد یار خاں دولتانہ اور فیروز خاں نون کی تقریروں کے مختصر اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے آگے چل کر یونینسٹ پارٹی کی تعمیر و تشکیل میں بڑا نمایاں حصّہ لیا۔ ایک تو یونینسٹ پارٹی کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اور دوسرے مسلسل نو سال تک یونینسٹ پارٹی کے نمائندہ وزیر رہے۔

احمد یار خاں دولتانہ نے اپنی پُرجوش تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا:۔

"...... راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ وزیرِ تعلیمات اورنگ زیب کی پالیسی اختیار کر رہے ہیں۔ میں راجہ صاحب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جب کہ بہت سے سیواجی ہمارے مدِ مقابل بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں اکبر پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں اورنگ زیب ہی پیدا کرنے چاہئیں مجھے یہ کہنے میں مسرت اور فخر ہے کہ خواہ کتنے ہی سیواجی ہمارے سامنے آ جائیں۔ میاں فضلِ حسین تنہا اُن کا مقابلہ کرنے کو کافی ہیں۔ میں انتہائی رنج و اندوہ سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہندوؤں کا تعصّب اورنگ دلی اب ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی

ہے۔ جس سے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ کیا اِس ایوان کے مسلمان ممبر اور کیا اِس صوبے کے مسلمان باشندے سبھی ہندوؤں کے تعصب سے نالاں ہیں۔ راجہ صاحب نے یہ لغو قرارداد پیش کر کے ہندو مسلم اتحاد کے اُس ناتوان و کمزور قلعہ کو، جو مسلمانوں کے خون اور ہندوؤں کی محنت سے تعمیر ہوا تھا، پاش پاش کر دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ یہ قلعہ گر گیا ہے۔ اور اچھا ہوا کہ ہندوؤں کے ہاتھ سے گرا ہے۔"

ملک فیروز خان نون نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا:۔

"...... اگر ہماری قوم کے ساتھ پہلے سے کسی نے انصاف کیا ہوتا تو میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نشستیں دینے کے لیے موجودہ سرکلر جاری کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ چونکہ ہمارے ساتھ منصفانہ سلوک کبھی نہیں ہوا اس لیے اِس قسم کے سرکلر کا اجرا لازمی اور ضروری تھا۔ جناب والا! میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان کیونکر ظلم اور بے انصافی کا شکار ہو رہے ہیں۔ حالیہ سرکلر کی رو سے میڈیکل کالج میں چالیس فیصد طلبہ لازماً داخل کیے جانے چاہئیں۔ لیکن ہوا کیا ہے؟ امسال ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں ممتحنوں کی اکثریت ہی وسیع القلب اور فراخ دل قوم کے فرزندوں پر مشتمل تھی جس کے ایک نونہال ہمارے راجہ نریندر ناتھ صاحب ہیں۔ چنانچہ مسلمان

طلبہ کو اِس کثرت سے فیل کیا گیا ہے کہ اُن غریبوں کی چالیس فی صد تعداد میڈیکل کالج تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ کیا یہی انصاف ہے جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے؟ یونیورسٹی کے نظم و نسق کے بارے میں اور بھی بہت سے افسوسناک واقعات میں بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن اس خیال سے صرفِ نظر کرتا ہوں کہ اس داستان سرائی سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موجودہ خلیج کے وسیع ہونے کا احتمال ضرور ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہندو مسلم نزاع جلد از جلد ختم ہو۔ اور دونوں قومیں متحد ہو کر ملک کی ترقی میں حصہ لیں لیکن بدقسمتی سے فریقِ مقابل کی طرف سے ایسی قرارداد پیش کی گئی ہے جس سے یہ نزاع کم ہونے کی بجائے اور بڑھے گی۔ آنریبل وزیرِ تعلیمات نے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کی آگ نہیں بھڑکائی۔ البتہ راجہ صاحب کی یہ قرارداد اِس سلگتی ہوئی آگ کو شعلوں میں تبدیل کر کے رہے گی۔"

میاں فضل حسین کی تقریر خاصی طویل تھی۔ اُس میں دلائل و براہین بھی تھے۔ اعداد و شمار بھی تھے۔ اور پارلیمنٹری آداب و قواعد کی پوری پابندی ملحوظ رکھی گئی تھی۔ راجہ نرندرناتھ نے اپنی تقریر میں سرکاری ملازموں کے عزل و نصب اور تغیر و تبدل کے بعض واقعات بھی پیش کئے تھے۔ جن سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وزیرِ تعلیمات نے ہندو افسروں کو محض اِس لیے برطرف کیا

کہ وہ ہندو تھے۔ اور مسلمان افسروں کو صرف اس لیے اچھی جگہوں پر تعینات کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ اگر یہ واقعات صحیح ثابت ہو جاتے تو وزیر موصوف کے لیے عافیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن فضل حسین نے ان اتہامات کو پرکاہ کی طرح اڑا کر رکھ دیا۔ انھوں نے عائد کردہ الزامات میں سے ایک ایک کو لیا۔ پھر اُن کا تار و پود یوں بکھیرا جیسے ایک چابکدست دھنیا روئی کے ڈھیر کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو ایوان کی فضا بالکل صاف ہو چکی تھی۔ اور شک و شبہ کے بادلوں کا نشان بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

اس تقریر کے ایک حصے کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

"جنابِ والا! میں پوچھتا ہوں کہ اس قرار داد کے محرک کس چیز کو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں؟ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں راجہ صاحب کو جس چیز پر اعتراض ہے وہ وزیر تعلیمات کی فرقہ وارانہ پالیسی ہے۔ وہ اس بات کو بھی قابلِ مذمت سمجھتے ہیں کہ وزیر تعلیمات نے مختلف امور میں فرقہ وارانہ نیابت مقرر کر دی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ پالیسی کے مفہوم کی وضاحت نہیں فرمائی۔ نہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ قابلِ اعتراض پالیسی کن اجزا و عناصر کا مرکب ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ پالیسی یا فرقہ وارانہ نیابت ایک ایسا لفظ ہے۔ جس کا کوئی صاف، واضح، غیر مشتبہ اور دو ٹوک مفہوم اب تک متعین نہیں کیا جا سکا۔ اگر اس لفظ سے بڑے معنی لیے

جاہیں تو فرقہ داری کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی پالیسی جو مذہبی تعصب اور مذہبی جنون کی بنا پر قائم ہو۔ اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے ہم مذہب افراد کو ترقی دی جائے۔ اور انہی پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہے۔ اگر قرارداد کے محرک کے ذہن میں فرقہ داری کا یہ مفہوم ہے۔ اور ان کا مدعا یہ ہے کہ میں نے حکومت کے نظم و نسق کے کسی شعبہ میں اس قسم کی پالیسی پر عمل کیا ہے یا عمل کرنے کی کوشش کی ہے تو میں اس کو سراسر غلط، بے بنیاد اور بالکل بے ہودہ بہتان قرار دے کر قطعاً قابلِ پذیرائی یا درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس اگر فرقہ وارانہ نیابت یا فرقہ وارانہ پالیسی سے یہ مطلب لیا جائے کہ کسی شخص کی قابلیت کا جائزہ لیتے وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی تعلیمی کیفیت کس درجہ کی ہے۔ اس کا تجربہ کس پائے کا ہے۔ اس کا خاندان کس حیثیت کا ہے۔ اس نے حکومت وقت کی کہاں تک خدمت کی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان امور کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا روا ہے کہ آخر وہ شخص کس مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہے۔

" اگر فرقہ وارانہ پالیسی اور فرقہ وارانہ نیابت کی یہی تعریف ہے جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھ کو اس چیز کا بانی یا موجد قرار دینے کی راجہ صاحب کے پاس کیا وجوہ

ہیں؟ قطع نظر اس سے کہ میں ذاتی طور پر فرقہ وارانہ پالیسی کو اچھا سمجھتا ہوں یا بُرا۔ قطع نظر اس سے کہ میں نے اِس پالیسی پر عمل کیا ہے یا اس پر عمل کرنے سے گریز کیا ہے۔ ایک بات میں پورے وثوق اور کامل ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ہرگز اس پالیسی کا موجد یا بانی نہیں ہوں حقیقت یہ ہے کہ میرے وزیر بننے سے بہت پہلے سے یہ پالیسی ہندوستان کے دیگر حصّوں ہی میں نہیں۔ پنجاب میں بھی رائج تھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ میں فرقہ وارانہ پالیسی کا بانی ہوں۔ یا میں نے اِس پالیسی پر عمل کر کے ہندو مسلم نفاق پیدا کیا ہے۔ میری ذات پر ایک قبیح اتہام ہے جس کے جواز کی کوئی وجہ میرے مخالفین کے پاس نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ دعوےٰ کرنے کا اہل ہو سکتا ہے کہ اُس کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق قائم ہوا تو لاریب وہ شخص میں ہوں۔

" قرار داد کے محرک کو سب سے بڑا رنج یہ ہے کہ پنجاب کے وزیر تعلیمات نے صرف اپنے صوبے ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ اِس اعتراض کا جواب دینے کے لیے میں چند ضروری امور کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا امر یہ ہے کہ اِس ہندو مسلم کشیدگی کی وجہ کیا ہے؟ ہم میں سے ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ

۱۹۱۶ء سے پہلے یہ کشیدگی ہمارے ہاں موجود تھی۔ پھر مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کشیدگی کے اسباب کیا تھے؟ اگر کوئی غیر جانب دار شخص ہمارے ملک کی تاریخ کے اس افسوسناک باب کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت فوراً منکشف ہو جائے گی کہ اس کشیدگی کا اولین سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی روزمرہ معاشرت میں اس مذہبی نفرت و عداوت کو دخیل کر رکھا ہے جو آج ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور کے اکثر سیاسی کارکن اس نفرت و عداوت کا قلع قمع کرتے رہے ہیں۔ لیکن نفرت و عداوت کا یہ جذبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف کی عمارت کا بنیادی پتھر بن گیا ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ اس عمارت کو منزل بہ منزل اور اونچا کرتے جائیں گے یا اسے منہدم کر کے پیوندِ زمین کر دینا چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں فریقِ مخالف کے پاس ہے۔

"نفرت و عداوت کا یہ جذبہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کئی صورتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ایک صورت چھوت چھات بھی ہے۔ ہندو صرف مسلمانوں ہی سے چھوت چھات نہیں کرتے بلکہ خود ہندو دھرم کے اندر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس خیال کرتا ہے۔ مثلاً برہمن غیر برہمنوں سے چھو جانا گناہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے

طور پر صوبۂ مدراس کو لیجیے - وہاں جس باہمی نفاق نے آگ لگا رکھی ہے کیا اُس کا ذمہ دار بھی میں ہوں ؟

"حکومتِ مدراس کے وزراء نے ایک قانون بنا دیا ہے جس کی رُو سے کوئی برہمن غیر برہمنوں پر تشدد نہیں کر سکتا - اِس قانون کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ موجودہ وزارت کے عہد میں کسی برہمن کو سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی - نہ صرف یہ بلکہ کسی سرکاری ملازم کو جو برہمن ہے اُس وقت تک ترقی نہیں مل سکے گی جب تک کہ حکومت کے تمام محکموں میں غیر برہمنوں کو اُن کا جائز حصّہ عطا نہیں ہو جاتا -

"میں پوچھتا ہوں کہ کیا اِس تمام تفرقے کا ذمہ دار بھی میں ہوں ؟ یقین فرمایئے کہ اِس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں بلکہ وہ قوم ذمہ دار ہے جس کی نمائندگی مہاجہ نرندر ناتھ صاحب کر رہے ہیں -

" رہا فرقہ وارانہ نیابت کا مسئلہ - قطع نظر اس سے کہ میں اِس قسم کی نیابت کو اچھا سمجھتا ہوں یا بُرا - سوال صرف یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ فرقہ وارانہ نیابت کی ضرورت ہے یا نہیں ؟ جنابِ والا ! میری ذاتی رائے ہے کہ ایشیا ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے تمام حصّوں میں مذہب انسانی زندگی کا ایک ایسا زبردست عنصر ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی - کسی شخص کے لیے یہ بڑ ہانک دینا آسان ہے کہ وہ مذہب کی پروا نہیں کرتا - لیکن اس قولی

برعکس کرنا بے حد مشکل ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ بڑی شدّومد سے اپنے آپ کو مذہبی تعصّبات سے بے نیاز ظاہر کرتے ہیں۔ وہی سب سے زیادہ تنگ نظر بھی نکلتے ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں وہ نسبتاً زیادہ فراخ دل اور وسیع النظر ہوتے ہیں۔ میں نے ۱۹۱۶ء میں انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی اِنہی عقائد کا پابند ہوں۔

"لیکن اگر کوئی شخص میرے خلاف یہ الزام عائد کرتا ہے کہ میں نے (ا) کو محض اِس لیے نقصان پہنچایا۔ کہ وہ ہندو تھا اور ب کو خالصتہً اس لیے اُونچا درجہ دیا کہ وہ مسلمان تھا۔ یا اگر راجہ صاحب میرے خلاف فردِ قرادِ جرم مرتّب کرتے وقت یہ فرمائیں کہ میں نے نااہل مسلمانوں کو ملازمت دے کر حکومت کے نظم ونسق کا معیار پست کر دیا ہے۔ تو یقین کیجئے کہ میں اِس قسم کے الزام کو بے بنیاد ہی نہیں سمجھتا بلکہ اِس کو اِس منصبِ وزارت سے جس پر میں آج فائز ہوں، غدّاری کے مترادف قرار دیتا ہوں۔

"جنابِ والا! مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر کسی خاص مذہب و ملّت کے افراد کو ملازمت میں جگہ دینے سے نظم ونسق کے معیار کے پست ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے آدمیوں کو ہرگز جگہ نہ دیجئے۔ بلکہ میں تو ایک قدم آگے بڑھ کر یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر انگریزوں کی بجائے ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر

فائز کرنے سے حکومت کے نظم و نسق کو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے تو یہ عہدے ہرگز ہندوستانیوں کو نہیں ملنے چاہئیں۔

"آئیے اب اس بات پر بھی کچھ عرض کر دوں کہ گورنمنٹ کالج کے داخلے میں فرقہ وارانہ تناسب کو کیوں رائج کیا گیا ہے۔ راجہ صاحب اِس بات پر سخت ناراض ہیں کہ میں نے گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کے لیے چالیس فی صد نشستیں مخصوص کر دی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو میرا یہ فیصلہ قابلِ اعتراض نظر آتا ہے تو آپ کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں کے لیے خاص تعداد میں نشستیں محفوظ کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں؟ اگر گورنمنٹ کالج میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کا تحفظ آپ کے نزدیک فرقہ داری ہے تو کیا کیمبرج اور آکسفرڈ میں ہندوستانیوں کے لیے نشستوں کا تحفظ مکروہ قسم کی نسلی و قومی عصبیت اور فرقہ پرستی نہیں؟ میں مزید یہ پوچھتا ہوں کہ جب کوئی طالب علم گورنمنٹ کالج میں داخل ہونے کے لیے جاتا ہے تو آپ کیوں اِس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ سفارش کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا؟ کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ سفارش بجائے خود ایک ذلیل اور قابلِ اعتراض چیز ہے؟

"گورنمنٹ کالج: ... داخلہ کے وقت طالب علم کے نمبروں کے علاوہ چار چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ آیا امیدوار کا

کوئی رشتہ دار کالج میں اس وقت پڑھتا ہے یا پہلے پڑھتا رہا ہے
دوم یہ کہ آیا اُمیدوار کا باپ اِس وقت سرکاری ملازمت میں ہے
یا پنشن لے چکا ہے۔ سوم یہ کہ آیا اُمیدوار نے سرکار والاتبار کی
کوئی خدمت کی ہے یا نہیں۔ چہارم یہ کہ آیا اُمیدوار کسی بڑے آدمی
کی سفارش لایا ہے یا نہیں۔

" غور فرمایئے۔ جس درس گاہ میں طلبہ کے داخلے پر اس قسم کی
پابندیاں ہوں۔ وہاں مسلمانوں کی خاک شنوائی ہوگی۔ اوّل تو
سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر
ہے۔ دوسرے مسلمان یوں بھی تعلیم میں بہت پس ماندہ ہیں۔
تیسرے، عام مسلمان بے حد غریب ہیں۔ اُنھیں بڑے آدمیوں
تک رسائی ہی ممکن نہیں۔ وہ سفارشیں کیوں کر مہیا کر سکتے ہیں
ان حالات میں جبکہ اُمیدوار کا باپ سرکاری ملازم بھی نہیں، جبکہ
قوم کی عام پسماندگی کے باعث اُمیدوار کا کوئی قریبی رشتہ دار
گورنمنٹ کالج میں تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکا۔ جبکہ نکبت و افلاس
کی وجہ سے اُمیدوار کی بڑے آدمیوں تک رسائی بھی نہیں تو پھر
خدارا بتایئے کہ کیا گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبہ کے داخل ہونے کا
کوئی امکان ہے؟

" میں نے اِس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا
ہوں کہ مسلمانوں کی شکایات بالکل بجا ہیں۔ اور مسلمان طلبہ کو

صوبے کی بہترین درس گاہ سے محروم رکھنا کسی صورت اور کسی حال میں جائز نہیں - چاروں طرف شور مچ رہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کے داخلہ میں فرقہ پرستی کے اصول کو رائج کر دیا گیا ہے - لیکن ذرا غور فرمائیے کہ اِس فرقہ پرستی سے کون سا آسمان گر پڑا ہے پچھلے سال جو مسلمان طلبہ داخل ہوئے تھے اُن میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو ۳۰۰ تھے - اور جو ہندو اُمیدوار داخل ہوئے تھے - اُن میں آخری طالب علم کے نمبر تین سو تین ۳۰۳ تھے - لے دے کے صرف تین نمبروں کا فرق ہے جس کے لیے یہ نالہ و بُکا اور نوحہ و شیون برپا ہے "

جب عدم اعتماد کی اِس قرار داد پر رائے شماری ہوئی تو تمام مسلمان ممبروں نے فضلِ حسین کے حق میں اور تمام ہندوؤں اور سکھوں نے فضلِ حسین کے خلاف ووٹ دیئے - ہندوؤں میں رہتک کے جاٹ اور کانگڑے کے راجپوت دیہاتی اور شہری - زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ سبھی شامل تھے - یوں کہنا چاہیئے کہ ایوان کی یہ تقسیم خالص فرقہ وارانہ تقسیم تھی مسلمان فضلِ حسین کے ساتھ اور ہندو اُن کے مخالف تھے - قرار داد کی ناکامی نے فضلِ حسین کو مسلمان عوام میں پہلے سے بھی زیادہ مقبول بنا دیا - لیکن اس کے باوجود میاں صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگرچہ اس وقت مسلمانوں اور سرکاری ممبروں کے تعاون سے انھوں نے یہ معرکہ تو جیت لیا ہے - تاہم اگر کل کو مسلمان ممبروں میں پھوٹ پڑ گئی - یا دو ترے سے اختلاف کی بنا پر سرکاری ارکان نے

اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ تو پھر کیا ہو گا؟

صوبے بھر میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ ٹھنڈی ہونے میں نہ آتی تھی۔ خلافت اور ترکِ موالات کے ابتدائی دور کا اتحاد خواب و خیال ہو چکا تھا۔ پنجاب کے ہندوؤں کے مسلسل اور متواتر پراپگنڈے سے ہندوستان بھر میں یہ بات عام پھیل گئی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کو جس شخص نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور یوں بالواسطہ ترکِ موالات کی تحریک کو ختم کرایا ہے وہ فضل حسین ہے"۔ انڈین اینول رجسٹر" سال ۱۹۲۳ء۔ جلد ۲ میں پنجاب کی سیاسی حالت کی تصویر اِن لفظوں میں کھینچی گئی ہے:-

"...... جیسا کہ پہلے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اب کے بھی فرقہ وارانہ کشمکش کی چنگاری پنجاب سے پھوٹی۔ ہندو مسلم نفاق کی سب سے زیادہ ذمہ داری جس شخص کے سر تھوپی جا رہی ہے وہ پنجاب کے وزیرِ تعلیم میاں فضلِ حسین ہیں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصد ہے۔ لیکن اکثریت کے باوجود تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ اور چونکہ اس باب میں ہندوؤں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے چاہتے ہیں کہ اُنھیں بعض ضروری تحفظات عطا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ یوں بھی وہ سیاسیات اور مذہب میں بہت پُر جوش واقع ہوئے ہیں اُن کا طبعی رجحان ہندوستانی قومیت کی طرف کم اور عالمگیر اخوتِ اسلامی کی طرف زیادہ ہے

ہندوؤں کی آبادی چونتیس ۳۴ فی صد ہے - جو بیشتر شہری اور قصباتی ہے - تعلیم، دولت، تجارت اور صنعت و حرفت میں ہندو مسلمانوں سے آگے ہیں - لیکن مسلمانوں کی مذہبی عصبیت سے بہت ڈرتے ہیں سکھ جو صوبے کی مجموعی آبادی کا گیارہ فی صد عنصر ہیں - ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے - لیکن گذشتہ دس بارہ سال سے اُن میں ایک زبردست انقلاب آگیا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنے لگے ہیں - اِس کے علاوہ اُن میں اپنی سیاسی اور عسکری اہمیت کا شعور بھی پیدا ہوگیا ہے - ان تینوں قوموں کی روایات اور مفاد ایک دوسرے سے اِس قدر مختلف ہیں کہ پنجاب مستقل طور پر فرقہ پرستی کا اڈہ بن کر رہ گیا ہے - اور یہاں کے باشندوں کا عام رجحان قوم پرستی کی طرف کم اور فرقہ داری کی طرف بڑھتا جا رہا ہے -

" پنجاب کے وزیرِ تعلیم میاں فضلِ حسین تحریکِ ترکِ موالات سے قبل کانگرس اور مسلم لیگ میں شامل تھے - مارشل لا کے ایام میں یہ بھی حکومت کے تشدّد کا نشانہ بنے تھے - منصبِ وزارت پر فائز ہو کر اُنھیں لامحالہ ترکِ موالات کی تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا - لیکن ساتھ ہی ایک سابق کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈر رہونے کی وجہ سے اُن پر اُس میثاقِ لکھنؤ کی پابندی بھی عائد ہوتی تھی جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور لیگ کے درمیان طے ہوا تھا - جہاں تک پنجاب کی صوبائی

مجلس قانون ساز کی پیلیٹن ترکیبی کا تعلق ہے۔ میثاقِ لکھنؤ کی جملہ شرائط کو کم و بیش جدید اصلاحات میں شامل کر لیا گیا تھا یعنی پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور دیگر سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو پچاس فیصد نمائندگی عطا ہو گی۔ میاں فضلِ حسین نے اپنی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اِن شرائط کی لفظ بہ لفظ پابندی کی۔ اور جب اُن کے حریفوں نے اُن کے خلاف فرقہ پرستی کا طوفان اٹھایا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے میثاقِ لکھنؤ پر عمل کر رہے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

"میاں فضلِ حسین کی اِس پالیسی کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب میں ترکِ موالات کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا مسلمان خواہ وہ ترکِ موالات کے حامی تھے یا مخالف، یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک پرندہ جو ہاتھ میں آ گیا ہے۔ یقیناً اُن دو پرندوں سے بہتر ہے جو ابھی جھاڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ مہاتما گاندھی جس مکمل سوراج کا خواب دکھا رہے ہیں خدا جانے وہ کب آئے گا۔ اور آیا بھی تو نہیں معلوم اُس کی شکل و صورت کیا ہو گی لہٰذا ہم اِس اُدھورے سوراج ہی سے کیوں نہ فائدہ اٹھائیں جو میاں فضلِ حسین کی کوششوں سے ہمیں مل رہا ہے۔ یہ سب کچھ محسوس کر کے مسلمان، من حیث القوم، فضلِ حسین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے"

اپریل ۱۹۲۳ء میں کانگریس نے سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسز سروجنی نائیڈو کو پنجاب بھیجا تاکہ ہندو مسلم قضیئے کا حل تلاش کیا جائے۔ یہ وفد تین چار ہفتے پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتا رہا۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی وفد کی تجویزوں کو کان دھر کر سننے پر تیار نہ تھا۔ آخر سی۔ آر۔ داس نے جو وفد کے لیڈر تھے، نہایت غصہ کے عالم میں ایک بیان دیا کہ "پنجاب اپنے جھگڑوں میں بے شک الجھا رہے۔ سوراج ان جھگڑوں کا انتظار نہیں کر سکتا ہم اہلِ پنجاب کے باہمی فسادات کا حل تلاش کرنے کو محض تضیعِ اوقات سمجھتے ہیں۔ پنجاب یونہی اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلتا رہے گا۔ ہمیں اس کی چنداں پروا نہیں۔ ہم کو سوراج پارٹی کا پروگرام اپنی تکمیل کے لیے بلا رہا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔"

بعض لوگوں نے یہ سوچ کر کہ ہندو مسلم فسادات کی جڑ چونکہ جداگانہ انتخاب ہے اس لیے اگر اس قسم کا انتظام کر لیا جائے کہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز میں ہندو مسلمان اور سکھ نشستوں کی جو موجودہ تعداد ہے۔ وہ تو محفوظ رہے لیکن انتخاب مخلوط ہو جائے۔ تو فرقہ وارانہ کشمکش کے کم ہو جانے کا بہت امکان ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی کوشش سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پنجاب کونسل میں مخلوط انتخاب کی قرار داد پیش کی گئی۔ میاں فضلِ حسین اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے قرار داد کے خلاف ایک طویل تقریر کی۔ جس کے ایک حصہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

"آج کل ہماری سیاسی حالت کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ ہر شخص صرف اپنی قوم کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتا اور ملک کی دوسری قوموں کے مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر ایک فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جداگانہ انتخاب سے اُسے کچھ فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ تو بے دریغ جداگانہ انتخاب کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ اور اگر یہی طبقہ کل کو یہ محسوس کرتا ہے کہ مخلوط انتخاب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے گا تو فوراً مخلوط انتخاب کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام ہتھکنڈے صرف اپنے اور اپنی قوم کے منافع کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ قوم پرستی کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ محض اپنے اپنے فرقے کا خیال کرنے کے بجائے سب لوگ مجموعی طور پر سارے ملک کی بہتری کا خیال کریں تاکہ اقلیت کو اپنی تقدیر اکثریت کے ہاتھ میں دے دینے سے تامل نہ ہو۔ اگر ماضی میں اس قسم کے باہمی اعتماد کی خوشگوار فضا موجود ہوتی۔ تو جداگانہ انتخاب کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔

"میں اِس ایوان کی توجہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف منعطف کراتا ہوں۔ جہاں انتخاب مخلوط ہے اور انتخابی حلقے بھی مخلوط ہیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ جس حلقہ میں مسلمان ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہاں سے مسلمان اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں سے ہندو ممبر منتخب ہوتا ہے۔ یہی حال اُن میونسپل کمیٹیوں کا ہے جہاں مخلوط انتخاب رائج ہے۔ مسلمان ووٹر مسلمان کو اور ہندو ووٹر اپنے

ہم قوم ہی کو ووٹ دیتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ انتخابی حلقے مخلوط ہونے کے باوجود انتخابات کی جنگیں جداگانہ نیابت کے اصولوں پر لڑی جارہی ہیں۔

"ملک بھر میں فرقہ پرستی کی وبا پھیل رہی ہے۔ اور اس وبا کے جراثیم ہر بستی اور ہر قریے میں سرایت کر گئے ہیں۔ انتخاب مخلوط رکھیے تو کیا اور جداگانہ رہے تو کیا۔ جب تک یہ جراثیم موجود ہیں محض انتخابی طور طریقوں کے اول بدل سے مرض کا ازالہ نہیں ہوگا ..... یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جداگانہ انتخاب نے ہندو مسلم کشیدگی پیدا کی ہے۔ ۱۹۲۲ء تک امرتسر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسا زبردست اتحاد تھا کہ سارا ہندوستان اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد اس اتفاق و اتحاد کی جگہ نفرت و عداوت نے لے لی ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ جداگانہ انتخاب تو وہاں گذشتہ پینتیس ۳۵ سال سے رائج تھا لیکن اس کے باوجود ہندو مسلم اتفاق کی لہریں برابر زور شور سے چلتی رہیں۔ اب پچھلے دو سال سے اس اتفاق کا شائبہ تک امرتسر میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ مرض کی جڑ جداگانہ انتخاب میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ چھپی ہوئی ہے۔

"جب تک لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہماری مذہبی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں انقلاب نہیں آسکتا یہ دعوے سراسر

غلط ہے کہ مخلوط انتخاب رائج کر دینے سے لوگ صرف موزوں اور قابل اُمیدواروں کو ووٹ دیں گے ۔ اور اس بات کا خیال نہیں کریں گے کہ آیا امیدوار اُن کا ہم قوم و ہم مذہب ہے یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہر طبقہ میں فرقہ پرستی کی بیماری پھیل گئی ہے اور ہر شخص ہر واقعہ کو صرف اِس نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اُس کو اور اُس کے فرقے کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔

"اِس بحث کے دوران میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جداگانہ انتخاب کی ترویج سے پہلے فرقہ وارانہ جھگڑے ہمارے ہاں موجود نہیں تھے یہ بات صریحاً غلط ہے ۔ جداگانہ انتخاب جاری کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی فرقہ وارانہ نزاع تھی ۔ جیسی آج ہے اب اس فرقہ پرستی کے اظہار اور اُس سے متمتع ہونے کے بہت سے ایسے مواقع نکل آئے ہیں جو ماضی میں نہیں تھے ۔ ملازمتوں کی کثرت حکومتِ خود اختیاری کے ادارے ۔ کونسل کی ممبری۔ یہ تمام چیزیں اس شکل میں پہلے موجود نہیں تھیں ۔

" یہ صحیح ہے کہ ہمارا انتہائے نظر یہی ہونا چاہیئے کہ ملک میں مخلوط انتخاب رائج کیا جائے ۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو تاکہ وہ اپنے اپنے فرقے اور اپنے اپنے طبقے کی بہتری کے خیال سے بلند ہو کر ملک کے تمام طبقوں کی فلاح و بہبود کو اپنا

نصب العین بنائیں۔ جس وقت یہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ تو ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر خود بخود اعتماد کرنے لگ جائے گا۔ اور پھر جداگانہ انتخاب کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی ۔"

۱۹۲۳ء کے نومبر میں پنجاب کی پہلی مجلسِ قانون ساز کی سہ سالہ زندگی ختم ہو گئی۔ اور نئے انتخابات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لالہ ہرکشن لال نے اعلان کر دیا کہ وہ دوبارہ انتخابات میں کھڑے نہیں ہوں گے۔ ہندو ہرکشن لال کو طعنہ دیتے تھے کہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود محض پانچ ہزار روپے مشاہرے کی خاطر سے فضلِ حسین کی "ہندو کُش" پالیسی میں شریک ہے۔ کونسل کے ختم ہوتے ہی لالہ ہرکشن لال نے ایک پبلک جلسے میں اپنی صفائی پیش کی۔ انھوں نے میاں فضلِ حسین کی پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے اُس دو عملی حکومت کو بھی بُرا بھلا کہا جو جدید اصلاحات کا نتیجہ تھی۔ اس طرح پنجاب کی اُس پہلی وزارت کا خاتمہ ہوا۔ جس میں دونوں وزیر شہری تھے اور کانگرسی بھی تھے۔ ہرکشن لال تو پنجاب کی سیاسیات سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن فضلِ حسین نے اس تجربے سے یہ سبق حاصل کیا کہ آئندہ کسی کانگرسی اور کسی شہری ہندو کو اپنا رفیقِ کار نہیں بنائیں گے۔

پانچواں باب

یونینسٹ پارٹی کا قیام

جنوری ۱۹۲۴ء میں پنجاب کی دوسری لیجسلیٹو کونسل مرتب ہوئی۔ اِس مرتبہ ایوان میں ممبروں کی تقسیم کسی حد تک جماعت بندی یعنی پارٹی کے اصول پر تھی۔ کانگرس اور خلافت کمیٹی نے چونکہ کونسلوں کے مقاطعہ کی شرط اُٹھا دی تھی۔ اِس لیے پنڈت موتی لال نہرو۔ اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی قیادت میں کانگرس کا ایک طاقتور عنصر سوراجیوں کے نقب سے مرکزی اسمبلی کے علاوہ صوبائی کونسلوں میں بھی داخل ہو گیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کونسل میں نَو سوراجی اور تین خلافتی ارکان آ گئے تھے۔ سوراجی سب کے سب ہندو تھے۔ جن کے لیڈر ڈاکٹر گوکل چند نارنگ تھے۔ خلافتی ارکان میں چودھری افضل حق۔ رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر شامل تھے۔ اس کے علاوہ پانچ ممبر، جن کے لیڈر راجہ نرندر ناتھ تھے، اپنے آپ کو ہندو سبھا پارٹی کہتے تھے۔ چھ زراعت پیشہ ہندوؤں کا ایک الگ گروہ تھا جس کے لیڈر چودھری لال چند تھے۔ مسلمانوں میں تین خلافتی ممبروں کے علاوہ چوبیس زراعت پیشہ ارکان کا علیحدہ جتھہ تھا۔ سات ممبر اپنے آپ کو مسلم لیگی

کہتے تھے۔ حالانکہ الیکشن میں مسلم لیگ نے بہ حیثیت سیاسی جماعت کے قطعاً کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ سکھوں میں گیارہ ممبر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے نمائندے تھے۔ سارے ایوان میں چھ ممبر ایسے بھی تھے۔ جو اپنے آپ کو کسی جماعت سے منسوب نہیں کرتے تھے۔

وزارت سازی کا وقت آیا تو گورنر، سر ایڈورڈ میکلگن نے حسبِ سابق مسلمانوں میں سے میاں فضلِ حسین کو منتخب کیا۔ میاں فضلِ حسین کا اثر گورنر پر اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ اُنھوں نے وزارت قبول کرنے سے پہلے یہ شرط پیش کی کہ اُنھیں اپنا ہندو رفیق نامزد کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ اور گورنر اس میں مداخلت نہ کرے۔ سر ایڈورڈ میکلگن نے یہ شرط منظور کر لی۔ میاں فضلِ حسین نے رُہتک کے ایک جاٹ چودھری لال چند کو اپنا ساتھی منتخب کیا۔ یہ وہی لال چند تھے جو جدید اصلاحات سے پہلے بھی پنجاب کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ اور شہری اور دیہاتی تفریق کے اِس قدر معاون تھے کہ اُنھی کی کوشش سے شہری اور دیہاتی آبادی کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے مقرر ہوئے تھے۔ اور اُنھی کی کوشش سے شہری اور دیہاتی آبادی کے تناسب سے نئی کونسل میں نشستوں کی تعداد بھی مقرر کی گئی تھی۔ اِسی سلسلے میں چودھری لال چند نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب دیہاتی آبادی کے تناسب سے کونسل کی نشستیں مخصوص ہو جائیں گی تو دیہات کے انتخابی حلقے سے صرف وہی امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔ جو قانونِ انتقالِ اراضی کی رُو سے زراعت پیشہ اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ میاں فضلِ حسین چونکہ اُن دنوں اِس تفریق و تقسیم کے حامی نہیں تھے۔ اُنھوں نے لال چند کی ان

تجویزوں اور کوششوں کی سخت مخالفت کی تھی - یہ لالہ چند ہی تھے جنھوں نے تین سال قبل اپنے اخبار جاٹ گزٹ میں یہ اعتراض کیا تھا کہ میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال کی وزارت "شہری وزارت" ہے - جو پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں کے لیے باعث توہین ہے -

سوال یہ ہے کہ میاں فضل حسین کو کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا کہ ایک ایسے شخص کو اپنا رفیق کار بنائیں - جو سیاسیات میں کبھی اُن کا ہم نوا نہیں تھا اور جس کے رجعت پسندانہ اور تفرقہ پردازانہ عقائد سے اُنھیں ہمیشہ اختلاف رہا تھا؟ اسی کا جواب تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں - گزشتہ تین سال کے تجربے نے فضل حسین کو یہ سبق سکھا دیا تھا - کہ شہری اور کانگرسی ہندوؤں سے اب انھیں کسی قسم کے اشتراک و تعاون یا کسی نوع کی ہمدردی کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہیے - اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی - میاں فضل حسین چونکہ بڑے زیرک اور ہوشیار آدمی تھے - اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ سوراج پارٹی کے کونسلوں میں داخل ہونے کے بعد ہوا کا رخ بدلنا شروع ہو گیا تھا - مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کی پارٹی اور سوراجیوں میں کامل اتحاد پیدا ہو گیا تھا - جس کی وجہ سے حکومت کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں - بنگال میں سی - آر - داس کی کوہ پیکر شخصیت نے مسلمانوں کے تمام خدشوں کو دور کر کے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا - اور اس طرح صوبے میں حکومت کا نظام اور وزارت کا قیام ناممکن کر دیا تھا - فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر کل کو پنجاب میں بھی کوئی موتی لال یا کوئی سی - آر - داس پیدا ہو گیا جس نے مسلمانوں کے تمام اندیشوں کو دور کر کے ایک زبردست حزب مخالف کی بنا

ڈال دی۔ تو اُن کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر اُنھوں نے کونسل کے ہندو ممبروں میں سے اُس شخص کو اپنا رفیقِ کار منتخب کیا۔ جو شہری آبادی کا سب سے بڑا دشمن اور شہریوں کے تفوق کا سب سے بڑا مخالف تھا۔

میاں فضل حسین کو یقین تھا کہ مسلمان تو بہر حال اُن کے ساتھ رہیں گے۔ خطرہ صرف ہندوؤں سے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس خطرہ کے ازالہ کی اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ ہندوؤں میں سے ایک گروہ کو کاٹ کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

کونسل میں تئیس دیہاتی مسلمان ممبر تھے۔ اِدھر چودھری لال چند چھ زراعت پیشہ دیہاتی ہندوؤں کے لیڈر تھے۔ اقتصادی مفاد کے مشترک ہو جانے سے اِن دونوں گروہوں میں یگانگت اور ہم آہنگی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اِس قسم کی یگانگت اس لیے بھی ضروری تھی کہ مسلمان بجائے خود اکثریت میں نہیں تھے۔ اور ایسی پارٹی بنانے سے معذور تھے جو تنہا حکومت چلانے کی قدرت رکھتی ہو۔ جداگانہ نیابت کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی مسائل اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر کونسل میں مخلوط پارٹی بنانا قطعاً معیوب نہیں تھا۔ آخر مطلب برآری کے لیے "سرکاری بلاک" پر کب تک انحصار ہو سکتا اور کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میاں فضلِ حسین نے پچھلے تین برسوں میں "سرکاری بلاک" کی غیر متزلزل اعانت سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ گورنر کی چشم کرم کا نتیجہ تھا۔ اور جو لوگ انگریز کی ذہنیت سے واقف تھے اُن کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ کہ ممکن ہے یہی چشم کرم رات بھر میں چشم قہر و غضب سے بدل جائے۔ یوں بھی ملک کے ترقی پذیر سیاسی حالات اِس بات کے متقاضی تھے کہ سرکاری اور نامزد ممبروں

کی اعانت سے بے نیاز ہو کر وزراء کو اپنی پارٹی پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد میں کوئی باہمی تصادم نہیں تھا۔ شہری مسلمان غیر زراعت پیشہ ہونے کے باوجود قانونِ انتقالِ اراضی کے حامی تھے۔ اور انہیں یہ کسی صورت سے گوارا نہیں تھا کہ دیہاتی مسلمان اس قانون کی حفاظت و صیانت سے محروم ہو جائیں۔ یا اُن کی زمینیں سود در سود کے چکر میں پڑ کر ہندو ساہوکاروں کے قبضے میں چلی جائیں چودھری لال چند کی پارٹی بھی اسی اصول کی حامی تھی۔ لہٰذا صوبے کے وسیع مفاد اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میاں فضلِ حسین کا یہ اقدام ہرگز قابلِ اعتراض نہیں تھا مقصد بہر حال یہ تھا کہ شہری ہندوؤں کے اُس دولت مند طبقہ کے استیلاء سے، جو مختلف ذرائع آمدنی کے علاوہ سرکاری ملازمتوں پر بھی قابض ہو چکا تھا، صوبے کی غریب اور پسماندہ آبادی کو محفوظ رکھا جائے۔

فضلِ حسین اور لال چند کی اس مشترک پارٹی کا نام نیشنل یونینسٹ پارٹی رکھا گیا۔ اور کونسل کے شہری مسلمان بطیبِ خاطر اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن سوراجیوں اور ہندو سبھائیوں کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا تھا کہ رہتک کا ایک جاٹ ہندو قوم کا نمائندہ بن کر وزارت کی کرسی پر بیٹھ جائے۔ اُن کے نزدیک تو گویا یہ منصب صرف اُنہی کے لیے مخصوص ہو چکا تھا۔ چنانچہ میاں فضلِ حسین کے اس فیصلے کے خلاف صوبے بھر کے شہری ہندوؤں میں ایکسر ہلچل مچ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جب لالہ ہرکشن لال وزیر تھے۔ تو شہری ہندو انہیں بزدلی

کا طعنہ دے کر کہتے تھے کہ یہ شخص کروڑپتی ہونے کے باوجود پانچ ہزار روپے مشاہرے کی خاطر سے فضلِ حسین کی "ہندو کش" پالیسی میں شریک ہے۔ جب لالہ ہرکشن لال رخصت ہو گئے اور وزارت ترک کیا انھوں نے کونسل کے دروازہ کی طرف بھی رخ کرنے سے انکار کر دیا۔ تو یہی شہری ہندو اب اس بات پر واویلا کر رہے تھے کہ فضلِ حسین کا رفیقِ کار خود اُن کی جماعت میں سے کیوں نہیں لیا گیا۔ اور یہ اعزاز رہتک کے ایک زراعت پیشہ دیہاتی کو کیوں عطا ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی اِس ناکامی اور محرومی کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے ایک بہت بڑی رقم جمع کر کے چودھری لال چند کے اُس حریف کو دی۔ جو گذشتہ الیکشن میں ان سے شکست کھا چکا تھا۔ اور اُسے لال چند کے خلاف انتخابی عذرداری دائر کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اگر یونینسٹ پارٹی ذات پات کی تفریق۔ اور قبائلی عصبیت کے جذبے سے بلند ہو کر۔ صرف اُنہی خطوط پر کام کرتی جو اُس نے اپنے لیے وضع کیے تھے۔ تو کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ لیکن مصیبت یہ آ پڑی کہ چودھری لال چند اور اُن کے رفقا یہ نقطہ نگاہ لے کر آئے تھے کہ پنجاب میں اگر کوئی طبقہ مظلوم ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کوئی طبقہ حکومت کی اعانت و سرپرستی کا محتاج ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اگر کسی طبقہ کو ملازمتیں۔ جاگیریں اور عہدے حاصل کرنے کا استحقاق ہے تو وہ جاٹ ہیں۔ اور اگر کوئی طبقہ اغیار کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے اب تک اپنے جائز حق سے محروم رہا ہے۔ تو وہ صرف جاٹ ہیں۔ چنانچہ اگر پنجاب کونسل کی صرف ۱۹۲۴ء کی کارگذاری پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔ تو یہ حقیقت بخوبی

واضح ہو جاتی ہے۔

یہاں پنجاب کونسل کی صرف فروری ۱۹۲۶ء سے نومبر ۱۹۲۶ء تک کی رو ئیداد میں سے چند سوال نکال کر درج کئے جاتے ہیں۔ جن کے جواب کونسل کے ممبروں نے وزیروں سے طلب کئے تھے۔

چودھری دُلی چند: (ا) "کیا یہ واقعہ ہے کہ۔ پی۔ ای۔ ایس کی ملازمتوں میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ اس ملازمت میں کتنی اسامیوں پر ہندو جاٹ متعین ہیں؟

(ب) کیا مہربانی کر کے حکومت آئندہ پی۔ ای۔ ایس کی اسامیوں پر براہ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟

چودھری دُلی چند: (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ پی۔ سی۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں ایک ہندو جاٹ بھی نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے۔ تو کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ اس ملازمت پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟"

"(ب) کیا مہربانی فرما کر حکومت آئندہ پی۔ سی۔ ایس کی جوڈیشل برانچ میں براہ راست تقرر کرتے وقت ہندو جاٹوں کو ترجیح دے گی؟"

چودھری دُلی چند: "(ا) کیا مہربانی کر کے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مندرجہ ذیل اسامیوں پر کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمان۔ کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ ہندو اور کتنے زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھ متعین ہیں:۔

۱۔ انسپکٹر پولیس

۲۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

۳۔ سب انسپکٹر آبکاری

۴۔ انسپکٹر آبکاری

۵۔ اسسٹنٹ جیلر

۶۔ جیلر

۷۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

۸۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

۹۔ سب جج

۱۰۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر و پیر جنگلات

۱۱۔ رینجر جنگلات

۱۲۔ ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت

۱۳۔ پنجاب سول سکریٹریٹ کے کلرک

(ب) کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ مذکورہ بالا اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کتنے ہندو جاٹ متعین ہیں؟

"(ج) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ پے در پے سرکلر جاری کرنے کے باوجود کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اب تک اُن کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا؟

"(د) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ وہ آئندہ سرکاری ملازمتوں میں

ہندو جاٹوں کو اُن کا پورا حصّہ دینے کے لیے کیا تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟

چودھری دُنی چند: "(ا) کیا مہربانی کر کے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ ضلع رُہتک کے ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس، سول سرجن کے دفاتر میں اور رُہتک اور کرنال کی جملہ تحصیلوں کے دفاتر میں کتنے آدمی ملازم ہیں اور وہ ملازم کن اقوام سے تعلق رکھتے ہیں؟"

"(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ اِن تمام دفاتر میں ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد قلیل ہے؟"

"(ج) اگر یہ صحیح ہے۔ تو کیا حکومت اِن اضلاع کے حکّام کے نام اس قسم کی ہدایات جاری کرے گی کہ وہ اپنے دفتروں میں ہندو جاٹوں کی تعداد میں اُن کی آبادی کے مطابق اضافہ کریں؟"

چودھری چھوٹو رام: "کیا مہربانی کر کے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہو کہ مجموعی طور پر مندرجہ ذیل ملازمتوں میں سے ہر ملازمت کی کتنی اسامیاں اس وقت صوبے بھر میں موجود ہیں اور ایسی ہر اسامی پر کتنے ہندو جاٹ اور مسلمان جاٹ۔ ہندو راجپوت اور مسلمان راجپوت متعین ہیں؟"

۱- اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر

۲- سب جج

۳- تحصیلدار

۴- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

۵ - انسپکٹر پولیس
۶ - سب انسپکٹر پولیس
۷ - ڈپٹی کلکٹر انہار
۸ - ضلعدار
۹ - ایکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر جنگلات
۱۰ - رینجر جنگلات
۱۱ - ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت
۱۲ - اسسٹنٹ رجسٹرار
۱۳ - ویٹرنری سپرنٹنڈنٹ
۱۴ - ویٹرنری انسپکٹر
۱۵ - ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۱۶ - اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس
۱۷ - انسپکٹر آبکاری
۱۸ - سب انسپکٹر آبکاری

چودھری چھوٹو رام :- کیا مہربانی کر کے حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی - جس میں پنجاب کی نوآبادیات میں سے ہر نوآبادی کے متعلق مندرجہ ذیل امور واضح کئے گئے ہوں ؟

" (ل) مربع جات اراضی کی کل تعداد کتنی ہے ؟

" (ب) ایسے مربع جات کی تعداد کتنی ہے جن کو ایک معینہ مدت کے لیے مستاجری پر دیا گیا ہے - اور وہ معینہ مدت تک ختم ہو رہی ہے ؟

" (ج) ایسے مربع جات کی تعداد کتنی ہے جن پر زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمان - زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھ - زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ ہندو اور دیگر اقوام کے لوگ -

۱ :- مالکانہ حقوق رکھتے ہیں - یا
۲ :- قابض کاشتکار ہیں - یا
۳ - غیر قابض کاشتکار ہیں - یا

۴ :- پیشہ دار ہیں ؟"

چودھری چھوٹو رام :- کیا مہربانی فرما کر حکومت بتلائے گی کہ قسمت انبالہ میں کتنے مربع جات اراضی ہندو جاٹوں کو عطا کیے گئے ہیں ؟"

چودھری چھوٹو رام :- کیا مہربانی فرما کر حکومت ایک ایسی فہرست پیش کرے گی جس میں مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہو ؟

"(ا) جب سے حکومت نے ریزولیوشن منظور کیا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں زمینداروں کو ایک خاص معینہ تعداد میں ملازمتیں دی جائیں گی اس وقت سے لے کر اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کل کتنے آدمیوں کا تقرر ہوا ہے۔ اور ان تقرر یافتہ امیدواروں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے ؟

۱- اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۶- انسپکٹر پولیس
۲- سب جج	۷- سب انسپکٹر پولیس
۳- تحصیلدار	۸- ضلعدار
۴- نائب تحصیلدار	۹- پی- ای- ایس
۵- ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس	۱۰- جیلر

"(ب) مذکورہ بالا ریزولیوشن منظور ہونے سے تین سال پیشتر انہی اسامیوں میں سے ہر ایک اسامی پر کتنے زمیندار امیدواروں کا تقرر ہوا تھا ؟"

چودھری چھوٹو رام :- "کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ پنجاب سول سکریٹریٹ کے کلرکوں میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے ؟"

چودھری چھوٹو رام :- کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ جب سے یہ ریزولیوشن منظور ہوا ہے کہ مختلف سرکاری محکموں میں جاٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ اب تک مندرجہ ذیل اسامیوں میں سے ہر اسامی پر کتنے امیدواروں کا تقرر ہوا ہے اور ان تقرر یافتگان میں سے ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے ؟

۱۔ سب جج	۶ - انسپکٹر پولیس
۲ - اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۷۔ سب انسپکٹر پولیس
۳ - تحصیلدار	۸ - ضلعدار
۴ - نائب تحصیلدار	۹ - جیلر
۵ - ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس	۱۰ - پی - ای - ایس

چودھری چھوٹو رام :- کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ گذشتہ پانچ سال میں حکومت پنجاب نے کتنے آدمیوں کو ڈیرہ دون کے فارسٹ کالج میں اکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر یا رینجر کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے اور اُن میں ہندو جاٹوں کی تعداد کتنی ہے ؟

(ب) کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ یہ بات صحیح ہے کہ اس طرح میں ہندو جاٹوں کی تعداد بے حد قلیل ہے ؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت اس درسگاہ میں ہندو جاٹ طلبہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی ؟

چودھری چھوٹو رام :- (ا) کیا مہربانی فرماکر حکومت بتائے گی کہ یہ واقعہ ہے کہ جب حکومت نے مختلف سرکاری محکموں میں اسامیوں کی ایک خاص تعداد زمینداروں کے لیے مخصوص کی تھی - تو اس ریزولیوشن کے ذریعے سے یہ بھی واضح

کیا گیا تھا کہ پیشہ ورانہ (پروفیشنل) اور ٹیکنیکل درس گاہوں میں زمیندار امیدواروں کو داخلے کی خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی؟

"(ب) اگر شق (ا) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی۔ کہ لاہور کے میڈیکل کالج۔ وٹرنری کالج۔ سینٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں داخلہ کے وقت ذمہ دار افسروں نے یہ تحقیقات کی تھی کہ آیا داخل ہونے والے امیدوار زمیندار ہیں یا غیر زمیندار؟

(ج) اگر اس قسم کی تحقیقات نہیں کی گئی تو کیا حکومت مہربانی کر کے متعلقہ درس گاہوں کے افسروں کے نام احکام جاری کرے گی کہ آئندہ داخلے کے وقت اس قسم کی تحقیقات ضرور کی جائے۔ تاکہ حکومت کے منظور کردہ ریزولیوشن پر لفظاً و معناً عملدرآمد ہو سکے؟

"(د) کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ امسال لاہور کے میڈیکل کالج۔ ویٹرنری کالج۔ سنٹرل ٹریننگ کالج اور امرتسر کے میڈیکل سکول میں کتنے مسلمان ہندو اور سکھ امیدوار داخل کیے گئے ہیں۔ اور ان تینوں فرقوں کے طلبہ میں سے ہر فرقہ کے زمیندار طلبہ کتنے ہیں اور غیر زمیندار کتنے؟

چودھری چھوٹو رام:۔ کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ۱۹۱۵ء سے لے کر اب تک کتنے سرکاری ملازموں کو ان کے حسن خدمات کے اعتراف میں کتنے مربع جات اراضی عام مروجہ شرائط پر قیمتاً عطا کیے جا چکے ہیں اور ان سرکاری ملازموں میں سے زمینداروں کی تعداد کتنی ہے اور غیر زمینداروں کی تعداد کیا ہے؟

چودھری دُنی چند:۔ (الف) کیا مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے جملہ مصارف

صوبے کے محاصل سے ادا کئے جاتے ہیں ؟

" (ب) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ صوبے کی آمدنی کا بیشتر حصہ زراعت پیشہ طبقہ کی جیبوں سے نکل رہا ہے۔ اور ریلوے کا محکمہ صوبائی محاصل میں ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرتا ؟

" (ج) کیا یہ صحیح ہے کہ اس کالج کے داخلے میں زراعت پیشہ طبقہ کے افراد کو کوئی ترجیح نہیں دی جاتی ؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اُمیدوار جن کو ریلوے کا محکمہ نامزد کرتا ہے۔ اس کالج میں آسانی سے داخل ہو سکتے ہیں ؟

" اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ تو کیا حکومت مہربانی فرما کر داخلے کے قواعد کو فوراً تبدیل کرنے کی کوشش کرے گی ؟"

چودھری ٹِکّی چند: "(ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اُوپر سالانہ آمدنی رکھنے والے اشخاص کے بچوں سے سکولوں میں اوّل گریڈ فیس وصول کی جاتی ہے ؟ اور کیا یہ بھی واقعہ ہے، کہ دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اوپر سالانہ آمدنی سے مُراد زرعی آمدنی بھی لی جاتی ہے ؟

" (ب) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت مہربانی کر کے دو ہزار یا دو ہزار روپے سے اُوپر کی سالانہ زرعی آمدنی کو آمدنی کی اس تعریف سے مستثنیٰ قرار دے گی ؟"

چودھری ٹکی چند: کیا یہ واقعہ ہے کہ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہر سال فرقہ دارانہ اصول پر مختلف طلبہ کو بتیس ۳۲ وظائف دیئے جاتے ہیں ؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان وظائف کے عطا کئے جانے کا تعلق ہے زراعت پیشہ

ہندو جاٹوں اور زراعت پیشہ ہندو راجپوتوں کو ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کیا گیا ہے؟

"کیا مہربانی فرما کر حکومت ہندو گوجروں کو بھی ایک جداگانہ فرقہ تسلیم کرے گی اور اُن وظائف میں سے جو ہندو قوم کے لیے مختص کئے گئے ہیں۔ ہندو گوجروں کے لیے الگ تعداد مخصوص کرے گی؟"

چودھری دُنی چند:- "کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈیرہ غازی خاں۔ جام پور۔ مظفر گڑھ اور قسمت راولپنڈی کے تمام گورنمنٹ سکولوں کی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف تعلیمی فیس وصول کی جاتی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت مہربانی کر کے کرنال۔ رہتک۔ گوڑگانواں اور حصار کے گورنمنٹ سکولوں میں بھی اسی قسم کی رعایت کا نفاذ کرے گی۔ تاکہ وہاں بھی ثانوی جماعتوں میں زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ سے نصف فیس وصول کی جائے؟"

چودھری دُنی چند:- "کیا مہربانی کر کے حکومت بتلائے گی۔ کہ اب تک حکومتِ پنجاب کی سفارش پر کتنے طلبہ کو ڈیرہ دون ملٹری کالج میں بھیجا گیا ہے؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ اِن طلبہ میں ایک بھی ہندو جاٹ نہیں؟ اگر یہ درست ہے تو کیا حکومت آئندہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے گی۔ جس سے کافی تعداد میں ہندو جاٹ طلبہ کو اس ملٹری کالج میں بھیجا جا سکے۔؟"

چودھری دُنی چند:- "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتلائے گی کہ گذشتہ دس سال میں حلقہ شرقی (ایسٹرن رینج) سے کتنے پروبیشنر سب انسپکٹر پولیس بھرتی کئے گئے ہیں؟ اور ان پروبیشنر سب انسپکٹروں میں کتنے زراعت پیشہ افراد

تھے؟ اور ان زراعت پیشہ افراد میں سے کتنے جاٹ تھے؟

چودھری ڈلی چند: کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی جونیئر اینگلو ورنیکلر کلاس سینیئر اینگلو ورنیکلر کلاس اور بی۔ٹی کلاس میں کتنے طلبہ داخل کئے گئے ہیں۔ اور ان داخل ہونے والے طلبہ میں زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ مسلمانوں۔ زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ ہندوؤں زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ سکھوں اور دوسری قوموں کی تعداد کتنی ہے؟ نیز حکومت یہ بھی بتائے کہ ان کلاسوں میں داخلے کے لیے کتنے ہندو جاٹوں نے درخواستیں دی تھیں۔ اور ان میں سے کتنے امیدواروں کو لیا گیا ہے؟"

چودھری ڈلی چند: "کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ

(ا) کیا اس وقت انڈین ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ب) کیا اس وقت پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کوئی ہندو جاٹ ہے؟

(ج) اگر جواب اثبات میں ہے تو ان افسروں کی تعداد کتنی ہے؟

(د) اگر جواب نفی میں ہے تو کیا حکومت کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس سے ان دونوں ملازمتوں میں ہندو جاٹوں کی کمی پوری ہو سکے؟"

چودھری چھوٹو رام اور چودھری ڈلی چند نے اس خیال سے کہ آج حسن اتفاق سے وزارت کی کرسی لالی چند کے قبضہ میں ہے۔ اور ادھر میاں فضل حسین اپنی حکومت کو سلامت رکھنے کے لیے ہندو جاٹوں کے محتاج ہیں، یہ نعرہ لگا دیا کہ سکولوں کی فیس معاف کرنے کا سوال ہو۔ یا کالجوں میں طلبہ کے داخلے کا قضیہ۔ نو آبادیوں میں مربعے لینے کا مسئلہ ہو یا ملازمتوں میں حصے بخرے کرنے کا معاملہ۔ ہندو جاٹوں کے

ہو اور کسی فرقے کے مفاد کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ پنجاب میں جاٹوں کے علاوہ اور قومیں بھی آباد تھیں۔ اور اِن میں سے ہر قوم آگے بڑھ کر خوانِ نعمت پر ہاتھ مارنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ چنانچہ جونہی ہندو جاٹوں نے انا ولا غیری کا نعرہ بلند کیا۔ ہندو راجپوت بھی سینہ تان کر اُٹھے۔ اور انھوں نے ہندو راجپوتوں کے حقوق کے تحفظ کی جنگ شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں ۱۹۲۴ء ہی کے چند مہینوں میں پنجاب کونسل میں حکومت سے جو استفسارات کئے گئے۔ اُن کے دو ایک نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

چودھری رام سنگھ:-

"کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ضلع کانگڑہ میں کتنے مربع جات اراضی ہندو راجپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟ اگر انھیں کوئی اراضی نہیں دی گئی تو کیا حکومت اس کی وجوہ بیان کر سکتی ہے؟"

چودھری رام سنگھ:-

"کیا مہربانی کر کے حکومت بتائے گی کہ نہر باری دو آب اور دوسری نہری نوآبادیوں میں کتنے مربع جاتِ اراضی ضلع کانگڑہ کے ہندو راجپوتوں کو عطا کئے گئے ہیں؟"

چودھری رام سنگھ:-

"(ا) کیا حکومت کو معلوم ہے کہ اضلاع ہوشیار پور۔ کانگڑہ۔ گورداسپور حصار اور سیالکوٹ کے ہندو راجپوتوں کی اقتصادی و مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اور اِسی وجہ سے اُن کی تعداد بھی پہلے سے کم ہو گئی ہے

"(ب) اگر شق (ا) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت مندرجہ ذیل تجاویز کو معرضِ عمل میں لانے کی کوشش کرے گی؟

ا:- مذکورہ بالا اضلاع کی تمام سرکاری ملازمتوں میں ہندو راجپوتوں کو زیادہ تعداد میں بھرتی کیا جائے۔

۲: مذکورہ بالا اضلاع میں کواپریٹو انسپکٹر اور زراعتی اسسٹنٹ کی اسامیوں پر ہندو راجپوتوں کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے ہم قوموں کو اقتصادی مسائل اور زراعت کے سائنٹیفک طریقوں سے اچھی طرح آگاہ کر سکیں۔"

جب ہندو راجپوت اور ہندو جاٹ بڑھ چڑھ کر اپنی اپنی قوم کی نمائندگی ادا کر رہے تھے۔ تو مسلمان کیونکر خاموش رہتے۔ چنانچہ جونہی یہ چھینا جھپٹی شروع ہوئی۔ چودھری شہاب الدین[1] اور بعض دوسرے لوگ بھی اس میدان میں کود پڑے۔ ان لوگوں نے اپنی بصیرت کو کام میں لا کر۔ حکومت سے جس قسم کے استفسارات کرنا شروع کئے۔ اُس کے چند نمونے مشتے از خروارے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

چودھری شہاب الدین:-

"(ا) کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ علی الترتیب سال ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں براہِ راست فوجی کمیشن کے لیے، حکومت نے کتنے آدمیوں کی سفارش کی تھی۔ اور ان اشخاص میں جاٹ اور راجپوت کتنے تھے؟

---

[1] بعد میں سر شہاب الدین بنے۔ اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک پنجاب اسمبلی کے سپیکر رہے۔

"(ب) کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ تین سال کے عرصے میں براہِ راست فوجی کمیشن کے لیے کسی راجپوت یا جاٹ کی سفارش نہیں کی گئی؟

"(ج) اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت بتائے گی کہ آئندہ وہ راجپوتوں اور جاٹوں کو براہِ راست فوجی کمیشن دلانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

چودھری شہاب الدین:-

"(ا) کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ آیا اُن سرکاری درس گاہوں میں جو کلیتہً یا بیشتر صوبائی خزانے سے چلائی جا رہی ہیں، تعلیم حاصل کرنے کے لیے زراعت پیشہ اقوام کے طلبہ کو خاص مراعات یا سہولتیں عطا کی جاتی ہیں یا نہیں؟

"(ب) کیا حکومت کے پیشِ نظر ایسی کوئی سکیم ہے جس سے گورنمنٹ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے زراعت پیشہ اقوام کے لڑکوں کو خاص مراعات عطا کی جا سکیں؟"

چودھری شہاب الدین:-

"کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق پنجاب کے ہائی سکولوں۔ مڈل سکولوں اور پرائمری سکولوں میں شہری اور دیہاتی طلبہ کی تعداد کتنی ہے اور ان تمام طلبہ میں زراعت پیشہ اقوام کے لڑکے کتنے ہیں؟"

چودھری صاحب داد خاں:

"کیا یہ واقعہ ہے کہ حلقۂ مشرقی (ایسٹرن رینج) میں رہتک اور حصار کے اضلاع کے کسی مسلمان راجپوت کو سب انسپکٹر پولیس بھرتی نہیں کیا گیا؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا حکومت اِن اضلاع کے مسلمان راجپوتوں کو براہِ راست سب انسپکٹر پولیس بھرتی

کرنے کی کوئی تدبیر اختیار کرے گی ؟"

چودھری صاحب داد خاں :

" کیا حکومت بتائے گی کہ اِس وقت حلقۂ مشرقی (ایسٹرن رینج) میں اضلاع حِصار و رُہتک کے کتنے مسلمان راجپوت ہیڈ کنسٹبل پولیس کی اسامی پر کام کر رہے ہیں؟"

چودھری علی اکبر :-

" (ا) کیا یہ واقعہ ہے کہ ضلع گورداسپور کے جاٹوں، ارائیوں اور غیر مسلم راجپوتوں کو نوآبادیات میں اراضی عطا ہوئی ہے ؟

"(ب) اگر شق (ا) کا جواب اثبات میں ہے تو کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ ضلع گورداسپور کے مسلمان راجپوتوں کو اب تک اراضی کیوں عطا نہیں کی گئی ؟"

محمّد سیف اللہ خاں :-

" کیا مہربانی فرما کر حکومت بتائے گی کہ گذشتہ پانچ سال کے عرصے میں زراعت پیشہ اقوام کے کتنے آدمیوں کو ضلع میانوالی کے سول ہسپتالوں میں کمپاؤنڈر اور ویکسینیٹر کی اسامیاں عطا کی گئی ہیں ؟"

میاں فضلِ حسین نے ۱۹۲۳ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ گورنمنٹ کالج اور میڈیکل کالج میں چالیس فیصد مسلمان داخل کیے جائیں گے اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نمائندگی حاصل ہوگی۔ لیکن اب چاروں طرف یہ شور اُٹھنے لگا تھا کہ اس چالیس فی صد نیابت میں جاٹوں کا کتنا حصّہ ہے اور راجپوتوں کا تناسب کتنا ہوگا۔ گوجروں کے پلّے کیا پڑے گا۔ گکھڑوں کو کیا عطا ہوگا۔ زراعت پیشہ لوگوں کے حصّے میں کیا آئے گا اور دیہاتیوں کو کیا ملے گا۔

یونینسٹ پارٹی کے درخت کا یہ پہلا پھل تھا جس کی سمیت نے آگے چل کر پوری قوم میں تشتت و افتراق اور بے اعتمادی و بدگمانی کا ایسا زہر پھیلا دیا۔ جس کا تریاق ربع صدی کی جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکا۔ ستم ہے کہ یہ سب کچھ میاں فضلِ حسین کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ جنھوں نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سر مائیکل اوڈوائر کی پالیسی پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا۔ کہ اُس نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کر کے صوبے کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں چودھری لال چند کی تجاویز کی محض اِس لیے مخالفت کی تھی کہ اِن تجویزوں پر عمل کرنے سے صوبے کی تعلیم یافتہ آبادی پر دیہاتیوں کا ناروا التفوق قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میاں فضلِ حسین نے حریفوں کے حملوں سے بچنے کے لیے اپنے گرد جو حصارِ عافیت کھڑا کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک زنداں کی صورت اختیار کرنے لگا تھا اور اہلِ نظر محسوس کر رہے تھے کہ چند سال ہی میں میاں فضلِ حسین اِس زنداں میں ایک قیدی کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔

اِس مسموم فضا کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہری اور دیہاتی طبقوں کے درمیان روز بروز بے اعتمادی بڑھنے لگی۔ دیہاتی سمجھتے تھے کہ صوبے کے محاصل میں شہریوں کا حصّہ کم ہے۔ لیکن وہ فائدہ زیادہ اُٹھا رہے ہیں۔ شہری مسلمان یہ کہتے تھے کہ ایک طرف تو وہ قانونِ انتقالِ اراضی کی پابندیوں کی وجہ سے زمینداری نہیں کر سکتے دوسری طرف تجارت اور صنعت و حرفت پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اِس لیے اُن کی معاش کا دارومدار لے دے کے سرکاری ملازمت ہی پر ہے۔ اب ملازمتوں کے

بٹوارے ہیں یعنی دیہاتی و شہری - زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ - زمیندار و غیر زمیندار کا سوال پیدا کرکے اُن کے لیے روزگار کی تمام راہیں بند کی جا رہی ہیں - یہ قبائلی تفریق اپنے نتائج کے اعتبار سے اتنی خطرناک تھی - کہ آگ کی مانند ہوا کے ایک ہی جھونکے سے، اُس کے شعلے دُور دُور تک پہنچنے لگے۔

پنجاب کونسل میں شہری مسلمان صرف پانچ تھے - ظاہر ہے، اتنے بڑے ایوان میں اِن پانچ ممبروں کی آواز کیا اثر پیدا کر سکتی تھی - تاہم یہ لوگ قومی اتحاد کو قائم رکھنے کی غرض سے یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے - لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ چودھری شہاب الدین ایسا شخص بھی جس کی تمام عمر لاہور میں بسر ہوئی تھی - اور جو لاہور کے شہری مسلمانوں کے ووٹ سے میونسپل کمیٹی کا صدر منتخب ہوا تھا - اِس رَو میں بے تکلف بہہ گیا ہے - اور اب جاٹ، اور راجپوت کی قبائلی تقسیم - اور شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تفریق کھڑی کرنے سے دریغ نہیں کرتا - تو انھوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا - اِس وبائی روگ تھام کا بظاہر اُن کے پاس کوئی علاج نہیں تھا - انھوں نے صرف اتنا کیا کہ جونہی موقع ملا - شدت سے اِس عصبیت کے خلاف آواز بلند کی -

نومبر ۱۹۲۴ء میں جب کونسل میں "پنجاب : شاملات بل" کی ترمیم پیش ہوئی تو شہری اور دیہاتی رقابت نے اُس جذبۂ عناد کا جواب تک سینوں میں پرورش پا رہا تھا، کھلے بندوں مظاہرہ کیا - چودھری شہاب الدین نے شہری ممبروں کو بڑے ڈانٹ کر کہا :- کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ شہری باشندے کون کون سے ٹیکس ادا کر رہے ہیں؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ سوائے انکم ٹیکس کے اور کسی قسم کا ٹیکس نہیں دیتے -

جب فوج میں بھرتی ہونے کا سوال آتا ہے تو شہری نہیں بلکہ دیہاتی لوگوں کو رنگروٹ بھرتی کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے لوگ میونسپل کمیٹی کو کچھ ٹیکس ضرور ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ٹیکس سراسر اُن کی ذاتی سہولت اور آرام کے لیے ہے۔ جنابِ والا! میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صوبے کے سرکاری محاصل میں زیادہ رقم گاؤں کے باشندوں کی جیب سے نکلتی ہے۔ شہر والوں کی ہمسائیوں سے نہیں آتی۔"

ملک فیروز خاں نون نے فرمایا: "میں شہری باشندوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان کے لیے جائز ہے کہ اس ٹیکس کی مخالفت کرکے اس رقم کا بوجھ بھی دیہاتی آبادی کے کندھوں پر پھینک دیں؟ مجھے امید ہے کہ اس ایوان کے شہری ممبر فرض شناسی کا ثبوت دیں گے اور اس ٹیکس کو دیہاتیوں کے سر پر ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

شیخ محمد صادق بیرسٹر ایٹ لا۔ جو امرتسر کے شہری حلقے سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ یونینسٹ پارٹی میں شامل تھے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شہری اور دیہاتی کی تفریق ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے۔ جس سے اگر ہندوؤں کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔ تو خود مسلمانوں کے سینے پر بھی اس سے گہرا زخم لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے اس روش کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جنابِ والا! اس ایوان میں پہلے ہی سے کافی اختلاف موجود ہے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا چلا آرہا ہے۔ دوسری طرف اکالیوں اور غیر اکالیوں کا قضیہ جاری ہے۔ اب شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک اور نیا تفرقہ قائم کی

جا رہی ہے ۔ جو لوگ دیہاتیوں کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں ۔ انھوں نے آبیانے میں تخفیف کرا کے اپنے دیہاتی بھائیوں کے بوجھ کو تو کم کر دیا ہے ۔ لیکن اب اُنہی کی کوشش سے شہریوں پر اسٹامپ ڈیوٹی نافذ کی جا رہی ہے ۔ کیا دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود حاصل کرنے کا یہی ڈھنگ ہے ؟ اور کیا آپ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر محض اس لیے مسکراتے رہیں گے ۔ کہ چلو چھٹی ہوئی ۔ یہ چھ لاکھ کی رقم تو شہریوں کی جیب پر پڑ گئی ہے ۔"

مولوی مظہر علی اظہر خلافتی تھے ۔ اور پنجاب کے مشرقی و مغربی شہروں سے منتخب ہو کر آئے تھے ۔ اُنھوں نے بھی اِس رَوش کے خلاف آواز بلند کی ۔ اور فرمایا: "ہمیں اِس سوال پر محض شہری اور دیہاتی نقطۂ نگاہ سے غور نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ مجموعی طور سے صوبے کی پوری آبادی پر کیا اثر پڑے گا اگر آپ نے غور و فکر کا یہ انداز اختیار نہ کیا ۔ تو وہ خلیج جو ہندو مسلم نزع ۔ اور زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ کی باہمی چپقلش نے پہلے ہی سے کافی وسیع کر رکھی ہے اب اُس میں شہری و دیہاتی تفریق سے ایک نئے اختلاف کا اضافہ ہو جائے گا اِن باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ صوبے کی آبادی کا ہر طبقہ، حریفانہ جذبے سے متاثر ہو کر، اِس بات کی کوشش کرے گا ۔ کہ ٹیکسوں کا بوجھ خود اُس پر نہیں بلکہ دوسرے طبقے پر پڑے ۔ اور یوں آہستہ آہستہ روز بروز ٹیکسوں میں اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا ۔"

اِس قسم کی چند متفرق آوازوں کے باوجود شہریوں اور دیہاتیوں کا باہمی اختلاف روز بروز بڑھتا گیا ۔ شہری مسلمان ایک عجیب مخمصے میں گرفتار تھے اگر وہ یونینسٹ

پارٹی کو چھوڑ دیتے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے کونسل میں مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے قطعِ تعلق کر لیا۔ یہ انقطاع گوارا نہیں تھا۔ کونسل کے باہر بھوپال کی آبادی میں بھی اِس نزاع کے اثرات نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ملازمتوں میں اگر براہِ راست تقرر یا نامزدگی کا سوال آتا تو ایک ایم اے پاس شہری مسلمان پر ایک ایسے دیہاتی مسلمان کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو محض میٹرک یا ایف اے تک تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

مثلاً اگر مقابلے کے امتحان کے ذریعہ سے پراونشل سول سروس کی دس اسامیوں کو پُر کرنے کا موقع آتا۔ تو حکومت اعلان کر دیتی تھی کہ اِن دس میں سے چار اسامیاں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ اِدھر جب امتحان کا نتیجہ نکلتا۔ تو معلوم ہوتا کہ کامیاب اُمیدواروں کی فہرست میں جو سب سے پہلے دس اُمیدوار ہیں۔ اُن میں صرف دو مسلمان آئے ہیں۔ اس صورت میں باقی دو اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے۔ حکومت نے اپنے اختیارِ خاص سے نامزدگی کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ قاعدے کی رُو سے چاہیے تو یہ تھا کہ کامیاب اُمیدواروں میں سرِ فہرست جن دس اُمیدواروں کے نام تھے۔ اُن کے معاً بعد علی الترتیب جن دو مسلمانوں کا نمبر تھا اُنھیں نامزد کر دیا جاتا۔ تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پاتی۔ لیکن حکومت اس قاعدے کو بالائے طاق رکھ کر۔ محض اپنی خوشنودی اور صوابدید سے ایسے لوگوں کو نامزد کر دیتی تھی۔ جو تعلیمی قابلیت میں پست ہونے کے باوجود بعض صلاحیتوں کی وجہ سے حکومت کے منظورِ نظر ہوتے تھے۔ اس طرزِ عمل کا ایک بیّن لیکن بے حد تلخ نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا ایک عنصر داخل

ہونا شروع ہوگیا جو ہندو اہلِ کاروں کے مقابلہ میں بے استعداد کم سواد اور نااہل تھا انجام کار اس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا۔ اور اغیار نے قوم کی قوم پر نالائقی کا الزام تھوپ دینے سے دریغ نہ کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پنجاب کونسل اپنی مذموم کارروائی سے، صوبے کی پوری آبادی کو شہری اور دیہاتی۔ جاٹ اور راجپوت۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ حصوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ تو مسلمانوں کے صائب الرائے سیاسی لیڈروں کا طرز عمل کیا تھا؟ کیا یہ سیاسی لیڈر، جو اکثر و بیشتر شہری آبادی سے تعلق رکھتے تھے، ردِ عمل کا شکار ہو کر شہری مسلمانوں کی پشت پناہ بن گئے تھے؟ اور کیا وہ دیہاتیوں کے حریف کی حیثیت سے اُن کے خلاف صف آرا ہونا جائز سمجھتے تھے؟ یا کیا اُن کی نظریں اِن مصنوعی حد بندیوں سے بلند ہو کر قوم کی مجموعی حالت کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہاں صرف دو مثالیں پیش کر دینا کافی ہوگا دسمبر ۱۹۲۴ء کے آخری ہفتے میں انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس بلگام (احاطہ بمبئی) میں ہوئے۔ کانگرس کے صدر مہاتما گاندھی اور خلافت کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ ڈاکٹر کچلو نے خلافت کانفرنس کے پنڈال میں جہاں مہاتما گاندھی۔ سی۔ آر داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ لالہ لاجپت رائے اور ولبھ بھائی پٹیل کے پائے کے لوگ موجود تھے۔ اپنے خطبہ صدارت میں یہ اعلان فرمایا:

"..... جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے۔ میں ذاتی طور پر میاں فضلِ حسین کی اِس روش کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اُنھوں نے حکومت سے تعاون کر کے ترکِ موالات کے قومی پروگرام کی خلاف ورزی کی ہے۔ بایں ہمہ مجھے اِس مجمع کے رُوبرو یہ اعلان کرنے میں قطعاً کوئی تامّل نہیں۔ کہ میاں فضلِ حسین کا اس کے سوا اور کوئی تصور نہیں۔ کہ وہ مسلمانوں سے کسی قدر انصاف کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ مسٹر چنتامنی اور آخر کار مہاتما گاندھی ایسے بلند پایہ لیڈر میاں فضلِ حسین کے کام کا بغور جائزہ لے چکے ہیں ان سب کی متفقہ رائے ہے کہ فضلِ حسین کی پالیسی حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اِس سلسلہ میں میاں صاحب کے خلاف پنجاب کے ہندوؤں نے جو شور و غوغا بپا کر رکھا ہے وہ بالکل نامناسب اور خود غرضانہ ہے۔ گذشتہ الیکشن کے بعد پنجاب میں جو سوراج پارٹی بنی تھی۔ اُس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سراسر ایک ہندو پارٹی ہے۔ پنجاب کی مصیبتوں کا اصل سبب اقتصادی ہے۔ کیونکہ ایک طرف صوبے کی ساری تجارت پر ہندوؤں کا اجارہ ہے۔ تو دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کی بیشتر تعداد بھی اُنہی کے قبضہ میں ہے[1]"

جون ۱۹۲۴ء میں حکومتِ ہند نے اس امر کا محاکمہ کرنے کے لیے کہ صوبوں میں دوعملی حکومت کیونکر کام کر رہی ہے۔ اس نظام میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا بُرائیاں ہیں۔

[1] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۲۴ء جلد ۲۔ شمارہ ۴۔

اصلاحات کی دوسری قسط صوبوں کو ملنی چاہیئے یا نہیں وزراء اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی جس کے صدر حکومتِ ہند کے ہوم ممبر سر الگزینڈر مڈی مین تھے۔ ممبروں میں سر محمد شفیع، مسٹر جناح، سر تیج بہادر سپرو، مہاراجہ بردوان، ڈاکٹر پرانجپے، سر اَرتھر فروم وغیرہ شامل تھے۔ اس کمیٹی کے اجلاس ہندوستان کے ہر صوبے میں ہوئے۔ اور رائے عامہ کی ترجمانی کرنے والے ذمہ دار افراد نے کمیٹی کے رُوبرو پیش ہو کر شہادتیں دیں مثلاً بنگال سے مولوی فضل الحق، سر عبدالرحیم اور پی۔ سی مِتّر۔ بمبئی سے پرشوتم داس ٹھاکر داس اور سر چمن لال سیتلواڈ۔ صوبجات متوسط سے مسٹر کیلکر۔ یو۔ پی سے پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اور مسٹر چنتامنی۔ پنجاب سے لالہ ہرکشن لال اور ملک برکت علی پیش ہوئے۔

حکومتِ ہند کے رجعت پسند عنصر کی خواہش تھی کہ صوبائی حکومتوں کی کمزوری اور خانہ جنگی کو ایسے مبالغہ آمیز طریقے سے بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے جس سے صوبوں کے وزیر لامحالہ نااہل اور بے تدبیر ثابت ہوں۔ تاکہ برطانوی حکومت اصلاحات کی نئی قسط دینے سے انکار کر دے۔ پنجاب میں ہندوؤں نے یہی روش اختیار کی تاکہ میاں فضلِ حسین کو زیادہ سے زیادہ بدنام کیا جا سکے۔ لالہ ہرکشن لال نے اپنی شہادت میں فضلِ حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی شہری اور دیہاتی کی باہمی چپقلش اور فرقہ وارانہ انتخاب کی سخت مذمت کی لیکن جب ملک برکت علی پیش ہوئے تو انھوں نے مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے جن باتوں پر زور دیا۔ وہ یہ تھیں۔

۱۔ پنجاب میں دو عملی حکومت کا نظام بہر صورت کامیاب رہا ہے اور وزیروں

نے اپنی کارگزاری سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری نبھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

۲: ہندو مسلم نزاع ایک عارضی چیز ہے۔ جب صوبائی خود مختاری (پراونشل اٹانومی) مل گئی تو دونوں قوموں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گا اور آپس کے جھگڑوں کو مٹا کر بارِ حکومت اٹھانے پر تیار ہو جائیں گی۔

۳:۔ مسلم لیگ گورنر کے اختیاراتِ خصوصی پر قانونی پابندیاں عائد کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ ضرور چاہتی ہے کہ اس قسم کی دستوری روایات قائم کر دی جائیں۔ جن کے تحت گورنر اپنے وزیروں کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرنے پائے۔ ہاں اگر وزیروں کو مجلسِ قانون ساز کا اعتماد حاصل نہیں۔ تو گورنر اُن کی رائے پر عمل کرنے کا بھی مجاز نہیں ہو گا۔ بلکہ اس صورت میں تو اُس کو حق ہو گا کہ مجلسِ قانون ساز کو توڑ کر نئے انتخابات کرائے۔

۴:۔ مسلم لیگ اس بات کی شدت سے حامی ہے کہ اگر صوبوں میں حکومتِ خود اختیاری کا نظام رائج کیا گیا۔ تو اُس کے ساتھ ہی مرکز میں بھی ذمہ دارانہ حکومت قائم کر دینی چاہیئے۔

۵:۔ مسلم لیگ کی رائے ہے کہ وزیرِ ہند (لندن) کی کونسل کو توڑ دیا جائے۔

۶:۔ اصلاحات کی جو قسط آئندہ عطا ہو گی اس میں تمام محکمے وزیروں کے سپرد کر دینے چاہئیں۔ کونسل میں سرکاری بلاک ختم کر دیا جائے۔ پارلیمنٹری انڈر سیکرٹری مقرر کئے جائیں اور چھوٹی بڑی تمام ملازمتوں کو وزراء کی تحویل میں دے دیا جائے۔

۷ :- مسلمان اصلاحات کی ایسی کسی سکیم کو ہرگز قبول نہیں کریں گے جس میں مندرجۂ ذیل اُمور کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو :

ا :- صوبے کی موجودہ حدود میں ایسا کوئی ردّ و بدل نہ کیا جائے جس سے پنجاب۔ بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہو۔

ب :- جداگانہ انتخاب برقرار رکھا جائے۔

ج :- مذہبی عبادات و رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔

د :- شمالی مغربی سرحدی صوبے میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

جب ملک برکت علی سے دورانِ شہادت میں یہ سوال کیا گیا کہ کیا لالہ ہرکشن لال اور میاں فضلِ حسین کے تعلقات کشیدہ تھے ؟

تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ قطعاً غلط ہے۔ لالہ ہرکشن لال تین سال فضلِ حسین کے شریکِ کار رہے۔ اور اس عرصے میں انھوں نے ایک بار بھی اُن کی پالیسی سے اختلاف نہیں کیا۔ وزارت قبول کرنے سے پہلے دونوں کانگرس میں اکٹھے کام کرتے تھے"۔ [۱]

حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی پیدا کی ہوئی قبائلی عصبیت کا زہر پھیل جانے اور مسلمانوں میں شہری دیہاتی کی دیوار کھڑی ہوجانے کے باوجود میاں فضلِ حسین کے پرانے رفقائے کار اب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اُنھیں اب بھی اعتماد تھا کہ فضلِ حسین سے بہتر آدمی ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ اُنھیں یقین تھا کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کا تعلق جن اُمور سے ہے وہ جاٹوں اور راجپوتوں کے

---

[۱] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۲۴ء جلد ۲۔ شمارہ ۳

بٹوارے، یا زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ طبقوں کی باہمی رقابت سے کہیں بالاتر ہیں۔ اور انہی امور کو اغیار کی دستبرد سے بچانا اُن کا سب سے بڑا قومی فرض تھا۔ پنجاب کے تمام اسلامی اخبار اور اسلامی ادارے فضلِ حسین کی پشت پر تھے۔ مسلمانوں کی اسی غیر مشروط حمایت کی بنا پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے فضلِ حسین کو صدارت کا اعزاز بخشا۔

چھٹا باب

تجاویزِ دہلی

شہری ہندوؤں کی کوشش سے چودھری لال چند کے خلاف جو انتخابی عذرداری دائر کی گئی تھی۔ وہ منظور ہو گئی اور لال چند کو نہ صرف وزارت بلکہ کونسل کی رکنیت سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن یہ واقعہ میاں فضلِ حسین کی پالیسی پر قطعاً اثرانداز نہ ہو سکا۔ انھوں نے گورنر سے کہہ کر نومبر ۱۹۲۴ء میں چودھری چھوٹو رام کو وزارت کے منصب پر فائز کرا دیا۔ چودھری چھوٹو رام ضلع رہتک کے ہندو جاٹ تھے اور رہتک ہی میں ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ وزیر بننے سے پہلے وہ پبلک پراسیکیوٹر کی اسامی کے لیے کوشاں تھے۔ چودھری چھوٹو رام شہری دیہاتی تفریق کے بہت بڑے حامی ہونے کے علاوہ بڑے صاف گو آدمی تھے۔ اُن کی صاف گوئی بعض اوقات تلخ کلامی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک بھی پہنچ جاتی تھی۔

جون ۱۹۲۴ء میں سر ایڈورڈ میکلگن اپنی میعاد پوری کر کے چلے گئے تو اُن کی جگہ پنجاب کے نئے گورنر سر میلکم ہیلی تشریف لائے۔ میلکم ہیلی اپنے پیشرو سے مختلف

آدمی تھے - وہ بڑے ٹھسّے اور رعب داب کے حاکم تھے - اور دب کر رہنا نہیں جانتے تھے - اُنھوں نے ابتدا میں میاں فضلِ حسین سے تعرّض نہیں کیا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد اُنھوں نے فضلِ حسین کو پنجاب کا ریونیو ممبر بنا دیا اور جب جنوری ۱۹۲۷ء میں نئی کونسل مرتب ہوئی - تو وزارت کی ترتیب میں ردّ و بدل کر کے مسلمانوں میں سے ملک فیروز خاں نون - ہندوؤں میں سے مسٹر منوہر لال اور سکھوں میں سے سردار جوگندر سنگھ کو لے لیا - منوہر لال شہری ہندوؤں کے نمائندے تھے - جوگندر سنگھ سکھوں کی نمائندگی کے دعوے دار تھے لیکن بظاہر کونسل کے سکھ ممبروں کی اکثریت اُن کی پشت پر نہیں تھی - فیروز خاں نون کو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان عنصر کے نمائندے کی حیثیت سے لیا گیا تھا - وزارت کی تشکیل کرتے وقت میلکم ہیلی کی پالیسی کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ یعنی "سرکاری بلاک" اُن کے ہاتھ میں رہے - چنانچہ وہ جب اور جہاں چاہتے اِس بلاک کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے تھے - اب یونینسٹ پارٹی کی قیادت چودھری چھوٹو رام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی - چھوٹو رام کو وزارت سے محروم ہو جانے کا یقیناً رنج تھا اور وہ اس محرومی کی وجہ سراسر یہ سمجھتے تھے کہ گورنر نے شہری ہندوؤں کے شور و غوغا سے متأثر ہو کر - وزارت کا منصب اُن سے چھین کر ایک شہری ہندو کے حوالے کر دیا ہے -

میلکم ہیلی کے اِس فعل کو خواہ مخالفانہ رنگ میں دیکھا جائے یا اُس پر ہمدردانہ نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے - ایک بات بہرصورت واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ ۱۹۲۱ء کی اصلاحات کے تحت صوبائی وزارت کابینہ کے اصولوں پر

ترتیب نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ وزیروں کا تقرر سراسر گورنر کے ایما اور مصلحت سے ہوتا تھا۔ میلکم ہیلی نے یقیناً محسوس کیا ہوگا۔ کہ پنجاب کے ہندوؤں کا طاقت ور، دولت مند، ذی اثر اور بلند آہنگ عنصر چھوٹو رام کو اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس بنا پر انھوں نے ہندوؤں کے شہری طبقے کے ایک شخص کو وزارت بخش دی۔ اگر اس طریقِ کار کو تسلیم کر لیا جائے کہ وزارتوں کی ترتیب و تشکیل فرقہ وارانہ اصول پر ہوتی تھی۔ تو میلکم ہیلی کا طرزِ عمل قابلِ اعتراض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہندو اور مسلمان ممبر جداگانہ نیابت کے تحت منتخب ہو کر کونسل میں آئے تھے۔ اس لیے ہندوؤں کی اکثریت کو آئینی نہ سہی، اخلاقی حق حاصل تھا کہ ایسے شخص کو وزارت کے منصب پر متمکن نہ ہونے دے۔ جو اُس کے سیاسی عقائد کی ترجمانی نہیں کر سکتا تھا۔

ریونیو ممبر بن جانے کے بعد اگرچہ میاں فضلِ حسین کا یونینسٹ پارٹی سے کوئی آئینی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ اس جماعت کی فلاح و بہبود اور اس کے مستقبل سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ باضابطہ نہ سہی بے ضابطہ، اُن سے پارٹی کے ہر کام میں مشورہ لیا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ چودھری چھوٹو رام اور ملک فیروز خاں نون مل کر بھی اُس خلا کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ جو فضلِ حسین کے نکل جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ چودھری شہاب الدین کونسل کے صدر بن چکے تھے۔ لیکن اُن کے اور فیروز خاں نون کے تعلقات کشیدہ تھے۔ چودھری صاحب خود وزارت کے خواہاں تھے لیکن فضلِ حسین کی کوشش سے یہ اعزاز فیروز خاں نون کے حصے میں آ گیا تھا۔ چودھری چھوٹو رام جس یونینسٹ پارٹی کی قیادت کا دعوےٰ کرتے تھے۔ اُس کے پچانوے فیصد ممبر مسلمان تھے۔ چھوٹو رام کو اپنی اس بنیادی کمزوری بلکہ مضحکہ انگیز حیثیت

کا بخوبی احساس تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتے تھے۔ اس دُکھ کا مداوا خود اُن کے پاس بھی نہیں تھا۔ راجہ نریندر ناتھ کی ہندو پارٹی، جو اب نیشنل پروگریسو پارٹی کے بلند بانگ نام سے پکاری جاتی تھی، آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چودھری چھوٹو رام کے ہندو رفقا ایک ایک کر کے یونینسٹ پارٹی سے کٹ کر نیشنل پروگریسو پارٹی میں شریک ہونا شروع ہوئے۔ چھوٹو رام شہری اور دیہاتی تفریق کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ اس لیے وہ اپنی ناکامیوں کا انتقام لینے کے لیے صرف ایک تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ یعنی موقع ہو یا نہ ہو۔ وہ بے دریغ شہری طبقے پر برسنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے غم و غصہ کا اولین ہدف شہری ہندوؤں کا وہ طبقہ تھا جس نے اُن کو وزارت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی آتش بیانی پر اُترتے تو ہندو مسلمان کی کوئی تمیز روا نہ رکھتے۔ اور پنجاب کی ساری شہری آبادی کو ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جاتے تھے۔

۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے چودھری چھوٹو رام نے فرمایا:

"......اس ایوان کے شہری ممبر آئے دن میری سرگرمیوں اور میرے سیاسی عقائد کا تمسخر اڑاتے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ طرزِ عمل مجھے تاریخ ہند کے ایک مشہور واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ وہ واقعہ نادر شاہ کا حملہ ہے۔ جو ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر ہوا تھا۔ نادر ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر گیا اور پنجاب کے میدانوں کو روندتا ہوا آندھی کی طرح مغلیہ حکومت کے دارالسلطنت دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا

محمد شاہ کو اس حادثہ کی اطلاعیں برابر پہنچ رہی تھیں۔ لیکن اُس عیش پرست شہنشاہ نے اس سارے واقعہ کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ نادر کرنال پہنچ گیا۔ جہاں سے اُس نے بادشاہِ دہلی کو آخری خط لکھا۔ اور چند شرائط پیش کیں جن کو اگر قبول کر لیا جاتا تو کسی قسم کی خونریزی نہ ہونے پاتی۔ لیکن محمد شاہ نے اس خط کو بھی ایک مذاق یا لطیفہ تصوّر کیا۔ اور عالمِ سرخوشی میں کاغذ کے اُس ٹکڑے کو یہ کہہ کر شراب کے پیالہ میں پھینک دیا کہ: ؎

این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولٰے

میں اپنے حریفوں، مخالفوں اور معترضوں سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ اُن ہولناک نتائج پر ضرور غور کریں جو محمد شاہ کے مضحکہ خیز طرزِ عمل سے پیدا ہوئے تھے۔ دیہاتیوں کے جائز مطالبات کا تمسخر اُڑا کر میرے مخالفین بھی وہی خطرہ مول لے رہے ہیں۔ جو محمد شاہ پر ایک عذاب بن کر نازل ہوا تھا۔ دو ہی دن کے اندر محمد شاہ کے ہوش وحواس درست ہو گئے تھے۔ اور اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ نہ تو نادر شاہ کی یلغار کوئی ہنسی مذاق تھی۔ اور نہ اُس کا تہدید آمیز خط ہی کوئی لطیفہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ایوان کے شہری ممبر، جو دولت اور دولت سے پیدا ہونے والے پندار کے نشے سے بدمست ہیں (ایک آواز: تمام شہری بدمست نہیں ہیں) آپ کی اصلاح کا شکریہ! ان پنجوں

پر بیٹھنے والے (بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) لوگ جو زیادہ تر شہری مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جنھیں اپنی دولت کا بڑا گھمنڈ ہے۔ اور جو اپنی اعلیٰ تنظیم و تعلیم کے نشے میں سرشار ہیں دیہاتیوں اور زمینداروں کے مطالبات کو ایک مذاق سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ممکن ہے کچھ مدت کے لیے وہ اپنی اس خیالی دُنیا میں غافل و بے ہوش رہیں۔ لیکن وہ گھڑی آنے والی ہے جب دیہاتیوں اور زمینداروں کی تحریک پوری قوت سے اُٹھے گی۔ اور اپنی یلغار میں اِن لوگوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گی قبل اس کے کہ وہ گھڑی آئے۔ میں اِن لوگوں کو اُن کے انجام پر متنبہ کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

کونسل کے وہ دو، چار مسلمان ممبر جو شہری حلقوں سے منتخب ہو کر آئے تھے سب کچھ سُنتے اور دیکھتے تھے۔ لیکن قوم کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ اُنھیں یہی اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے بھی زبان کھولی۔ تو مسلمانوں میں خانہ جنگی کی ایک نئی بنیاد کھڑی ہو جائے گی۔ چودھری چھوٹو رام نے جب پے در پے اپنی آتش بیانی کے جوہر دکھانا شروع کیے۔ اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے صوبے کی شہری آبادی کو اپنی دشنام طرازی کی لپیٹ میں لے لیا تو شیخ دین محمد[1] نے

---

[1] شیخ دین محمد اُس زمانہ میں گوجرانوالہ میں پریکٹس کرتے تھے۔ بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں باؤنڈری کمیشن کے ممبر بھی تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ کے گورنر ہو گئے تھے۔ بعد میں معاملاتِ کشمیر میں حکومتِ پاکستان کے مشیر ہو گئے تھے۔

مجبور ہو کر ایک تقریر میں کونسل کے مسلمان شہری نمائندوں کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا :

"...... ہماری بدقسمتی ہے کہ اِس ایوان میں ہر موضوع پر بحث کرتے ہوئے شہری اور دیہاتی کی تمیز پیدا کر دی جاتی ہے مجھے یہ عرض کرنے میں ہرگز کوئی تامّل یا تکلف نہیں کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے باہمی مفاد میں قطعاً کسی قسم کا تصادم یا عناد نہیں ہے (نعرہ ہائے تحسین) اگر بعض خود غرض لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے جدا جدا اور الگ الگ ہیں - تو میں اس خیال کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں - دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کرنے والے لوگ جو چاہیں سمجھیں - اور جو نقطہ نگاہ چاہیں پسند کریں - انھیں اس بات کا اختیار ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ آبادی کے یہ دونوں طبقے ایک ہی قسم کے قوانین کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں - دونوں پر ایک ہی قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں - اور دونوں ایک ہی قسم کی مجبوریوں اور مصیبتوں سے پریشان ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ تہذیبِ جدید کے جملہ فوائد سے شہری باشندوں نے نسبتاً جلد متمتع ہونا شروع کر دیا تھا اور یہ فوائد دیہاتی آبادی تک دیر میں پہنچے ہیں -

"جنابِ والا ! اِس ایوان کے اُن تمام ممبروں نے جو شہری حلقوں کی نمائندگی کرتے ہیں ، کم از کم اُن شہری ممبروں نے جو ایوان کی اِس سمت بیٹھتے ہیں قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک دیہاتیوں کے

مفاد کی پوری نگہداشت نہ ہو جائے گی۔ وہ اپنے ذاتی مفاد و آرام کو ترک کیے رکھیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ دیہاتیوں کی ترقی میں ہماری ترقی کا راز مضمر ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب تک دیہاتیوں کے مصائب رفع نہیں ہوں گے۔ ملک کی نجات نہیں ہو سکتی۔"

شیخ دین محمد غیر زراعت پیشہ تھے۔ شہری حلقے سے منتخب ہو کر آئے تھے اور یونینسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ جو کچھ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے پنجاب کی مسلمان تعلیم یافتہ شہری آبادی کو اتفاق تھا۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق شدت سے زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس تفریق کا سب سے بڑا اثر اُن شہری مسلمانوں پر پڑا۔ جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد محض اس لیے مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کا خاندان قانونِ انتقالِ اراضی کے تحت زراعت پیشہ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ اور نہ اُن کی پشت پر کسی بڑے زمیندار کی سفارش تھی۔ جب ملازمتوں کے بٹوارے میں بھی جاٹ، راجپوت، اعوان اور گکھڑ کی تمیز روا رکھی جانے لگی۔ اور وزراء سے آئے دن اس موضوع پر جواب طلب کیے جانے لگے۔ تو اس بدلے ہوئے ماحول میں محض اوّل درجہ کی تعلیمی سند کو کامیابی کا پروانہ سمجھ لینا حماقت تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں سردار جوگندر سنگھ نے اپنے محکمے کے جو اعداد و شمار پیش کیے اُن میں ملازمتوں کا تناسب یہ تھا:۔

پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کل چودہ مسلمان تھے۔ جن میں سے تیرہ زراعت پیشہ دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھا۔ ایگریکلچرل اسسٹنٹ کی جو نسبتاً ادنیٰ اسامیاں مسلمانوں کے پاس تھیں جن میں سے ترسٹھ زراعت پیشہ

دیہاتی اور ایک غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھا۔

پراونشل ویٹرنری سروس میں کل دس مسلمان تھے۔ جن میں سے آٹھ زراعت پیشہ دیہاتی اور دو غیر زراعت پیشہ شہری مسلمان تھے۔

اس کے برعکس انہی ملازمتوں میں ہندوؤں کا تناسب حسب ذیل تھا:

پراونشل ایگریکلچرل سروس میں کل گیارہ ہندو تھے۔ جن میں سے چار زراعت پیشہ دیہاتی اور سات غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

ایگریکلچرل اسسٹنٹ کی چھپن اسامیاں ہندوؤں کے پاس تھیں جن میں سے انیس[19] زراعت پیشہ دیہاتی اور سینتیس غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

پراونشل ویٹرنری سروس میں کل پانچ اسامیاں ہندوؤں کے پاس تھیں اور یہ پانچوں غیر زراعت پیشہ شہری ہندو تھے۔

تجارت، صنعت و حرفت اور کاروبار میں شہری مسلمانوں کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ تمام پیشے کلیتہً ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ بیمہ کمپنیوں، بنکوں اور درآمد و برآمد کے اداروں میں مسلمان ڈھونڈے سے نظر نہیں آتا تھا۔ کاشتکاری اور زمینداری کے دروازے بھی شہری مسلمانوں پر بند ہو چکے تھے۔ ان حالات نامساعد میں لے دے کے صرف سرکاری ملازمت رہ گئی تھی۔ جس سے شہروں کے تعلیم یافتہ مسلمان روٹی کما سکتے تھے۔ لیکن یہاں یونینسٹ پارٹی نے اُن کے راستے میں ایک سنگین دیوار کھڑی کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ شہری مسلمانوں میں بے کاری بڑھنے لگی۔ اور روز افزوں بے کاری کے ساتھ اضطراب، انتشار اور پریشانی میں بھی

اضافہ ہونا شروع ہوا۔

میں اُس وقت جب پنجاب میں شہری اور دیہاتی کی تفریق آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج کی طرف جارہی تھی۔ ہندوستان کی سیاسیات میں ایک ایسا انقلاب آرہا تھا۔ جس نے پنجاب کے مسلمانوں کو بالواسطہ متاثر کرنا شروع کیا۔ فضلِ حسین اور جناح کے تعلقات میں اب تک کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ دونوں کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں میثاقِ لکھنؤ مرتب ہوا تھا۔ دونوں نے ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ دونوں آئینی جدّوجہد کے قائل اور آل انڈیا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔ لیکن اب حالات نے ایک ایسی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ جس سے فضلِ حسین اور جناح کے تعلقات کشیدہ ہوئے فضلِ حسین نے آل انڈیا مسلم لیگ سے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا پروانہ چھین لینے کی پوری کوشش کی۔ اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے فضلِ حسین کے حیرت انگیز اثر و رسوخ نے جناح کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا۔ اور آخر اسی یاس و حرماں اور شکستہ خوردگی کے احساس ہی نے انھیں وطن ترک کرنے اور انگلستان میں مستقل اقامت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فضلِ حسین اور جناح کی یہ کشیدگی آخر وقت تک قائم رہی۔ اور اسی کشیدگی کی وجہ سے فضلِ حسین نے ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں جناح اور مسلم لیگ کے پاؤں نہ جمنے دیئے۔ اس تمام عرصے میں فضلِ حسین نے سیاسیات کے ایک بہت بڑے ماہر اور چابکدست شاطر کی طرح پسِ پردہ رہ کر جو کھیل کھیلا۔ اُس کو دیکھ کر اُن کے حریفوں کو بھی اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ یہ شخص اپنے فن میں یگانۂ روزگار ہے۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں کانگریس کے اجلاس گوہاٹی کے صدر سری نواس آئنگر تھے۔
مدراس کے ایک مشہور قانون دان اور مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کے ڈپٹی لیڈر
تھے۔ شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات سخت خراب ہو چکے تھے
اور آئے دن فرقہ وارانہ فساد برپا ہو رہے تھے۔ سری نواس آئنگر بڑے دردمند
اور نیک نیت تھے۔ انھیں اس صورت حال سے سخت رنج پہنچ رہا تھا۔ انھوں
نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں سے پے در پے درخواست
کی کہ آپس میں صلح و صفائی سے رہنا چاہیے۔ سری نواس آئنگر اور مسٹر جناح کے
تعلقات آپس میں بہت دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ دونوں مرکزی اسمبلی میں
بڑی یگانگت اور اتفاق سے کام کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء کے اجلاس بجٹ کے دوران
میں جناح اور آئنگر غیر رسمی طور پر ایک دوسرے سے ملتے اور ملک کے سیاسی
حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ دونوں اس بات کے دل سے خواہاں تھے
کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا کوئی مستقل اور پائدار حل تلاش کرنا چاہیے تاکہ یہ روز روز
کا خون خرابہ ختم ہو۔

آخر ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح کی دعوت پر ہندوستان کے تیس سربرآوردہ
اور مختلف الخیال مسلمان لیڈر دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں جمع ہوئے تاکہ فرقہ وارانہ
جھگڑوں کو ختم کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل مفاہمت پیدا کرنے
کی کوئی تجویز سوچی جائے۔ اس مجمع میں مسٹر جناح کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد، مولوی
شفیع داؤدی، نواب اسمٰعیل خان، میاں شاہ نواز، سر عبدالرحیم، سردار محمد نواز خان،
عبدالمتین چودھری، سید عبدالعزیز، نواب سر ذوالفقار علی خان، ڈاکٹر ایل کے حیدر،

مولوی سید مرتضےٰ۔ امام صاحب جامع مسجد دہلی۔ ڈاکٹر سر عبداللہ المامون سہروردی۔ سید آلِ نبی۔ شاہ محمد زبیر وغیرہ شامل تھے۔ مسٹر جناح کی صدارت میں اس اجتماع نے سری نواس آئنگر کی اُن تجویزوں پر غور کیا۔ جو انھوں نے باضابطہ مسٹر جناح کو ارسال کی تھیں۔ یہ تجویزیں اس نقطۂ نگاہ سے مرتب کی گئی تھیں کہ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ میں ترمیم و تنسیخ کر کے ملک میں مخلوط انتخاب جاری کیا جائے۔

کافی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد یہ قرار پایا کہ اگر (۱) سندھ کو احاطۂ بمبئی سے الگ کر کے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے (۲) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجاتِ ہند کی طرح اصلاحات رائج کر دی جائیں (۳) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایوان کی ⅓ تعداد سے کم نہ ہو (۴) پنجاب اور بنگال کی مجالسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی اُن کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے۔ (۵) مسلمانوں کی اقلیت کے صوبوں میں اُن کا ویٹج برقرار رکھا جائے۔ تو مسلمان ہندوستان کے مرکز اور تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔

۲۹ مارچ ۱۹۲۷ء کو مسٹر جناح نے اِن تجاویز کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ:

"معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اِن تجاویز کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ مجالسِ قانون ساز میں نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب مسلمان جبھی قبول کریں گے کہ پہلے ہندو ہماری

یہ شرائط تسلیم کر لیں۔ کہ سندھ کو احاطہ بمبئی سے علیحدہ کیا جائے اور صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں جب ہندو یہ شرطیں منظور کر لیں گے۔ اور ہمارے مطالبات کی تائید کر دیں گے تو مسلمان اپنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اسلامی اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو جو ویٹیج حاصل ہے۔ اُس کے بدلے میں سندھ، سرحد اور بلوچستان میں ہندو اقلیتوں کو ویٹیج دیا جائے گا۔ اس ویٹیج کی صحیح تعداد معین کرنے اور باہمی اتمام و تفہیم کے لیے ہندو اور مسلمان اپنی الگ الگ کمیٹیاں بنائیں گے۔ پنجاب اور بنگال میں دونوں قوموں کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی مقرر کی جائے گی یعنی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ انتخاب مخلوط ہو گا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی پورے ایوان کی ⅓ تعداد سے کم نہ ہو گی۔ اور جہاں بھی نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب رائج کیا جائے گا۔

ہماری اس پیش کش کی تمام شقیں ایک دوسرے سے ملحق اور لازم و ملزوم ہیں اگر فریقِ ثانی اس پیش کش کو قبول کرتا ہے تو کلی اور مجموعی حیثیت سے قبول کرے۔ اور اگر رد کرتا ہے تو بھی کلی اور مجموعی حیثیت سے رد کرے۔

سو اس پیشکش کا، جو نتائج کے اعتبار سے بڑی دُور رس ہے سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ جُداگانہ نیابت سے چھٹکارا پانے کا صرف یہی

ایک حل ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ حصّہ ترک کرنے پر بخوشی رضامند ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ان تجاویز پر رواداری اور فراخ دلی سے غور کیا جائے گا۔ جہاں تک طریقِ انتخاب کا تعلق ہے۔ وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں۔ انتخاب جداگانہ رہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی کے تحفظ و بقا کا پورا یقین ہو جانا چاہیئے۔ اور انھیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر ان کے حقوق پامال نہیں کر سکے گی۔ اور اس بات کا بھی یقین ہو جائے کہ ہندوستان میں مکمّل ذمّہ دارانہ قومی حکومت قائم ہونے تک کا جو درمیانی وقفہ ہے۔ اس میں وہ اکثریت کے جور و استبداد سے بالکل محفوظ رہیں گے اس لیے اس سارے قضیئے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کے حفظ و بقا کا کیونکر اطمینان دلایا جائے۔ مذکورہ بالا تجاویز مرتب کرتے وقت یہی نکتہ ہمارے پیشِ نظر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جونہی یہ بنیادی مسئلہ حسبِ خاطر طے ہو گیا۔ باقی تفصیلی اور جزوی معاملات آسانی سے طے کر لیے جائیں گے۔

"میرا ارادہ ہے کہ جب ہندو لیڈروں کی طرف سے اس پیشکش کا جواب موصول ہو گا۔ تو میں بہت جلد ایک مشترکہ اور نمائندہ اجلاس منعقد کروں گا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی کے اراکین

خلافت کانفرنس، اور جمعیتہ العلما کی مجالسِ عاملہ کے اراکین۔ کونسل آف سٹیٹ اور مرکزی اسمبلی کے مسلمان اراکین شامل ہوں گے اور پھر اِن تمام نمائندہ حضرات کے مشورے سے ایک منتخب کمیٹی بنائی جائے گی۔ جو اس بارے میں کانگرس۔ ہندو مہا سبھا اور ملک کی دوسری سیاسی انجمنوں کے نمائندوں سے گفت و شنید کر سکے گی۔ اِس قسم کے مذاکرات کے بعد جو آخری تجاویز مرتب ہوں گی۔ وہ اُس وقت تک نافذ نہیں ہو سکیں گی جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی جملہ نمائندہ انجمنیں اُن پر اپنی اپنی تصدیق و توثیق کی مُہر ثبت نہ کر دیں گی آخر میں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ملک جن نازک حالات میں سے اِس وقت گذر رہا ہے۔ اُس کے پیشِ نظر ہمیں مفاہمت و مصالحت میں قطعاً دیر نہیں کرنا چاہیئے۔"

۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کو سری نواس آئنگر کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ جہاں مسٹر جناح کی تجاویز کو من و عن منظور کر لیا گیا اور سارا ہندوستان تہنیت و مبارک باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ صدر کانگرس سری نواس آئنگر نے اِس صورتِ حال کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا :-

"عرصۂ دراز کے بعد یہ موقع پیش آیا ہے کہ ہندوستان کے سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں نے پہلی مرتبہ اِس قوی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں حقیقی اور پائیدار بنیادوں پر قومی زندگی استوار کی جائے۔ یہ تجاویز جواب تجاویز دہلی کے نام سے ہمارے ملک کی تاریخ میں مشہور ہو چکی

ہیں، ہمارے مسلمان احباب کی اسی خواہش کی آئینہ دار ہیں۔ اِن تجاویز پر بعض حلقوں میں نظری اعتراض کیے جا رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تجاویز اس وقت ہمارے درمیان ایک نہایت محفوظ اور معقول مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ جس پر آگے چل کر مستقبل میں مکمل و مستحکم قومیت کی عمارت کھڑی کی جا سکے گی۔"

پنڈت موتی لال نہرو نے کہا: "ملک میں اس وقت جو افسوسناک فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو چکی ہے اُس کو دُور کرنے کے لیے اِن تجاویز سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں۔"

ڈاکٹر انصاری نے فرمایا: "چند آدمیوں کو چھوڑ کر مسلمان قوم کی تمام سیاسی جماعتوں اور سیاسی عقیدہ کے رہنماؤں نے گذشتہ مارچ میں جناح کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ یقین کیجیے کہ جن لوگوں نے متحد و متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا اُن کے سامنے ایک سخت کٹھن منزل تھی۔ یہ فیصلہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور آپ کو اِس اَمر کا احساس ہونا چاہیئے کہ اِس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ فیصلہ ہر اعتبار سے انصاف، حُبِ وطن اور عزت و آبرو پر مبنی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اُس سپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو جناح کانفرنس میں جاری و ساری تھی۔ وہ سپرٹ

یہ تھی کہ ملک کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر ہم میں سے دونوں
فریقوں کو اپنے اپنے حقوق و واجبات میں سے کچھ نہ کچھ
حصہ ترک کرنا چاہیئے۔"

سروجنی نائیڈو نے کہا: "کانگرس نے مسٹر جناح کی حیثیت مسٹر کو کھلے ہندو مسلم اتحاد کا
بہترین سفیر کہا کہ۔ نیتے تھے، تجاویز منظور کر کے ثابت
کر دیا ہے کہ یہ جماعت ہندوستان کی نمائندگی کا
دعوےٰ کرنے میں بجا اور مخلص ہے۔ میں متحدہ قومیت ہند
کی طرف سے کانگرسی لیڈروں کی خدمت میں اُن کے
اِس کارنامے پر ہدیۂ تشکر و تہنیت پیش کرتی ہوں۔"

مولانا محمد علی نے فرمایا: "دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں مسلمان رہنماؤں کی جو کانفرنس
ہوئی تھی۔ اُس میں ہر نوع کا سیاسی عقیدہ رکھنے والے
لوگ شامل تھے۔ جب آخر تک تصفیہ کی کوئی صورت
نظر نہ آئی۔ تو ہم نمازِ مغرب کے لیے اُٹھے۔ او دبارگاہِ
ربی میں خلوصِ دل سے دعا کی۔ کہ اس وقت فرقہ وارانہ
کشیدگی سے ملک میں جو تاریکی چھا رہی ہے اُس میں ہمیں
منزلِ مقصود کا صحیح راستہ دکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ
قبولِ دعا کی گھڑی تھی۔ کیونکہ نماز کے فوراً بعد جب ہم
دوبارہ جمع ہوئے۔ تو مرکزی اسمبلی کے نائب صدر
(مسٹر محمد یعقوب) کی تحریک پر مخلوط انتخاب کی تجویز منظور

کر لی گئی۔ اور یوں اس قضیے کا فیصلہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہے
کہ آنے والی نسلیں ہمارے اس فیصلے پر ہمیشہ فخر کریں گی"۔

جس وقت جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں تجاویز دہلی پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ سر محمد شفیع نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے ان تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اعلان کیا کہ وہ جداگانہ انتخاب کبھی ترک نہیں کریں گے سر محمد شفیع ۲۰ مارچ کی جناح کانفرنس میں شریک تھے۔ اور اس وقت انھوں نے ان تجاویز کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ لاہور واپس پہنچے تو میاں فضل حسین نے ان سے صاف کہہ دیا کہ وہ مخلوط انتخاب پر رضامند نہیں ہیں۔ سر محمد شفیع کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ تجاویز دہلی سے روگردانی کریں۔

انھی دنوں اس امر کی تحقیقات کے لیے کہ آیا ہندوستان اصلاحات کی دوسری قسط حاصل کرنے کا مستحق ہے یا نہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ جس کے صدر سر جان سائمن تھے۔ اور اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے اس فیصلے کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں میں سے مسٹر جناح۔ سر عبدالرحیم۔ سر علی امام۔ سر محمد یعقوب اور مہاراجہ محمود آباد جیسے لوگوں نے اس کمشن کا مقاطعہ کرنے کی تجویزیں پیش کرنا شروع کیں۔ لیکن ایک اور طبقہ جس کے لیڈر سر محمد شفیع تھے مقاطعہ کا حامی نہیں تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی تجاویز دہلی کے مؤید اور

سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے علم بردار تھے۔ اِدھر سر محمد شفیع اور اُن کے ساتھی تجاویز دہلی سے منحرف اور سائمن کمشن سے تعاون کے حامی تھے میاں فضلِ حسین نے اپنی زبردست شخصیت کا سارا وزن ترازو کے اُس پلڑے میں ڈال دیا جس میں سر محمد شفیع بیٹھے تھے۔ وہ خود تو حکومتِ پنجاب کے ریونیو ممبر کی حیثیت سے سیاسیات میں کھلم کھلا حصہ لینے سے معذور تھے۔ لیکن اس کل کے تمام پرزے اُنہی کے اشاروں سے حرکت میں آ رہے تھے۔ اِس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصے نے، جس کے صدر سر محمد شفیع تھے دسمبر ۱۹۲۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں اپنا جلسہ منعقد کیا۔ اور دوسرے حصے نے جس کے کرتا دھرتا مسٹر جناح تھے اُنہی دنوں سر محمد یعقوب کی صدارت میں اپنا اجلاس کلکتہ میں کیا۔ اجلاسِ کلکتہ میں شرکت کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ملک برکت علی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ سر عبدالرحیم۔ سر علی امام۔ مہاراجہ محمود آباد۔ مسٹر ایم۔ سی چھاگلا۔ مولوی فضل الحق وغیرہ شامل تھے۔ اجلاسِ لاہور میں سر محمد شفیع کے علاوہ جن قابلِ ذکر لوگوں نے شرکت کی۔ اُن میں علامہ اقبال۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں اور مولانا حسرت موہانی موجود تھے۔

لاہور کے اجلاس میں تجاویزِ دہلی کی مخالفت اور سائمن کمشن سے تعاون کی قرار دادیں منظور ہوئیں اور اجلاس کلکتہ میں سائمن کمشن سے مقاطعہ کرنے اور تجاویزِ دہلی کی حمایت میں قرار دادیں پاس کی گئیں۔ تجاویزِ دہلی کی حمایت میں

ملک برکت علی نے اور سائمن کمشن سے مقاطعہ کی قرارداد مسٹر چھاگلا[1] نے پیش کی۔ تجاویز دہلی کی حمایت میں جب قرارداد پیش ہوئی تو تائید کرنے والوں میں مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جناح شامل تھے۔ مسٹر جناح نے تائید کرتے ہوئے فرمایا:۔

"...... یہ تجاویز بہت سے دماغوں کے مجموعی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ آپ یہ توقع نہ رکھیئے کہ ہر شخص کو اس طویل قرارداد کے ایک ایک لفظ یا ایک ایک جملے سے اتفاق ہو گا۔ لیکن جہاں تک اس روح کا تعلق ہے جو اس قرارداد میں جاری و ساری ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجویز ہندوستان کی دونوں قوموں کے لیے جائز، معقول اور منصفانہ ہے۔ اس ایوان کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ملک کی اکثریت کو بھی اپنے ساتھ شامل کر سکیں گے؟ اگر قوم کی اکثریت بھی ہماری ہم نوا بن جائے۔ تو مجھ سے بڑھ کر اور کسی کو مسرت نہ ہو گی۔ بہر حال یہ امر بھی تصفیہ طلب ہے۔ اور آئندہ ہمارا فرض ہو گا کہ عوام کو اس قرارداد کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کریں۔ اور انھیں اس کی صداقت کا یقین دلا کر اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کریں۔

---

[1] مسٹر محمد علی کریم چھاگلا بیرسٹر ایٹ لاء۔ اس وقت بمبئی صوبہ مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے آج کل آپ بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔

جہاں تک غرض و غایت اور مقاصد کا تعلق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کے لیے اس قرارداد سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی۔"

جب کلکتہ اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی دو شاخیں علیحدہ علیحدہ آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں، مدراس میں منعقد ہُوا اور وہاں بھی تجاویزِ دہلی کی حمایت میں ایک زبردست قرارداد منظور کی گئی۔ اب اگرچہ مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ بایں ہمہ لیگ کا فریقِ غالب، جو اپنے فریقِ مخالف سے زیادہ طاقتور، ذی اثر اور فعال تھا کانگریس کا ہم نوا بن چکا تھا۔ ترکِ موالات اور خلافت کا دور ختم ہو جانے کے باوجود ملک میں اُن مسلمان لیڈروں کا وقار ہنوز قائم تھا۔ جنھوں نے ابھی چند سال قبل ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی تحریک چلائی تھی۔ اور جنھوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پہلی بار پشاور سے لے کر راس کماری تک مسلمانوں کو ایک ہی قومی نظام کے تحت لا کھڑا کیا تھا۔ سر محمد شفیع جانتے تھے کہ ایسے لوگوں کے سامنے اُن کا چراغ نہیں جل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی لاہور تشریف لائے۔ اور انھوں نے موچی دروازہ کے باہر ایک جلسے میں سر محمد شفیع کو للکار کر کہا۔ کہ اگر وہ سائمن کمیشن سے تعاون کے حامی اور تجاویزِ دہلی کے مخالف ہیں تو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال سے نکل کر یہاں آئیں تاکہ کھلے میدان میں لوگ اُن کے دلائل سن سکیں۔ تو سر محمد شفیع کو سر فروش محمد علی کی یہ دعوتِ مبارزت قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یوں بھی سالہا سال اور عرصۂ دراز سے مسلم لیگ اور مسٹر جناح ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملحق و پیوست - اور لازم و ملزوم ہو چکے تھے کہ لیگ کو جناح یا جناح کو لیگ سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا - سر محمد شفیع اور سر فضل حسین کی کوشش سے اگرچہ لیگ کی ایک شاخ کا اجلاس جیبیہ ہال میں ہو چکا تھا - لیکن عوام کے نزدیک حقیقی مسلم لیگ وہی تھی جس کے سر گروہ مسٹر جناح تھے - مسلم لیگ کا ماضی - اس کی پوری تاریخ اور ساری جدّ و جہد اُسی مسلم لیگ سے وابستہ تھی جس کی قیادت جناح کے ہاتھ میں تھی - یہ حقیقت عوام و خواص کے علاوہ خود ارکانِ حکومت کو بھی معلوم تھی - یہ صحیح ہے کہ جب سائمن کمشن ہندوستان میں وارد ہوا تو شفیع لیگ نے اس کا خیر مقدم بھی کیا - اُس کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات بھی پیش کئے - اور اُسے اپنے اشتراک و تعاون کا یقین بھی دلایا - لیکن یہ ایک عارضی چیز تھی - جو ہوا کے جھونکے کی طرح اِدھر سے اُدھر نکل گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ سائمن کمشن کے رخصت ہوتے ہی اس لیگ کی سرگرمیوں پر اوس پڑ گئی - اور سر محمد شفیع پھر گوشۂ عافیت میں جا کر بیٹھ گئے -

سر محمد شفیع اپنی اعتدال پسندی اور عافیت کیشی کے اعتبار سے طبعاً اس قابل نہ تھے کہ مستقل طور پر اُس مسلم لیگ کے حریف بن سکیں جس کی پشت پر جناح - محمد علی - شوکت علی - ظفر علی خاں - کچلو - تصدق شروانی اور انصاری جیسی شخصیتیں کارفرما تھیں - میاں فضلِ حسین اس راز سے واقف تھے - اس لیے جیبیہ ہال کے جلسے کے بعد اُن کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جناح کا اثر زائل کرنے کی سب سے بہتر تدبیر کیا ہو سکتی ہے - سائمن کمشن کی تحقیقاتی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہندوستان

کے لیے جدید اصلاحات کے خاکہ کی ترتیب و تدوین شروع ہونے والی تھی اور اس کام میں میاں فضلِ حسین سراسر اپنی رائے اور صوابدید سے مسلمانوں کی رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے جب تک جناح اور فضلِ حسین ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ فضلِ حسین کو نہ لیگ پر اعتماد ہو سکتا تھا۔ اور نہ جناح کے ہاتھ میں مسلمانوں کا ہاتھ دینے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

چند ہی مہینوں کے اندر حالات میں خود بخود ایک ایسا تغیر آنا شروع ہوا جس سے بتدریج فضلِ حسین کا کام آسان ہوتا چلا گیا۔ مئی ۱۹۲۷ء میں جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے تجاویزِ دہلی کی منظوری کا اعلان کیا تھا۔ تو اس کے ساتھ یہ تحریک بھی شروع ہو گئی تھی کہ ہندوستان کا ایک دستورِ اساسی وضع کرنا چاہیئے تاکہ وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ کا منہ بند کیا جا سکے۔ جو آئے دن یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک کا دستور (کانسٹی ٹیوشن) وضع کرنے سے معذور ہیں۔ یہ تحریک سال بھر چلتی رہی۔ بالآخر ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو کانگرس کی کوشش سے بمبئی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اور اس کانفرنس نے دستور وضع کرنے کا کام ایک سب کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ جس کے یہ دس ارکان تھے۔ سر علی امام شعیب قریشی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ ایم۔ ایس اینے۔ ایم آر جیکر۔ جی آر پردھان۔ سردار منگل سنگھ۔ سر تیج بہادر سپرو۔ ایم این جوشی۔ سبھاش چندر بوس۔ پنڈت موتی لال نہرو اس کمیٹی کے صدر تھے۔

۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل پارٹیز کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ جہاں سب کمیٹی نے اپنے وضع کیے ہوئے دستورِ اساسی کی رپورٹ

جسے آئندہ نہرو رپورٹ کا نام دیا جانے والا تھا، پیش کی۔ اس رپورٹ میں تجاویزِ دہلی سے صریحاً انحراف کیا گیا تھا۔ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی بجائے بالغوں کو حقِ رائے دہندگی عطا کر کے، بلا تخصیص، مخلوط انتخاب رائج کر دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مرکز میں بھی مسلمانوں کو ⅓ نشستیں دینے سے انکار کر کے مخلوط انتخاب کی سفارش کر دی گئی تھی۔ مولانا محمد علی اُس وقت بغرضِ علاج یورپ گئے ہوئے تھے۔ مسٹر جناح بھی انگلستان میں تشریف فرما تھے البتہ مولانا شوکت علی اجلاس میں موجود تھے۔ اُنھوں نے اِن تجاویز کی مخالفت کی۔ لیکن کانفرنس نے اس شرط کے ساتھ منظوری عطا کر دی کہ دسمبر میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوگا تو ایک کنونشن منعقد کر کے نہرو رپورٹ پر آخری مہرِ تصدیق ثبت کی جائے گی۔

پنجاب میں میاں فضلِ حسین اور سر محمد شفیع نے اِس صورتِ حال سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور یہ پراپاگنڈہ شروع ہو گیا۔ کہ اگر مسلمان مارچ ۱۹۲۷ء میں تجاویزِ دہلی پیش کر کے اپنے قومی موقف سے رُوگردانی اختیار نہ کرتے اور کسی شرط پر بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے کی ہامی نہ بھرتے۔ تو آج نہرو رپورٹ مرتب کرنے والوں کو مسلمانوں کے قومی مطالبات کے ساتھ یہ استہزا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ روزنامہ انقلاب کو لاہور سے جاری ہوئے بمشکل ڈیڑھ سال گذرا تھا لیکن اِس پراپگنڈے میں انقلاب پیش پیش تھا۔ اور آئندہ نہرو رپورٹ کو ختم کرانے اور مسلمانوں میں جداگانہ حقوق کا شعور پیدا کرنے میں جس شدت، تواتر اور تسلسل سے انقلاب

نے زوردار مقالے لکھے۔ اُس کی نظیر ہندوستان کا اور کوئی اردو اخبار پیش نہیں کر سکا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس پھر کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ اور مہاراجہ محمود آباد کو اُس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ مہاراجہ محمود آباد تجاویزِ دہلی کے مؤید تھے اور نہرو رپورٹ کے بھی حامی سمجھے جاتے تھے۔ اِس لیے عام قیاس تھا کہ اُن کی صدارت اور مسٹر جناح کی رہنمائی میں لیگ بہر صورت نہرو رپورٹ کو منظور کرے گی۔ سر محمد شفیع دوبارہ اپنی لیگ کا علیحدہ اجلاس کرنے سے معذور تھے۔ یوں بھی شفیع لیگ کی نمائندہ حیثیت ہر اعتبار سے محلِ نظر بن گئی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ کلکتہ میں نہرو رپورٹ پر منظوری کی مہر ثبت کر دی گئی تو اِس فیصلے کو رَدّ کرنے کے لیے مسلمان کیا ذرائع اختیار کر یں گے۔ یہاں میاں فضلِ حسین کے زرخیز دماغ نے ایک ایسی تجویز ڈھونڈ نکالی۔ جو آگے چل کر اپنے نتائج کے اعتبار سے، اِس قدر مؤثر ثابت ہوئی کہ اُس نے مسلسل کئی سال تک مسلم لیگ کو سیاسیاتِ ہند سے خارج کیے رکھا۔

فضلِ حسین کی در پردہ اور سر محمد شفیع کی ظاہرا کوشش سے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا خاکہ تیار کیا گیا۔ جس کی ہئیتِ ترکیبی یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کی مختلف قومی جماعتوں سے کم از کم چھ سو نمائندے مدعو کیے جائیں یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کی شاخہائے کلکتہ و لاہور سے بیس بیس نمائندے۔ آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلمائے ہند سے بیس بیس نمائندے۔ ہندوستان کے ہر صوبے کے مسلمانوں کے بیس بیس نمائندے۔ مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے تمام غیر سرکاری

مسلمان ممبر۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے کی مجلسِ قانون ساز کے تمام غیر سرکاری مسلمان ممبر۔ یہ لوگ جن کی مجموعی تعداد چھ سو (۶۰۰) کے لگ بھگ ہو گی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخری عشرے میں دہلی میں جمع ہو کر پوری بلند آہنگی سے تجاویز دہلی کی تردید اور نہرو رپورٹ کی مخالفت میں آواز بلند کریں۔ اس اجتماع کی صدارت کے لیے آغا خان کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ جنھیں خط و کتابت کے ذریعے سے اِس کام پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ تاہم مزید تشفی اور بالمشافہ گفتگو کے لیے سر محمد شفیع خود یورپ تشریف لے گئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہندوستان کی سیاسیات میں آغا خان کا کوئی عملی دخل باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن برطانیہ کے اونچے طبقے میں جتنی شہرت اور مقبولیت انھیں حاصل تھی۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کا بڑے سے بڑا اور نامور سے نامور آدمی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع اس راز سے واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ آغا خان کی صدارت میں جو آواز بلند کی جائے گی۔ اُس کی بازگشت اور کہیں سے اٹھے یا نہ اُٹھے۔ لیکن لندن کے وائٹ ہال میں اس کی گونج ضرور سنائی دے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء کا آخری ہفتہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مسلم لیگ۔ کانگرس اور آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے۔ مسلم لیگ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نہرو رپورٹ کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ آخر ایک قرارداد کے ذریعے سے یہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر جناح کی قیادت میں تئیس نمائندے آل پارٹیز کنونشن میں، جہاں نہرو رپورٹ

زیرِ بحث آنے والی تھی، شامل ہوں۔ اور چند ضروری تجاویز مجلس پیش کریں۔

اِن تیس نمائندوں میں مسٹر جناح کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد۔ ڈاکٹر کچلو۔ ایم سی چھاگلا۔ ملک برکت علی۔ ڈاکٹر سیّد محمود۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سیٹھ عبداللہ ہارون(؟)۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ سیٹھ یعقوب حسن۔ تصدق احمد خاں شروانی۔ چودھری خلیق الزماں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ مولوی فضل الحق۔ سر عزیز الحق۔ شاہ محمد زبیر۔ مولوی اکرم خاں وغیرہ موجود تھے۔

اُنہی دنوں آغا خاں کی صدارت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد دہلی میں ہو رہا تھا۔ اور کانفرنس کے سیکرٹری فضل رحمت اللہ نے مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ لیکن مسلم لیگ نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا نے لیگ کے اجلاس میں اِس موضوع پر ایک الگ قرارداد پیش کی۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

"آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری نے مسلم لیگ کو اِس مضمون کی دعوت ارسال کی ہے۔ کہ اِس کانفرنس میں لیگ اپنے نمائندے بھیجے۔ افسوس ہے کہ مسلم لیگ یہ دعوت قبول کرنے سے معذور رہی ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ کی پختہ رائے ہے کہ اگر قومی جدّوجہد کے دوران میں ہر نازک موقع پر اِس کانفرنس کی قسم کے ہنگامی اور حریف ادارے قائم کرنے کی رسم چل نکلی۔ تو بالآخر مسلمانوں کے مجموعی مفاد کے لیے سخت نقصان رساں ثابت ہوگا۔ لیگ کی رائے میں تمام محبِ وطن مسلمانوں کا فرض تھا کہ اِس وقت مسلم لیگ

کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر فیصلہ کرنے کہ آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے لیگ کی یہ بھی رائے ہے کہ جو آئینی طرزِ عمل مسلم کانفرنس نے اختیار کیا ہے۔ اور جس کا خاکہ کانفرنس کے سیکرٹری نے اپنے دعوت نامے میں درج کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکے گا۔ اور نہ اِس طرزِ عمل سے کانفرنس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔"

مسٹر چھاگلا نے یہ قرارداد پیش کرتے وقت کہا کہ:

"اگر ہم نے مسلم کانفرنس میں اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت قبول کر لی۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم گویا خود اپنے ہاتھ سے لیگ کی موت کے محضر پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کانفرنس سراسر مسلم لیگ کے لیے باعثِ توہین ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت نہیں رہی۔"

مسٹر جناح نے اِس قرارداد کی تائید میں ایک پُر جوش تقریر کی اور فرمایا:

"اِس کانفرنس کا انعقاد صرف اِس لیے کیا گیا ہے کہ مسلم لیگ کو کسی نہ کسی طرح پسِ پشت پھینک دیا جائے۔ لہذا ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرنا، جو اپنے دعوے کی رُو سے خود اپنے خلاف مصروفِ پیکار ہیں ہماری غیرت، ہمارے وقار اور ہمارے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ میں کانفرنس کے بانیوں کو متنبہ کر دینا اپنا

فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر کانفرنس نے اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا جس کی زد لیگ یا لیگ کے اصولوں پر پڑی۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ، جو مسلمانوں کی تنہا نمائندہ جماعت ہے، اُس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔"

۳۱ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کنونشن میں مسلمانوں کے تئیس نمائندے شریک ہوئے۔ جن کی ترجمانی کے فرائض مسٹر جناح نے ادا کئے۔ کنونشن کی فضا قطعاً امید افزا یا سازگار نہ تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو ہندو سبھا کے روز افزوں اثر کے نیچے آ کر اپنا وہ طنطنہ ترک کر بیٹھے تھے۔ جو کسی زمانے میں اُن کا شیوہ خاص سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے کے اتحاد نے کانگرس کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اور سوراجیوں کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کانگرس اگرچہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں اجلاسِ مدراس کے موقع پر ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا مطمحِ نظر قرار دے چکی تھی۔ لیکن نہرو رپورٹ میں مکمل آزادی کو ترک کر کے درجۂ مستعمرات کو اپنا نصب العین قرار دے دیا گیا تھا۔

مسٹر جناح کنونشن کی اس بدلی ہوئی فضا کو خوب محسوس کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے ملک و ملت کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر صرف تین ترمیمیں پیش کرنے پر اکتفا کیا اور فرمایا کہ اگر یہ ترمیمیں منظور کر لی گئیں تو آل انڈیا مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ وہ ترمیمیں ایسی ہرگز نہ تھیں۔ جن کے منظور کر لینے سے کنونشن کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہنچنے یا ہندوستان کی آئندہ ترقی کے راستے میں کوئی خلل واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔

پہلی ترمیم کا مفہوم یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں میں سے ⅓ مسلمان ہوں گے۔ دوسری ترمیم یہ تھی کہ اگر پنجاب اور بنگال میں بالغوں کو حقِ رائے دہندگی عطا نہ ہو سکا۔ تو مخلوط انتخاب رائج کر کے کم از کم دس سال کے لیے مسلمانوں کی نشستیں اُن کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں گی۔ اور دس سال کی میعاد گذرنے کے بعد مسلمانوں کو حق حاصل ہو گا کہ اس تجویز پر نظرِ ثانی کر سکیں تیسری ترمیم یہ تھی کہ اختیارات مابقی مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کیے جائیں گے۔

یہ ترمیمیں پیش کرتے وقت مسٹر جناح نے جو تقریر کی وہ دردمندی، مصالحت آمیزی اور حبِّ وطن کے جذبات سے لبریز تھی۔ انھوں نے کنونشن کو مخاطب کر کے جس خلوصِ بے پایاں سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ یہ شخص ہر قیمت پر ملک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ اس یادگار تقریر کا کچھ حصّہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہو گا۔

"......... جب ایک قوم آزادی کی جدّ و جہد میں مصروف ہو۔ اور فرزندانِ وطن حصولِ آزادی کے لیے بدیشی حکومت کے خلاف مصروفِ پیکار ہوں۔ تو اُس وقت آپ کو لامحالہ اقلیتوں کا مسئلہ طے کرنا پڑے گا۔ آپ جس طرح کا دستورِ اساسی چاہیں وضع کر لیں۔ جب تک اقلیتیں یہ محسوس نہیں کریں گی۔ کہ اُن کے حقوق محفوظ ہیں۔ وہ اُس دستور کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تامّل سے کام لیں گی۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ضمن میں، اقلیتوں کی حفاظت ہی قوم پرستی کی سب سے

بڑی آزمائش ہے ۔۔۔۔۔ میں اس وقت ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ اور میری یہ آرزو ہے کہ میں آزادی کی جد و جہد میں نو کروڑ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھوں کیا آپ محض اِس خیال سے مطمئن ہو جائیں گے کہ چند مسلمان آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں؟ کیا آپ صرف اس بات سے مطمئن ہو جائیں گے کہ جناح یہ کہتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں"۔ کیا آپ جناح کی شرکت کے متمنّی ہیں یا پوری مسلمان قوم کے اشتراک کے خواہاں ہیں؟ ۔۔۔۔۔ خدارا یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کو دھمکیاں دے رہا ہوں۔ مجھے یہی اندیشہ ہے کہ کہیں میری باتوں کو غلط معنے نہ پہنائے جائیں۔ اگر اقلیتوں کا یہ مسئلہ آپ نے آج حل نہ کیا۔ تو لازماً کل کو حل کرنا پڑے گا۔ ہم ایک ہی مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہمیں مِل جُل کر اسی ملک میں زندگی بسر کرنا۔ اور یہیں روزمرّہ کا کام کاج کرنا ہے۔ اِس لیے اگر ہمارے درمیان باہمی اختلاف ہیں بھی۔ تو اُن کی وجہ سے دشمنی اور عداوت تو مول نہ لے لیجئے۔ اگر ہم اتفاق اور یگانگت پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ تو کم از کم اتنا تو کریں کہ دشمنوں کی مانند ایک دوسرے کا سر پھوڑ کر نہیں۔ بلکہ دوستوں کی طرح آپس میں مصافحہ کر کے جُدا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلم اِتحاد کے بغیر ہندوستان کی

ترقی ناممکن ہے۔ اس لیے ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے راستے میں کسی خیالی منطق، کسی فلسفے اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجیے۔"

مسٹر جناح کی ان دردمندانہ گذارشات کے باوجود کنونشن نے تینوں ترمیمیں منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی بھی کنونشن میں موجود تھے۔ لیکن وہ مسلم لیگ کے نمائندے بن کر نہیں بلکہ کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے جب درجۂ مستعمرات کے خلاف تقریر کرنا چاہی تو لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مولانا نے تنگ آکر کہا "اگر یہ غنڈہ گردی جاری رہی تو میں تقریر نہیں کر سکوں گا۔"

حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا "سب سے بڑے غنڈے تو خود آپ ہیں۔"

مولانا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی تھے۔ انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے کنونشن کو بے نقط سنائیں اور دل کی بھڑاس نکال کر واپس چلے آئے۔

کنونشن نے بڑے دھوم دھڑکے سے نہرو رپورٹ پر منظوری کی مہر ثبت کر دی لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ وہ شخص جو مسلم لیگ کی روحِ رواں، مسلمانوں کی نیابت کا مستحق ترین دعویدار اور کانگرس سے اتحاد و اتفاق برقرار رکھنے کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ اس کی تینوں نہایت بے ضرر ترمیمیں رد کر کے اسے یقین دلا دیا گیا کہ کانگرس کو نہ تو اس کے تعاون کی ضرورت ہے اور نہ کانگرس اس کی دوستی کی خواہاں ہے۔ اب ایک طرف کانگرس نے تکبر و رعونت سے سرشار ہو کر اس ارمغانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ جو جناح نے پیش کیا تھا۔ اور دوسری طرف دہلی میں خود مسلمانوں کے

۱؎ انڈین اینوئل رجسٹر (۱۹۲۸ء) جلد اول۔

ایک بہت بڑے اجتماع نے جناح کی قیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان حالات میں جناح کے لیے گوشۂ عزلت کے سوا اور کیا چارہ تھا۔

مولانا محمد علی کے مزاج میں انتہا پسندی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ جب وہ مہاتما گاندھی کی طرف جھکے۔ تو انھیں پیغمبری کا مرتبہ دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اب وہاں سے برگشتہ خاطر ہوئے۔ تو اُن کے مزاج میں پھر اشتعال پیدا ہوا اور وہ سیدھے دہلی تشریف لے گئے۔ جہاں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے انھوں نے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی۔ اور فرمایا کہ "فکر مت کرو۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایک مسلمان ہمیشہ تین کافروں پر غالب رہتا ہے۔"

مسلم کانفرنس کا انعقاد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں ہوا۔ آغا خاں بنفس نفیس صدارت کے لیے تشریف لائے تھے۔ کانفرنس کے حامیوں کے اندازے کے مطابق تین ہزار کا مجمع تھا۔ جس میں ذیل کے اصحاب نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ سر عبدالکریم غزنوی۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ ملک فیروز خاں نون۔ نواب سر محمد یوسف۔ نواب اسمٰعیل خاں۔ سر محمد شفیع۔ سر رضا علی۔ صاحبزادہ سلطان احمد خاں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شفیع داؤدی۔ سر محمد یعقوب۔ چودھری ظفر اللہ خاں۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ اور مفتی کفایت اللہ۔ مرکزی اسمبلی۔ کونسل آف سٹیٹ۔ اور یو۔ پی اور پنجاب کی مجالسِ قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی اکثریت بھی حاضر تھی۔ اس کے علاوہ بنگال۔ بمبئی۔ آسام اور صوبجاتِ متوسط کی کونسلوں کے بعض مسلمان ممبر بھی موجود تھے۔

آغا خاں کے خطبۂ صدارت کے بعد اہم ترین چیز وہ طویل قرارداد تھی جسے سر محمد شفیع نے پیش کیا۔ اس قرارداد میں جن امور پر زور دیا گیا۔ وہ یہ تھے اول، مسلمان کسی شرط پر اور کسی صورت میں بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ دوم، سندھ کو احاطۂ بمبئی سے الگ کیا جائے۔ سوم، شمال مغربی صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔ چہارم، ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر قائم کی جائے۔ پنجم، اختیارات باقیہ مرکز کی بجائے صوبوں کو تفویض کیے جائیں۔ ششم، مرکزی اسمبلی میں ⅓ نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔

سر محمد شفیع نے یہ قرارداد پیش کرتے وقت مسٹر جناح، آل انڈیا مسلم لیگ اور آل پارٹیز کنونشن پر پے در پے طعن و تشنیع کے نشتر چلائے۔ پہلے انھوں نے مسلم کانفرنس کی ہمہ گیر اور نمائندہ حیثیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"اس کانفرنس میں ہر خیال اور ہر نقطۂ نگاہ کے آدمی شریک ہیں۔ خلافت کمیٹی کی روح و رواں علی برادران ہیں۔ جمیعتہ العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ ہیں۔ مولانا شفیع داؤدی ہیں جنھوں نے ایک زمانے میں ترک موالات کو رکھا تھا۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے ایک سو سے زیادہ ممبر موجود ہیں پھر ان سب سے بالاتر وہ یکتائے زمانہ ہستی ہے جو اس وقت کرسی صدارت پر رونق افروز ہے اور جس کا مقابلہ آج دنیائے اسلام میں کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ یہ نظارہ دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص

اِس کانفرنس کو مسلمانانِ ہند کی نمائندہ آواز قرار دینے سے انکار کرنا ہے۔ تو یقیناً غلط اور جھوٹ کہنا ہے۔ جو فیصلے آج ہم کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ پوری مسلمان قوم کی ہم نوائی کا وزن شامل ہے اگر کسی شخص نے ان فیصلوں کو رَدّ کرنے کی کوشش کی۔ تو پھر جو نتائج برپا ہوں گے ہم اپنے آپ کو اُن کا ذمّہ دار قرار نہیں دیں گے ...... ہم نے مسٹر جناح کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ لیکن اُن کا ارشاد ہے کہ کلکتہ پہنچو۔ کیا مسٹر جناح یہ چاہتے ہیں کہ جو حشر اُن کا اور اُن کے ساتھیوں کا وہاں ہوا ہے۔ وہی حشر ہمارا بھی ہوتا؟ یہ پہلا موقع ہے کہ اغیار نے مسلمانوں کے کسی قومی ادارے کے ساتھ ایسا شرمناک سلوک روا رکھا ہے۔ میں اِس واقعہ کو تنہا مسلم لیگ ہی کی توہین نہیں سمجھتا بلکہ اسے پوری مسلمان قوم کی رُسوائی کے مترادف قرار دیتا ہوں ...... کنونشن میں مسٹر جناح کے سوا اور کسی کو بھی بولنے تک نہیں دیا گیا۔ خود مسٹر جناح کی تقریر کے دوران میں شرم شرم کے نعرے لگتے رہے۔ اور اُن کی ہر درخواست کو ہندوؤں نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اگر ہم کنونشن میں شریک ہوتے۔ تو یقیناً ہمارے ساتھ بھی یہی ذلّت آمیز سلوک کیا جاتا۔ کلکتہ جانے اور مفت میں رُسوائی مول لینے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم یہاں جمع ہو کر اپنے مطالبات پیش کریں۔ اگر برطانوی حکومت نے ہمارے اِن مطالبات کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہماری مرضی کے

خلاف ہندوستان پر کوئی آئین مسلط کرنے کی کوشش کی۔ تو ہم اُسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔"[1]

۱۹۲۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت افراتفری اور انتشار کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کا وہ عنصر جو حسا دفکرا سر محمد شفیع کی رہنمائی قبول کرنا ۔۔۔ یا سر فضل حسین کے اشاروں پر کام کرنا عار سمجھتا تھا۔ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصے نے جس میں تصدق احمد خاں شروانی۔ ڈاکٹر کچلو۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ چودھری خلیق الزماں۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سید عبداللہ بریلوی۔ ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شریک تھے۔ نہرو رپورٹ کی حمایت میں غیر مشروط طور پر کانگرس کی شرکت گوارا کر لی۔ دوسرا طبقہ جو نسبتاً اعتدال پسند تھا مثلاً ایم سی چھاگلا۔ ملک برکت علی۔ مہاراجہ محمود آباد۔ سر عزیز الحق۔ مولوی اکرم خاں۔ مولوی فضل الحق وغیرہ۔ یہ لوگ چپکے سے میدان چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ مسٹر چھاگلا نے جو اُس وقت مسلمانوں کے قوم پرست حلقے میں بڑی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ کانگرس کے طرزِ عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آل پارٹیز کنونشن کے اجلاس کلکتہ کے سامنے مسلم لیگ کی نمائندگی اِس لیے کی گئی تھی کہ مسلمان چند ضروری ترمیموں کے بعد نہرو رپورٹ کو منظور کر سکیں۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ اِس امر کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اِن مطالبات پر فراخ دلی سے غور کرنے

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۲۸ء جلد دوم

کی بجائے، کنونشن نے ہندو سبھا کے زیر اثر آکر اور اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر، بالکل الٹی صورت اختیار کر لی۔ مجھے یہ امر ظاہر کرنے میں کوئی تامل نہیں۔ کہ مسلم لیگ کے اُن نمائندوں کی، جو کنونشن میں شریک تھے۔ اور جنہوں نے مسلمانوں کے جائز مطالبات پیش کئے تھے، اکثریت نہرو رپورٹ کی حامی تھی! اور یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنی ملت سے جنگ کی۔ بلکہ جو اپنی جماعت (مسلم لیگ) سے محض نہرو رپورٹ کی تائید کرنے کے جرم میں مورد عتاب بھی بنے۔ اگر کنونشن لیگ کے ان تیس منتخب نمائندوں کے ساتھ کسی امر پر گفتگو کرنے سے قاصر ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہندوستان کے کسی مسلمان سے بھی فیصلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی اگر ان تیس نمائندوں کو فرقہ پرست قرار دے کر ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں ایک بھی قوم پرست مسلمان موجود نہیں۔"[1]

مسٹر جناح نے ہر چند حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور اسی کوشش کے دوران میں اپنے مشہور چودہ نکات بھی مرتب کر ڈالے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعات کی باگ ڈور اور حالات کو حسب منشا تشکیل کرنے کی قوت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کانگرس نے ایک ایسے نازک موقع پر مسلمان رہنماؤں کو ذلیل کیا۔ جب وہ

[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کا اخباری بیان۔ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء۔

محبت و اخوت کے جذبات سے سرشار ہو کر ہندوؤں سے گلے ملنے کو بالکل تیار تھے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناح کانفرنس میں تجاویز دہلی مرتب ہوئیں۔ اور سری نواس آئنگر کے قول کے مطابق "گویا ہندوستان کے آسمان پر ہندو مسلم اتحاد کا نیا آفتاب طلوع ہوا"۔ اس آفتاب کی پذیرائی میں مدراس کی کانگرس اور کلکتہ کی مسلم لیگ دونوں نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے۔ مسلم لیگ تو آخر وقت تک اس آفتاب کو خوش آمدید کہتی رہی۔ لیکن موتی لال نہرو کی کوتاہ اندیشی، تنگ نظری اور کج روی نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حتیٰ کہ تجاویز دہلی کا سب سے بڑا مداح اور حامی سری نواس آئنگر خود موتی لال کی ضد سے اس قدر تنگ آیا کہ اس نے کانگرس کی رکنیت سے مستعفی ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی اور چند سال بعد وہ غریب انتہائی دل شکستگی کے عالم میں اس دنیا ہی سے رخصت ہو گیا۔

موتی لال نے یہ نہ سوچا کہ جس نہرو رپورٹ کو وہ صحیفہ آسمانی سمجھ کر ایک لفظ بدلنے کو تیار نہ تھے۔ اور جس دستاویز کو وہ گویا دیوتاؤں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مقدس تحریر خیال کر کے تغیر و تبدل سے بالاتر سمجھتے تھے صرف سال بھر کے بعد ایک مردہ و مقہور لاش کی مانند دریائے راوی کی لہروں میں بہا دی جانے والی تھی۔ نہرو رپورٹ کو ایک سال سے زیادہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن یہ بارہ مہینے کا وقفہ اپنے پیچھے منافقتوں، جھگڑوں اور دشنام طرازیوں کی ایک ایسی تلخ یاد چھوڑ گیا۔ جس نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان۔ بلکہ خود مسلمانوں کے اندر عرصہ دراز تک خانہ جنگی کی آگ کو روشن کیے رکھا۔

پنڈت موتی لال نہرو ایک بڑے وطن پرست اور قوم پرور لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے اس پیش پا افتادہ حقیقت کو نہ پہچانا کہ مسٹر جناح کو ٹھکرا کر وہ مسلمان قوم کے ساتھ آبرومندانہ مفاہمت کی تمام امیدوں کا اپنے ہاتھ سے خون کر رہے ہیں۔ جناح کو رد کر دینے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ طے کرنے کے لیے کانگریس کو سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سے گفت و شنید کرنا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ موتی لال اور شفیع یا موتی لال اور فضل حسین کے درمیان ایک خوفناک خلیج حائل تھی۔ جس کا پاٹنا دونوں کے لیے ناممکن تھا۔ مسلمانوں میں صرف جناح ایک شخص تھا۔ جو اپنی قوم کو مخلوط انتخاب پر رضامند کر کے ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد کھڑی کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن جب موتی لال نہرو کی ضد اور ہٹ دھرمی نے جناح کو گوشہ عزلت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ تو کانگریس کا دوسرے مسلمان رہنماؤں سے کسی حسن سلوک کی توقع رکھنا محض خیال خام تھا چنانچہ آئندہ فرقہ وارانہ جھگڑوں نے جو نیا رنگ اختیار کرنا شروع کیا اس کی تمام تر ذمہ داری پنڈت موتی لال نہرو کی اسی روش پر عائد ہونی چاہیے۔

ساتواں باب

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک

اپریل ۱۹۳۰ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر مقرر ہو کر، دہلی تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ، سیاسی مد و جزر کے اعتبار سے ہندوستان کا بڑا نازک اور پُر خطر دور تھا۔ کانگرس نے اِسی زمانہ میں سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کی تحریکیں شروع کیں۔ صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں کی تنظیم اِسی زمانے میں ہوئی۔ پنجاب میں مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد اِسی زمانے میں رکھی گئی۔ لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد اِسی زمانے میں ہوا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بھی اِسی زمانے میں پارلیمنٹ نے منظور کیا۔

سر فضلِ حسین کے پنجاب سے رخصت ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی کی وہ قبائلی عصبیت، جس نے اپنے حفظ و بقا کے لیے شہری دیہاتی کی تفریق کھڑی کی تھی خود اپنے حربوں کا شکار ہو گئی۔ اِس قبائلی عصبیت کی بنیاد محض چند افراد کی جلبِ منفعت کی خواہش تھی۔ فضلِ حسین کی زوردار شخصیت نے اِس خواہش کو کئی برس تک عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا۔ لیکن جونہی وہ ہمہ گیر شخصیت

آنکھوں سے اوجھل ہوئی۔ ذاتی رقابت اور شخصی حرص و آز کے شرمناک مناظر سب کے سامنے آنے لگے۔ چودھری شہاب الدین کی انتہائی خواہش تھی کہ فضل حسین کے جانے کے بعد ریوینیو ممبری کا منصب انھیں ملے اس ضمن میں انھیں اپنے ہم زلف میاں احمد یار خاں دولتانہ کی امداد پر پورا بھروسہ تھا۔ احمد یار خاں دولتانہ کا شمار پنجاب کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ مخلص و وفاشعار دوست تھے۔ اور دوست کی کامیابی کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کرنا اور شب و روز محنت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ احمد یار خاں دولتانہ سر سکندر حیات خاں کے نہایت عزیز دوست تھے۔ ادھر سر سکندر خود پنجاب کی ریوینیو ممبری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ چودھری شہاب الدین اور سر سکندر کی اس باہمی کشمکش میں احمد یار خاں دولتانہ نے سر سکندر کا ساتھ دیا۔ اور شہاب الدین کو کسی نہ کسی طرح دست بردار ہونے پر رضامند کر لیا۔ لیکن ناکامی کا یہ داغ چودھری شہاب الدین کے سینہ پر ہمیشہ تازہ رہا۔ اور انھوں نے سر سکندر کو کبھی معاف نہ کیا۔

اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کونسل کے نئے انتخاب ہوئے۔ تو وزارت کی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ چودھری شہاب الدین کی ہر ممکن کوشش تھی کہ ملک فیروز خاں نون دوبارہ وزیر نہ بننے پائیں۔ پہلے انھوں نے کونسل کے مسلمان ممبروں کو اپنے لیے ہموار کرنا چاہا لیکن جب معلوم ہوا کہ اُن کی کامیابی کے امکانات چنداں روشن نہیں۔ تو انھوں نے فوراً چودھری ظفر اللہ خاں کو بڑھاوے دے کر آگے کر دیا۔ اب ملک فیروز خاں نون اور چودھری ظفر اللہ خاں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس مقابلے میں

سر سکندر بھی فیروز خاں نون کے خلاف تھے۔ کم از کم اُن کی یہ خواہش ضرور تھی کہ زید، بکر، عمرو کوئی وزیر بن جائے۔ لیکن فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کی کرسی پر بیٹھنا نصیب نہ ہو۔ مصیبت یہ تھی کہ اس ساری تگ و دو کا حقیقی سبب یہ تھا کہ فیروز خاں نون کی وجہ سے شاہ پور کی ملک برادری کا اثر و رسوخ صوبے بھر میں پھیل گیا تھا۔ اور اٹک اور ملتان کے زمیندار شاہ پور کے اس روز افزوں اقتدار کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ میاں فضلِ حسین کی ہمدردی ملک فیروز خاں نون کے ساتھ تھی۔ اور اگرچہ اُن کی کوشش سے فیروز خاں نون کو دوبارہ وزارت کا منصب مل گیا۔ لیکن پنجاب کونسل کے دیہاتی ممبروں میں سخت پھوٹ پڑ گئی۔ چودھری شہاب الدین۔ سر سکندر حیات خاں۔ ملک فیروز خاں نون۔ چودھری ظفر اللہ خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ اِن میں سے ہر شخص اپنی اپنی جنگ میں مصروف تھا۔ اور یوں وہ ریت کی دیوار، جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا، باہمی رقابت کی بادِ صرصر کے ایک ہی جھونکے سے ہلنے لگی۔

ہندوؤں میں سے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کو وزیر بنایا گیا جو اپنی ہندو سبھائی ذہنیت کے لیے دُور دُور تک مشہور تھے۔ سرکاری بلاک سراسر گورنر کے زیرِ اثر تھا۔ شہری مسلمان یوں برگشتہ خاطر تھے کہ الیکشن کے دوران میں ملک فیروز خاں نون نے شہری مسلمان اُمیدواروں کے مقابلے میں دیہاتی اُمیدواروں کی مدد کی تھی۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا بڑے سے بڑا رکن بھی اُس زہر آلود عصبیت

سے پاک نہیں۔ جس نے شہری مسلمانوں پر ترقی کی تمام راہیں بند کر رکھی تھیں خود یونینسٹ پارٹی کے اندر اس حد تک تفرقہ پھیل گیا تھا۔ کہ کئی بار اس پارٹی نے رائے شماری کے وقت ملک فیروز خاں نون کے خلاف ووٹ دیا۔ سال بھر کے اندر یونینسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف چونتیس رہ گئی تھی۔ جن میں سے بتیس مسلمان اور صرف دو ہندو تھے۔ اس طرح اقتصادی بنیادوں پر مخلوط پارٹی بنانے کا جو ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا وہ سر فضلِ حسین کے دہلی رخصت ہوتے ہی ختم ہو گیا۔

سر سکندر حیات خاں پانچ سال تک پنجاب کے ریونیو ممبر رہے۔ اس دوران میں انھیں دو مرتبہ قائم مقام گورنر کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ انھیں معلوم تھا کہ سر فضلِ حسین جب پانچ سال کے بعد حکومتِ ہند کی کیبنٹ سے سبکدوش ہو کر واپس پنجاب آئیں گے۔ تو اس صوبے کی زمامِ حکومت اُن کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ سر سکندر کو خود اپنا مستقبل بنانے اور اپنی حیثیت مضبوط کرنے کی فکر تھی۔ کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کی ایک معقول تعداد سر سکندر کے ساتھ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میاں احمد یار خاں دولتانہ کی دوستی ہر آڑے وقت میں اُن کی پشت پناہ بن سکتی تھی۔ ہندوؤں میں راجہ نریندر ناتھ کے ساتھ اُن کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ ان حالات کی موجودگی اور سر فضلِ حسین کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھا کر سر سکندر نے اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کیں۔ پانچ سال تک مسلسل و پیہم میاں فضلِ حسین کے خلاف یہ پراپاگنڈہ جاری رکھا گیا کہ وہ مشرقی پنجاب کے شہری باشندے ہیں۔ دیہاتی نہیں ہیں۔ پیشے کے

اعتبار سے بیرسٹر ہیں۔ زمیندار نہیں ہیں۔ نظر بہ ظاہر انھیں مغربی پنجاب کے زمینداروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ یہ محض زمینداروں کی بے خبری اور سادہ لوحی ہے کہ انھوں نے نو سال تک ایک شہری مسلمان کو اپنا لیڈر بنائے رکھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مغربی پنجاب کے زمیندار بیدار ہوں۔ اور ایک ایسے شخص کو اپنا لیڈر بنائیں جو اُن کا ہم پیشہ، ہم وطن ہم مشرب اور ہمدرد ہو۔

سر سکندر نے متواتر پانچ سال تک مغربی پنجاب کے زمینداروں میں یہ خیالات راسخ کرنے کی کوشش کی۔ یوں بھی ریونیو ممبر کی حیثیت سے اُن کا سرکاری اثر و رسوخ مسلّم تھا۔ نواب مظفر خاں کی لاہور میں موجودگی اُن کے لیے بڑی اعانت کا باعث تھی۔ چنانچہ سکندر۔ دولتانہ اور مظفر ان تینوں کی متفقہ کوشش سے میاں فضلِ حسین کے خلاف شدت سے پراپاگنڈہ جاری رکھا گیا۔ یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی تھی کہ شہری دیہاتی کی وہ تفریق جسے میاں فضلِ حسین نے محض اپنی لیڈری کو برقرار رکھنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ خود اُن کے خلاف ایک موثر حربے کے طور سے استعمال کی جانے لگی تھی۔ تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ جو ہتھیار ہم غنیم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہی ہتھیار اُلٹ کر ہمارے خلاف بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ سر فضلِ حسین کے بارے میں تاریخ اپنا یہی فیصلہ دُہرا رہی تھی۔ چنانچہ جب پانچ سال کی میعاد ختم کر کے سر سکندر پنجاب سے رخصت ہوئے۔ تو انھیں الوداع کہتے وقت راجہ نریندرناتھ نے کونسل کے ایوان میں کہا تھا کہ "یہ عارضی جدائی ہے۔ اور دو سال کے بعد آپ پنجاب کے وزیرِ اعظم بن کر

یہاں تشریف لائیں گے۔"

میاں فضل حسین دہلی میں بیٹھے ہوئے سب کچھ سن رہے تھے۔ پنجاب میں چودھری شہاب الدین۔ ملک فیروز خاں نون اور چودھری چھوٹو رام اُن کے سب سے بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن میاں فضلِ حسین نے محسوس کر لیا تھا کہ اُن کا مقابلہ ایک ایسے شخص کے ساتھ آ پڑا ہے جس نے اندر ہی اندر نہایت ہوشیاری سے اُن کے گھر میں نقب لگا دی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دماغی اور علمی قابلیت کے اعتبار سے سر سکندر میاں فضل حسین سے کمتر تھے۔ لیکن مغربی پنجاب کے زمینداروں میں اُن کی رشتہ داریاں، قرابتیں اور خاندانی مراسم اِس قدر وسیع تھے کہ وہ محض اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر ایک مضبوط جتھہ کھڑا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ سر سکندر ایک زندہ دل۔ محفل آرا۔ متواضع۔ مہمان نواز اور دوست پرور آدمی تھے۔ جب وہ کُرتے اور تہبند میں ملبّس اپنے دیہاتی بھائیوں میں انتہائی بے تکلفی سے اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ تو اُن کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان کسی غیریت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میاں فضل حسین اِن خصائص سے محروم تھے۔ دائم المریض ہونے کی وجہ سے اُن کے مزاج میں رُکھائی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کم سخن تھے۔ لوگوں سے ملتے جُلتے بھی کم تھے۔ اور زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہ تھے اُن کا سارا رہن سہن۔ اندازِ نشست و برخاست اور طرزِ بود و ماند ایسا تھا۔ جس میں "دیہاتیت" نام کو نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میاں فضلِ حسین حکومت ہند سے سبکدوش ہو کر واپس پنجاب آئے۔ تو یونینسٹ پارٹی دو حصّوں میں تقسیم ہو چکی

تھی۔ اور سر سکندر کی قیادت میں اس پارٹی کا ایک طاقت ور عنصر فضلِ حسین کی لیڈری کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سیاست بھی ایک عجیب و غریب دور سے گزر رہی تھی۔ بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھیوں نے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں بم پھینک کر۔ اور سانڈرس کو گولی کا نشانہ بنا کر۔ اگر ایک طرف حکومت کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ تو دوسری طرف عام تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں میں مرنے مارنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ کانگریس نے اجلاس لاہور کے بعد سول نافرمانی کی قرارداد منظور کر دی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب مہاتما گاندھی سابرمتی آشرم سے پیدل ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ سمندر کے کنارے پہنچ کر خلافِ قانون طریقے سے نمک بنائیں گے۔ گاندھی جی کے اِس اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے ہر حصے میں کھلم کھلا قانون شکنی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ چند ہی مہینوں کے اندر پورا ہندوستان اس طرح بھڑک اٹھا۔ گویا کسی نے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھا دی ہے ہندو عورتیں، جو اب تک کسی سیاسی تحریک میں شامل نہیں ہوتی تھیں، ہزاروں کی تعداد میں گھروں سے نکل آئیں۔ اور بڑے بڑے جلوس مرتب کر کے محلوں اور بازاروں میں گھومنے لگیں۔ طلبہ نے کالجوں کو خیر باد کہہ کر رضاکاروں کی وردی پہن لی۔ کسانوں اور کاشتکاروں نے مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع ہو گیا۔ بعض سرکاری ملازموں نے نوکری کرنے کے بجائے قومی تحریک میں شریک ہونے کو ترجیح

دی۔ غرضکہ دیکھتے ہی دیکھتے کانگریس اور حکومت کے درمیان وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ گئی۔ جس میں ہزاروں رضاکار گرفتار ہوئے۔ جگہ جگہ گولی چلی۔ لوگ مرے۔ قیدیوں سے جیل بھر دیئے گئے۔ کہیں کہیں ستیہ گرہ کرنے والوں کی جائیدادیں بھی ضبط ہوئیں۔ اس ہنگامے میں اگرچہ بہت سے مسلمان بھی شریک تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم سول نافرمانی سے الگ تھلگ رہے۔ ۱۹۲۱ء کے ترک موالات کی تحریک میں تو مسلمان مقدمۃ الجیش کی طرح آگے آگے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی میں اُن کی شرکت مختصر و محدود تھی۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ ڈاکٹر کچلو اور وہ گروہ جس نے بعد میں احرار کے نام سے شہرت حاصل کی تھی۔ اس تحریک میں شریک ہو کر قید و بند کا شکار ہوئے۔ لیکن عام مسلمان محض تماشائی کی حیثیت سے اس جنگ کا نظارہ کرتے رہے۔

البتہ صوبۂ سرحد میں سول نافرمانی کی تحریک کا بالواسطہ اثر بہت زیادہ ہوا اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ صوبۂ سرحد انگریزی عملداری کی ابتدا سے سرزمینِ بے آئین چلا آرہا تھا۔ اور وہاں کی آبادی کا تعلیم یافتہ عنصر اپنے آپ کو ہندوستان کے دیگر حصّوں کے مقابلہ میں پسماندہ اور فروتر پاکر سخت پریشان رہتا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات پورے ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ لیکن صوبۂ سرحد کو محروم رکھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ پورے برِ عظیم میں ہوا۔ لیکن صوبۂ سرحد پھر محروم رہا۔ حد یہ ہے کہ پشاور کی میونسپل کمیٹی میں انتخاب کی بجائے حکومت کی

خوشنودی سے ممبر نامزد کئے جاتے تھے۔ تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے بھی حکومت نے جان بوجھ کر اِس صوبہ کو حد درجہ بدحال اور پستی کے عالم میں رکھا ہوا تھا۔ اِصلاحِ معاشرت کی بے ضرر سے بے ضرر تحریک کو بھی حکومت جبر و تشدد سے دبا دیتی تھی۔

آخر ۱۹۲۹ء میں سید قاسم شاہ اور عبد الغفار خاں کی کوششوں سے اُتمان زئی میں ایک افغان جرگہ منعقد ہوا۔ جس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ صوبۂ سرحد کے لوگوں میں اصلاحِ معاشرت کی تحریک شروع کی جائے اور انھیں فضول خرچی۔ اسراف۔ مقدمہ بازی اور خانہ جنگی سے باز رکھا جائے۔ جرگے کے تحت خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کی گئی۔ جن کا امتیازی نشان سرخ قمیص تھا۔ یہ لوگ ہند و بیرونِ ہند کی کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اِن کا مقصد صرف اپنے بھائی بندوں کی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح تھا۔ حکومت نے حد درجہ عاقبت نا اندیشی سے اِس جماعت کو کچلنا چاہا۔ لیکن حکومت کے اِس طرزِ عمل کے جواب میں تحریک روز بروز مقبول ہونے لگی۔ اور رضا کار زیادہ تعداد میں بھرتی ہونے لگے۔

اُسی زمانے میں پنجاب میں کانگرس کی سول نافرمانی اپنے عروج پر تھی اور حکومت کو ہر گھڑی اندیشہ تھا کہ اگر سول نافرمانی کے جراثیم صوبۂ سرحد میں بھی داخل ہو گئے تو یہاں اِس آگ کا بجھانا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس نے خان عبد الغفار خاں۔ میاں احمد شاہ۔ خان علی گل خاں۔ سید لال بادشاہ وغیرہ کو گرفتار کر کے تین تین سال کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ تحریک کا اخبار پختون

ضبط کر لیا گیا۔ اور اُتمان زئی پر چھاپہ مار کر مرکزی دفتر پر قبضہ کر لیا۔ جب حکومت کے اِس جابرانہ سلوک کے خلاف لوگوں نے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں پُر امن مظاہرہ کرنا چاہا۔ تو حکومت نے چھاؤنی سے گورا فوج منگوائی جس نے عین بازار میں ٹینک اور توپیں رکھ کر نہتے آدمیوں پر گولہ باری شروع کر دی پہلے حملے میں ڈپٹی کمشنر کے حکم سے گولی چلائی گئی۔ جس میں بارہ آدمی مرے۔ جب لوگوں نے اس کے باوجود منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اور اِس بات پر اصرار کیا کہ شہدا کی لاشیں تجہیز و تکفین کے لیے اُن کے حوالے کی جائیں تو حکومت نے توپوں کے منہ کھول دیئے۔ اور دو سو کے قریب آدمی شہید ہو گئے۔

عین اُس وقت جب صوبہ سرحد کے باشندوں کے خون سے پشاور کی سرزمین لالہ زار بن رہی تھی۔ ہندوستان بھر میں کوئی اسلامی جماعت۔ کوئی اسلامی انجمن۔ کوئی اسلامی ادارہ ایسا نہیں تھا۔ جو صدائے احتجاج بلند کرتا۔ اور حکومت سے پوچھتا کہ یہ کس جرم کی پاداش میں مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔ مسلم لیگ ختم ہو چکی تھی۔ ابنائے زماں کی ناقدری کے ہاتھوں جناح وطن میں رہنے کے باوجود غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ محمد علی مرض الموت میں مبتلا اپنی زندگی کا آخری سال پورا کر رہا تھا۔ سر محمد شفیع۔ میاں فضل حسین اور آغا خاں کی کوشش سے جو مسلم کانفرنس معرض وجود میں آئی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں اپنی طویل قرارداد منظور کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکی تھی مسلمانوں کا وہ فعال، گرم جوش اور تہور پیشہ

عنصر جو کسی صورت میں بھی عافیت کی زندگی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ غیر مشروط طور پر کانگرس میں شریک ہو کر قید و بند کے شدائد برداشت کر رہا تھا۔ حکومت نے صوبہ سرحد میں مارشل لا جاری کر کے چاروں طرف ایک آہنی دیوار کھینچ دی تھی تاکہ زخمیوں کی کراہ اور مرنے والوں کی چیخیں باہر سنائی نہ دے سکیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پشاور سے لے کر مدراس تک کے مسلمان جاگ اٹھتے۔ اور بیک آواز اپنے بھائیوں کے خون کا قصاص طلب کرتے۔ لیکن وہ قوم جس نے چند سال قبل ترکوں کے مصائب سے بے قرار ہو کر خلافت جیسی ہمہ گیر تحریک چلائی تھی۔ سرحد کے مسلمانوں پر جور و ستم کی بارش دیکھ کر بھی جنبش نہ کر سکی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی بے حسی کا اس سے دل خراش منظر کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

آخر کار وقت کی نزاکت کا احساس کر کے کانگرس اٹھی۔ اور اس نے وٹھل بھائی پٹیل سابق صدر مرکزی اسمبلی کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ جس نے حکومت کے معاندانہ رویہ کے باوجود پشاور جا کر ان مظالم کی پوری چھان پھٹک کی اور واپس آکر اپنی مفصل، جامع اور حقائق کو واشگاف کر دینے والی رپورٹ شائع کی۔

اس رپورٹ نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی۔ اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ انگریز کس شدت سے پٹھانوں کی بہادر اور شجاع قوم کو مٹا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کانگرس کی اس ہمدردی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرخ پوشوں کی تحریک آگے چل کر کانگرس میں مدغم ہو گئی۔ اور عبدالغفار خاں اور ان کے رفقا ۱۹۴۷ء

تک کانگرس کے دست و بازو بنے رہے ۔ اور ایسا ہوتا کچھ تعجب انگیز بھی نہ تھا ۔

سوال یہ ہے کہ اس پُر خطر اور نازک دور میں ہندوستان کے مسلمان کیا کر رہے تھے ؟ اس کا جواب نہایت آسان ہے ۔ مسلم کانفرنس کی باگ ڈور میاں فضلِ حسین کے ہاتھ میں تھی ۔ اور اب وہی لیس پردہ بیٹھ کر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کی تشکیل کر رہے تھے ۔ انھوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر مسلم کانفرنس کے لیے حیدر آباد (دکن) اور آغا خاں سے بہت بڑی رقمیں حاصل کیں[1] ۔ اور اس روپے کو نشر و اشاعت پر صرف کیا ۔ انگلستان اور ہندوستان میں بعض آدمیوں کو معقول تنخواہ دے کر تحریری پراپاگنڈے پر مامور کیا ۔ ہندوستان خصوصاً پنجاب کے چند اردو اور انگریزی اخباروں کے بیش قرار وظائف مقرر کیے ۔ اس کے علاوہ ایک مرکزی بورڈ قائم کر کے نہایت ہوش مندی سے پبلسٹی کا کام شروع کیا گیا ۔ بعض لیڈروں کو بھی مالی امداد دی گئی ۔ اس طرح ایک باضابطہ اور مرتب شدہ سکیم کے تحت کانفرنس کی قرار دادوں ۔ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں پر کھلے دل سے روپیہ صرف ہونے لگا ۔ ہر چھ مہینے کے بعد ہندوستان کے کسی نہ کسی مقام پر کانفرنس کا ایک اجلاس بھی منعقد کر دیا جاتا تھا ۔

مولانا شوکت علی ۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں ۔ علامہ اقبال ۔ سر محمد یعقوب

---

[1] سوانح عمری میاں فضلِ حسین (انگریزی) از عظیم حسین ؛

سیٹھ عبداللہ ہارون - سر محمد شفیع - نواب اسمٰعیل خاں - سر عبدالرحیم وغیرہ کانفرنس کی نمایاں اور ذمہ دار شخصیتیں تھیں - کانفرنس کی تمام جزئیات سر فضلِ حسین کے ایما اور مشورے سے طے ہوتی تھیں - اور جب تک وہ کسی پروگرام کی منظوری نہ دیتے - کانفرنس اُس کو اختیار نہ کرتی تھی - سر فضلِ حسین کی سیاسی بصیرت کا کمال ہے کہ وہ خود حکومتِ ہند کے رُکن کی حیثیت سے وائسرائے کو بار بار مسلم کانفرنس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے - اور آہستہ آہستہ انھوں نے وائسرائے اور حکومتِ ہند کے ارکان کو یقین دلا دیا تھا کہ مسلم کانفرنس اسلامیانِ ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے - اور اگر آئندہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل کے طے کی نوبت آئی - تو حکومت کو صرف مسلم کانفرنس کے نمائندوں سے گفت و شنید کرنا ہوگی -

میاں فضلِ حسین مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ، ہمدرد اور مخلص رہنما تھے - اُن کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کی تدبر کی اور ہوش مندی سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اُن کا کام کرنے کا انداز جداگانہ تھا - انھیں سب سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد تھا - اور یہ خود اعتمادی اِس حد تک ترقی کر گئی تھی کہ وہ کسی اور کی رائے کو حتی الامکان درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے - فضلِ حسین کی اگرچہ ابتدائی سیاسی تربیت کانگرس اور مسلم لیگ کے گہوارہ میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کی تحریک میں شامل ہونے کی بجائے وزارت کی مسند قبول کرنے کو ترجیح دی - اس کے بعد جب خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں ناکام ہوئیں - اور ردِ عمل کے طور پر مسلمانوں میں بڑی شدت سے ذہنی

اور اقتصادی انتشار پھیلنا شروع ہوا۔ تو میاں فضلِ حسین کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کسی قسم کی عوامی تحریک چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس قوم کو اگر تباہی سے بچانا مقصود ہے۔ تو آئندہ اسے ہر نوع کی عوامی تحریک سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک انھوں نے پنجاب میں یہی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ اور مسلمانوں کو ہمیشہ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے یا عوامی تحریک چلانے سے روکے رکھا۔ اُن کے اس سیاسی رویّے کو اگر کسی قدر وضاحت سے بیان کیا جائے۔ تو وہ یہ ہے کہ "عوام کالانعام ہیں۔ اُن کی سیاسی بصیرت ناقص ہے۔ اُن سے کسی سیاسی تحریک میں کام لینا عقلمندی کے خلاف ہے۔ میں مسلمان قوم کی ضروریات سے خوب واقف ہوں۔ اس لیے مجھ پر اور میری بصیرت پر اعتماد کرو اور تمام کام مجھی پر چھوڑ دو۔"

جب اپریل ۱۹۳۰ء میں سر فضلِ حسین دہلی پہنچے تو انھوں نے اپنے انہی قاعدوں کے مطابق کام شروع کیا۔ صوبہ سرحد میں جب انگریز نے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ تو میاں فضلِ حسین کو سب سے بڑی فکر یہ لاحق ہوئی کہ کہیں ان خوں چکاں واقعات سے متاثر ہو کر پنجاب کے خلافتی لیڈر مسلمانوں کو منظم کر کے کوئی تحریک شروع نہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً پنجاب کے گورنر سر جیافرے ڈی مونٹ مورنسی کو لکھا کہ مسلمانوں میں سے فلاں فلاں شخص کو بُلا کر تاکید کیجیے کہ سرحدی مسلمانوں کی ہمدردی میں لوگوں کو مشتعل نہ کیا جائے [1]

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۶۷

اسی طرح جب کانگرس کی سول نافرمانی کا اثر روز بروز پھیلنے لگا۔ اور بعض مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی تحریک سے الگ تھلگ رہنا خود اُن کی قوم کے لیے مفید نہیں۔ کیونکہ انگریز اور کانگرس کی اس جنگ میں مسلمانوں کا محض تماشائی بن کر میلہ دیکھتے رہنے سے قوم میں جُبن اور بُزدلی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ تو میاں فضلِ حسین نے فوراً پنجاب میں زمیندارہ لیگیں قائم کرائیں اور اُن لیگوں کے ذریعے سے پنجاب کے دیہات میں کانگرس کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپاگنڈہ کیا گیا۔[1] ہندوستان کے تمام صوبوں کی دیہاتی آبادی سول نافرمانی کی تحریک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل تھی۔ لیکن پنجاب کی دیہاتی آبادی کو چھوئی موئی کے پودے کی مانند اس طرح محفوظ رکھا گیا تھا کہ اُس پر سیاسیات کے شجرِ ممنوعہ کا سایہ بھی نہ پڑ سکتا تھا۔ سر مائیکل اوڈوائر کی بھی پالیسی تھی۔ جس پر ایک زمانے میں میاں فضلِ حسین نے شدید نکتہ چینی کی تھی۔ زمانے کی نیرنگی ہے کہ آج وہ خود اُسی پالیسی پر کاربند تھے۔

لیکن اس پالیسی کا نتیجہ کیا نکلا؟ قوم میں بڑی سُرعت سے جمود۔ بے حسی اور تعطل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ کوئی قوم محض چوٹی کے دو، چار یا پانچ، دس افراد کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ قوم کی اصلی زندگی کا راز خود قوم کی زندگی میں مضمر ہے۔ چنانچہ میاں فضلِ حسین ایسے زیرک آدمی سے یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ انھوں نے ۲۹ جولائی ۱۹۳۱ء کو بڑے اندوہگیں لہجے میں سر محمد یعقوب

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۶۷۔

کو ایک خط میں لکھا:۔

"......مسلمانوں کے بارے میں مجھے سب سے زیادہ فکر یہ ہے کہ انہیں یوں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کی بجائے اپنی اور اپنے ملک کی بہتری کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ بحالاتِ موجودہ وہ محض تماشائی بن کر ہندو سیاست دانوں اور حکومت کی باہمی جنگ کا نظارہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مسلمان لیڈر وقتاً فوقتاً یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو سول نافرمانی کی تحریک سے دور رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ تو محض ایک قسم کا منفی طرزِ عمل ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی تعمیری منصوبہ مرتب کیا جائے اور بہتر تنظیم کھڑی کی جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے پروگرام میں یہ چیز بھی شامل ہونی چاہیئے کہ تعمیر و ترقی کی مقامی تحریکوں میں زیادہ قوت پیدا کی جائے۔ ہمیں ان عزائم کو لے کر آگے بڑھنا چاہیئے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ہم اس دوڑ میں ابنائے وطن سے پیچھے رہ جائیں گے۔"[1]

وہ کون سی تنظیم۔ کون سا منصوبہ۔ اور کون سی مقامی تحریکیں تھیں۔ جن کی طرف میاں فضلِ حسین نے اس مکتوب میں اشارہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم کانفرنس کے سوا کوئی تحریک یا تنظیم یا منصوبہ میاں فضلِ حسین کے ذہن میں نہیں تھا۔ احرار کی تحریک کو میاں فضلِ حسین نے جس طرح

---

[1] سوانح عمری ص ۲۴۷

ختم کیا۔ وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ مسلمانوں میں کسی عوامی تحریک کے وجود کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔

سول نافرمانی میں مسلمانوں کے اُس گروہ نے جو آگے چل کر احرار کے نام سے مشہور ہوا۔ اپنی استعداد سے بڑھ کر قربانیاں کی تھیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولوی مظہر علی اظہر، مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور اُن کے بیسیوں رفقا نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن مارچ ۱۹۳۱ء میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو مہاتما گاندھی کی خواہش تھی کہ پنجاب کے کسی مسلمان کو کانگرس کی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) میں لیا جائے۔ اُنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ کسی موزوں آدمی کی سفارش کیجیے۔ مولانا نے مولوی عبدالقادر قصوری سے ذکر کیا۔ اور مولوی عبدالقادر قصوری نے جھٹ اپنے دوست ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کر دیا۔ اور یوں ڈاکٹر عالم کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لیے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے ساتھیوں کو اس واقعہ سے سخت رنج ہوا۔ کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز چودھری افضل حق کو ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم کا پنجاب میں قطعی کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ اُن کی پُشت پر نہ تھا۔ اور وہ سوائے اپنی ذات کے پنجاب کے کسی قابلِ ذکر ادارے کی نمائندگی کا دعوےٰ نہ کر سکتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے رفقا نے محسوس کیا کہ کانگرس نے اُن کی قربانیوں کی کوئی قدر نہیں کی اور اُن کی خدمات کو ٹھکرا کر ایک ایسے شخص کو اپنا معتمد بنا لیا ہے

جو اعتماد کا اہل نہ تھا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر اس پورے گروہ نے کانگرس سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ کراچی سے واپس آتے ہی مجلسِ احرارِ اسلام کی بنیاد رکھی گئی۔ اور کانگرس سے اپنا تعلق منقطع کر کے اِس مجلس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق اور جداگانہ نیابت کی حمایت کا اعلان کر دیا۔[1]

یہ بڑی مبارک گھڑی تھی کہ مسلمانوں کا سب سے فعال، بلند آہنگ اور ایثار پیشہ عنصر، جو اب تک کانگرس سے وابستہ چلا آ رہا تھا۔ اغیار سے کٹ کر دوبارہ اپنوں کے ساتھ آ ملا تھا۔ اِس واقعہ کو خوش آمدید کہنا اور مجلسِ احرار کے قیام کو فالِ نیک تصور کرنا ضروری تھا۔ لیکن میاں فضلِ حسین کو اندیشہ ہُوا کہ یہ جماعت مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی عوامی تحریک چلائے گی۔ احرار کے تمام لیڈر مسلمانوں کے متوسط یا غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔ اُن کا ربط و ضبط۔ اُن کا خطاب و کلام۔ اُن کے تعلقات و مراسم براہِ راست عوام کے ساتھ تھے یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی آواز بلند کی تو اُس کی بازگشت مسلمانوں کے اُس طبقے سے اٹھی۔ جو قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جسے نظرانداز کر دینے سے قومی بیداری کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

---

[1] پنڈت جواہر لال نہرو نے افراد و اشخاص کے نام لیے بغیر اس واقعہ کا ذکر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں کیا ہے ص ۲۶۹۔ طبع ۱۹۴۹ء ؂

احرار نے اگست ۱۹۳۱ء میں تحریک کشمیر شروع کی کشمیری مسلمانوں کے لیڈر شیخ محمد عبداللہ اِس سے قبل حدودِ ریاست کے اندر اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ لیکن اُس کا اثر محدود تھا۔ اور ریاست کا ڈوگرہ حکمران اِس سے چنداں متاثر و مرعوب نہیں تھا۔ جب احرار نے اِس طرف توجہ کی تو پورا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ سیالکوٹ اِس تحریک کا محاذ تھا۔ وہاں سے احراری جتھے جموں کی طرف کوچ کرتے تھے اور حدودِ ریاست پر پہنچتے ہی ریاستی حکومت انہیں گرفتار کر لیتی تھی۔ دو مہینے کے اندر اِس تحریک کا یہ عالم تھا کہ سیالکوٹ سے جموں تک چالیس میل کے فاصلے میں گویا کئی بستیاں آباد ہو گئی تھیں۔ جہاں صبح و شام اور دن رات ہزاروں رضا کار کوچ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ چالیس میل کی اِس پوری مسافت میں شروع سے آخر تک جتھوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر یوں ہنستے کھیلتے گرفتار ہونے کے لیے جاتے تھے گویا عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ اکتوبر کے آخر تک گرفتار ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور مہاراجہ پر ایک سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ آخر اُس نے گڑگڑا کر حکومتِ ہند سے مدد طلب کی۔ اور وائسرائے کو ریاستی معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ اِس طرح گلینسی کمیشن کا تقرر ہوا۔ اور دربارِ کشمیر کو طوعاً و کرہاً رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑا۔

تحریکِ کشمیر نے ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی خاکستر میں اب بھی ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ جو ہوا کے ایک جھونکے سے شعلوں کی طرح لپکنے لگتی ہیں مسلمان، جو کانگرس کی سول نافرمانی کے ہنگامے دیکھ دیکھ کر مرعوب ہوئے جا رہے

تھے۔ اب مطمئن تھے کہ اُن کے دست و بازو میں بھی اتنی قوت ہے کہ وہ کشمیر کے متکبر و مغرور حکمران کو سرنگوں کر سکتے ہیں۔ اگر میاں فضلِ حسین اُس وقت احرار کی بیخ کنی پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ تو یہ جماعت آئندہ مسلمانوں کے لیے یقیناً بڑی مفید ثابت ہوتی۔ لیکن میاں فضلِ حسین کی سیاست میں احرار کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ احرار کو اِس بات کا فخر تھا کہ اُن کی رسائی عوام تک ہے۔ اور وہ عوام ہی کے سہارے آگے بڑھیں گے۔ میاں فضلِ حسین سرے سے عوامی تحریکوں کے مخالف تھے۔ وہ صرف اپنی فراست سے بساطِ سیاست کے چند مُہروں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر حرکت دے کر بازی جیتنے کے قائل تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تحریکِ کشمیر کے ختم ہوتے ہی احرار نے اپنی توپوں کا رُخ میاں فضلِ حسین کی طرف پھیر دیا۔ اور جب تک وہ زندہ رہے۔ احرار نے اُنھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیا۔ قادیانیت کی مخالفت بھی اسی جھگڑے کا ایک شاخسانہ تھی۔

افسوس ہے کہ میاں فضلِ حسین کی قابلِ رشک سیاسی بصیرت اور احرار کی حیرت انگیز قوتِ عمل متحد ہو کر مسلمانوں کی خدمت نہ کر سکی۔ یہ دونوں چیزیں بہت بڑی نعمت تھیں۔ جس طرح بصیرت کے بغیر محض عمل کی قوت اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اِسی طرح عمل کے بغیر محض بصیرت انسان کو مفلوج کر دیتی ہے۔

کانگرس کو یہ دونوں چیزیں میسر تھیں۔ اِس کے برعکس مسلمانوں کی بہت کم سیاسی تحریکیں ایسی تھیں۔ جن میں اِن دونوں محاسن کا اجتماع ہُوا ہو۔ تحریکِ کشمیر کے بعد احرار بعض فروعی اور بے مصرف باتوں میں اُلجھ کر اپنی قوتِ عمل

کو ضائع کرنے لگے۔ قادیانی فتنے کا ڈھونگ بھی صرف میاں فضل حسین کی مخالفت کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ حالانکہ قوم کے بعض بے حد اہم سیاسی امور اور اقتصادی مسائل اُن کی توجہ کے طلب گار تھے۔ احرار نے بار بار مسلم کانفرنس پر حملے کیے۔ میاں فضل حسین کو قادیانیت نواز کہہ کہہ کر ہندوستان بھر میں اُن کے خلاف پراپگنڈہ کیا گیا۔ یہ سب کچھ سراسر محنت اور وقت کا زیاں تھا۔ اگر احرار کے حسب منشا قادیانیت کا استیصال بھی ہو جاتا۔ تو بھی مسلمانوں کے سیاسی مسئلہ کا تشفی بخش حل ممکن نہ تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ احرار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ میاں فضل حسین اُن کے راستے میں حائل ہیں اس لیے اُنھوں نے سب سے پہلے اِس سنگِ گراں کو راہ سے ہٹا دینا ضروری سمجھا۔ ہوش مندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ تحریکِ کشمیر سے فارغ ہو کر احرار کوئی سیاسی اور اقتصادی پروگرام مرتب کرتے اور مسلمان عوام کی بے پناہ قوت کو ساتھ لے کر اس پروگرام کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتے۔ لیکن اُنھوں نے زود رنج اور مشتعل ہو کر میاں فضل حسین سے جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ کا نتیجہ خود اُن کے لیے اچھا نہ نکلا اور میاں فضل حسین کے حربوں نے انھیں ۱۹۳۵ء میں شکستِ فاش دے کر مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے خارج کر دیا۔

عین اُس وقت جب کانگرس کی سول نافرمانی عروج پر تھی۔ وائسرائے نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کا دستور وضع کرنے کے لیے عنقریب لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جس میں ہندوستان کی تمام قوموں کے نمائندے شریک ہوں گے۔ کانگرس نے وائسرائے کے اِس

اعلان کو قطعاً قابلِ اعتناء قرار نہ دیا۔ لیکن ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے اُس طبقے نے جو کانگریس میں شامل نہیں تھا۔ مجوزہ گول میز کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کانفرنس کے ہندوستانی نمائندوں کا انتخاب کس اصول اور قاعدے سے ہوگا۔ اِس بارے میں وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندو مسلمان اور سکھ نمائندوں کا انتخاب خود اپنی مرضی اور صوابدید سے کریں گے۔ لیکن بظاہر اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر قابلِ ذکر سیاسی گروہ کو جائز نمائندگی عطا کی جائے۔

میاں فضلِ حسین بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اگر گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے وہ مطالبات تسلیم نہ کئے گئے۔ جن کو مسلم کانفرنس نے مرتب کیا تھا۔ تو آئندہ ہندوستان کی دستوری اور آئینی ترقی میں مسلمان اپنی ہمسایہ قوم سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور اس طرح گذشتہ دس برس کی جدوجہد بالکل رائگاں جائے گی۔ چنانچہ اُن کی کوشش تھی کہ گول میز کانفرنس میں صرف اُن مسلمانوں کو بھیجا جائے۔ جو مسلم کانفرنس کے ممبر اور میاں فضلِ حسین کی ہدایات کے مطابق کام کرنے کو تیار تھے۔

کانگریس کے ہم خیال مسلمانوں نے نیشنلسٹ مسلم کانفرنس کے نام سے اپنا ایک علیحدہ ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور سیکرٹری تصدق احمد خاں شروانی تھے۔ اس جماعت میں بعض ایسے لوگ بھی شریک تھے جو کانگریس کے باضابطہ رکن نہ تھے۔ لیکن رائے دہندگی بالغاں

کی بنا پر مخلوط انتخاب کے شدید حامی تھے مثلاً سر علی امام۔ سید حسن امام۔ مہاراجہ محمود آباد وغیرہ۔ میاں فضلِ حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کو بھی گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع مل گیا تو باہمی اختلاف پیدا ہوگا۔ اور کانفرنس کے مباحث میں تمام مسلمان اتفاق، یگانگت اور یک جہتی سے کام نہیں کر سکیں گے اس طرح مبادا آپس کے تفرقے سے فائدہ اٹھا کر اغیار مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

فضل حسین کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔ اس سے قبل نہرو رپورٹ کے بارے میں کانگرس نے گنتی کے چند مسلمانوں کی آڑ لے کر پوری مسلمان قوم کے احتجاج کو ٹھکرا دیا تھا۔ مہاتما گاندھی ایک طرف مسلمانوں کو کورا چیک پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے تھے کہ جب تک کانگرسی مسلمان غیر کانگرسی مسلمانوں سے اتفاق رائے نہیں کریں گے وہ مسلمانوں کے جداگانہ مطالبات کو تسلیم کرنے سے معذور ہیں۔

اِن حالات میں میاں فضلِ حسین کی یہ رائے بالکل درست اور صائب تھی کہ گول میز کانفرنس میں جانے والا مسلمان وفد ہم خیال، متحد اور ایک پروگرام کے تحت کام کرنے والے افراد پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے وائسرائے سے کہہ کر ذیل کے اصحاب کو نامزد کرا دیا۔ آغا خاں۔ مولانا محمد علی۔ سر شاہ نواز بھٹو۔ نواب چھتاری۔ راجہ شبیر محمد خاں۔ مولوی فضل الحق۔ سر عبدالکریم غزنوی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ حافظ ہدایت حسین۔ مسٹر جناح۔ سر عبدالقیوم۔ سر سلطان احمد۔ سر محمد شفیع۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں۔

چودھری ظفر اللہ خاں اور بیگم شاہنواز۔

ان افراد میں صرف مسٹر جناح ایک ایسے شخص تھے۔ جو مسلم کانفرنس کے ممبر نہ تھے۔ اور جن کی آزادئ فکر سے میاں فضل حسین خائف تھے۔ اگر فضل حسین کا بس چلتا تو وہ جناح کو اس وفد سے یقیناً خارج کرا دیتے۔ لیکن جناح کی سیاسی عظمت، جس کے سامنے اُن کے بڑے سے بڑے حریف کو بھی سرِ خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس قدر واضح اور نمایاں تھی کہ وائسرائے اُن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ مسٹر جناح اپنے چودہ نکات مرتب کر کے عملاً مسلم کانفرنس کے مطالبات کے ہم نوا بن چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میاں فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ وہ اُنھیں بوقتِ ضرورت آسانی سے مرعوب و متاثر نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ گول میز کانفرنس میں جناح کے اثر کو جس قدر کم کیا جا سکتا ہے کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کو کانفرنس کے لیے نامزد کرنے میں اُن کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ شفاعت احمد خاں، مسٹر جناح کو کھری کھری سنا سکیں گے۔

۱۰ مئی ۱۹۳۰ء کو یو۔ پی کے گورنر سر میلکم ہیلی کو ایک خط میں میاں فضل حسین لکھتے ہیں:۔

"...... صاف بات یہ ہے کہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کانفرنس میں صرف جناح تقریریں کرے۔ اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر جناح اپنی تقریروں میں ایسے

خیالات کا اظہار کرنے لگ جائے۔ جو محض اُس کے ذاتی خیالات ہیں اور جن سے ہندوستانی مسلمان قطعاً متفق نہیں۔ تو پھر کانفرنس میں ایک آدھ ایسا مضبوط اور نڈر آدمی ضرور ہونا چاہیے جو کھڑا ہو کر جناح کو دو بدو جواب دے سکے۔ اور یہ کہہ سکے کہ جناح کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات نہیں ہیں۔ بلاشبہ یہ کام مشکل بھی ہے اور ناگوار بھی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اُس نمائندے کی، جس کے خیالات کی تردید منظور ہے حیثیت بہت بلند ہو۔ مجھے یقین ہے کہ شفاعت احمد اور ظفر اللہ اِس فرض کی بجا آوری سے قطعاً دریغ نہیں کریں گے۔ شفیع کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اُس نے جناح کی مخالفت میں کچھ کہا تو مبادا اُسے ذاتی رقابت پر محمول کیا جائے"[1]

سوال یہ ہے کہ جناح کے وہ کون سے ذاتی خیالات تھے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات سے متضاد تھے۔ اور جن کے اظہار پر فضلِ حسین یوں بھڑ بھڑا دینا چاہتے تھے؟ صرف یہ کہ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اِس شرط پر مخلوط انتخاب قبول کرنے کی ہامی بھری تھی کہ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ حالانکہ جناح کا یہ جرم اس قدر شدید اور ناقابلِ عفو نہ تھا کہ فضلِ حسین اس سے کبھی درگذر نہ کرتے۔

---

[1] سوانح عمری ص۲۵۱

گول میز کانفرنس میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ خود آغا خاں اور سر محمد شفیع فرقہ دارانہ مفاہمت کے لیے مخلوط انتخاب قبول کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ صرف یہی نہیں۔ اس واقعہ کے دو سال بعد خود میاں فضلِ حسین نے ہندوؤں اور سکھوں کو مخلوط انتخاب کی پیش کش کی تھی۔[1]

گول میز کانفرنس میں مسٹر جناح ایسے حالات میں گھرے ہوئے تھے کہ اپنے اور بیگانے دونوں اُن سے ناخوش تھے۔ فضلِ حسین نہایت ہوشیاری سے کانفرنس کے مدوجزر کو اپنے حسبِ منشا استعمال کرنے میں مصروف تھے۔ وہ حکومتِ ہند اور وائسرائے سے پے بہ پے (ایسی) یادداشتیں لندن بھجوا رہے تھے۔ جو اُن کے خیالات کی مؤید اور حامی تھیں۔ ملک عمر حیات خاں ٹوانہ وزیرِ ہند کی کونسل کے رُکن تھے۔ وہ فضلِ حسین کے ایما پر وزیرِ ہند کے سامنے برابر انہی خیالات کو پیش کرنے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ جب برطانیہ کے وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے مسلمانوں کے مطالبات سے بے اعتنائی کا اظہار کیا تو فضلِ حسین نے فوراً وائسرائے کے توسل سے وزیرِ ہند کو یہ شکایت پہنچائی کہ مسلمان نہرو رپورٹ کو رد کر چکے ہیں۔ اور سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حکومت اب مسلمانوں کی وفاداری کا یہ انعام دے رہی ہے کہ ہم پر وہی آئین مسلط کیا جا رہا ہے۔ جو ہمیں نہرو رپورٹ نے پیش کیا تھا۔[2]

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۰۰۔ [2] سوانح عمری صفحہ ۲۵۶

دوسری گول میز کانفرنس میں جو ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی۔ مہاتما گاندھی بھی شریک تھے۔ جب انگلستان میں اُن کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور حکومت بھی اُن سے مرعوب ہوتی نظر آئی۔ تو فضلِ حسین نے شفاعت احمد خاں کو ایک خط میں لکھا:۔

"۔۔۔۔۔ لندن میں جو گاندھی کی آؤ بھگت ہو رہی ہے اُس کی پرواہ مت کرو۔ اگر کانفرنس کے مسلمان مندوبین نے اپنے پتّے ہوشیاری سے استعمال کیے تو یقین کرو کہ تم دوسری قوموں سے بازی لے جاؤ گے۔ آغا خاں تمہارا لیڈر ہے جسے انگلستان کی معاشرتی زندگی میں بے حد نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہاں کا کوئی باشندہ، انگریز یا ہندوستانی، اِس عظمت میں آغا خاں کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اگر تم نے متحد ہو کر آغا خاں کی قیادت میں کام کیا تو پھر کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔"[1]

گول میز کانفرنس کی کارروائی دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے کھیل میں میاں فضلِ حسین کا ہاتھ پسِ پردہ کام کر رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک تفصیل کو اپنے فہم کے مطابق طے کرنے میں مصروف تھے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ فضلِ حسین کی اِس پالیسی نے جناح کو بالکل بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تھا اور وہ کانفرنس میں ایک یکہ و تنہا شخص کی حیثیت سے موجود تھے جو نہ خود کسی

---

[1] سوانح عمری صد ۲۵۲

کا لیڈر رہے - اور نہ کسی لیڈر کی قیادت میں کام کرنے پر رضامند ہے۔

۱۹۳۶ء میں جناح نے لاہور آ کر ایک تقریر کے دوران میں اپنی اس قابلِ رحم حالت کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا تھا:

"میرے دوست پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں گول میز کانفرنس کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اس کانفرنس میں بالکل یکہ و تنہا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو ناراض کیا۔ کیونکہ وہ مجھے مخلوط انتخاب کا حامی سمجھتے تھے۔ ہندو مجھ سے الگ ناراض تھے۔ کیونکہ میں چودہ نکات کا موجد تھا۔ میں نے والیانِ ریاست کو بھی ناراض کیا۔ کیونکہ میں اُن کی پس پردہ اور خفیہ کارروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اور میں نے ان کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا برطانوی پارلیمنٹ بھی مجھ سے ناراض تھی۔ کیونکہ میں نے ابتدا ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس ایک بہت بڑا فریب ہے اور میں کسی شرط پر بھی برطانوی حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ کانفرنس کے مندوبین کے ہجوم میں میرا ایک بھی حامی اور مددگار نہ رہا" [1]

---

[1] فروری ۱۹۳۶ء میں مسجد شہید گنج کا قضیہ چکانے کے لیے مسٹر جناح لاہور تشریف لائے تھے تو ۲ مارچ کو باشندگانِ لاہور کی طرف سے، جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بھی

بقیہ صفحہ ۲۶۹ پر

سر سیموئل ہور (حال لارڈ ٹمپل وڈ) جس زمانے میں وزیر ہند تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"..... جناح بھی چونکہ اُن کے ساتھ (آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خاں کے ساتھ) بیٹھتے تھے۔ اِس لیے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے وفد کی رہنمائی کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً بحث میں نمایاں حصّہ لیا۔ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ اُن کے

شامل تھے۔ مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے کی غرض سے بریڈلا ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا جس کے صدر لاہور کے بشپ تھے۔ اس جلسے میں پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لا نے جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ہندو پارٹی کے لیڈر بھی تھے مسٹر جناح کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "گول میز کانفرنس کے مباحث میں مسٹر جناح نے دوست دشمن کسی کی پروا نہیں کی۔ اور جس رائے کو وہ دیانت و امانت سے صحیح سمجھتے تھے اُس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنوں اور بیگانوں دونوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ گویا صدا بہ صحرا بن کر رہ گئے۔ لیکن یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر جناح جس بات کو درست سمجھتے ہیں اُس پر چٹان کی طرح جم جاتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی ترغیب و تحریص اُنھیں اس مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

پنڈت نانک چند کی اس تقریر کے جواب میں مسٹر جناح نے وہ تقریر کی تھی جس کا اقتباس اوپر درج ہے۔

مطبوعہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء

تغیر پذیر ذہن کی حرکات سمجھنے سے معذور تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ کسی شخص کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں۔ کیا وہ ایک آل انڈیا فیڈریشن کے حامی تھے؟ اس کا تیقن کے ساتھ جواب دینا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ اگرچہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُنھوں نے اُس وقت تقسیم ہند یا قیام پاکستان کی قطعاً کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ کیا وہ مرکز میں ردّ و بدل کئے بغیر صوبائی خود مختاری کے حامی تھے؟ بعض اوقات ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبائی خود مختاری سے آگے نہیں جانا چاہتے لیکن پھر دوسرے لمحے میں وہ مرکز اور صوبجات دونوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے لگ جاتے تھے۔ اُن کی یہی تغیر پذیر ذہنی کیفیت تھی۔ جو اُن کے ساتھ تعاون کرنے میں ہمارے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ اور جس کی وجہ سے وہ اپنے مسلمان رفقا کی صاف اور صحیح رہنمائی کرنے سے معذور تھے۔" لہ

حقیقت یہ ہے کہ لارڈ ٹمپل وڈ نے اس ساری کیفیت کا پس منظر سمجھے بغیر اپنی رائے قائم کر دی ہے۔ اصل بات وہی ہے جس کا ذکر جناح نے اپنی الم مور والی تقریر میں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق اپنے اور بیگانے دونوں غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں۔ اور کوئی شخص بھی اُس کے خیالات اور عقائد

لہ NINE TROUBLED YEARS, Page 52

کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ تو غلط تصورات کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں۔

گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کو جس قدر کامیابی ہوئی۔ اُس کا سہرا میاں فضلِ حسین کے سر ہے۔ مسلم کانفرنس کے کم و بیش تمام مطالبات منظور کر لیے گئے تھے۔ جداگانہ انتخاب بدستور قائم رہا۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں ویٹیج برقرار رکھا گیا۔ صوبہ سرحد میں مکمل اصلاحات رائج کر دی گئیں۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک جداگانہ صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت (اگرچہ بے حد قلیل) قائم ہو گئی۔ صرف بنگال کے متعلق مسلم کانفرنس کا مطالبہ تسلیم نہ کیا جا سکا۔ وہاں اگرچہ مسلمانوں کی آئینی اکثریت تو قائم نہ ہوئی۔ لیکن یورپین ممبروں کو ویٹیج عطا کر کے کانگرس کا زور توڑ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گورنروں کو اس قسم کی ہدایات جاری کر دی گئی تھیں کہ صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصّہ ضرور ملنا چاہیے۔

اِن مراعات کے علاوہ میاں فضلِ حسین کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اُنھوں نے آئی۔ سی۔ ایس اور امپیریل سروس کی دوسری اسامیوں میں مسلمانوں کے لیے پچیس (۲۵) فی صد حصّہ آئینی طور پر محفوظ کرا دیا۔ ۱۹۲۸ء میں حکومتِ ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ امپیریل سروس کی ۳۳ فی صد اسامیاں اقلیتوں کے لیے مخصوص کر دی جائیں گی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے؛ انھیں اس تینتیس (۳۳) فی صد میں سے بمشکل چودہ فی صد حصّہ ملتا تھا۔ اور باقی اسامیاں مسیحی، پارسی اور سکھ لے جاتے تھے۔ حالانکہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب سے بیشتر اسامیوں کے مستحق مسلمان تھے۔ میاں

فضلِ حسین نے چار سال کی لگاتار کوشش کے بعد ۱۹۳۲ء میں حکومتِ ہند کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ لیفٹیننس فی صد کے اس تناسب میں سے پچیس اسامیاں لازماً مسلمانوں اور باقی آٹھ دیگر اقلیتوں کو ملنی چاہییں۔ اس کے ساتھ ہی ضمناً یہ بھی تسلیم کرایا کہ اگر ان آٹھ اسامیوں میں سے کسی اسامی کے لیے غیر مسلم اقلیت کا کوئی موزوں اُمیدوار نہ مل سکا تو وہ اسامی بھی مسلمانوں کے حصے میں چلی جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ فضلِ حسین سے پہلے تین مسلمان علی الترتیب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ سر علی امام۔ سر محمد شفیع اور سر حبیب اللہ لیکن تدبّر۔ معاملہ فہمی۔ سیاسی بصیرت اور مسلمانوں کی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لحاظ سے ان تینوں میں سے کوئی شخص میاں فضلِ حسین کے برابر کام نہ کر سکا۔

ایف۔ ڈبلیو۔ وِلسن ایک مشہور انگریز اخبار نویس تھے۔ جو روزنامہ پائنیر (الہ آباد) کے ایڈیٹر تھے۔ پھر انڈین ڈیلی میل کے ایڈیٹر ہو کر بمبئی چلے گئے تھے۔ وِلسن کی رسائی وائسرائے سے لے کر ہر چھوٹے بڑے انگریز افسر تک تھی۔ اس طرح انھیں حکومت کے بعض ایسے رازوں کا علم تھا۔ جو عوام تو کیا، خواص کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رہتے تھے۔ وِلسن نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا:۔

"..... بدقسمتی سے لارڈ ارون کو اپنی کونسل کے لیے جو ہندوستانی ممبر میسّر آئے۔ وہ بہت ہی معمولی قابلیت کے آدمی تھے سیاسی بصیرت سے محروم ہونے کے علاوہ انھیں ہندوستان کی سیاسی ترقی و تبدیلی کا بھی براہِ راست کوئی علم نہ تھا۔ ان میں سے دو نے تو

سائمن کمشن کی تشکیل کے وقت وائسرائے کو صریحاً غلط مشورہ دے کر گمراہ کیا تھا۔

البتہ لارڈ ارون کی حکومت کے آخری دور میں سر فضل حسین نے جو بلاشبہ ہندوستان کے قابل ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وائسرائے کی کونسل کو اپنی شرکت کا اعزاز بخشا۔ فضل حسین کا رویہ عام ملکی اصلاحات کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وائسرائے کی کونسل میں اُن کی موجودگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اس کام کے لیے وہ اصلاحات کے نفاذ کو بھی اُس وقت تک ملتوی رکھنے کو تیار ہیں۔ جب تک مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک پونڈ سے بھی زیادہ گوشت کا مطالبہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ ہندوستان میں یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ سر فضل حسین اور ہندوستان کی سول سروس کے درمیان ایک واضح مفاہمت قائم ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ سر فضل حسین سول سروس کی ہر آڑے وقت میں مدد کریں۔ اور اس کے معاوضے میں سول سروس والے مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کریں گے .... لندن کی گول میز کانفرنس میں غیر کانگرسی مسلمانوں نے جس یکجہتی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا۔ اور جس ہوشمندی اور تدبر سے اپنے مطالبات تسلیم کرائے اُسے دیکھ کر اِن لوگوں کو، جن کی باگ ڈور براہِ راست فضل حسین کے ہاتھ میں تھی بے اختیار مبارکباد کہنے کو جی چاہتا ہے

فضلِ حسین کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان میں اُس وقت تک نئی اصلاحات رائج نہیں ہوسکیں گی۔ جب تک وہ مسلمانوں کو اس قدر مضبوط و منظم نہ کردیں کہ وہ اپنی شرط منوانے کے قابل ہوسکیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ سر فضلِ حسین اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی عوامی اور قومی تحریکوں سے دلچسپی رکھتے پھریں۔ میرا یقین ہے کہ وہ اِن تحریکوں سے چشم پوشی ضرور کرتے ہیں تاکہ حکومت میں اُن کا وقار روز بروز بڑھتا ہے۔ اور وائسرائے اور وائٹ ہال یہ خیال کرکے اُن کے ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اپنی زبردست شخصیت سے مسلمانوں کو حکومت کی وفاداری و خیرخواہی سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ سر فضلِ حسین نے سول سروس سے جو مفاہمت کر رکھی ہے اُس کی ابتدا لاہور میں ہوئی تھی مقصد یہ تھا کہ قوم پرست مسلمانوں کی تحریک کو کچلا جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کو شدّ و مد سے پیش کیا جائے۔ اور آخر کار گول میز کانفرنس میں تہدید و تخویف کے حربوں سے اِن مطالبات کو منوایا جائے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر حکومت ہند کے رجعت پسند طبقے کا دل باغ باغ ہوجاتا ہوگا۔" [1]

---

[1] THE INDIAN CHAOS (PAGE 81 and 113)

BY F. W. WILSON

ولسن نے سول سروس اور سر فضلِ حسین کی جس باہمی مفاہمت کا ذکر کیا ہے۔ اُس کو حسبِ روایت تسلیم کرنے میں مجھے تامّل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فضلِ حسین نے قومی تحریکوں کو ہمیشہ کچلا۔ اور مسلمانوں کی جنگ محض اپنی صوابدید۔ اپنی بصیرت اور اپنی عقل کے مطابق لڑنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپریل ۱۹۳۵ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر واپس لاہور آئے۔ تو اُنھیں حد درجہ حسرت آمیز لہجے میں کہنا پڑا:۔

"......آج قوم میں کوئی لیڈر نہیں۔ اور اس تہی دامنی کی ذمّہ داری حکومت کی پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کے کارندے جونہی دیکھتے ہیں کہ کسی ہندوستانی کا اپنی قوم میں اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ تو فوراً اُس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اب تو یہ حکومت کا مسلّمہ قاعدہ بن گیا ہے۔ ہندوؤں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کانگرسی ہیں۔ اور حکومت کے خلاف ہیں لیکن مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ مسلمانوں کے متعلق حکومت نے یہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے کہ اُن میں باہمی پھوٹ ڈالنے کے لیے اندر ہی اندر بڑی ہوشیاری سے پراپاگنڈہ کیا جاتا ہے۔ ذاتی رقابتوں کو زور شور سے ہوا دی جاتی ہے۔ فرقہ واریت اور جماعت سازی کے جذبے کو اُبھارا جاتا ہے اور جب اِن حربوں سے بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ تو پھر قوم کے ادنٰے اور غلیظ طبقے سے لیڈروں پر کیچڑ اُچھلوائی جاتی ہے۔ نتیجہ

کیا ہونا ہے؟ حکومت کو اپنے حسب منشا کام کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ ان حالات میں صوبائی وزیروں کی حیثیت سوائے اس کے اور کیا رہ جاتی ہے کہ وہ معمولی تحصیلداروں کی طرح گورنروں کے اشارے پر ناچتے پھریں"۔[1]

یہ اس یونینسٹ پارٹی کے کارناموں پر میاں فضل حسین کا ہلکا سا تبصرہ ہے جسے خود انھوں نے ۱۹۲۳ء میں قائم کیا تھا۔ اور جس کے سپرد انھوں نے پنجاب کی تقدیر کر رکھی تھی۔ آج وہ قومی لیڈروں کے فقدان۔ سیاسی زندگی کے افلاس وزیروں کی بے بسی اور حکومت کی خودسری کی بڑی دردمندی سے شکایت کر رہے تھے۔ حالانکہ اگر وہ ذرا غور فرماتے تو انھیں یہ حقیقت معلوم ہو جاتی کہ اس صورت حالی کی تمام تر ذمّہ داری اُنہی پر عائد ہوتی تھی۔

علامہ اقبال نے اُنہی دنوں، جب میاں فضل حسین حکومت ہند کی رکنیت سے سبکدوش ہو کر لاہور تشریف لائے تھے، انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"...... یہ کس قدر افسوسناک امر ہے۔ کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اُسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لیے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۲۷۴

تھے۔ لیکن انھوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ اس طرح اُن کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اُس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تیسرے درجے کے لوگ، جو اپنے موجودہ عروج کے لیے فضلِ حسین کے ممنون ہیں، خود ادنےٰ صلاحیت کے مالک ہونے کے باعث، فضلِ حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی۔ کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن میں صحیح "لیڈرشپ" مفقود ہو چکی ہے۔ اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے"۔

اس واقعہ سے سال بھر پہلے۔ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام ہی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر۔ خوش آمدید کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے مسلمانوں کے باہمی نفاق پر اظہارِ افسوس کیا تھا۔ اور پنجاب کے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔

گورنر کے اِس مشورے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک انگریزی بیان میں۔ جو تبصرہ کیا تھا۔ اُس کی چند سطور کا ترجمہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"میں گورنر کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مسلمانانِ پنجاب کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کی ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔ کہ خود حکومت بھی اپنے اعمال و افعال کا محاسبہ کرے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت پنجاب کے مسلمانوں میں۔ شہری اور دیہاتی کی جو خوفناک تفریق قائم ہو چکی ہے۔ اور جس نے اِس صوبے کے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے وہ کس کی قائم کی ہوئی ہے؟ یہ تفریق صرف شہری اور دیہاتی مسلمانوں تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ اِس نے خود دیہاتی مسلمانوں کو بھی قسم قسم کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو آئے دن ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

" سر ہربرٹ ایمرسن نے اِس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ پنجاب کے مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا نہیں کر سکے۔ کاش سر ہربرٹ ایمرسن کو اس امر کا احساس ہوتا کہ پنجاب کے شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں۔ جو خوفناک پھوٹ پڑ چکی ہے۔ وہ سراسر حکومت نے خود پیدا کی ہے۔ اور حکومت ہی اس پھوٹ کو قائم رکھنے پر مُصر ہے۔ ہماری قومی سیاست۔ ایسے خودغرض اور طالع آزما

قسم کے افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ جن کے سامنے۔ صرف جلبِ منفعت کے ذاتی اغراض ہیں۔ اور جو مسلمانانِ پنجاب میں یک جہتی قائم کرنے کے ہرگز خواہاں نہیں۔ حکومت خود اِن غرض مند افراد کی سرپرستی کرنے میں مصروف ہے۔ اور یوں بالواسطہ شہری و دیہاتی جھگڑے کو زور شور سے ہَوا دے رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ مسلمان کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اِس صورتِ حال کو دیکھ کر میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کہ حکومت نے یہ طرزِ عمل غالباً اختیار ہی اِس واسطے کیا تھا۔ کہ پنجاب میں کوئی حقیقی لیڈر پیدا نہ ہو سکے۔

"سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ میں اس کے برعکس۔ اِس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں۔ کہ حکومت نے جان بُوجھ کر ایسا طرزِ عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جس نے اِس صوبے میں۔ اصلی اور پائدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام اُمیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔"

اقبالؔ کا یہ فیصلہ کسی عجلت یا تیز مزاجی، یا جلد بازی کا نتیجہ نہ تھا۔ اِس فیصلے کے پیچھے پورے بارہ سال کا عمیق مشاہدہ اور تجربہ کام کر رہا تھا۔ اقبالؔ اور فضلِ حسین پُرانے دوست تھے۔ دونوں کالج میں ہم جماعت و ہم سبق رہ چکے تھے۔ اقبالؔ نے بانگِ درا کی ایک بے مثال نظم فلسفۂ غم فضلِ حسین ہی کی خاطر سے

لکھی تھی - اقبالؔ، فضلِ حسین کی قائم کی ہوئی مسلم کانفرنس کے بڑے سرگرم رُکن تھے اور آگے چل کر اُس کے صدر بھی بن گئے تھے - اقبالؔ کو فضلِ حسین نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا ڈیلی گیٹ بنا کر انگلستان بھیجا تھا - اس لیے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اقبالؔ نے کسی قسم کی ذاتی رنجش یا عداوت کی بنا پر فضلِ حسین کے خلاف مذکورہ بالا الفاظ کہے ہوں گے -

اقبالؔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رُکن رہے - یہ تین سال اُنھوں نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریقِ کار کو بغور دیکھا - شہری و دیہاتی چپقلش لیجسلیٹو کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی - اور پھر اس چپقلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا - اقبالؔ سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں - بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اقبالؔ ایسے بلند پایہ مفکر، فلسفی اور شاعر کو صوبے کی لیجسلیٹو کونسل میں نہیں جانا چاہیئے تھا - یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے لیکن میری ناچیز رائے ہے کہ اگر اقبالؔ کونسل کے اندر بیٹھ کر یونینسٹ پارٹی کے طرزِ عمل کو بچشمِ خود ملاحظہ نہ کرتے - تو شاید اُن کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پا سکتا - جو قدرت نے اُن کی زندگی کے آخری دو برسوں میں اُن کے لیے مقدّر کر رکھا تھا -

۱۹۳۵ء میں ملک کی حالت یہ تھی کہ مسلم لیگ ایک تنِ نیم جاں کی طرح پڑی سسک رہی تھی - مسلم کانفرنس اپنا ہنگامی کھیل ختم کر کے روپوش ہو چکی تھی محمد علی فوت ہو چکا تھا - جناح ساڑھے تین سال کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں

واپس ہندوستان آیا تھا۔ اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اِس ملک میں اُس کے پاؤں دوبارہ جم سکیں گے یا نہیں۔ پنجاب میں احرار، اُس شمع کی طرح جس کی لَو بجھنے سے پہلے آخری مرتبہ بھڑکتی ہے۔ گویا سنبھالا لینے والے تھے اِن حالات میں میاں فضلِ حسین کا یہ شکوہ بالکل بجا تھا کہ قوم "لیڈرشپ" سے محروم ہو گئی ہے۔ اُن کا یہ خیال بھی درست تھا کہ :-

"پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکام بالادست نے پنجاب کو اسی چیز سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اصلاحات کے نفاذ کے بعد پنجاب نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ پنجاب پھر اس نعمت سے محروم ہو گیا ہے"۔ [1]

پنجاب خودداری سے محروم ہو گیا تھا۔ یا اُس کا وقار زائل ہو گیا تھا۔ یا اُس کی عزتِ نفس مجروح ہو گئی تھی۔ تو اس کی ذمہ داری اُن لوگوں پر تھی جو اس صوبے کے حکمران تھے۔ جن کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی۔ جو سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ اور سرکار دالاتبار کے دربار میں قوم کی نمائندگی کا دعوے کرتے

---

[1] میاں فضل حسین نے اپنے انتقال سے چند مہینے قبل انگریزی میں ایک پمفلٹ پنجاب پالیٹکس کے نام سے لکھا تھا۔ اگرچہ پمفلٹ پر مصنف کا نام "ایک پنجابی" درج تھا۔ لیکن یہ بات ہر شخص کو معلوم تھی کہ اصلی مصنف میاں فضلِ حسین ہیں۔ یہ اقتباس اسی پمفلٹ کے صہ ۲۹ سے لیا گیا ہے۔

تھے۔ یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں نے مسلمانوں کی نمائندگی کے دعویدار بن کر جس قدر دُنیوی و مالی فوائد اُٹھائے۔ اگر اُن کی تفصیل بیان کی جائے تو شاید حیرت سے لوگوں کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ ہزاروں ایکڑ زرخیز اراضی اِن لوگوں نے مفت حاصل کی۔ اپنی اولاد کو بڑے بڑے عہدے دلوائے جاگیریں، انعام اور خطابات حاصل کیے۔

یہ صحیح ہے کہ میاں فضلِ حسین نے اپنے تدبّر سے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی مہم کو منزلِ کامرانی تک پہنچایا تھا۔ اُنھوں نے محض اپنی ذاتی قابلیت سے وائسرائے اور حکومتِ ہند کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے نئی دہلی میں بیٹھ کر لندن کی بساطِ سیاست پر اپنے مہروں کو اس طرح حرکت دی کہ خود گاندھی بھی اُن کی چال کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔[1]

---

[1] مہاتما گاندھی نے گول میز کانفرنس میں اس بات پر اصرار کیا تھا کہ جب تک نیشنلسٹ مسلمانوں کے نمائندے ڈاکٹر انصاری کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے وہ مسلمانوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ گاندھی جی کی ضد سے حکومت بھی مرعوب ہو گئی تھی۔ اور وائسرائے نے ڈاکٹر انصاری کو لندن بھیجنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن میاں فضلِ حسین جانتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ ڈاکٹر انصاری لندن پہنچ گئے تو مسلمانوں کا متحدہ محاذ پارہ پارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اور وائسرائے سے صاف کہہ دیا کہ اگر ڈاکٹر انصاری کو لندن بھیجا گیا تو کانفرنس کے تمام مسلمان مندوبین

(بقیہ صفحہ ۲۸۳ پر)

فضلِ حسین کی ابتدائی تربیت کانگریس اور مسلم لیگ کے گہوارے میں ہوئی تھی - وہ شروع میں ایک عوامی لیڈر ہی کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے آئے تھے اس لیے ہر چند کہ دنیادی مصلحتوں نے قدم قدم پر اُن کا دامن پکڑ رکھا تھا - وہ دل میں یقیناً سمجھتے تھے کہ جب تک کسی لیڈر کے پیچھے عوام کی مجموعی طاقت نہ ہو اُس کی آواز میں زور پیدا نہیں ہو سکتا - چنانچہ جب پہلی گول میز کانفرنس میں لیبر حکومت کے وزیرِ اعظم نے مخالفانہ رویہ کا اظہار کیا - اور مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ اُن کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جائیں گے - تو میاں فضلِ حسین نے لکھا کہ :-

"اگر جداگانہ انتخاب برقرار نہ رکھا گیا - اگر اقلیت کے صوبوں سے ویٹج چھین لیا گیا - اگر پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت نہ دی گئی - تو میں اس بات پر مجبور ہو جاؤں گا کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے ساتھ لے کر کانگریس میں شامل ہو جاؤں کیونکہ کانگریس کے ذریعہ سے ہندوستان کی جدید تشکیل میں حصہ لینا اس امر سے بہتر ہے کہ ہم انگریز کے عطا کیے ہوئے آئین کے تحت آہستہ آہستہ اپنی ہستی کو معدوم کر بیٹھیں" [1]

فضلِ حسین کی یہ دھونس (انگریزی میں "بلف" کہنا چاہیئے) ممکن ہے لارڈ اردن پر چل گئی ہو - لیکن اُن کی گذشتہ دس برس کی زندگی اِس دعوے

مستعفی ہو کر واپس آ جائیں گے - فضلِ حسین کی یہ دھمکی کارگر ہوئی - اور ڈاکٹر انصاری لندن نہ جا سکے -
(INDIAN CHAOS Page 14)

[1] سوانح عمری ۲۵۶

کی کھلم کھلا تکذیب کر رہی تھی۔ میاں فضلِ حسین نے یقیناً مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب اور ویٹیج سے دیا۔ اُنھوں نے پنجاب میں مسلم اکثریت بھی قائم کرا دی۔ اُنھوں نے سندھ کو جداگانہ صوبہ بھی بنوا دیا۔ اُنھوں نے سرحد میں اصلاحات بھی رائج کرا دیں۔ اور اُنھوں نے امپیریل سروس میں مسلمانوں کا پچیس ۲۵ فیصد تناسب بھی مقرر کرا دیا۔ لیکن یہ کامیابی محض اُن کی ذاتی کامیابی تھی۔ جسے اُنھوں نے اپنی ہوشیاری، سیاسی مہارت اور شاطرانہ صلاحیت سے حاصل کیا تھا۔ قوم کی اجتماعی قوّت اور عوام کی مجموعی طاقت اِس جدّوجہد میں اُن کے ساتھ نہ تھی۔ بلکہ یُوں کہنا صحیح ہوگا کہ اُنھوں نے اِس اجتماعی قوّت اور مجموعی طاقت کو مختلف حیلوں سے ہمیشہ دبائے رکھا۔

چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں نیا دستور بن کر آیا۔ تو مسلمانوں کے آئینی حقوق تو بلاشبہ محفوظ تھے لیکن اُن کی اجتماعی زندگی بالکل بے جان، بے حس اور بے رُوح ہو چکی تھی۔ لیڈر شپ کے فقدان کی وجہ سے چاروں طرف ایک افسردگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اور بعض اوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ قوم کی قوم پر گویا سکوتِ مرگ طاری ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے کہا ہے ؎

سینے میں دلِ آگاہ جو ہے، کچھ غم نہ کرو، ناشاد سہی
بیدار تو ہے، مشغول تو ہے، نغمہ نہ سہی، فریاد سہی
ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اُس کے اندر ہے
اِک وجد تو ہے، اک رقص تو ہے بے چین سہی، برباد سہی

دلِ آگاہ کی یہی "بیداری و مشغولیت" اور بگولے کا یہی "وجد و رقص" زندگی کی علامت ہے۔ اِس سے بحث نہیں کہ دل ناشاد و نامراد ہے یا شاد کام و بامراد۔ بگولہ بے چین و برباد ہے یا مضطرب و پریشاں ؎

زندگی سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام
تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

(اقبالؔ)

جس دن کوئی فرد یا کوئی قوم اِس سوختنِ ناتمام ۔ اِس وجد و رقص ۔ اِس بیداری و مشغولیت اور اِس اضطراب و التہاب سے محروم ہوئی اُسی دن اُس پر موت کی خاموشی طاری ہو جائے گی ۔ راقم التحریر کو وہ زمانہ یاد ہے جب بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی اپنے مقدمے کی روزمرہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے کمرۂ عدالت میں کھڑے ہو کر رام پرشاد بسملؔ کی یہ غزل گایا کرتے تھے[1] ؎

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

نوجوش و تہوّر اور ایثار و سرفروشی کی چنگاریاں سنٹرل جیل کی دیواروں کو چیر کر

---

[1] رام پرشاد بسملؔ شاہجہانپور (یو۔ پی) کے باشندے اور ہندوستان کے مشہور انقلاب پسند تھے۔ ۱۹۲۶ء میں کاکوری کے ڈاکے میں گرفتار ہوئے۔ اور پھانسی کی سزا پائی۔

ہندو نوجوانوں کو آتش بجاں اور شعلہ بداماں کر رہی تھیں - راقم السطور کو وہ دن بھی یاد ہے - جب مہاتما گاندھی عصائے پیری تھام کر سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف پیدل روانہ ہوئے تھے - تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین اپنے محور سے ہٹ جائے گی - راقم الحروف کو وہ وقت بھی یاد ہے جب سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے پہلے غیر سرکاری صدر وٹھل بھائی پٹیل نے اپنے بلند و بالا منصب پر لات مار کر وائسرائے کو لکھا تھا کہ :-

"میرے ہم وطن اس وقت موت، اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں ملک کے سینکڑوں نامور لوگ جیلوں میں داخل ہو چکے ہیں - ہزاروں اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار بیٹھے ہیں اور لاکھوں ایسے ہیں جو اس زبردست تحریک کی خاطر زندان کی کال کوٹھڑی میں جانے کے لیے بخوشی آمادہ ہیں - جہادِ حریت کی تاریخ کے اس نازک موقع پر میرا یہ کام نہیں کہ اسمبلی کی کرسیٔ صدارت پر بیٹھا رہوں - بلکہ میرا فرض ہے کہ اپنے بھائیوں کے پہلو بہ پہلو آزادیٔ وطن کی جنگ میں حصّہ لوں" - [1]

تو اس انقلاب انگیز بیان کی اشاعت کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں ایک ایسی زبردست ہلچل مچ گئی تھی - جس کے سامنے انگریزی ملوکیت کا اقتدار ڈانواں ڈول ہوتا نظر آ رہا تھا -

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۳۰ء - جلد اول صـ ۱۰۳

سر فضل حسین نے بلاشبہ اپنے سیاسی فہم و فراست سے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ لیکن وہ یہ حقیقت بھول گئے کہ قومیں محض چند بڑے آدمیوں کے "سیاسی ہیر پھیر" سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ قوموں کا سرمایۂ نازش و افتخار عوام کا جذبۂ ایثار اور عوام کا جوشِ عمل ہے۔ فضل حسین کی سیاست میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ انھوں نے عوام کو نہ صرف ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا بلکہ عمداً ایسی تدبیریں اختیار کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی عوامی قوت بیدار ہونے کی بجائے روز بروز غافل و درماندہ ہوتی گئی۔ یہ شرف قدرت نے اقبال اور جناح کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ کہ ایک تو اپنے قلم کی معجز نگاری اور دوسرا اپنے عمل کی قوت سے قوم میں نئی زندگی کی روح پھونک کر اسے منزلِ مقصود کا راستہ دکھلائے۔

حصّہ دوم

اقبال کے آخری دو سال

آٹھواں باب

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت، جوں جوں نئے آئین کے نفاذ کا وقت قریب آ رہا تھا، ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو رہی تھیں۔ کانگرس نے بڑی ردّ و کد کے بعد صوبائی اسمبلیوں میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اِس غرض کے لیے ایک کُل ہند پارلیمنٹری بورڈ بھی وضع کیا گیا تھا۔ جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ مجالسِ قانون ساز کے لیے موزوں کانگرسی اُمیدواروں کا انتخاب کرے۔ ابتدا میں ڈاکٹر انصاری اِس بورڈ کے صدر رہے۔ لیکن بعد میں صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے دو حصّے تھے۔ ایک کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے۔ اور دوسرے کا تعلق پورے ہندوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن کے قیام سے تھا۔ صوبائی اسمبلیوں کی اہمیت اس خیال سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کہ آئندہ فیڈریشن کی مرکزی اسمبلی کے ممبروں کا انتخاب صوبوں کی مجالسِ قانون ساز کے ذمّے تھا۔ اس لیے ظاہر ہے اِن مجالس میں جس جماعت کے ارکان کی اکثریت

ہو گی - وہی جماعت فیڈرل اسمبلی میں بھی اپنے نمائندے بھیج سکے گی ....
کانگرس کی ہمہ گیر اور زوردار تنظیم کے پیشِ نظر یہ کہنا چنداں مشکل نہیں تھا - کہ آئندہ صوبائی اسمبلیوں میں کانگرسی ممبروں کی بہت بڑی تعداد داخل ہو گی اور آئین کو کامیاب یا ناکام بنانے کی ذمہ داری گویا ایک حد تک انہی ممبروں کے سر عائد ہو گی -

مسلمانوں کا اِس قسم کا کوئی مرکزی ، وسیع الاثر یا ہمہ گیر ادارہ نہیں تھا جو کانگرس کی مانند ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب کی نگرانی کر سکے - یا اُن اسمبلیوں میں بھیجنے کے لیے موزوں مسلمان امیدواروں کا انتخاب کرے مسٹر جناح ۱۹۳۴ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے تھے اور اُن کی کوشش سے مسلم لیگ میں کچھ حرکت پیدا ہو گئی تھی - لیکن چونکہ لیگ نے اپنی گذشتہ تیس سال کی زندگی میں براہِ راست کبھی انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا - اِس لیے مسٹر جناح اِس تذبذب میں تھے کہ لیگ کے تحت ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے یا نہ کیا جائے - لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستان بھر میں اپنا اثر و رسوخ رکھتی ہو - ۱۹۲۳ء میں خلافت کمیٹی نے سوراج پارٹی کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ ضرور لیا تھا - لیکن تحریکِ خلافت کے ختم ہوتے ہی خلافت کمیٹی بھی ختم ہو گئی تھی -

آخر جب مختلف خیال رکھنے والے لوگوں نے مسٹر جناح سے بار بار درخواست کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور انھیں ایک پالیسی کے تحت لانے کے لیے

اس موقع پر مسلم لیگ کا انتخابات میں شریک ہونا ضروری ہے تو ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے چوبیسویں سالانہ اجلاس میں جو سر وزیر حسن کے زیرِ صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تھا۔ منجملہ دیگر قراردادوں کے ذیل کی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

"...... ہرگاہ کہ آئینِ جدید کے نفاذ کے ساتھ اس ملک میں جو پارلیمنٹری نظامِ حکومت رائج ہوگا۔ اس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کر لیا گیا ہے۔ جو اس قسم کی حکمتِ عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کاربند ہوں۔ کہ رائے دہندوں کی سیاسی تربیت کر سکیں اور اسی نوع کے عزائم و مقاصد رکھنے والی دیگر جماعتوں سے تعاون میں سہولت بہم پہنچا سکیں۔ اور آئینِ نو سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کر سکیں۔

"ہرگاہ کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو تقویت پہنچانے اور صوبائی حکومتوں میں اُن کے لیے مناسب اور مؤثر حصّہ حاصل کرنے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔

"لہٰذا قرار دیا جاتا ہے کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصّہ لینے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اس بورڈ کے ارکان کی کم از کم

تعداد پینتیس ہو اور اسے اختیار حاصل ہو کہ ہر صوبے کے مقامی
حالات کے پیش نظر مختلف صوبوں میں صوبائی الیکشن بورڈ قائم کر کے
مرکزی بورڈ سے اُن کا الحاق کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے
مناسب تدابیر و ذرائع اختیار کرے۔"

یہ قرارداد راجہ غضنفر علی خاں نے پیش کی۔ جو اُس وقت کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے۔ تائید کرنے والوں میں مولانا احمد سعید دہلوی سیکرٹری جمعیت العلمائے ہند۔ سر سلیمان قاسم مٹھا (بمبئی) سید حسین امام (بہار) عبدالحمید خاں (مدراس) نواب زادہ لیاقت علی خاں (یو۔ پی) حاجی رشید احمد (دہلی) اور مولانا محمد عرفان سیکرٹری خلافت کمیٹی بمبئی شامل تھے۔

عین جس وقت آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے کے لیے مذکورہ بالا پروگرام مرتب کر رہی تھی۔ پنجاب میں میاں فضل حسین یونینسٹ پارٹی کو پھر سے زندہ کرنے میں مصروف تھے۔ سر سکندر حیات خاں پنجاب کی ریونیو ممبری کی پنج سالہ میعاد ختم کر کے ہندوستان کے ریزرو بنک کے ڈپٹی گورنر بن چکے تھے۔ جہاں وہ ساڑھے پانچ ہزار روپے مشاہرہ لیتے تھے۔ اُن کی جگہ نواب مظفر خاں پنجاب کے ریونیو ممبر بن گئے تھے۔ میاں فضل حسین کو معلوم تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک طاقتور عنصر اُن کے خلاف ہے۔ اور سر سکندر اس باغی فریق کے لیڈر ہیں۔ تاہم وہ اس پارٹی کے منتشر عناصر کو یکجا کرنے کی فکر میں شب و روز کام کر رہے تھے۔ پنجاب میں نواب مظفر خاں۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول محمود، سر سکندر کے بہت بڑے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔

سر سکندر کو معلوم تھا کہ میاں فضلِ حسین سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہ تھا یہ بھی صحیح ہے کہ فضلِ حسین بیمار تھے - اور کام کی شدت جس قسم کی جسمانی طاقت و توانائی اور صحت کی طالب گار تھی - وہ انھیں حاصل نہ تھی ۔ لیکن فضلِ حسین کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ذہانت ایک ایسا حربہ تھا جس کا لوہا اُن کے حریف بھی مانتے تھے ۔ اور سر سکندر کو یقین تھا کہ اگر اُن کے اور میاں فضلِ حسین کے درمیان مقابلہ کی نوبت آئی تو انجام کار یونینسٹ پارٹی فضلِ حسین ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی - اِس صورت میں سر سکندر کے سامنے دو راستے کھُلے تھے - اول یہ کہ میاں فضلِ حسین کے تحت ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا قبول کر لیں - دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے کسی نئی پارٹی کی داغ بیل ڈالیں - سر سکندر بیک وقت اِن دونوں راستوں پر گامزن تھے ۔

اِدھر وقتاً فوقتاً میاں فضلِ حسین کو اپنے خلوص اور نیاز مندی کا یقین دلاتے رہتے تھے اور اُدھر میاں فضلِ حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کی دوڑ دھوپ بھی کرتے رہتے تھے - سر سکندر خود تو بنک کی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھے لیکن میاں احمد یار خاں دولتانہ اور میر مقبول محمود اُن کے نائب سالار کی حیثیت سے برابر لاہور میں کام کر رہے تھے ۔

جونہی سر سکندر کو معلوم ہوا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات میں حصّہ لینے کا عزم رکھتی ہے - انھیں فوراً یہ ڈھارس بندھی کہ شاید لیگ ہی اُن کی پریشانیوں کا مداوا بن سکے - اور وہ مسلم لیگ ہی کے توسّل سے میاں فضلِ حسین کے خلاف اپنی پارٹی مضبوط کر سکیں - چنانچہ اُنھوں نے میاں احمد یار خاں دولتانہ کو لیگ

کے اجلاس میں شرکت کے لیے بلبئی بھیجا - اور ۱۲ اپریل کی مذکورہ بالا قرارداد میاں احمد یار خاں دولتانہ کی موجودگی میں اور اُن کی رضامندی سے منظور ہوئی -

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت مسٹر جناح اِس تذبذب میں تھے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات کی جنگ لڑی جائے یا نہ لڑی جائے تو سر سکندر نے مسٹر جناح سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے نام پر اپنی جماعت منظم کر یں گے - اور مسلم لیگ، کے ٹکٹ پر میاں فضلِ حسین کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دیں گے -

سر سکندر کے راجہ نرندر ناتھ سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور راجہ صاحب ہر اُس شخص کی مدد کرنے کو تیار تھے - جو میاں فضلِ حسین کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکے - چنانچہ سر سکندر جب لاہور آتے تو راجہ نرندر ناتھ سے ضرور ملتے تھے اُن کا اندازہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کا وہ عنصر جو اُن کا حامی تھا - اگر راجہ نرندر ناتھ کی پارٹی سے تعاون کرے - تو اس طرح غالباً اُن کی جماعت کے ارکان کی تعداد میاں فضلِ حسین کے حامیوں سے بڑھ جائے گی - میاں فضلِ حسین، سر سکندر کی اِن سازشوں سے سخت پریشان تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ حالات و واقعات پر اُن کی گرفت پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی - ایک خط میں چودھری شہاب الدین کو لکھتے ہیں -

" دوست، عزیز اور رشتہ دار اس قدر خود غرض - حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں کہ اُن کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے - صبر و شکر کرنے اور غداریوں کو برداشت کرنے

کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تو زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ جو کام شروع کیا تھا اُسے بالخیر انجام تک پہنچایا جائے"۔[1]

میاں فضلِ حسین اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ کہ اگر سر سکندر اُن کی قیادت میں کام کرنا نہیں چاہتے۔ تو وہ بخوشی سیاسیات سے کنارہ کش ہونے اور لیڈری کا منصب سکندر کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں سر سکندر کو لکھتے ہیں:

"...... اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتہً دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ آپ بنک سے فوراً مستعفی ہو کر یہاں آجایئے۔ اور پارٹی کی زمامِ قیادت سنبھال لیجئے۔ میں چونکہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو رہا ہوں۔ اس لیے آپ کو غالباً اِس بات پر چنداں اعتراض نہیں ہو گا کہ میں ایک بیان شائع کر کے عوام کو اُن حالات و کوائف سے مطلع کر دوں۔ جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ میری تمنا ہے کہ آپ، آپ کے دوست اور آپ کی پارٹی کو ہر قسم کی کامیابی نصیب ہو"۔[2]

جب کشیدگی یہاں تک پہنچ گئی۔ تو سر سکندر نے بطور مصلحت خود لاہور آکر میاں فضلِ حسین سے معذرت کی۔ اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اُن کے

---

[1] سوانح عمری صـ ۳۲۳ ۔ [2] ایضاً صـ ۳۳۱

جملہ خدشات رفع کرنے کی کوشش کی ۔ احمد یار خاں دولتانہ نے بھی منت سماجت کر کے فضلِ حسین کو خوش کرنا چاہا ۔ آخر میاں فضلِ حسین اس قسم کی نیاز مندانہ گذارشات سے مطمئن ہو کر بظاہر پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ لیکن اِس مصالحت پر ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک اور شگوفہ کھلا ۔

میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل ہارپر نلسن فضلِ حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خاں چپکے چپکے ہارپر نلسن کے پاس جاکر پوچھتے تھے کہ فضلِ حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں ۔ ہارپر نلسن نے ایک ذمّہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خاں کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا ۔ لیکن اُنھوں نے میاں فضلِ حسین کو فوراً آگاہ کر دیا کہ اُن کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں ۔ فضلِ حسین کو نواب مظفر خاں کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہنچا ۔ کہ اُنھوں نے رنج و الم کی شدّت میں خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیا ۔ اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کش مکش کے بعد اِس مذموم ارادے سے باز آئے ۔[1]

حالات کی یہ روش سخت افسوسناک اور عبرت انگیز تھی ۔ وہ شخص جس کی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت نے پنجاب ہی نہیں ، بلکہ پورے ہندوستان کی سیاست کا رُخ پلٹ دیا تھا ۔ اب اُن لوگوں کی سازشوں سے جن کو خود اُسی نے ایک مٹی کے بُت کی طرح اپنے ہاتھ سے بنایا تھا ۔ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ پریشانی کے عالم میں اپنی جان لینے پر آمادہ ہو گیا تھا ۔ تاہم جب یاس و ناامیدی

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۳۲۴

کے یہ بادل چھٹ گئے اور فضلِ حسین کی طبیعت کو کسی قدر سکون حاصل ہوا تو انھوں نے پھر گرم جوشی سے یونینسٹ پارٹی کی تشکیل کی طرف توجہ کی۔

جب تعمیر و تشکیل کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔ تو ۱۹ اپریل کو نواب شاہ نواز خاں والیئے ممدوٹ کے مکان واقع ڈیوس روڈ لاہور پر ایک پر تکلف تقریب منعقد ہوئی۔ جہاں فضلِ حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا باضابطہ افتتاح کیا۔ ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک یونینسٹ پارٹی کی ہیئت ترکیبی یہ رہی تھی۔ کہ لوگ اپنے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل میں آتے تھے اور ایوان کے اندر باہمی افہام و تفہیم سے ایک پارٹی بنا لیتے تھے۔ کونسل سے باہر یونینسٹ پارٹی کا قطعاً کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ کبھی اس پارٹی نے آئینی و دستوری معاملات میں ہندوؤں یا مسلمانوں یا سکھوں کی رہنمائی کی۔ اور نہ کبھی عوام میں کوئی شخص اس پارٹی کا ممبر بنا۔ میاں فضلِ حسین نے اب پہلی مرتبہ یونینسٹ پارٹی کو ایک عوامی ادارے کا رنگ دے کر اُس کے نام پر الیکشن کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ طریقِ انتخاب جداگانہ تھا۔ اور ہندو اُمیدوار ہندو عوام سے اور مسلمان اُمیدوار مسلمان عوام سے ووٹ مانگتے تھے۔ اِن حالات میں میاں فضلِ حسین کا یہ اقدام کہ ایک نام نہاد اقتصادی پروگرام کی بنا پر ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کی کسی مخلوط پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصّہ لیا جائے ایک ایسا معنوی تضاد تھا۔ جس کو جداگانہ انتخاب کے اُصول کے ساتھ کسی طرح منطبق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ کونسل کے

اندر جا کر کام چلانے کے لیے بعض اصولوں پر متفق ہو جائیں۔ اور پھر انہی اصولوں کی روشنی میں وضع آئین و قوانین میں حصہ لیں۔ لیکن ایک طرف اس شدت سے جداگانہ انتخاب کی پابندی کا دعوے کرنا۔ کہ ۱۹۲۸ء میں جب مسلم لیگ نے پنجاب و بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کیے جانے کی شرط پر مخلوط انتخاب کی حمایت کی تھی۔ تو لیگ کو مسلمانوں کی بدخواہ اور غیر نمائندہ جماعت قرار دے کر اس کے جواب میں مسلم کانفرنس کا وجود کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہ اب جو ہندوستان میں پہلی مرتبہ پارلیمنٹری نظامِ حکومت کے مطابق وزارتیں مرتب کرنے کا وقت آیا۔ تو اسی متاعِ عزیز کو جس کا نام جداگانہ انتخاب تھا۔ ایک مخلوط انتخابی جماعت کے قیام سے عملاً مجروح اور بے کار کر کے رکھ دیا۔

۱۹۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا افتتاح کرتے وقت میاں فضلِ حسین نے ایک طویل تقریر کی۔ جس میں ملک فیروز خاں نون۔ سر سکندر حیات۔ چودھری شہاب الدین۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور چودھری چھوٹو رام کی دل کھول کر تعریف کی۔ اور ۱۹۲۱ء سے لے کر اب تک پنجاب کو جو کچھ عروج نصیب ہوا تھا۔ اُسے سراسر ان پانچ آدمیوں کی کوششوں کا ثمر قرار دیا۔ ممدوٹ والا کو یونینسٹ پارٹی کا صدر دفتر قرار دیا گیا تھا اور اسی جلسے میں پچاس ہزار روپیہ چندہ جمع ہو گیا۔ سید مراتب علی۔ نواب کالا باغ۔ اور سردار محمد نواز خاں رئیس کوٹ نے پانچ پانچ ہزار روپے دیئے۔ سر فضلِ حسین۔ چودھری ظفر اللہ خاں۔ نواب اللہ بخش ٹوانہ۔ نواب ممدوٹ۔ سر عمر حیات خاں ٹوانہ۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔

سر سکندر حیات - چودھری شہاب الدین - ملک فیروز خاں نون اور چودھری چھوٹو رام نے تین تین ہزار روپے عطا کئے - ان کے علاوہ سردار حبیب اللہ مولوی غلام محی الدین قصوری - میاں امیر الدین - سید افضال علی حسنی اور میر مقبول محمود نے ایک ایک ہزار دیا - ان تمام عطیوں سے بالاتر بیس ہزار کی رقم ایک ایسے شخص نے دینے کا وعدہ کیا جسے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے دُور کا تعلق بھی نہ تھا - یعنی ہز ہائینس آغا خان - دس ہزار کی پہلی قسط بھیجتے وقت آغا خاں نے فضلِ حسین کو لکھا :-

"........ میرے گماشتوں نے دس ہزار کی پہلی قسط آپ کو بھیج دی ہے - دوسری قسط اِنشاء اللہ اگست کے آخر یا ستمبر کے شروع میں بھجوا دوں گا - ڈاربی کی دوڑ میں اب کی میرا گھوڑا محمود اوّل آیا ہے - اور اِس طرح میں آپ کو یہ روپیہ بھجوانے کے قابل ہو سکا ہوں - ورنہ میری مالی حالت ایسی نہیں کہ آپ کی مدد کر سکوں" [1]

سوال یہ ہے کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے آغا خاں کو کیا دلچسپی تھی ؟ اس کا جواب چنداں مشکل نہیں - جن لوگوں نے آغا خاں کی خود نوشت سوانح عمری پڑھی ہے - انھیں اس سوال کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے میں کچھ دقت پیش نہیں آئے گی - ۱۹۱۲ء سے ہندوستان کی سیاسیات میں آغا خاں کی

---

[1] سوانح عمری صہ ۳۱۲

کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور اُنھوں نے مستقل طور پر یورپ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ پہلی جنگِ یورپ اور پھر تحریکِ عدم تعاون کے دوران میں آغاخاں کا نام کبھی سُننے میں نہیں آیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں جب میاں فضلِ حسین نے جناح کا زور توڑنے۔ اور مسلم لیگ سے مسلمانوں کی نمائندگی کا پروانہ چھیننے کے لیے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کرائی۔ تو اُس کی صدارت کے لیے آغاخاں کو انگلستان سے بُلایا۔ اور یوں پُورے سولہ سال کی گمنامی کے بعد آغاخاں کو پھر سے مسلمانوں کی قیادت کا شرف حاصل ہُوا۔ اور وہ اپنی اِس عزّت افزائی کے لیے کلیتہً فضلِ حسین کے ممنون تھے۔

۱۹۳۰ء میں جب گول میز کانفرنس کے اجلاس شروع ہوئے۔ تو وہاں بھی فضلِ حسین کی کوشش سے مسلمانوں کے وفد کی رہنمائی آغاخاں کے سپرد ہوئی۔ گول میز کانفرنس نے حکومتِ برطانیہ کے اربابِ حلّ وعقد کو یہ احساس کرا دیا کہ آغاخاں صرف گھوڑ دوڑ ہی کے شوقین نہیں بلکہ عرصۂ سیاست کے بھی بہت بڑے شہسوار ہیں۔ چنانچہ آغاخاں نے اپنی سوانح حیات میں بار بار اِس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے بعد برطانیہ کے دفترِ خارجہ۔ وزیرِ ہند اور وائسرائے کا رویہ اُن کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا۔ اور ان لوگوں نے آغاخاں کی سیاسی قابلیت سے بھی فائدہ اُٹھانے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ رویّے کی اس خوشگوار تبدیلی کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آغاخاں کو جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کا نمائندہ مقرر کیا گیا اور پھر وہ اُس لیگ کے صدر بھی بنا دیئے گئے اندریں حالات اگر آغاخاں نے فضلِ حسین کی درخواست پہ یونینسٹ پارٹی کو

بیس ہزار روپے عطا کئے ۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی ۔ یہ بیس ہزار کی رقم گویا فضل حسین کے احسانات کا حقیر معاوضہ تھی ۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کو یونینسٹ پارٹی کا چیف سیکرٹری اور نواب ممدوٹ کو خزانچی مقرر کیا گیا ۔ اِن کی مدد کے لیے ایک بہت بڑا سیکرٹریٹ بھی قائم ہوا ۔ جس میں سردار حبیب اللہ ۔ مولوی غلام محی الدین قصوری ۔ سیّد افضال علی حسنی ۔ سیّد امجد علی ۔ میاں امیر الدین ۔ میر مقبول محمود اور نواب زادہ خورشید علی خاں کو مختلف فرائض سپرد کیے گئے ۔

میاں فضل حسین ۱۹۲۱ء سے مسلسل حکومت سے وابستہ چلے آرہے تھے وہ بلاشبہ بڑے ذہین اور حالاتِ زمانہ سے واقف شخص تھے ۔ لیکن پندرہ سال تک حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہنے کے بعد اُن کا عوام سے براہِ راست کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا ۔ وہ یہ حقیقت سمجھنے سے معذور تھے کہ عدمِ تعاون اور سولِ نافرمانی کی وسیع تحریکوں نے ہندوستان کی نژادِ نو کے ذہن و فکر کو کس طرح نئے راستوں پر ڈال دیا تھا ۔ کانگرس کا روز افزوں اثر ایک سیلاب کی طرح اپنی لہروں پر ہندو نوجوانوں کو آگے بڑھائے لیے جاتا تھا ۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان سیاسی شعور کے اعتبار سے پس ماندہ تھے ۔ لیکن اِس پس ماندگی کے باوجود اُنھیں یونینسٹ پارٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ۔ اِس پارٹی نے ۱۹۲۴ء سے لے کر اب تک مسلمانوں کے لیے کیا کیا تھا کہ انھیں دوبارہ اُسی دام میں قدم رکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی ۔

زیادہ سے زیادہ یہ دعوٰے کیا جا سکتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی نے سرکاری ملازمتوں

کے حصول میں مسلمانوں کی بہت مدد کی۔ آئیے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے اس بات پر ایک نگاہ ڈالیں کہ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے سرکاری محکموں کی تمام چھوٹی بڑی اسامیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا کیا تناسب تھا۔ اِس طرح ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے۔ کہ بارہ سالہ دورِ اقتدار میں یونینسٹ پارٹی نے کہاں تک مسلمانوں کو اُن کا جائز حق دلانے کی کوشش کی۔

پنجاب سول سروس (ایگزیکٹو برانچ) میں مسلمانوں کا تناسب ۴۰ فی صد۔ اور جوڈیشل برانچ میں ۴۳ فیصد تھا۔ پولیس کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ یہ محکمہ مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ لیکن یہاں انسپکٹر کی اسامیوں میں مسلمان ۳۸ فیصد تھے۔ البتہ سب انسپکٹری میں انھیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں حاصل تھیں اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ہیڈ کنسٹیبل کے درجے میں انھیں آبادی کے تناسب سے زیادہ حصّہ ملا ہوا تھا۔

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی (محکمہ انہار) کی پراونشل انجنیئرنگ سروس میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد ۶۶ تھی اور اس کے مقابلے میں مسلمان صرف ۱۸ تھے۔ سب انجنیئرنگ کے درجے میں مسلمان ۱۲ فیصد اور ہندو ۸۷ فیصد تھے۔ سبارڈی نیٹ انجنیئرنگ سروس میں مسلمان ۳۰ فیصد اور ہندو اور سکھ ۷۰ فیصد تھے۔ کلرک اور ہیڈ کلرک کی اسامیوں پر مسلمانوں کا تناسب ۳۶ فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کا حصّہ ۶۶ فیصد تھا۔ پٹواریوں میں مسلمان صرف ۳۸ فی صد تھے واضح رہے کہ یہ محکمہ گذشتہ دس سال سے ایک مسلمان ممبر کے تحت چلا آ رہا تھا۔

محکمہ جنگلات کی پراونشل سروس میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹر کے عہدہ پر مسلمانوں کا تناسب ۱۷ فیصد تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب ۸۳ فی صد تھا۔

محکمۂ مال کے پٹواریوں میں البتہ مسلمان ۵۰ فیصد کے قریب تھے۔

محکمۂ قانون میں مسلمانوں کی نیابت ۱/۳ سے زیادہ نہ تھی۔ جیل کے محکمہ کی اعلیٰ اسامیوں پر مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ لیکن وارڈر اور ہیڈ وارڈر کی ادنیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ اُن کی آبادی کے تناسب سے زیادہ تھا۔ ہائی کورٹ کے کلرکوں میں مسلمانوں کا حصہ ۳۷ فی صد کے قریب تھا لیکن پنجاب سول سکریٹریٹ میں، جو تمام صوبے کے نظم و نسق کا مرکزی ادارہ سمجھا جاتا تھا، مسلمان کلرکوں کی تعداد صرف ۳۷ فی صد تھی۔ فنانشل کمشنر کے دفتر میں مسلمان صرف ۲۷ فیصد تھے۔ حالانکہ ۱۹۲۶ء سے اب تک ریونیو ممبری کا منصب مسلمان کے پاس چلا آرہا تھا۔

اب آئیے ان محکموں کی طرف جنھیں محکمہ جاتِ منتقلہ کہا جاتا ہے۔ اور جو وزرا کی تحویل میں تھے۔ زراعت کے محکمے کی پراونشل سروس کے درجۂ اول میں ایک مسلمان بھی نہیں تھا۔ اور ایگریکلچرل اسسٹنٹ کے عہدے پر مسلمانوں کا تناسب صرف ۲۳ فی صد تھا۔ ویٹرنری میں اُن کا تناسب ۴۰ فی صد کے قریب۔ اور کواپریٹو سوسائٹی کے محکمے کی ماتحت ملازمتوں میں انھیں آبادی کے تناسب کے لگ بھگ حصہ ملا ہوا تھا۔

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی پراونشل سروس میں مسلمان ۱۱ فیصد تھے اور سپیشل گریڈ میں اُن کا حصہ صرف ۷ فیصد تھا۔ سب انجینئر کی اسامی پر اُن کا تناسب ۱۶ فیصد

کے قریب تھا اور کلرکوں میں وہ صرف ۳۶ فیصد تھے۔

محکمہ تعلیمات کے سپیشل گریڈ میں مسلمان گیارہ فی صد تھے۔ پراونشل گریڈ کے درجۂ دوم کی ایک سو گیارہ اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس صرف ۳۶ فیصد حصّہ تھا۔ اور ۵۷ فیصد حصّہ ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں۔ سبارڈی نیٹ سروس کی ۹۰۸ اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس ۳۹ فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ۶۱ فیصد حصّہ تھا۔ واضح رہے کہ گیارہ سال سے محکمۂ تعلیمات کی مسندِ وزارت پر مسلمان متمکن چلے آرہے تھے۔

میڈیکل سروس کے اعداد و شمار یہ ہیں۔ سول سرجن کی اسامیوں میں سے مسلمانوں کا تناسب ۲۲ فیصد۔ اسسٹنٹ سرجن ۲۷ فیصد اور سب اسسٹنٹ سرجن بھی ۲۲ فیصد تھا۔ ڈسپنسروں کی معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمان صرف ۳۲ فیصد تھے۔

پبلک ہیلتھ کے محکمہ میں مسلمانوں کا مجموعی حصّہ ۳۰ فیصد تھا۔ لوکل سیلف گورنمنٹ اور رجسٹریشن کے محکمہ میں بھی مسلمانوں کا یہی کچھ حال تھا۔[1]

یونینسٹ پارٹی کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں اُن کا جائز حق نہ مل سکا۔ حالانکہ تعلیم یافتہ مسلمان مارے مارے بیکار پھرتے تھے سیاسی بیداری کا صوبے بھر میں نام و نشان نہیں تھا۔ عوام میں جب کبھی کسی سیاسی

---

[1] یہ تمام اعداد و شمار میاں فضلِ حسین کے ایک انگریزی پمفلٹ "پنجاب پالٹیکس" سے حاصل کئے گئے ہیں۔

تحریک کے برگ و بار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے گورنر سے مل کر اس تحریک کو ابھرنے سے پہلے ہی کچل دیا۔ یونینسٹ پارٹی صوبے کے چند بڑے بڑے زمینداروں کا ایک اجارہ تھا۔ جس سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں نے ایک طرف تملق و خوشامد کی روایات کو فروغ دیا۔ اور دوسری طرف عوام کی نمائندگی کے دعوے دار بن کر۔ اور ہر قسم کا مال و دولت سمیٹ کر اپنے گھر بھرنا شروع کر دیئے۔ پھر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق کو اس درجہ راسخ کر دیا کہ اب یہ دونوں طبقے خواہ مخواہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کے دورِ جدید کا افتتاح کرتے وقت بعض ایسے لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ جو کسی زمانے میں اُن کے شریک و سہیم رہ چکے تھے۔ لیکن اب بعض وجوہ سے اُن کے راستے کٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں ملک برکت علی بھی شامل تھے۔ ملک صاحب نے اس دعوت کا جو جواب دیا۔ وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری ہے۔

"...... آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں خودداری کا فقدان ہو گیا ہے۔ اور قومی کارکنوں کے سامنے سب سے مقدم اور ضروری مسئلہ یہ ہے۔ کہ زائل شدہ خودداری کو کیونکر بحال کیا جائے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اس خوب صورت حقیقت کو اس سے بہتر پیرایہ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو میں یہ عرض کروں گا کہ

خودداری کے اس فقدان کی ذمہ داری سراسر اُس یونینسٹ پارٹی کے سر عائد ہوتی ہے۔ جسے آپ پنجاب کے سیاہ و سپید کا مالک بنا کر خود دہلی تشریف لے گئے تھے۔ یہی پارٹی آپ کی غیر حاضری میں برسرِ اقتدار رہی۔ اور اسی پارٹی نے صوبے کی خودداری کو بیچ کھایا ہے۔ ستم ہے کہ اب آپ نے پھر اُسی پارٹی کو منظورِ نظر قرار دے کر اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے آپ حالات پر قابو پا سکیں۔ لیکن کب تک؟ سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد یہ کام کون کر سکے گا؟۔ کیا نون اور سکندر یہ کام کریں گے؟ ہمیں یہ دیکھ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ وہ لوگ جن کو خود آپ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اب آپ کو گرانے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں۔ ایسٹرن ٹائمز کہتا ہے کہ سر سکندر نے آپ کی قیادت قبول کر لی ہے۔ لیکن ٹربیون کا بیان اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سر سکندر ہے کون؟ میاں صاحب! خدارا آنکھیں کھولیے۔ اور صوبے کے لائق اور قابل افراد کو اپنے گرد جمع کیجیے۔ اُن افراد کو جنھیں آپ نے دھتکار کر پرے پھینک دیا ہے۔ اور جو گمنامی میں پڑے ہوئے اپنا وقت کاٹ رہے ہیں۔ صوبے کے یہی لائق اور قابل افراد شہنشاہیت پسند گورنر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ آپ بھی تو اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب آپ یہاں حکمراں تھے۔ تو پنجاب میں یقیناً خودداری کا

جذبہ موجود تھا۔ لیکن آپ کے جانشینوں نے جو کچھ حال کر دیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ تعجب ہے کہ آپ پھر بھی اُن کے عظیم الشان کارناموں کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

"ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ پھر سے قابل افراد کو میدان میں لے آئیں گے۔ سچ پوچھئے تو اِن سکندروں اور فوتوں کو بہ عجلت تمام ختم ہو جانا چاہیئے۔ اور جس قدر جلد یہ لوگ اپنے اصل مقام پر واپس چلے جائیں اُتنا ہی بہتر ہے۔ موجودہ صورتِ حال کے ذمہ دار آپ اور صرف آپ ہیں۔ یہ سکندر اور یہ فوتن اور یہ انگریز کے اشارے پر ناچنے والے بڑے بڑے زمیندار تو ایک منٹ میں صاف کئے جا سکتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ اِن لوگوں کی پشت پناہ اور ملجا و ماوی آپ ہیں۔

"مسلمانوں کو آپ سے بھی شکایت ہے۔ کیا آپ اس سے باخبر ہیں؟ اگر نہیں تو میں نے جرأت کر کے سارا حال آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ تاکہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ کے کسی دوست نے اپنا سینہ چیر کر آپ کو دل کی بات نہیں بتائی۔ ہمارے دل میں اب بھی آپ کی عزت اور احترام موجود ہے۔ لیکن ہم نے مجبور اور تنگ آ کر قومی خدمت کے میدان سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سا دردمند دل ہے جو اِس افسوسناک صورتِ حال پر آٹھ آٹھ آنسو نہیں روتا۔

جسے آپ کی لیڈرشپ نے پیدا کر دیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہم لوگ صوبے کی خدمت اور اُس کے وقار کو بلند کرنے کی تمام کوششوں سے محروم ہو گئے ہیں؟

نہ اقبال ختم ہو چکا ہے۔ بیچارا شاہ نواز اپنا وقت پورا کر چکا ہے اور شجاع بھی گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ باقی رہ گئے۔ سکندر، فیروز اور سر شہاب۔ اب انہی لوگوں کا بول بالا ہو گا۔ جو ماحول اس وقت طاری ہے اور جو موانع حائل ہیں۔ اُن کی موجودگی میں اِن لوگوں کے سوا اور کون ترقی کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی اُس یونینسٹ پارٹی کی مہربانی سے ہوا ہے جس کے بلند بانگ دعاوی کا ڈھنڈورا آپ بدستور پیٹ رہے ہیں" [1]

۲۹۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح لاہور تشریف لائے اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ دو مہینے پہلے جب وہ مسجد شہید گنج کا قضیہ چکانے کے لیے لاہور آئے تھے۔ تو بھی احمد یار خاں دولتانہ ہی کے مکان واقع جیل روڈ پر ٹھہرے تھے۔ مسٹر جناح کی تشریف آوری کا مقصد یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادِ بمبئی کے مطابق پنجاب میں بھی ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے۔

یکم مئی کو مسٹر جناح سر فضلِ حسین سے اُن کے مکان پر جا کر ملے۔ اسی مکان

---

[1] اصل خط انگریزی میں تھا جو ۴ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا تھا۔

میں جہاں آج کل ریڈیو سٹیشن قائم ہے۔ مسٹر جناح کے ساتھ ملک لال دین قیصر مرحوم بھی تھے۔ جناح اور فضلِ حسین کی گفتگو دیر تک جاری رہی۔ دونوں اپنے اپنے سیاسی عقیدے کے مطابق اپنی اپنی جگہ چٹان کی طرح کھڑے تھے۔ مسٹر جناح چاہتے تھے کہ مسلمان امیدواروں کو لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لینا چاہیئے۔ اور اسمبلی کے اندر اپنے ہم خیال و ہم عقیدہ لوگوں کے ساتھ تعاون کر کے وزارت مرتب کرنا چاہیئے۔ میاں فضلِ حسین کا جواب تھا کہ پورے ایوان میں مسلمان صرف اکیاون فی صد ہیں۔ اور جب تک انھیں غیر مسلموں کے کسی قابلِ اعتماد فریق کا تعاون حاصل نہ ہو۔ وزارت نہیں بنا سکتے۔ اس لیے انھوں نے اسمبلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی چودھری چھوٹو رام کے ساتھ مل کر ایک غیر فرقہ وارانہ اور مخلوط جماعت یعنی یونینسٹ پارٹی بنائی ہے اور اب اسی پارٹی کے نام پر الیکشن لڑی جائے گی۔

مسٹر جناح ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی اس بنیادی کمزوری سے واقف تھے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو چونکہ ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی نہیں ملی۔ اس لیے انھیں لامحالہ کسی غیر مسلم گروہ کے ساتھ مل کر وزارت بنانا پڑے گی۔ چنانچہ انھوں نے میاں فضلِ حسین سے یہاں تک کہہ دیا کہ :-

"آپ بے شک اسمبلی کے ایوان میں چودھری چھوٹو رام سے اشتراک و تعاون کیجیئے۔ لیکن اسمبلی کے باہر کسی مخلوط پارٹی کے نام پر نہیں بلکہ مسلم لیگ کے نام پر الیکشن لڑنی چاہیئے۔ تاکہ اسمبلی کے اندر مسلمانوں کا وجود ایک جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے برقرار

ہے۔ جب تک طریقِ انتخاب جداگانہ ہے مسلمانوں کو جداگانہ پارٹی بنانے کے بغیر چارہ نہیں۔ اور اگر آپ مخلوط پارٹی کے نام پر الیکشن لڑنے کے قائل ہیں تو پھر مخلوط انتخاب رائج کیے جانے پر آپ کو کیا اعتراض ہے علاوہ ازیں یونینسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی بجائے مسلمان کانگریس میں کیوں نہ شامل ہو جائیں۔ جو یقیناً یونینسٹ پارٹی سے زیادہ ترقی پسندانہ جماعت ہے۔"

اِس بحث مباحثہ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ میاں فضلِ حسین کا جواب بہرصورت یہی تھا کہ اِس بات کا انتظار کرنا کہ اسمبلی کے اندر جاکر کسی ہم خیال جماعت کا تعاون حاصل کیا جائے۔ صرف بے سُود ہی نہیں بلکہ سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا ہم یونینسٹ پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ پارٹی نہیں بنا سکتے۔

یہ صورتِ حال تھی جب مسٹر جناح علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے ڈاکٹر صاحب اُن دنوں خاصے پریشان تھے۔ اُن کی صحت خراب تھی۔ اور وہ بیماری جس نے بعد ازاں مرض الموت کی صورت اختیار کرلی شروع ہو چکی تھی۔ سال بھر پہلے اُن کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اور دونوں بچوں کی نگہداشت کا سارا بوجھ تنہا اُن پر آپڑا تھا۔ پریکٹس بند ہو جانے کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع بھی مسدود ہو گئے تھے۔

جب اِن دو عظیم المرتبت انسانوں کی ملاقات ہوئی۔ تو میرے مرحوم دوست فضلِ کریم دُرّانی وہاں موجود تھے۔ دُرّانی صاحب انگریزی کے بڑے فاضل

انشاپرداز تھے۔ اور اُن دنوں ایک ہفتہ وار اخبار "رودھ" نکالتے تھے۔ درّانی مرحوم نے ایک مرتبہ اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بڑا دلچسپ نقشہ کھینچا تھا۔ کہنے لگے "مسٹر جناح اپنی روایتی جامہ زیبی۔ اور خوش پوشاکی کا ایک دلآویز مرقع بنے ہوئے تشریف لائے۔ اعلیٰ درجہ کی ولایتی دکان کا سِلا ہوا بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ اِدھر ڈاکٹر صاحب کی درویشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جسم پر سوائے بنیان اور دھوتی کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ "اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑپتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔"

درّانی مرحوم کی روایت ہے کہ یہ بات سن کر مسٹر جناح کرسی سے دو انچ اوپر اُٹھے۔ اور بڑے جوش سے کہنے لگے "مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔"

جہاں تک میری ناچیز معلومات کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان، اس سے قبل، کبھی گہرا ربط وضبط قائم نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۷ء تک سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے ہمیشہ گریزاں رہے یہاں تک کہ تحریکِ عدمِ تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے

مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصّے ہو گئے۔ تو ڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سیکرٹری بھی بن گئے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی۔ تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے اُس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر۔ اور پھر اُس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست تھے ہیں ۱۹۲۷-۲۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے انھوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ:۔

"جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے اُن تینوں ترمیموں کو بے دردی سے رد کر دیا۔ جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آچکا تھا۔ اِدھر کانگرس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ اِن حالات میں میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا۔ تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویّہ پر سخت نکتہ چینی کی۔ اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ جب تک وہ اُس پر ندامت کا اظہار کر کے، آئندہ اُس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں گے۔ مصالحت نہیں ہو سکتی۔"

ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسٹر جناح گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان چلے گئے۔ اور پھر وہیں مستقل اقامت کے ارادے سے ٹھہر گئے۔ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے اور اس طرح غالباً برسوں کے بعد انھیں مسٹر جناح سے بالمشافہ ملاقات کا موقع ملا۔

مجھے لندن میں بعض ایسے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جو گذشتہ تیس پینتیس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ اُن کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ کہ جب ڈاکٹر صاحب لندن تشریف لائے تھے۔ تو چند اصحاب کی کوششوں سے ایک اقبال ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی۔ جس نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی تھی۔ جہاں گول میز کانفرنس کے مندوبین کے علاوہ بہت سے اہلِ قلم انگریز بھی شریک ہوئے تھے۔ اس دعوت میں مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب کی مدح و ستائش میں ایک فصیح تقریر کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سنہ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے بھی انگلستان تشریف لائے تھے۔ مسٹر جناح کو حکومت نے ایک بے مصرف آدمی " سمجھ کر مدعو نہیں کیا تھا۔ اور اس دوران میں خود مسٹر جناح ہندوستان کی سیاسیات سے اس قدر بددل ہو گئے تھے۔ کہ انھوں نے ترکِ وطن کر کے لندن ہی میں اپنا مکان خرید لیا تھا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب اور مسٹر جناح کے درمیان پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور جب ڈاکٹر صاحب گول میز کانفرنس کی کارروائی سے اس قدر برگشتہ خاطر ہوئے کہ انھوں نے واپسی کا رختِ سفر باندھ لیا۔ تو ان

کے اور مسٹر جناح کے درمیان پھر ملاقات ہوئی۔ اور دونوں میں کم از کم اس بات پر ضرور اتفاق ہو گیا تھا کہ گول میز کانفرنس کے ڈھونگ سے مسلمانوں کو اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ جتنا اس کا ڈھنڈورہ پیٹا جا رہا تھا۔

مئی ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر جا کر اُن سے ملے۔ تو ۱۹۲۸ء کی غلط فہمیاں رفع ہو چکی تھیں اور کچھ لندن کی ملاقاتوں کی وجہ سے۔ اور کچھ بعد کے واقعات کی نوعیت کے باعث اُن کے درمیان اچھی خاصی یگانگت پیدا ہو چکی تھی۔ اس لیے جب مسٹر جناح نے پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کی درخواست کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فوراً اِس تجویز کی حمایت کی۔ اور امداد و اعانت کا پورا وعدہ کیا۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کے مکان پر دو یا تین روز قیام کرنے کے بعد مسٹر جناح ہوٹل میں اُٹھ آئے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ احمد یار خاں دولتانہ یونینسٹ پارٹی کے چیف سیکرٹری تھے۔ اور اب کہ سر فضل حسین سے کھلم کھلا ٹھن جانے کا احتمال پیدا ہو گیا تھا۔ مسٹر جناح نے اُن کے چیف سیکرٹری کے ہاں ٹھہرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔

اتحادِ ملت اور مجلسِ احرار کے لیڈروں نے بھی مسٹر جناح سے ملاقات کی۔ احرار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہونے کو تیار تھے لیکن شرط یہ تھی کہ اول تو کسی قادیانی کو لیگ میں شریک نہ کیا جائے۔ دوم مسلم لیگ کا نصب العین درجہ مستعمرات کے بجائے مکمل آزادی ہونا چاہیے۔

نصب العین کی تبدیلی کے بارے میں مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا

فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہوگا۔ قادیانیوں کی شرکت یا عدم شرکت کے متعلق انھوں نے کوئی وعدہ نہ کیا۔ تاہم مجلسِ احرار اور اتحادِ ملت کے رہنماؤں نے پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہونے کی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۸ رمئی ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول خاں اور پیر تاج الدین کے مشترکہ دستخطوں سے ذیل کا بیان ایسوسی ایٹڈ پریس کی معرفت تمام اخباروں میں شائع ہوا۔

"مسٹر جناح کی بے نفسی اور دور اندیشی کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے ایسے موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔ جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت نئے انتخابات کا وقت قریب آ رہا ہے۔ مسٹر جناح کے اِس اقدام سے اُن غرض پرست اور رجعت پسند حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہے جو اب تک مسلمانانِ ہند کی قیادت کا غلط دعوے کر کے اپنی مطلب برادی کرتے رہے ہیں۔ یہ کھلبلی، یہ اضطراب اور یہ پریشانی ہمارے نزدیک کچھ غیر متوقع نہیں۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تنظیم کا جو بیڑہ اٹھایا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی اِن مطلب پرست لیڈروں کے ہوائی قلعہ کا پاش پاش ہو جانا یقینی ہے۔ کیونکہ اب مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کے صحیح نمائندے جائیں گے۔

" اندریں حالات ہمیں یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہیں ہوا کہ بعض

اخباروں نے مسٹر جناح کی ناکامی کی فرضی اور بے بنیاد داستانیں وضع کر کے شائع کرنا شروع کر دی ہیں - ان اخباروں کا یہ بیان کہ پنجاب میں سوائے احرار لیڈروں کے اور کسی جماعت نے مسٹر جناح کا ساتھ دینا گوارا نہیں کیا - ایک صریح جھوٹ ہے -

" ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مذکورہ بالا اخباروں کے اس قسم کے بیان صرف غلط ہی نہیں - بلکہ گمراہ کن ہیں واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم کو مسٹر جناح کی دیانت وامانت اور سیاسی بصیرت پر ایسا پختہ اعتماد ہے کہ مسلمانانِ پنجاب کے تمام طبقوں نے بیک آواز مسٹر جناح کی تجویز کو لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا پنجاب کے مسلمان مسٹر جناح کی اس تجویز کے دل سے حامی ہیں کہ آئندہ صوبے کی اسمبلی میں ایسے خوددار، خوداعتماد اور محبِ وطن نمائندوں کو بھیجا جائے - جو اگر ایک طرف مسلمان قوم کے حقوق کا خاطر خواہ تحفظ کریں تو دوسری طرف ایوان کے دیگر ترقی پسند ممبروں کے ساتھ مل کر رائے عامہ کا وقار بھی قائم کر سکیں -

" ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ مسٹر جناح کی یہ تجویز جداگانہ انتخاب کا لازمی نتیجہ اور تتمہ ہے - اس لیے ہم اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ جس اہم کام کی ابتدا انھوں نے کی ہے ہم اس کو تکمیل تک پہنچانے میں دل وجان سے اُن کے حامی ہیں" [1]

---

[1] روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور - مورخہ ۹ رمئی ۱۹۳۶ء

اِس بیان کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ یونینسٹ پارٹی نے لاہور کے متعدد اخباروں کو مالی وظائف دینا شروع کر دیئے تھے۔ اور یہ اخبار یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر کا اشارہ پاکر بھڑوں کے چھتے کی طرح مسٹر جناح پر پل پڑے تھے۔ لاہور سے اُن دنوں مسلمانوں کا صرف ایک انگریزی روزنامہ ایسٹرن ٹائمز نکلتا تھا جو کلیتہً یونینسٹ پارٹی کے پراپاگنڈے کے لیے وقف تھا۔ اس کے علاوہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے صفحات پر ایک صاحب "مسلم کارسپانڈنٹ" کے نام سے ہر ہفتے یونینسٹ پارٹی کی قصیدہ خوانی اور مسٹر جناح کی مذمت میں اپنا زورِ قلم صرف کرتے تھے۔ اُردو روزناموں میں انقلاب یونینسٹ پارٹی کا سب سے بڑا اور سب سے بلند آہنگ نقیب تھا۔

اُنہی دنوں ایک روز ملک برکت علی میرے ہاں تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ غلام رسول خاں بھی تھے۔ جن سے ملاقات کا شرف اِس سے قبل مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ ملک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم جدید ہونے والی ہے لیکن کام کرنے والوں کی سخت کمی ہے۔ اِس لیے بہتر ہے کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

مجھے ملک صاحب کے اِس ارشاد کی تعمیل میں بے حد تامل تھا۔ اور اِس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مجھے سیاسیات میں عملی حصّہ لینے کا قطعاً شوق نہیں تھا۔ اُس زمانے میں سیاسیات سے میری دلچسپی صرف اِس حد تک محدود تھی کہ روزانہ اخبار پڑھ لیا۔ مہینے میں سیاسیات کی دو ایک تازہ کتابیں نظر سے گذر گئیں۔ اور یا پھر کبھی دوستوں کی محفل میں کسی سیاسی موضوع

پر گفتگو چھڑ گئی۔ تو اس میں حصہ لے لیا۔ اس سے آگے بڑھنا مجھے منظور نہیں تھا۔

تامل کی دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مجھے اپنے سیاسی عقائد پر اعتماد نہیں تھا۔ میں اس زمانے میں مخلوط انتخاب کا حامی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کانگرس کے ذریعے سے پنجاب کے مسلمانوں کے سیاسی جمود کو رفع کیا جائے۔ لیکن ملک صاحب سے میری دوستی اور نیاز مندی ایسی معمولی چیز نہ تھی کہ وہ میرے ایک دفعہ کے انکار سے خاموش ہو جاتے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ "کام کرنے والوں کا سخت قحط ہے۔ لیگ کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہیں کہ تنخواہ دار آدمی رکھ لیے جائیں۔ ادھر یونینسٹ پارٹی نے صرف پراپاگنڈے کے لیے ایک لاکھ روپے جمع کر لیے ہیں۔ تمھارا یہ لکھنا پڑھنا اگر آج قوم کے کام نہ آیا۔ تو کب کام آئے گا؟"

میں نے آخر ملک صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ چنانچہ ۱۲ مئی کو میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کے مکان بیرون بھاٹی دروازہ پر جب مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ تو مجھے بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ جلسے کی صدارت کے لیے علامہ اقبال بہ نفسِ نفیس تشریف لائے تھے اور انھی کی صدارت میں چار قراردادیں منظور ہوئیں۔

پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ کی ازسرِنو تنظیم کی جائے اور اصحاب ذیل کو صوبہ لیگ کے عہدیدار مقرر کیا جائے۔ صدر: علامہ اقبال۔ نائب صدر: ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین۔ سیکرٹری۔ غلام رسول خاں، بیرسٹرایٹ لا۔ جائنٹ سیکرٹری: میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لا اور عاشق حسین بٹالوی۔

دوسری قرارداد یہ تھی کہ مسٹر جناح کی اس اسکیم کا خیر مقدم کیا جاتا ہے جس کی رُو سے آل انڈیا مسلم لیگ ایک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے تمام صوبوں میں مسلمانوں کے انتخابات کی نگرانی کرے گی۔ نیز ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کریں۔ تیسری قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ جون کے وسط میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے جو اجلاس لاہور میں ہونے والے ہیں۔ اُن کے جملہ انتظامات اور باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنے کے لیے ایک مجلسِ استقبالیہ قائم کی جائے۔

چوتھی قرارداد فلسطین کے متعلق تھی جس میں برطانیہ کی عرب دشمنی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔

مسٹر جناح ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہر کر راولپنڈی تشریف لے گئے اور وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد کشمیر چلے گئے۔ سری نگر سے ۲۱ مئی کو انھوں نے مرکزی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ بورڈ کے تمام ممبروں کی تعداد ۵۶ تھی۔ جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے آدمی شامل تھے۔ پنجاب سے ذیل کے گیارہ اصحاب نامزد کیے گئے تھے۔

علامہ اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں (اتحادِ ملت) مولانا محمد اسحاق مانسہروی (اتحادِ ملت) سید زین العابدین شاہ گیلانی (اتحادِ ملت)۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ شیخ حسام الدین (احرار) چودھری افضل حق (احرار) چودھری عبدالعزیز بیگووال (احرار)

خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (احرار)۔

اِس طرح گویا چار نشستیں احرار اور تین نشستیں اتحادِ ملت کو حاصل ہوئیں اتحادِ ملت والے بڑے ذکی الحس تھے۔ اُنھوں نے دبے لفظوں میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ روز نامہ زمیندار اتحادِ ملت کا اخبار تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاں اتحادِ ملت کے صدر تھے۔ اس لیے زمیندار میں پے در پے ایسے مقالے شائع ہونے شروع ہوئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اتحادِ ملت کے رہنما غالباً مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ۲۳ مئی کو علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو لکھا۔

"...... مجھے امید ہے کہ پنجاب کی تمام جماعتیں بالخصوص احرار اور اتحادِ ملت۔ کسی قدر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں گی۔ اتحاد کے ایک بڑے گرم جوش اور سرگرم ممبر نے چند روز ہوئے مجھ کو یہی بتایا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے متعلق خود اتحادِ ملت والے وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کدھر کا رُخ کریں گے۔ تاہم ابھی بہت وقت ہے۔ اور ہمیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ عوام اتحاد کے نمائندوں کو اسمبلی میں بھیجنے کے کہاں تک شوقین ہیں۔"[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اتحادِ ملت کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے کہ یہ جماعت کب بنی۔ کیونکر بنی۔ اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے۔ ۱۹۳۵ء کے

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

اوائل تک احرار پنجاب پر چھائے ہوئے تھے۔ اُن کے شاندار جلسے اور دھوم دھامی جلوس دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ آئندہ پنجاب کی سیاست میں یہ جماعت ایک فیصلہ کن حصہ لے گی۔ احرار کے حریف منتشر اور غیر منظّم تھے۔ تاہم موقع کے منتظر تھے کہ کب احرار کے مقابلے میں اپنا جھنڈا بلند کریں۔ ایسا موقع جولائی ۱۹۳۵ء میں آگیا۔ جب سکھوں نے مسجد شہید گنج کو مسمار کر کے مسلمانانِ پنجاب کے دلوں پر ایسا چرکا لگایا۔ جس کا گھاؤ مدّت تک مندمل نہ ہو سکا۔

عوام کا خیال تھا کہ احرار، جو ہر مصیبت کے وقت سینہ تان کر آگے کھڑے ہو جاتے تھے، شہید گنج کے حادثۂ خونیں پر بھی مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ احرار نے اِس موقع پر بالکل سکوت اختیار کر لیا۔ لوگ پریشان تھے اور رہنمائی کے محتاج۔ جب احرار نے کوئی قدم نہ اُٹھایا تو مولانا ظفر علی خاں۔ سید حبیب۔ ملک لال خاں۔ سید زین العابدین شاہ۔ میاں فیروز الدین احمد۔ ملک لال دین قیصر۔ ڈاکٹر محمد عالم وغیرہ آگے بڑھے۔ اور ان لوگوں نے اپنے فہم و فراست کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دینے کی کوشش کی۔ حکومت نے سوائے ڈاکٹر عالم کے باقی تمام اصحاب کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ فروری ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی کوشش سے یہ لوگ رہا ہوئے۔ اور اُنھوں نے مل کر مجلسِ اتحادِ ملت کی بنیاد رکھی۔ جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج کو سکھوں سے واپس لیا جائے۔ اس واقعہ کے بعد پنجاب میں احرار اور اتحادِ ملت دو حریف جماعتیں بن گئیں۔ جن کے درمیان عرصہ دراز تک مخالفت کی آگ بھڑکتی رہی۔

۲۸ مئی کو علامہ اقبال نے اپنے دولت کدہ پر مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے پنجابی اراکین کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی شریک ہوئے۔ خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ سید محمد علی جعفری۔ مالک نورانی روزنامہ احسان۔ پیر تاج الدین بیرسٹرایٹ لا۔ پیر نور احمد۔ غلام رسول خاں بیرسٹرایٹ لا۔ شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ۔ میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لا۔ عاشق حسین بٹالوی۔

اس جلسہ کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی۔ اور دو قرار دادیں منظور ہوئیں۔ پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے ایک صوبہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جائے۔ دوسری قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ مجوزہ پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط مرتب کر کے انہیں علامہ اقبال کے نامِ نامی سے پنجاب بھر میں تقسیم کیا جائے۔

۸ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس لاہور میں ہونے والے تھے اور ۶ جون کو مسٹر جناح کشمیر سے واپس لاہور پہنچ رہے تھے۔ یہ زمانہ سخت مصروفیت کا تھا۔ علامہ اقبال اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود سارے کام کی ایک ایک تفصیل کو بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔ انہی دنوں بڑے زور سے یہ افواہ اڑنے لگی کہ مسٹر جناح کی آمد پر یونینسٹ پارٹی سیاہ جھنڈیوں سے مظاہرہ کرے گی۔ جب ہم لوگوں نے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کا واقعی یہ ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا۔ تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ اس لیے کہ عین اس وقت جب مسلمانانِ ہند کے نمائندوں کا

اجتماع لاہور میں ہونے والا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کی اس قبیح حرکت سے اہلِ لاہور کے دامن پر ایک شرمناک دھبہ لگ جانے کا اندیشہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک لال دین قیصر سے کہا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے فلاں فلاں ممبر کے پاس جاکر یہ پیغام پہنچادیں۔ کہ اگر انھوں نے سیاہ جھنڈیوں کا پروگرام ترک نہ کیا۔ تو اس کے نتائج خود یونینسٹ پارٹی کے لیے سخت خطرناک ثابت ہوں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس پارٹی کے بعض ہوشمند آدمیوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوُا۔ اور سیاہ جھنڈیوں کا مذموم ارادہ فسخ کر دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے پرانے اور ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کو سیاہ جھنڈیوں کے پروگرام کا علم نہیں تھا۔ یہ ساری کارروائی دو، تین ایسے نوجوانوں کی تھی۔ جن کی متاعِ علم و عمل ہر قابلِ تحسین چیز سے خالی تھی۔ لیکن جو اپنی ہستی کا ثبوت دینے کے لیے ہر قسم کی شرارت اور فتنہ پردازی پر ہمہ اوقات تیار رہتے تھے۔

اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ۸ جون کو مسلم لیگ کونسل اور پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس کس جگہ ہوں گے۔ لاہور میں بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس لیے خیال تھا کہ اگر اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں یہ اجلاس منعقد ہو جائیں۔ تو کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ بجلی کے پنکھے مہیا ہو جائیں گے۔ نواب مظفر خاں انجمن حمایتِ اسلام کے صدر تھے۔ اِس کام کے لیے اُن کی اجازت درکار تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب مظفر خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ لیکن اُنھوں نے حبیبیہ ہال دینے سے انکار کر دیا۔ نواب مظفر خاں یونینسٹ پارٹی کے بہت بڑے رُکن تھے۔ اُن سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ مسلم لیگ کو حبیبیہ ہال استعمال کرنے کی اجازت دیں گے۔

لیکن یہ امر یقیناً موجبِ حیرت ہے کہ جس انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں کی کامیابی کا دارومدار ہمیشہ اقبال کی نظم پر رہا ہو۔ آج اُسی انجمن کا صدر اقبال کی درخواست کو ٹھکرا کر حبیبیہ ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجبوراً برکت علی اسلامیہ ہال میں لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے جہاں مسلم لیگ کا الیکشن مینی فسٹو باضابطہ منظور کیا گیا۔ اور پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد وضوابط مرتب کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ مولانا ظفر علی خاں اور اُن کے دونوں ساتھی پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہو گئے، استعفے کی وجہ مولانا نے یہ بیان کی کہ اتحادِ ملت چونکہ مکمل آزادی کی حامی ہے اور مسلم لیگ کا نصب العین درجۂ مستعمرات ہے۔ اس لیے دونوں جماعتوں میں اشتراک و تعاون نہیں ہو سکتا۔ مولانا کا یہ عذر محض عذرِ لنگ تھا حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ اُنھوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعوے بھی دائر کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ اتحادِ ملت کا علیحدہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے شہید گنج کے نام پر الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر من وعن یہی کچھ ہُوا۔ اور ڈاکٹر عالم نے نہایت ہوشیاری سے اتحادِ ملت۔ زمیندار مولانا ظفر علی خاں اور شہید گنج کو سراسر اپنی الیکشن کے لیے استعمال کیا۔

مرزا ابو الحسن اصفہانی نے اپنی کتاب میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے اِس اجلاس کا حال بیان کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جس سے ایک طرف ہماری قومی جدوجہد کی ابتدائی بے سروسامانی اور دوسری طرف ہمارے علمائے کرام کی سنگ دلی پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ اصفہانی صاحب

فرماتے ہیں:

"پارلیمنٹری بورڈ کے اس اجلاس میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ یہ تقریریں کرنے کی عادت اب ایک طرح روایت اور کمزوری بن گئی ہے۔ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی تقریروں میں مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے اس بات کا خیر مقدم کیا کہ اُنھوں نے مسلم لیگ کو زندہ اور فعال سیاست کے میدان میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن آخری روز اِنھی علمائے کرام میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ انتخابات میں لیگ کو کامیاب کرانے کے لیے پراپیگنڈے کی مہم کا بڑی سرگرمی اور خوش اسلوبی سے چلانا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا ہمارا خیال ہے کہ دیوبند کو اس پراپیگنڈے کا مرکز بنایا جائے بشرطیکہ اس مہم کا تمام خرچ لیگ برداشت کرے اس کے بعد اُنھوں نے فرمایا کہ پراپیگنڈے کی اس مہم کا آغاز کرنے کے لیے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہو گی۔

لیگ کے پاس اُس وقت پچاس پیسے بھی نہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری دونوں بغیر تنخواہ کے مفت کام کر رہے تھے۔ اور دفتر بھی گویا اُن کے ہینڈ بیگ ہی میں تھا۔ اِن علما کو ہم سے کہیں زیادہ مسلم لیگ کی مالی کمزوری کا علم تھا۔ بظاہر اُنھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اُن کی اِس تجویز کا جواب سوائے انکار اور معذوری کے کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے اُنھیں بتایا کہ مسلم لیگ کے

پاس کوئی سرمایہ نہیں۔ اور مستقبل قریب میں بھی کسی چندے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ ہم سب کو دل لگا کر خلوص سے کام کرنا چاہیئے آخر میں مسٹر جناح نے فرمایا کہ اگر لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم خلوصِ نیت سے اُن کی خدمت کر رہے ہیں تو روپیہ یقیناً جمع ہونا شروع ہو جائے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کام کر کے دکھایا جائے۔

یہ سُن کر علما کو سخت مایوسی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ ہندو کانگرس کی طرف کھسکنے لگے۔ بالآخر اُنھوں نے اپنے آپ کو کانگرس کے پراپیگنڈے کے لیے وقف کر دیا کیونکہ کانگرس اُن کے مالی مطالبات پُورا کرنے کی استطاعت رکھتی تھی۔ مجھے اس واقعہ سے بہت صدمہ ہوُا کیونکہ مجھے یہ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے علمائے کرام اس قدر خود غرض واقع ہوئے ہیں کہ اپنے ذاتی مفاد کو قوم اور ملّت کے مفاد پر مقدّم رکھتے ہیں۔ اور عین اُسی وقت یہ لوگ مسلمانوں کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے جب ہم اپنے قومی استقلال کی جنگ میں مصروف تھے۔" [1]

---

[1] "Qaid-E-Azam Jinnah As I Knew Him" By M.A.H. Ispahani, Page 23,24.

جب پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو سر فضلِ حسین نے ۶ رمئی کو ایک خط میں سر سکندر کو لکھا:

"جناح نے مرکزی پارلیمینٹری بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ جناح نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ لیکن جن اخباروں نے اس کا پراپاگنڈہ کیا ہے۔ وہی اس خبر کے بھی ذمہ دار ہیں۔ کہ جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نے اس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ اتحادِ ملت نے بھی انکار کر دیا۔ رہ گئے احرار۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں۔ اُن کا رویہ ہمارے متعلق یکساں رہے گا۔ البتہ اقبالؔ۔ شجاعؔ۔ تاج الدین۔ برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اِس بورڈ سے کچھ لے مرنے کی آرزو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں"۔ [1]

میاں فضلِ حسین نے اقبالؔ۔ شجاعؔ۔ تاج الدین۔ اور برکت علی کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک یہ چند "متفرق شہری باشندے" اچھوتوں کی بستی سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں پنجاب کی سیاسیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ تعجب ہے کہ وہ شخص جس نے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء

---

[1] سوانح عمری ص ۳۰۹

تک اپنی لیڈری کی عمارت انہی "چند متفرق شہری باشندوں" کے کندھوں پر سوار ہو کر استوار کی تھی۔ وہ شخص جس کو سیاسی جدوجہد کے اس پُرخطر زمانے میں، شاہ پور کے ٹوانے اور نون۔ اٹک کے کھٹڑ اور ملک۔ جہلم کے راجے اور چودھری حکومت کا معتوب سمجھ کر اپنے قریب بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آج خود حکومت کے قصرِ رفیع الشان میں داخل ہو کر اپنے انہی پرانے رفیقوں کا ذکر اس حقارت سے کرتا ہے۔ گویا اقبال۔ شجاع۔ تاج الدین۔ برکت علی اس قابل بھی نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوےٰ کر سکیں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

جون کے آخر میں میاں فضلِ حسین، ایک خط میں آغا خاں کو لکھتے ہیں:

"... جناح کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے اس لیے شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ اس بورڈ سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اب مولانا ظفر علی خاں اور اتحادِ ملت کے فیصلے نے تو گویا اس بورڈ کی کمر ہی توڑ دی ہے۔ صرف احرار باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا احرار لیگ میں شامل ہو کر اپنی جداگانہ ہستی کو معدوم کر ڈالیں گے؟ غالباً نہیں! بہر حال جہاں تک پنجاب کا

تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا وجود باقی نہیں رہا"۔[1]

میاں فضلِ حسین اگرچہ سر سکندر کو خط لکھ لکھ کر یونینسٹ پارٹی کی کامیابی اور جناح کی ناکامی کا مژدہ سنا رہے تھے۔ لیکن سر سکندر بدستور اپنی دو رُخی چالوں میں مصروف تھے۔ وہ ۲۰ جون کو بمبئی سے لاہور پہنچے۔ اور ایک طرف راجہ نریندر ناتھ سے ملے۔ اور دوسری طرف علامہ اقبال کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ راجہ نریندر ناتھ سے اُن کی جو گفتگو ہوئی اُس کی اطلاع کسی طرح سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کو بھی مل گئی۔ اور ۲۲ کو سول میں چھپ گیا کہ سر سکندر اور راجہ نریندر ناتھ کے درمیان اس امر کے متعلق تبادلہ خیال ہُوا ہے۔ کہ سر فضلِ حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی کو ختم کر کے پنجاب کی سیاسی جماعتوں میں کیونکر اتحاد قائم ہونا چاہیئے۔ میاں فضلِ حسین اُس وقت ڈلہوزی میں تھے۔ انھوں نے فوراً وہاں سے چودھری شہاب الدین کو لکھا:

"...... لاہور کے اخبارات سے معلوم ہُوا ہے کہ سکندر، احمد یار اور نریندر ناتھ کے درمیان پھر گفت و شنید اور مشورے ہو رہے ہیں میں حیران ہوں کہ جو احسان میں نے احمد یار اور سکندر پر کئے ہیں کیا یہ لوگ اُن احسانات کے مستحق تھے؟ اور پھر جس جس طرح میں ان دونوں کی مدد کرتا رہا ہوں۔ کیا اُس سے پنجاب یا مسلمانانِ پنجاب یا ہماری پارٹی کو کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ میں یہ باتیں آپ سے

---

[1] سوانح عمری صـ ۳۱۲

پوچھتا ہوں۔ کیونکہ اِن دونوں کے متعلق میں نے جو کچھ کیا۔ آپ ہی کی سفارش پر کیا۔"[1]

اِدھر ۲۵ر جون کو علامہ اقبال اپنے ایک خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں:-

"...... دو، ایک روز ہوئے سر سکندر لاہور سے رخصت ہو گئے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی پہنچ کر آپ سے ملیں گے۔ اور بعض امور کے متعلق گفتگو کریں گے ...... اس گفتگو کے نتیجے سے مجھے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ اگر آپ اُن کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آملیں گے"۔[2]

میری ناچیز رائے میں ڈاکٹر صاحب کو سر سکندر کے متعلق محض خوش فہمی تھی۔ سر سکندر نہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کو تیار تھے۔ نہ راجہ نریندر ناتھ سے مل کر علیحدہ پارٹی بنانے پر آمادہ تھے۔ وہ صرف ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ میاں فضلِ حسین کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ علامہ اقبال اپنے اِسی ۲۵ر جون کے مکتوب میں مسٹر جناح کو یہ بھی لکھتے ہیں:

"...... دو لتانہ کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر اس قسم کا اعلان کرنے پر تیار ہیں۔ کہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا مسائل میں یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر مسلم لیگ کے فیصلے کے پابند ہوں گے۔ اور ان مسائل

---

[1] سوانح عمری صفحہ ۳۳۴ ۔ [2] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

کے متعلق وہ صوبائی اسمبلی کے کسی غیر مسلم فریق کے ساتھ علیٰحدہ سمجھوتہ نہیں کریں گے بشرطیکہ پنجاب مسلم لیگ بھی اِس اَمر کا اعلان کر دے کہ جو لوگ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر پنجاب اسمبلی میں داخل ہوں گے وہ صرف اُس پارٹی کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں سب سے زیادہ مسلمان شریک ہوں۔ از راہِ کرم اِس تجویز کے متعلق اپنی رائے سے مجھے فوراً مطلع فرمائیے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ احمد یار خاں دولتانہ ۲۴ جون کو ڈاکٹر صاحب سے اُن کے دولت کدے پر جا کر ملے۔ اِدھر ۲۴ جون ہی کو ڈلہوزی سے میاں فضلِ حسین نے چودھری شہاب الدین کو وہ غم و غصّہ سے بھرا ہوا خط لکھا۔ جس میں انھوں نے احمد یار خاں دولتانہ اور سر سکندر کو احسان فراموش۔ سازشی اور الطاف و اکرام کے نااہل قرار دیا۔ ظاہر ہے۔ اِن حالات میں دولتانہ کی یہ تجویز میاں فضلِ حسین کی تجویز تو ہو نہیں سکتی۔ پھر لُطف یہ ہے کہ ۲۰ جون کو سر سکندر لاہور آئے اور ۲۳ اور ۲۴ کو واپس بمبئی تشریف لے گئے۔ اِن چار یا پانچ دنوں میں احمد یار خاں دولتانہ برابر اُن کے ساتھ رہے۔ اور انھیں ڈلہوزی جانے اور میاں فضلِ حسین سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خود میاں فضلِ حسین ۲۹ جون کو ڈلہوزی سے واپس لاہور پہنچے۔ پھر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تجویز میاں فضلِ حسین نے احمد یار خاں دولتانہ کے توسّل سے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجی ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ لاہور پہنچنے سے قبل میاں فضلِ حسین نے آغا خاں کو وہ خط لکھا تھا۔ جس کا اقتباس اوپر درج کیا جا

چکا ہے اور جس میں انھوں نے بڑے اطمینان سے آغاخاں کو یہ خبر سنائی تھی کہ "جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا وجود باقی نہیں رہا۔"

ظاہر ہے جس جماعت کا وجود ہی میاں فضلِ حسین کے نزدیک باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ مفاہمت کرنے پر وہ کیوں کر آمادہ ہو سکتے تھے۔ میری ناچیز رائے ہے کہ یہ تجویز دولتانہ اور سکندر کے باہمی مشورے کا نتیجہ تھی۔ فضلِ حسین اس سے بالکل بے خبر تھے۔ دولتانہ اور سکندر غالباً یہ چاہتے تھے کہ اقبال کے بیان سے فضلِ حسین کو پریشان کیا جائے۔ اور جب فضلِ حسین اس تجویز کی مخالفت کریں۔ تو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو یہ کہہ کر ان سے بدگمان و برگشتہ کیا جائے۔ کہ یہ شخص (فضلِ حسین) مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہونے دیتا۔

یونینسٹ پارٹی کے اندر اس قسم کی خفیہ سازشیں اور باہمی رقابتیں جاری تھیں۔ کہ ۹ جولائی کو میاں فضلِ حسین کا لاہور میں انتقال ہو گیا اور رات بھر میں پنجاب کی سیاسی فضا یکسر بدل گئی۔ سر سکندر کو ان کے دوستوں نے اسی وقت ٹیلی فون پر اطلاع دے دی کہ میدان صاف ہے۔ فوراً لاہور پہنچو۔

میاں فضلِ حسین مسلسل سولہ[16] سال پنجاب کی سیاست پر حاوی رہے۔ اور پانچ سال انھوں نے پورے ہندوستان کی سیاست کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق چلایا۔ ان کے بڑے بڑے حریف بھی ان کی چال کے سامنے مات کھا جاتے تھے۔ ان کے جسم کو اگرچہ مختلف امراض نے حد درجہ نحیف و نزار بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ذہن و فکر کی جلاوت ایک لمحہ کے لیے

بھی کُند نہ ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے لیڈی فضلِ حسین کو لکھا " سیاسیات سے قطع نظر۔ میرے دل میں تو اُن خوشگوار ملاقاتوں کی مسرت بخش یاد باقی ہے۔ جو مجھے آپ کے نامور شوہر کے ساتھ میسر آئی تھیں "

مسز سروجنی نیڈو نے لکھا " جن لوگوں کو فضلِ حسین سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ وہ اُن کی تیز و طرار ذہانت اور مغلوب کُن بصیرت سے مختلف تاثرات لے کر واپس آتے تھے۔ مثلاً خوف۔ مدح و ستائش۔ ناپسندیدگی۔ بے اعتمادی خلوص و محبت۔ لیکن اِن مختلف و متضاد تاثرات کے باوجود ایک چیز یقینی تھی۔ وہ یہ کہ جو شخص بھی فضلِ حسین سے ملتا تھا۔ اُن کی زبردست شخصیت اور قوّت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔"

علّامہ اقبال۔ ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز نے ایک مشترکہ بیان میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا:

" سر فضلِ حسین کی وفاتِ حسرت آیات سے ہمارا صوبہ ایک حقیقی محبِ وطن کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ پنجاب کی پبلک زندگی سے اُن کا تعلق بہت گہرا تھا۔ اور اس تمام عرصے میں ہر مرحلے پر فتح و کامرانی نے اُن کے قدم چُومے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے معرکے سر کئے۔ لیکن یہ امر بے حد المناک ہے۔ کہ عین جس وقت وہ اصلاحاتِ جدیدہ کے تحت اپنا مستقبل مرتّب کرنے کی تجویزیں سوچ رہے تھے۔ موت نے اُن کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ ہم اس سانحۂ عظیم میں اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہم

سے ایک ایسا عظیم الشان لیڈر جدا ہو گیا ہے جس کو قدرت نے سیاسیات کا صحیح شعور عطا کیا تھا۔ اور جو پارلیمنٹری قابلیت کے علاوہ تدبر و معاملہ فہمی اور تعمیری کام کرنے کی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا۔"[1]

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۹۳۶ء

نواں باب

۱۹۳۷ء کا انتخاب

سر سکندر ۲۲ جولائی کو چند روز کے لیے لاہور تشریف لائے۔ اور یونینسٹ پارٹی کے ایک رسمی جلسے میں اُن کو پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اِسی جلسے میں سر سکندر نے اعلان کیا کہ وہ حتی الامکان بہت جلد بنک کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ جائیں گے۔ اور مستقل طور پر پارٹی کی زمامِ قیادت سنبھالنے کی کوشش کریں گے اب چونکہ یونینسٹ پارٹی کے اندر وہ باہمی چپقلش ختم ہو چکی تھی۔ جو مدت سے سر سکندر اور فضلِ حسین کے درمیان چلی آ رہی تھی اِس لیے سر سکندر کو مسلم لیگ سے ربط و ضبط بڑھانے۔ یا میاں فضلِ حسین کے حریفوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

میاں فضلِ حسین کے انتقال کے بعد یونینسٹ پارٹی کے ایک نہایت وسیع اور بلند پایہ رکن، ملک زمان مہدی خاں اِس پارٹی سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے۔ زمان مہدی علی گڑھ کے دَورِ اوّل کے بہترین تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور طالب علمی کے زمانے میں محمد علی۔

شوکت علی ۔ حسرت موہانی وغیرہ کے ہم عصر رہ چکے تھے ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے تھے ۔ اور ۱۹۳۴ء میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ پنشن کے بعد وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو گئے تھے ۔ میاں فضل حسین سے اُن کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے چلے آ رہے تھے ۔ جب میاں صاحب سیالکوٹ میں پریکٹس کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے اور زمان مہدی وہاں بہ سلسلۂ ملازمت تعینات تھے ۔

زمان مہدی نے اپنی پوری ملازمت کے دوران میں قومی خدمت کے اُس جذبہ کا بار بار مظاہرہ کیا ۔ جو کسی زمانے میں علی گڑھ کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا ۔ جب وہ منٹگمری اور رہتک کے اضلاع میں ڈپٹی کمشنر تھے ۔ تو انھوں نے محض اپنی ذاتی کوشش سے اِن دونوں شہروں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عظیم الشان اجلاس منعقد کرائے ۔ اور ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے مسلمان لیڈروں کو مدعو کیا ۔ منٹگمری میں تنہا اُن کی کوشش سے نادار اور کم استطاعت مسلمان طلبہ کی مدد کے لیے ایک بہت بڑا ٹرسٹ قائم کیا گیا جس سے ہزاروں نوجوان فائدہ اُٹھا چکے ہیں ۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے موقع پر انھوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود ، ترکوں کے لیے چندہ جمع کر کے ہندوستان کی مرکزی انجمن کے پاس روانہ کیا ۔

میرے محترم دوست اور اُردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے جب شاہنامۂ اسلام لکھا ۔ تو زمان مہدی گوجرانوالہ میں ڈپٹی کمشنر تھے ۔ حفیظ صاحب گوجرانوالہ گئے ۔ تو زمان مہدی نے شاہنامہ کی فروخت میں اِس گرم جوشی سے حصّہ

لیا - گویا وہ ڈپٹی کمشنر نہ تھے - ایک قومی رہنما کار تھے - اُنھوں نے شاہنامہ کی ایک ایک جلد پان پان سو روپے میں فروخت کروائی - اس کے علاوہ ہر سال وہ انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس پر بہت بڑی رقم فراہم کر کے انجمن کو بھیجا کرتے تھے۔ [1]

زمان مہدی کے لیگ میں شامل ہونے پر ہم لوگ بہت خوش ہوئے - علامہ اقبال کو خصوصیت سے بہت مسرت ہوئی - وہ زمان مہدی کے بڑے مداح اور قدردان تھے - ڈاکٹر صاحب کی صحت چونکہ خراب تھی اور انھیں پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے بورڈ کے ہر جلسے میں شریک ہونے کی زحمت برداشت کرنا پڑتی تھی - اس لیے اُنھوں نے اِس خواہش کا اظہار فرمایا - کہ زمان مہدی خان کو اُن کی جگہ پارلیمنٹری بورڈ کا صدر منتخب کر لیا جائے - لیکن بورڈ کے تمام ممبروں نے

---

[1] میرے والدِ مرحوم و مغفور سر فضلِ حسین کے بڑے مداح اور معاون تھے چنانچہ میاں صاحب کے انتقال سے چند روز قبل وہ اُن کی عیادت کے لیے لاہور تشریف لے گئے - وہ فرماتے تھے کہ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ خدا آپ کو تندرستی عطا فرمائے اور آپ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے عرصۂ دراز تک سلامت رہیں - لیکن چونکہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے ہمیں بتا دیجئے کہ آپ کے بعد ہم کس کو اپنا لیڈر سمجھیں - میاں صاحب نے جواب دیا - کہ خدا جس کو چاہے گا لیڈری کے منصب پر کھڑا کر دے گا - اس میں میرا کوئی اختیار نہیں - والدِ مرحوم نے پوچھا کہ سر سکندر کے متعلق کیا رائے ہے ؟ تو میاں صاحب نے چلیں بہ جبیں ہو کر صرف اتنا کہا " ہاں ! مخلص آدمی ہے " پھر والدِ مرحوم نے پوچھا " اور زمان مہدی ؟ " اس پر میاں صاحب نے فرمایا " وہ بہتر آدمی ہے "

اس تجویز سے اختلاف کیا۔ اور عرض کیا کہ اس مرحلہ پر ڈاکٹر صاحب کا پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت سے مستعفی ہو جانا، بورڈ کے وقار کو بہت کم کر دیگا البتہ زمان مہدی خاں کو بورڈ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کر لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان مہدی کی تنظیمی قابلیت پر بڑا اعتماد تھا۔ اس لیے اُنھوں نے بورڈ کے ممبروں کی متفقہ عرضداشت کے باوجود یہی فیصلہ کیا۔ کہ اُنھیں صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ تاکہ زمان مہدی کی صلاحیتوں سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

بااین ہمہ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ بورڈ کی رکنیت ترک نہیں کریں گے اور جب کسی کام میں مشورے کی ضرورت پیش آئے گی وہ ہر ممکن مدد دینے کو تیار ہوں گے آخر کار بورڈ کو اس خواہش کے سامنے مجبوراً سر جھکا دینا پڑا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا استعفیٰ لکھ کر غلام رسول خاں کے حوالے کر دیا۔ تاکہ ۱۳ راگست کو بورڈ کے اجلاس میں پیش کر دیا جائے۔

جب غلام رسول خاں نے ۱۳ راگست کے جلسے کا ایجنڈا جاری کیا۔ تو اُس میں ڈاکٹر صاحب کے مجوّزہ استعفےٰ کی شق بھی تھی۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر ممدوٹ وِلا میں بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ وہاں فوراً مسرت وکامرانی کے شادیانے بجنے لگے۔ کہ لو اقبالؔ نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفےٰ دے دیا ہے۔ اب مسلم لیگ کا ڈھونگ بھی ختم سمجھو۔ سیّد نور احمد، اُس زمانے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار تھے اور اُن کا قلم یونینسٹ پارٹی کی حمایت کے لیے وقف ہو چکا تھا۔ اُنھوں نے جونہی یہ خبر سنی۔ فوراً ایک جلی عنوان چھپا کر سول میں

مضمون لکھ دیا۔ کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے حالات ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں اندرونی خلفشار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ باہمی رقابتیں زوروں پر ہیں۔ کام کرنے کے لیے آدمی نہیں ملتے۔ روپے کی سخت کمی ہے۔ آخر کار اس صورت حال سے تنگ آ کر علامہ اقبالؒ نے بورڈ کی صدارت سے استعفا دے دیا ہے۔

رسول کا یہ پرچہ ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ سے گذرا۔ تو انھیں سخت غصہ آیا۔ کہ ہمارے حریف کیسے اوچھے وار کرنے اور ہمیں کس کس طریقے سے بدنام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے فوراً غلام رسول خاں کو بلا کر زبانی حکم دیا۔ کہ ان کا استعفے ۱۳ راگست کے اجلاس میں پیش نہ کیا جائے۔ پھر اس مضمون کی ایک باضابطہ تحریری اطلاع بھی سیکرٹری کو بھیج دی۔ کہ وہ اپنا استعفے واپس لیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب نے پنجاب کے ساٹھ نمایاں اور سربرآوردہ اصحاب کی ایک فہرست تیار کر کے غلام رسول خاں کے حوالے کی۔ اور فرمایا کہ خود ان کی طرف سے بورڈ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی جائے کہ ان ساٹھ آدمیوں کو بورڈ میں شامل کر لیا جائے۔

۱۳ راگست کو برکت علی اسلامیہ ہال میں بورڈ کا اجلاس ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ اس لیے ملک برکت علی نے صدارت فرمائی۔ جلسے میں چالیس آدمی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا استعفے پیش نہ ہوا۔ اور ملک زمان مہدی خاں کو بورڈ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ نشر و اشاعت اور پراپگنڈے کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے سپرد یہ کام بھی کیا گیا کہ اس حلف نامے کا مسودہ تیار کرے جس پر اسمبلی

کے مسلم لیگی اُمیدواروں کو دستخط ثبت کرنا ہوں گے۔

ابتدا میں اِس سب کمیٹی کے پانچ ممبر تھے۔ یعنی علامہ اقبال۔ ملک نے مان مہدی غلام رسول خاں۔ چودھری افضل حق اور مولوی مظہر علی اظہر۔ لیکن چند روز بعد چار نئے آدمیوں کا اضافہ کیا گیا۔ جن میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی۔ میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لا۔ ملک برکت علی اور عاشق حسین بٹالوی شامل تھے۔

۳۰ ستمبر کو سر سکندر حیات خاں ریزروبنک سے مستعفی ہوکر واپس لاہور پہنچ گئے۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ عام آدمیوں کی طرح بے کار رہتے اس لیے منصوبہ یہ تیار کیا گیا۔ کہ نواب مظفر خاں بیماری کا عذر پیش کر کے چار مہینے کی رخصت پر چلے جائیں۔ اور اُن کی جگہ سر سکندر کو ریوینیو ممبر بنا دیا جائے اِس منصوبے کی تیاری میں سب سے بڑا ہاتھ خود پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کا تھا۔ نواب مظفر خاں بالکل تندرست و توانا۔ اور اچھے بھلے تھے۔ یہ خود ساختہ بیماری صرف اِس لیے ظہور میں آئی۔ کہ گورنر کو اندیشہ تھا۔ کہ جب تک سر سکندر حیات خود حکومت کے اعلےٰ منصب پر بیٹھ کر الیکشن کی جنگ نہیں لڑیں گے۔ یونینسٹ پارٹی کی سو فیصد کامیابی محال تھی۔ اب ایک طرف تو سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور دوسری طرف گورنر کے بعد پنجاب کے سب سے بڑے حاکم بھی وہی تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی اِس دوگانہ حیثیت سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ جس جس حلقے میں یونینسٹ اُمیدوار کا پلڑا کمزور نظر آتا تھا۔ وہاں سر سکندر نے اپنے سرکاری عہدے کا پورا وزن ڈال کر اُس پلڑے کو برابر کر دیا۔ آگے چل کر یہ بات واضح کر دی جائے گی۔ کہ اس سازش میں گورنر۔ سر سکندر اور

پنجاب کے تمام بڑے بڑے سرکاری اہل کار شریک تھے۔ اِن لوگوں نے تحریص و ترغیب اور تہدید و تخویف کے تمام حربوں سے مسلح ہو کر ہر اُس شخص کا سر کچلنے کی کوشش کی جس نے یونینسٹ اُمیدوار کی مخالفت کی تھی۔

یُوں تو احرار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس بورڈ سے جو توقعات انھوں نے قائم کر رکھی تھیں وہ بظاہر پوری نہیں ہوئیں۔ انہیں سب سے بڑی غلط فہمی یہ تھی کہ جناح نے بمبئی کے تاجروں اور اودھ کے تعلقہ داروں سے کئی لاکھ روپے جمع کئے ہیں، جو آئندہ الیکشن میں لیگی امیدواروں کے کام آئیں گے۔ اِس مغالطے میں مبتلا ہو کر چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ یہ سمجھے بیٹھے تھے۔ کہ اس فنڈ سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ پنجاب کے حصے میں ضرور آئے گا اور یہ رقم جلسے، جلوسوں کے علاوہ اخباری پراپگنڈے پر خرچ ہو گی۔

احرار کا یہ بھی خیال تھا کہ ملک برکت علی، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ مصروف آدمی ہیں۔ انہیں ہائی کورٹ کی پریکٹس سے فرصت ہی کہاں ہے، کہ پنجاب کا دورہ کریں۔ اور شہر بہ شہر دھوم دھامی جلسے منعقد کر کے دھواں دھار تقریروں کا جادو بکھیریں۔ اِدھر احرار اِس فن میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اور سالہا سال سے اُن کی زندگیاں انہی ہنگاموں کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ اس لیے اُن کا اندازہ تھا کہ جناح کے فنڈ میں سے پنجاب کو جو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، اُس کا بیشتر حصّہ اُنہی کی مرضی اور صوابدید سے خرچ ہو گا۔

عجیب بات ہے کہ سر فضلِ حسین ایسا سمجھ دار آدمی بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔

تھا۔ کہ جناح نے پارلیمنٹری بورڈ کے لیے کئی لاکھ روپے جمع کر لیے ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے آغا خاں سے یونینسٹ پارٹی کے لیے مالی امداد طلب کی۔ تو اپنے خط میں یہ بھی لکھا :-

"...... جناح کہتا پھرتا ہے۔ کہ اس نے بمبئی کے کروڑپتی تاجروں اور راجہ محمود آباد سے اس بورڈ کے لیے کئی لاکھ روپے حاصل کر لیے ہیں۔ جناح کی ان باتوں نے ہماری مشکلات میں اور زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے اخباروں، بالخصوص اردو اخباروں کی مالی حالت چونکہ ہمیشہ مخدوش رہتی ہے اس لیے وہ آنے والے الیکشن سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے ابھی سے منہ کھولے بیٹھے ہیں...... ان غیر معمولی حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ آپ سے اعانت کی درخواست کروں" [1]

تعجب ہے سر فضل حسین نے یہ بات کہاں سے سنی تھی۔ کہ بمبئی کے کروڑپتی سیٹھوں اور راجہ محمود آباد نے جناح کو لاکھوں روپے عطا کیے ہیں۔ راقم التحریر کو اچھی طرح یاد ہے کہ مسٹر جناح نے اپنی کسی تقریر یا کسی بیان میں اشارۃً بھی یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے پاس لاکھوں کا سرمایہ موجود ہے۔ لاکھوں کا کیا ذکر ان کے پاس تو چند ہزار کی رقم بھی نہ تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو اپنی اپنی الیکشن کے مصارف خود

---

[1] سوانح عمری ص ۳۱۱

برداشت کرنا ہوں گے۔

بہرحال جب احرار کو پتہ چلا کہ پارلیمنٹری بورڈ کے پاس کوئی رقم نہیں تو انھوں نے سوچا کہ اپنے الیکشن پر اپنی ہی جیب سے خرچ کرنا پڑا۔ تو پھر وہ آئندہ انتخابات میں جناح کا نوسل کیوں اختیار کریں؟ کیا احرار اتنے گئے گزرے ہیں۔ اور کیا پنجاب میں ان کی اتنی ساکھ بھی باقی نہیں کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ کے بغیر الیکشن کی جنگ بھی نہ جیت سکیں گے؟ ان خیالات سے متاثر ہو کر چودھری افضل حق۔ مولوی مظہر علی اظہر اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ انھیں زود یا بدیر مسلم لیگ سے علیحدہ ہونا پڑے گا اب سوال یہ تھا کہ وہ کس مسئلہ کو مابہ النزاع قرار دے کر ہم سے علیحدگی اختیار کریں گے۔

جب اسمبلی میں جانے والے مسلم لیگی امیدواروں کا حلف نامہ تیار کرنے کے لیے مقررہ سب کمیٹی کا اجلاس ہوا تو غلام رسول خاں نے حسبِ ذیل مسودہ منظوری کے لیے پیش کیا:

"بخدمت آنریری سیکرٹری صاحب!

پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ۔ لاہور

(ا) میں اپنے آپ کو آئندہ اسمبلی کے انتخاب کے لیے حلقہ...... سے بطور امیدوار پیش کرتا ہوں۔

(ب) میں مبلغ پچاس روپے (بصورتِ خواتین امیدوار پچیس روپے) بذریعہ منی آرڈر یا چیک یا نقد اس درخواست کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

(ج) میں اقرار صالح کرتا ہوں۔ کہ میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کا اپنی نامزدگی کے متعلق پابند رہوں گا۔

(د) میں حلفاً اقرار کرتا ہوں۔ کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ۔ پارلیمنٹری بورڈ کے پروگرام کو منظور کرتا ہوں۔ اور ہر ممکن طریقے سے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا۔

(ھ) میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے آئندہ اسمبلی کے لیے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا۔ تو میں کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر اسمبلی کے انتخاب کا خواہاں نہیں ہوں گا۔

(و) میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ میں اپنی حیثیت میں اسلامی اوقاف کی حفاظت حسب منشائے شریعت کروں گا۔

(ز) میں اقرار صالح کرتا ہوں۔ کہ میں ہر ممکن طریقے سے مسجد شہید گنج کی واگذاری کے لیے کوشاں ہوں گا۔ اور اس مقدس اور قدیم مسجد کی مسماری اور اُسے غیر اسلامی طور پر استعمال کرنے کی جو مذموم اور قبیح حرکت کی گئی ہے اُس کے تدارک کی پوری کوشش کروں گا۔"

سب کمیٹی کے احرار ممبروں کو مذکورہ بالا مسودہ کی شق (ز) منظور نہیں تھی لیکن اس شق کی معقولیت اس قدر نمایاں اور بدیہی تھی۔ کہ انھیں اختلاف کی جرأت نہ ہو سکی۔ تاہم جب غلام رسول خاں نے مسجد شہید گنج کے بارے میں شق (ز) پڑھی تو مولانا حبیب الرحمٰن چمک کر بولے "یہ شق احرار کو پریشان کرنے کے لیے رکھی گئی ہے"۔

اُن دنوں احرار کی یہ حالت تھی۔ کہ مسجد شہید گنج کے نام سے بدکتے تھے۔ اور عام مسلمانوں میں اُن کی ہوا بگڑ جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ جب ۷ جولائی ۱۹۳۵ء میں یہ مسجد مسمار کی گئی۔ تو احرار نے کسی قسم کا قدم اٹھانے کی بجائے۔ سکوت مصلحت آمیز اختیار کر لیا تھا۔ گذشتہ ایک سال سے پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے بڑا ہنگامی مسئلہ یہی تھا۔ کہ شہید گنج کو کیونکر واگذار کرایا جائے۔ اسی غرض کے لیے سول نافرمانی شروع کی گئی اور تحریک کے بڑے بڑے کارکن جیلوں میں چلے گئے اسی غرض کے لیے مسٹر جناح کو لاہور آ کر حکومت سے عارضی طور پر مصالحت کرانا پڑی۔ اور اسی غرض کے لیے عدالت میں قانونی چارہ جوئی کی گئی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ مسلم لیگ ایسے اہم مسئلے سے چشم پوشی اختیار کرتی۔ درآں حالیکہ مسلمان اپنی تمام قومی جماعتوں سے توقع رکھتے تھے کہ جب تک وہ مسجد کی بازیابی کے لیے کوئی حتمی وعدہ نہ کریں گی۔ انہیں الیکشن میں مسلمانوں سے ووٹ لینے کا کوئی حق نہیں۔

غلام رسول خاں نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ "مسجد شہید گنج کی بازیابی پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے ہم اسے کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کل الیکشن کے موقع پر کسی جلسہ عام میں مسلمان ہم سے یہ پوچھتے ہیں۔ کہ کیا مسلم لیگ مسجد کو واگذار کرانے کی حامی ہے یا نہیں۔ تو کیا ہم جواب میں خاموشی اختیار کر لیں گے؟

مولانا حبیب الرحمٰن فوراً بولے "بہت اچھا۔ مجھے اس شق پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شق بھی بڑھا دیجئے۔ کہ مسلم لیگ مسجد واگذار کرانے کے لیے

صالح کرنا چاہیے کہ وہ اسمبلی میں جا کر مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کرا کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے یہ نئی شق پیش کر کے ہمیں حیران ہی نہیں، پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزائیت یا غیر مرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے توقع رکھنا کہ مرزائیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے۔ ایک لایعنی بات تھی۔

زمان مہدی خاں اس وقت جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن سے کہا کہ "بے سود جھگڑا نہ کیجیے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا موقع محل ہے؟"

مولانا نے چمک کر فرمایا "جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیابی آج پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے۔ کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا۔ تو چلیے ہم اسی وقت موچی دروازہ کے باغ میں ایک جلسہ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کر لیتے ہیں۔"

مولانا کی رائے درست تھی۔ احرار نے سالہا سال کے پراپگنڈے سے عام مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر رکھی تھی۔ اور اگر اس امر کے متعلق کسی جلسہ عام میں استصواب کیا جاتا۔ تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے۔ چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلف نامہ میں ایک نئی

شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی "میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا۔ تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا"

دوسرے روز غلام رسول خاں حلف نامے کا مسودہ لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انھیں سارا واقعہ سنایا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے مرزائیت کے متعلق نئی شق بڑھائی جانے پر کسی تعجب کا اظہار نہ فرمایا اور نہ کوئی اعتراض کیا۔

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد سب کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا۔ جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اگر پارلیمنٹری بورڈ نے کسی شخص کی درخواست منظور کر کے اسے آئندہ الیکشن میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کی اجازت دے دی تو اس امیدوار کا فرض ہو گا کہ پانسو روپے بورڈ کے فنڈ میں جمع کرائے۔

چودھری افضل حق نے اس مسئلے کی مزید وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ کہ یہ پانسو روپے کس مقصد سے جمع کرائے جائیں گے؟

غلام رسول خاں نے جواب دیا کہ "بورڈ کو تمام امیدواروں کی الیکشن کے سلسلے میں مختلف قسم کے اشتہارات اور پمفلٹ طبع کرانا ہوں گے۔ پھر ان امیدواروں کی حمایت میں مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان کے انتخابی حلقوں میں دورہ کرنا ہو گا۔ آخر ان کاموں کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

چودھری افضل حق بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ کہنے لگے "واہ حضرت۔

پانچ سو روپے صرف اشتہاروں اور ہینڈ بلوں کے لیے۔ الیکشن کا خرچ الگ۔ میں تو پانچ سو میں الیکشن بھی لڑ سکتا ہوں۔ اور دوسری شادی بھی کر سکتا ہوں۔"

میں اتفاق سے چودھری صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے عرض کیا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ، خدا کے لیے دونوں کام کیجیے۔"

احرار اس پانچ سو کی شرط پر بگڑ گئے۔ اور چند روز کے بعد انھوں نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفے دے دیا۔ یوں مسلم لیگ اور احرار کا عارضی اتحاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مسلم لیگ کی تحریک بڑھنا شروع ہوئی۔ تو اور لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پارلیمنٹری بورڈ کی رکنیت کا حلقہ وسیع ہونے لگا۔ نئے آنے والوں میں سردار مظفر علی خاں قزلباش بیرسٹر۔ محمد عظیم خاں ایڈووکیٹ۔ شیخ محمد جان سوداگر انارکلی۔ حافظ فیروز الدین سوداگر برانڈرتھ روڈ۔ شیخ محمد حسن پنشنر سب جج اور سید تصدق حسین بھیروی وغیرہ قابلِ ذکر تھے۔ اب تک پارلیمنٹری بورڈ کا کوئی مستقل دفتر نہیں تھا۔ غلام رسول خاں ٹمپل روڈ پر ۱۲ بنگلے میں رہتے تھے۔ وہیں اکثر لکھنے پڑھنے کا کام کیا جاتا تھا لیکن چونکہ الیکشن روز بروز قریب آ رہے تھے۔ اس لیے فیصلہ ہوا کہ الگ دفتر قائم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایڈورڈز روڈ پر چند کمروں کا ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لے لیا گیا۔ اور محمد عظیم خاں کو اس دفتر کا انچارج مقرر کیا گیا۔ محمد عظیم خاں میرے بڑے پرانے اور عزیز دوست تھے۔ وہ لاہور میں وکالت کرتے تھے اور میونسپل کمشنر بھی تھے۔ ان کے دادا خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں اپنے زمانے میں لاہور کے سب سے معزز، نیک نام

اور سمجھ دار اور وہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ افسوس کہ عظیم حسین جوانی میں انتقال کر گئے۔

یہ بھی فیصلہ ہوا کہ محمد عظیم خان کے علاوہ ذیل کے اصحاب بھی باری باری سے دفتر میں کام کیا کریں گے۔ غلام رسول خان۔ ملک زمان مہدی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ سردار مظفر علی خان قزلباش اور عاشق حسین بٹالوی۔ اس کے علاوہ ایک فنانس کمیٹی بھی تشکیل کی گئی جس میں اصحاب ذیل شریک تھے۔ مظفر علی خان قزلباش۔ میاں عبدالرشید۔ سید محمد تقی جعفری۔ شیخ جان محمد۔ شیخ محمد حسن۔ حافظ فیروز الدین۔ ملک نور الٰہی۔ ملک زمان مہدی۔ میاں عبدالمجید اور غلام رسول خان۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا مینی فسٹو مرتب کرنے۔ اور اس کی صوبے بھر میں نشر و اشاعت کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں یہ لوگ شامل تھے۔ سید تصدق حسین حیدری۔ خلیفہ شجاع الدین۔ مظفر علی خان قزلباش۔ شیخ محمد حسن۔ محمد عظیم خان۔ عاشق حسین بٹالوی۔ ملک برکت علی۔ ملک زمان مہدی اور غلام رسول خان۔

ایک کمیٹی پراپیگنڈے کے لیے۔ اور ایک کمیٹی اس غرض کے لیے بنائی گئی کہ پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ کر کے۔ عوام کو پارلیمنٹری بورڈ کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرے۔ ان کمیٹیوں میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوئے۔ مثلاً میاں محمد شفیع سیکرٹری انڈر گریجویٹ مسلم برادرہڈ۔ مولانا عبدالحنان۔ راجہ غضنفر علی خان۔ پیر تاج الدین وغیرہ۔

ظاہر ہے علامہ اقبال کسی کمیٹی میں بھی شامل نہیں تھے۔ اور اُن کی صحت کے پیشِ نظر یہی مناسب خیال کیا گیا تھا۔ کہ انھیں اس ضمن میں حتی الوسع زحمت نہ دی جائے۔ لیکن ہر کمیٹی کے کام کی رُوداد سے اُن کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ غلام رسول خاں، ہر دوسرے روز، اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملات کی اطلاع کراتے تھے۔

علامہ اقبال اپنے ۹ رجون ۱۹۳۶ء کے خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں :-

"...... مجھے اُمید ہے کہ جو اعلان بورڈ شائع کرے گا اُس میں پوری سکیم کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح بحث کی جائے گی۔ اور اس سلسلہ میں مخالفوں کی طرف سے جو اعتراض کئے جا رہے ہیں۔ اُن کا بھی شافی جواب موجود ہوگا۔ بورڈ کو چاہیئے کہ اپنے اس بیان میں اس امر کی وضاحت بھی کرے۔ کہ آج ایک طرف حکومت ہے اور دوسری طرف ہندو۔ اور ان دونوں کے درمیان خود مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے۔ بورڈ کا فرض ہے۔ کہ اس بیان کے ذریعہ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا جائے۔ کہ اگر انھوں نے مسلم لیگ کی موجودہ سکیم کو منظور نہ کیا۔ تو گذشتہ پندرہ سال میں ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ تمام تر ضائع کر بیٹھیں گے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ اگر آپ یہ بیان اخبارات کو دینے سے پہلے مجھے دکھا دیں۔"[1]

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ بالا خط مسٹر جناح کو دستی بھیجا تھا۔ جو اُس وقت پارلیمنٹری بورڈ کے افتتاحی اجلاس کے لیے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اور ہوٹل میں مقیم تھے۔ جس بیان کی اہمیت کا ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں بار بار ذکر کیا ہے۔ اور جسے وہ اخبارات میں چھپنے سے پہلے خود دیکھنا ضروری سمجھتے تھے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا مینی فسٹو تھا۔ اسی مینی فسٹو میں مسلم لیگ نے اپنی آئندہ پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ یہی مینی فسٹو آئندہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا سنگِ بنیاد بننے والا تھا۔ اور اسی مینی فسٹو سے اپنے اور بیگانے مسلم لیگ کے سیاسی موقف سے آگاہ ہونے کا حق رکھتے تھے۔

یہ پورا مینی فسٹو اِس کتاب کے ضمیمہ میں درج کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک ہندوستان کی آزادی۔ ہندو مسلم اتحاد۔ بدیشی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد۔ اور اقتصادی بدحالی کو رفع کرنے کا تعلق ہے مسلم لیگ کا مینی فسٹو کانگرس کے مینی فسٹو سے رتی برابر بھی کم نہیں تھا۔ مسلم لیگ نے اُس خود غرض۔ رجعت پسند اور حکومت کے کاسہ لیس گروہ کی بھی مذمت کی تھی۔ جو ۱۹۲۰ء سے صوبائی حکومتوں پر قابض چلا آرہا تھا۔ اور جس نے اپنی بقا کے لیے رائے عامہ پر اعتماد کرنے کی بجائے ہمیشہ سرکاری بلاک پر انحصار کیا تھا۔ لیگ نے یہ کہہ کر کہ:

"..... مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ کے بعد یہ قومی مطالبہ روز بروز تقویت پکڑنے لگا۔ کہ ہندوستان میں جلد از جلد

مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ مسلمان اِس مطالبہ میں
ہندوستان کی باقی اقوام کے ہم نوا تھے۔ اور آزادیٔ وطن کی
جدّوجہد میں وہ کسی طرح بھی ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے.....
لیگ اب بھی اِس مطالبے پر قائم ہے کہ موجودہ صوبائی۔ اور
مجوزہ مرکزی آئین کو فوراً بدل کر اُس کی جگہ جمہوری اور خود اختیاری
حکومت اُستوار کی جائے "

گویا کانگریس کو اپنا دستِ تعاون پیش کیا تھا۔

لیگ کے اِس مینی فسٹو میں جن اہم امور پر خصوصیت سے زور دیا گیا
تھا وہ یہ تھے۔

۱:- تمام تشدّد آمیز قوانین کی تنسیخ۔

۲:- عوام کی بنیادی آزادی میں خلل انداز ہونے۔ اور اقتصادی
لوٹ کھسوٹ کرنے والے قوانین کا انسداد۔

۳:- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات میں تخفیف۔

۴:- ہندوستان کی فوج کو قومی فوج بنانا۔

۵:- ہندوستانی صنعت وحرفت کا فروغ۔

۶:- ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لیے شرحِ سکّہ اور شرحِ
مبادلہ میں ضروری ترمیم۔

۷:- دیہاتی آبادی کی معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح۔

۸:- دیہاتی آبادی کے قرضے میں تخفیف۔

۹ :- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دینا۔
۱۰ :- ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنا۔

اسی مینی فسٹو کو دیکھ کر پروفیسر کوپ لینڈ نے لکھا تھا کہ :

"...... مسلم لیگ کے انتخابی مینی فسٹو، جو مسٹر جناح کے زیر ہدایت تیار کیا گیا تھا، اور کانگرس کے مینی فسٹو میں کسی ضروری اور اہم امر کا اختلاف نہیں تھا۔ مجوزہ فیڈرل حکومت کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ اور اگرچہ صوبائی آئین کو بھی قابلِ اعتراض ٹھہرایا گیا تھا — بایں ہمہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ اس آئین سے امکانی حد تک فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ لیگ کے مینی فسٹو کا اہم ترین جزو وہ ہے جہاں میثاقِ لکھنؤ کو ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ کا سب سے درخشاں باب قرار دیا گیا ہے ..... اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ مسٹر جناح مسلم لیگ اور کانگرس کے اسی اتحاد کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے جو ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا تھا۔" لے

پروفیسر کوپ لینڈ کی یہ رائے بالکل درست ہے مسٹر جناح اس وقت شدت سے اس بات کے خواہش مند تھے۔ کہ صوبائی حکومتوں کو ان رجعت پسند عناصر سے پاک کیا جائے۔ جو گذشتہ ۱۶ سولہ سال سے قابض چلے آ رہے تھے۔

لے INDIA: A RESTATEMENT BY. Sir Reginald Coupland, Page 152

اور مسلمانوں کے ترقی پسند عنصر اور کانگرس کے درمیان اتحاد قائم کرکے۔ ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خواب بہرحال شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ سردست اسی قدر اشارہ کر دینا کافی ہے۔ اس کتاب کے ایک آئندہ باب میں اس موضوع پر مفصل بحث کی جائے گی۔

پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے جو مینی فسٹو شائع کیا۔ اُس کا پروگرام بھی کم و بیش انہی خطوط پر مرتب کیا گیا تھا۔ جو مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے قائم کئے تھے۔ مثلاً قومی مفاد کے تحت یہ امور درج تھے۔

۱۔ ٹیکسوں کے گراں بوجھ میں کمی۔

۲۔ نظامِ حکومت کے اخراجات میں کمی اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لیے معتدبہ رقوم کا مہیا کرنا۔

۳۔ عوام کی بنیادی آزادی کے مخالف قوانین کا انسداد۔ اور اُن قوانین کی تنسیخ۔ جو صوبے کی اقتصادی تباہ کاری کا باعث ہیں۔

۴۔ تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ۔

۵۔ صوبے کے تمام طبقوں کے درمیان اتحاد، محبت اور باہمی تعاون کے جذبات کو ترقی دینا۔

تنظیم اور ترقی زراعت کے تحت یہ امور درج تھے:

۱۔ مقروض کاشتکاروں کے قرض کا بوجھ کم کرنے کے لیے امدادِ باہمی کے بنکوں کا قیام۔ اور ان بنکوں کو ہندوستان کے ریزرو بنک سے انفکاکِ رہن اراضی کی غرض سے روپیہ حاصل کرنے کے لیے مزید آسانیاں بہم پہنچانا۔

۲ - مالیہ کی موجودہ شرح میں کمی - اور حتی الامکان مالیہ کی تشخیص پر انہی اصولوں کا اطلاق کرنا - جن کی بنا پر انکم ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے -

۳ - منڈیوں - منڈی بورڈوں - ڈپوؤں اور سٹوروں کا قیام -

۴ - موجودہ پیداوار کو بڑھانے کے لیے ایسے اداروں کا قیام - جہاں زراعت کے متعلق تجربات ہوں -

۵ - ایسے اداروں کا قیام جہاں کاشتکاروں کو پمفلٹوں - لکچروں اور ریڈیو کے ذریعہ سے منڈیوں کے حالات - اجناس کے نکاس اور زراعت کے جدید طریقوں کے متعلق مفید اطلاعات بہم پہنچائی جاسکیں -

۶ - پنجاب کی پیداوار کو بیرونی اور غیر ملکی مقابلے سے محفوظ رکھنے کا انتظام - اور غیر ممالک کے زرعی حالات کے مطابق معلومات بہم پہنچانا -

۷ - گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کی ترقیٔ نسل کا انتظام -

۸ - مالکوں اور مزارعوں کو دیہاتی اور قصباتی سرمایہ داروں کے ظلم سے محفوظ رکھنا -

۹ - قانونِ انتقالِ اراضی پنجاب کی حمایت -

۱۰ - ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا - اور گھریلو صنعتوں کا رواج -

۱۱ - ٹکنیکل اداروں کا قیام -

مزدوروں کی فلاح و بہبود کے تحت یہ امور درج تھے :

۱ - معقول اُجرتوں کا بندوبست -

۲ - کم سے کم اُجرت مقرر کرنے کے لیے مختلف بورڈ قائم کرنا -

۳ - کام کرنے کے اوقات میں کمی -

۴ - حادثات کے لیے معقول معاوضے کا بندوبست -

معاشرتی اصلاحات کے تحت یہ امور درج تھے :

۱ - مسلمانوں کے اقتصادی اور تمدنی حالات کو بہتر بنانے کے لیے مؤثر اقدام -

۲ - مسلمانوں کی بہتری کے لیے صوبے کے تمام ذرائع سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے عملی اقدام - اور دیہاتی اور قصباتی مفاد کی مصنوعی تفریق کو دور کر کے مسلمانوں کو قومی اتحاد کے سلسلے میں منسلک کرنے کی ہر ممکن کوشش -

۳ - پس ماندہ اقوام کی ترقی -

۴ - ہسپتالوں، ڈسپنسریوں - اور زچہ خانوں کا قیام - جہاں مریض، بچوں اور عورتوں کے لیے خاص انتظام ہو -

۵ - دیہات اور قصبات میں صفائی کا بہتر انتظام -

۶ - پینے کے لیے پاکیزہ اور صاف پانی کی فراہمی -

۷ - سڑکوں کی تعمیر اور درستی -

۸ - روشنی کے بہتر انتظامات -

۹ - شراب اور دیگر منشی اشیا کے استعمال کا انسداد -

۱۰ - ایسی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا - جن سے بے روزگاری دور ہو مثلاً بے روزگاری کا بیمہ - بیروزگاروں کو کام مہیا کرنے کے اداروں کا قیام - اور غریب لوگوں کی امداد کے قوانین -

اسلامی قانون اور تمدن کی حفاظت کے ذیل میں یہ امور درج تھے:

۱ - تمام مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت۔

۲ - اسلامی تمدن کی حفاظت کے لیے مؤثر اقدام۔

۳ - جملہ اسلامی اوقاف کی بہتر تنظیم کے لیے شرع اسلامی کے مطابق مؤثر قوانین پاس کرانا۔

۴ - مساجد اور دیگر مقدس مقامات کی مرمت اور حفاظت کے لیے مؤثر قوانین پاس کرانا۔

۵ - اردو زبان اور اردو رسم الخط کا تحفظ و ترقی۔

تعلیم کے ذیل میں یہ امور درج کیے گئے تھے۔

۱ - ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دینا۔

۲ - ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق ایک وسیع النظر پالیسی اختیار کرنا اور لوگوں کی ضروریات کے مطابق طریق تعلیم تجویز کرنا۔

۳ - صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو ترقی دینا۔

۴ - پنجاب یونیورسٹی کے دستور اساسی اور نظام میں ایسی ضروری اصلاحات کرانا جن سے یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ اور دوسری متعلقہ مجالس اور ملازمتوں میں مسلمانوں کو بھی حصۂ نمائندگی حاصل ہو جائے۔

سرکاری ملازمتوں کے متعلق یہ امور درج تھے:

۱ - سرکاری ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر۔ اور جلد از جلد ان کے کماحقہ تناسب کا تعین۔

۲ - حکومت خود اختیاری کے اداروں میں مسلمانوں کو ان کا جائز تناسب

اور حصّہ نمائندگی دلاتا۔

آخر میں یہ شق درج تھی۔ کہ نئے دستورِ اساسی سے پورا فائدہ اُٹھانے۔ اور آئینی ترقی کے حصول کے لیے صوبے کی مختلف قوموں اور سیاسی جماعتوں میں یک جہتی اور تعاون کو بڑھانا۔ اور اِس امر کا قطعاً یقین کرا دینا۔ کہ ہر فرقے اور ہر جماعت کو اپنے معتقدات اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی مکمل آزادی ہو گی اور کسی اقلیت کو اپنے مذہب یا قلّتِ تعداد کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے گا۔

جب پنجاب میں انتخابات کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ تو علامہ اقبالؔ نے محسوس کیا۔ کہ مسٹر جناح کو پھر ایک بار یہاں تشریف لانے کی تکلیف دینا چاہیے تاکہ مسلم لیگ کی انتخابی مہم کا آغاز بھی اُنھی سے کرایا جائے۔ مسٹر جناحؔ نے بڑی خوشی سے یہ دعوت قبول فرمائی۔ اور ۹ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں رونق افروز ہوئے اس سے قبل جب وہ جون میں پارلیمنٹری بورڈ کے افتتاحی اجلاس کے لیے لاہور آئے تھے۔ تو ہم صرف چھ، سات آدمی اُن کے استقبال کے لیے سٹیشن پر گئے تھے۔ غلام رسول خاں کی خواہش تھی۔ کہ اب کی استقبال بہتر طریق سے ہونا چاہیے۔ سب سے بڑی دِقّت یہ تھی کہ احرار یا مجلسِ اتحادِ ملّت کی طرح مسلم لیگ کے پاس باوردی رضاکاروں کا کوئی جیش نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں راجہ عبدالعزیز نے بڑی مستعدی سے کام لیا۔ وہ عین وقت پر لاہور چھاؤنی کی انجمنِ اسلامیہ کے باوردی رضاکاروں کا ایک پورا دستہ لے کر آ گئے۔ اس طرح مسٹر جناحؔ کی تشریف آوری کے وقت لاہور کے سٹیشن پر اچھی خاصی رونق اور چہل پہل ہو گئی۔ راجہ عبدالعزیز لاہور ہائی کورٹ کے بار روم میں ہیڈ کلرک

تھے۔ لیکن ملازمت کے متعلقہ اوقات کے بعد۔ اُن کا بیشتر وقت لیگ کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔

مسٹر جناح نے اِس مرتبہ دو ہفتے لاہور میں قیام فرمایا۔ پھر چند روز کے لیے پشاور بھی تشریف لے گئے تھے۔ ۱۱ر اکتوبر کی شام کو دہلی دروازہ کے باغ میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہوا۔ علامہ اقبال کا پختہ ارادہ تھا۔ کہ اِس جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ لیکن اُسی شام اُن کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ اِسی لیے ملک زمان مہدی خاں نے صدارت کی۔ جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا۔ حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار، ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ مسٹر جناح نے انتخابی مہم کا آغاز کرتے ہوئے ایک نہایت زوردار تقریر کی۔ جو اِس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کی گئی ہے۔

مسٹر جناح کی یہ تقریر اِس اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ کہ اِس میں انھوں نے نہایت اختصار لیکن جامعیت سے وہ تمام اصول بیان کر دیئے تھے۔ جن کی بنا پر مسلم لیگ پنجاب کے انتخابات میں حصّہ لینے کا عزم رکھتی تھی۔ پوری تقریر میں ایک لفظ بھی ہندوؤں، سکھوں اور کانگرس کے خلاف نظر نہیں آتا۔ مسٹر جناح کے تمام حملوں کا ہدف یونینسٹ پارٹی تھی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ جہاں تک اِس صوبے کا تعلق ہے مسلم لیگ کو اگر کسی جماعت سے جنگ پیش آنے والی ہے۔ تو وہ یونینسٹ پارٹی تھی۔ اس تقریر کے دو، چار جملے یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"...... کیا میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھ سکتا ہوں۔ کہ اگر وہ اہلِ پنجاب کی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لیے اِس

قدر بے تاب تھے۔ تو آج سے پہلے کہاں تھے؟ کیا انھوں نے ریزرو بنک کی ملازمت اسی خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے اس سے پہلے کیوں استعفا نہ دیا؟ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سر سکندر حیات خاں کو قلمدانِ وزارت سنبھالنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ کہ یہ تمام ردّ و بدل صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں وزارتیں اور عہدے تقسیم ہوتے رہیں۔ یہ پارٹی جو خود غرض اور طامع افراد پر مشتمل ہے۔ اور جس کو حکومت پنجاب کی سرپرستی اور امداد بھی حاصل ہے۔ یقیناً اس قابل ہے۔ کہ اس کی جی کھول کر مذمت کی جائے"۔

جب مسٹر جناح نے یونینسٹ پارٹی پر یہ پے جملے کیے تو لاہور کی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اردو اخبارات میں سے صرف روزنامہ احسان لیگ کا حامی تھا۔ انگریزی اخباروں میں سول اور ٹریبون کبھی کبھار لیگ کی خبر شائع کرتے تھے۔ سول میں آئے دن سیّد نور احمد۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور نواب زادہ خورشید علی خاں کے مضامین چھپتے تھے۔ جن میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف سخت زہر اگلا جاتا تھا مسٹر جناح کی مذکورہ بالا تقریر کے جواب میں احمد یار خاں دولتانہ نے سول میں لکھا:

"..... میرے معزز دوست مسٹر جناح لاہور کے ووٹروں کو ہمارے

خلاف مشتعل کرنے میں مصروف ہیں۔ اور تعجب ہے کہ یہ سب کچھ اِس دعوے سے کر رہے ہیں۔ کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد ہو۔ اور پنجاب میں گورنر کی وزارت نہ قائم ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح جس کام کا ایک دفعہ ارادہ کرلیں۔ پھر اُن کو اُس کام سے باز رکھنا ممکن نہیں۔ تاہم میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح ہم سے خواہ مخواہ مفت میں جنگ مول لے رہے ہیں۔ ہم اُن سے لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ ہماری مرضی کے خلاف ہمیں جنگ پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہم تو اُن سے مفاہمت کے متمنی تھے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی قسم کے زبانی سمجھوتے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔

"اگر مسٹر جناح نے اپنی موجودہ مہم کو ترک نہ کیا۔ تو مجھے اندیشہ ہے کہ اُنھیں پنجاب میں سوائے ناکامی اور مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کچھ بعید نہیں۔ کہ مسٹر جناح کی اِس قابلِ اعتراض روش سے تنگ آکر۔ آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے نمائندے مسلم لیگ گروپ میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔ اور اُس کی بجائے انڈی پنڈنٹ رہنا پسند کریں۔ یا پھر لیگ کے مقابلے میں دوسری جماعتوں سے مل کر کسی اقتصادی پروگرام کی بنا پر علیحدہ پارٹی بنا لیں۔"

جب دولتانہ کا یہ بیان شائع ہوا۔ تو مسٹر جناح پشاور میں تھے۔ اُنھوں نے

وہیں سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر کو ایک طویل خط لکھ کر احمد یار خان دولتانہ کے بیان کی دھجیاں اڑا دیں۔ اُنھوں نے فرمایا:

"...... مسلم لیگ کے جس پروگرام پر میں لیگ کے صدر کی حیثیت سے آج کل عمل کر رہا ہوں۔ یہ پروگرام آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس بمبئی میں ایک باضابطہ قرارداد کے ذریعہ سے طے کیا تھا۔ جس وقت یہ قرارداد منظور ہوئی تھی۔ احمد یار خان دولتانہ اجلاس میں موجود تھے۔ اور اُنھوں نے اِس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ کیا اُس وقت اُنھیں پنجاب کے حالات کا علم نہیں تھا۔ یا کیا اُس وقت اُنھوں نے پنجاب کی سیاست کا تجزیہ نہیں کیا تھا؟ بیشک یہ صحیح ہے۔ کہ جب میں کسی طے شدہ پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیتا ہوں۔ تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت مجھے اُس کی خلاف ورزی یا اُس سے بدعہدی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی ہاں بعض ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنھیں اس قسم کی بدعہدی، خلاف ورزی اور وعدہ شکنی کرنے میں ضمیر کی کوئی سرزنش محسوس نہیں ہوتی...... میں احمد یار خان دولتانہ سے پوچھتا ہوں۔ کہ وہ کون سا زبانی سمجھوتہ تھا۔ جو اُنھوں نے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے مجھ کو پیش کیا تھا۔ اور جسے میں نے قبول کرنے سے انکار کیا ہے؟ یہ بڑا اہم معاملہ ہے اور اُن کا فرض ہے۔ کہ کھلے بندوں عوام کو بتائیں کہ یونینسٹ پارٹی کے کس

رکن نے اپنی پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے میرے ساتھ سمجھوتہ
کرنے کی خواہش کی تھی . . . . مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ اگر مسلم لیگ
نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ خواہ مخواہ جنگ جاری رکھی۔
تو آئندہ فیڈرل اسمبلی میں پنجاب کے مسلمان نمائندے ،لیگ
کے خلاف کسی اور پارٹی سے تعاون کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔
میں سمجھتا ہوں کہ احمد یار خاں دولتانہ کے یہ الفاظ اُن کے
ارادوں کی غمازی اور اُن کی نیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔
مقتدر آزماؤں کا یہ بے ضمیر جتھا ، جسے یونینسٹ پارٹی کا نام
دیا گیا ہے ، اگر برسر اقتدار آ گیا۔ تو کیا پنجاب اور کیا مرکز
دونوں جگہ یہی کچھ کرے گا۔" [1]

۱۳ر اکتوبر کو محمد عظیم خاں نے مسٹر جناح کے اعزاز میں اپنے مکان پر چائے کی ایک پُرتکلف دعوت دی۔ یہاں بھی مسٹر جناح نے ایک مختصر لیکن بہت زور دار تقریر کی اور مسلم لیگی کارکنوں کو اس طرف متوجہ کیا ، کہ آئندہ الیکشن کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کریں۔ چنانچہ اُسی تقریب میں ملک زمان مہدی خان۔ خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی نے اپنے حصے کا پانچ پانچ سو روپیہ ادا کر دیا۔ ۱۴ر اکتوبر کو ڈی۔ اے ۔ وی کالج۔ سناتن دھرم کالج۔ دیال سنگھ کالج وغیرہ کے ہندو طلبہ نے مسٹر جناح کے اعزاز میں ایک جلسہ

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

لاجپت رائے ہال میں منعقد کیا۔ جس کی صدارت سر منوہر لال نے فرمائی۔

اِس جلسہ میں سر منوہر لال کی تحریک پر حاضرین نے بالاتفاق یہ قرار داد منظور کی۔ کہ مسٹر جناح ہندوستان کے بہت بڑے اور قابلِ فخر محبِّ وطن لیڈر ہیں۔[1]

جب پنجاب میں یہ کچھ ہو رہا تھا۔ تو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ میں بھی ردّ و بدل جاری تھا۔ یو۔ پی سے نواب چھتاری۔ سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خاں مرکزی بورڈ کے ممبر نامزد کیے گئے تھے۔ لیکن اب اِن تینوں نے بورڈ سے استعفا دے دیا۔ اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا یو۔ پی کی یہ ایگریکلچرل پارٹی گویا پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا مثنیٰ اور ہمزاد تھی۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے استعفے نے عجب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ ابھی چند مہینے قبل وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب کئے گئے تھے۔ اب اُن کے استعفے کے بعد لیگ کا کوئی سیکرٹری نہیں تھا۔ بہار سے سید حسین امام اور سید عبد العزیز نے پارلیمنٹری بورڈ سے استعفا دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر۔ بلا وجہ مسلم لیگ کے خلاف سب و شتم کا افسوسناک سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اور مسٹر جناح کو مجبوراً انھیں پارلیمنٹری بورڈ سے نکال دینا پڑا۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

لاہور کے اُردو اخباروں میں، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ صرف روزنامہ احسان لیگ کا حامی تھا۔ اِس لیے مسلم لیگ کے پراپا گنڈے کا تمام تر دارومدار احسان پر تھا۔ اِس موقعہ پر ملک برکت علی نے بہت بڑی قربانی کی۔ انھوں نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے صرف کر کے انگریزی کا ایک ہفت روزہ اخبار نیو ٹائمز جاری کرا دیا۔ علامہ اقبال نے بڑی خوشی سے اِس کی سرپرستی قبول فرمائی۔ اور جب تک وہ زندہ رہے۔ اخبار کے سرورق پر اُن کا نامِ نامی بطور سرپرست چھپتا رہا۔ نیو ٹائمز ۱۹۳۹ء کے اوائل تک جاری رہا۔ لیکن چونکہ خسارہ بے حد ہو رہا تھا۔ اِس لیے مجبوراً بند کرنا پڑا۔ تاہم اِس اخبار نے اپنی سوا دو سال کی زندگی میں بڑے زبردست مقالے اور مضامین شائع کیے مسٹر جناح التزاماً اس کا مطالعہ فرماتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں اُن کے اور پنڈت نہرو کے درمیان مراسلت ہوئی۔ اور پنڈت نہرو نے مسلمانوں کے مطالبات سے تجاہلِ عارفانہ کا اظہار کیا۔ تو مسٹر جناح نے اُن کو نیو ٹائمز کا وہ پرچہ بھیج دیا۔ جس میں اِسی موضوع پر ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہُوا تھا۔

اسی دوران میں ایک روز سردار احمد بخش خاں ہمارے سیکرٹری غلام رسول خاں کے پاس آئے۔ احمد بخش خاں، سر سکندر حیات کے بہت قریبی عزیز تھے! اور غلام رسول خاں کے پُرانے دوست بھی تھے۔ دونوں بیرسٹری کی تعلیم کے زمانے میں اکٹھے انگلستان میں رہ چکے تھے۔ احمد بخش خاں نے غلام رسول خاں کو سر سکندر کا یہ پیغام دیا کہ اگر لیگ، پارلیمنٹری بورڈ الیکشن سے دستبردار ہو جائے۔

تو مسلم لیگ کے ۲ دو ممبروں کو سر سکندر بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھیجنے کو تیار ہیں لیکن شرط یہ تھی کہ ملک برکت علی کو اسمبلی کی رکنیت قطعاً نہیں دی جائے گی۔ بات یہ تھی کہ سر سکندر اور ملک برکت علی کے تعلقات بہت کشیدہ تھے اور یہ کشیدگی ۱۹۲۱ء سے چلی آرہی تھی۔ جب سر سکندر کے انتخاب کے خلاف اُن کے حریف سر محمد امین شمس آبادی نے اپیل کی تھی۔ تو ملک برکت علی نے اپیل کی پیروی کر کے۔ سر سکندر کو پنجاب کونسل سے خارج کروا دیا تھا۔ ملک صاحب نے مطالبہ کیا تھا۔ کہ سر سکندر کو آئندہ کبھی انتخاب میں کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن ٹربیونل نے ایسا سخت قدم اٹھانے کی بجائے صرف اُن کا انتخاب ناجائز قرار دیئے جانے پر اکتفا کیا تھا۔

سردار احمد بخش خاں چاہتے تھے۔ کہ اگر علامہ اقبال پارلیمنٹری بورڈ کے دو ممبروں کو نامزد کر دیں۔ تو سر سکندر انھیں بلا مقابلہ پنجاب اسمبلی میں بھجوا دیں گے۔ جب غلام رسول خاں نے یہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بلا تامّل رد کر دیا۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ قطعاً گوارا نہ تھا۔ کہ ملک برکت علی سے یُوں بے وفائی کی جائے۔ دوسری وجہ انھوں نے یہ بیان فرمائی۔ کہ لیگ کا مقصد محض یہ نہیں کہ اسمبلی کی دو نشستیں حاصل کر لی جائیں۔ بلکہ اس تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔ اگر ہم نے صرف دو ممبریوں کی بھیک مانگ کر۔ اصل تحریک سے چشم پوشی کر لی۔ تو سارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء کے اواخر میں۔ ہم نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ جو لوگ لیگ پارلیمنٹری

بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں بورڈ کے پاس اپنی درخواستیں بھیج دیں۔ اِس اعلان کے جواب میں آٹھ امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئیں۔ (۱) ملک برکت علی۔ (۲) خلیفہ شجاع الدین (۳) ملک زمان مہدی خاں (۴) راجہ غضنفر علی خاں (۵) سردار کریم بخش حیدری۔ میاں عبدالمجید (۷) مظفر علی خاں قزلباش (۸) مشتاق علی خاں۔

ملک برکت علی پنجاب کے مشرقی قصباتی حلقے سے کھڑے ہو رہے تھے۔ جس میں جالندھر۔ فیروز پور۔ قصور۔ ہوشیار پور۔ نکودر۔ پٹی۔ اور پتو کی شہر شامل تھے۔ خلیفہ شجاع الدین لاہور شہر۔ ملک زمان مہدی تحصیل حافظ آباد۔ راجہ غضنفر علی خاں تحصیل پنڈ دادن خاں۔ سردار کریم بخش حیدری تحصیل علی پور۔ اور مشتاق علی خاں ضلع رہتک سے امیدوار تھے۔ تحصیل لاہور سے دو امیدواروں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ایک میاں عبدالمجید بیرسٹر ایٹ لا۔ دوسرے سردار مظفر علی خاں قزلباش۔ پارلیمنٹری بورڈ نے یہ امر واضح کر دیا تھا۔ کہ اگر کسی شخص کو بورڈ نے اپنا امیدوار نامزد نہ کیا۔ تو وہ شخص کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر۔ یا اپنے طور پر الیکشن میں کھڑے ہونے کا مجاز نہیں ہوگا۔ میاں عبدالمجید نے بلا تامل یہ شرط منظور کر لی۔ لیکن سردار مظفر علی خاں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا انھوں نے اپنی درخواست واپس لے لی۔ اور جب بورڈ نے میاں عبدالمجید کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ تو مظفر علی خاں قزلباش یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر اُن کے خلاف کھڑے ہو گئے۔

لاہور شہر سے خلیفہ شجاع الدین کی کامیابی کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

اُن کے مقابلے میں دو بڑے زبردست اُمیدوار تھے - ایک میاں امیرالدین جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے - دوسرے مشہور نومسلم بیرسٹر خالد لطیف گابا - جو مجلسِ اتحادِ ملّت کے اُمیدوار تھے - علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ خلیفہ شجاع الدین لاہور شہر کی بجائے کسی اور حلقے سے کھڑے ہو جاتے تو بہتر تھا - لیکن انھوں نے مشورہ قبول نہ کیا -

ڈاکٹر صاحب کی یہ خواہش بھی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو اس امر پر متحد ہو جانا چاہیے - کہ ہر حلقے میں یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار کا مقابلہ کیا جائے - لیکن افسوس کہ اس ضمن میں مسلم لیگ - مجلسِ اتحادِ ملّت اور احرار کا کوئی باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا - اور اکثر حلقوں میں یہ جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئیں -

امرتسر سے دو آدمیوں نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا تھا - ایک یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار شیخ محمد صادق - اور دوسرے احرار کے اُمیدوار شیخ حسام الدین اس مقابلے میں شیخ محمد صادق کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا - اور اندیشہ تھا کہ کہیں یونینسٹ پارٹی کو کامیابی نہ ہو جائے - اس موقع پر علامہ اقبال نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا ہونے پر آمادہ کیا - جو ۱۹۳۰ء کی تحریکِ سول نافرمانی میں تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے تھے - اور اب امرتسر کی بجائے لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے - یہ صحیح ہے کہ امرتسر میں ڈاکٹر کچلو کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا بھی چراغ نہ جل سکتا تھا - لیکن دِقت یہ تھی کہ کچلو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے کو تیار نہ تھے - اور اُدھر کانگرسی ٹکٹ پر اُن کی کامیابی کے

امکانات قطعاً نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا اور ڈاکٹر کچلو کو انڈی پنڈنٹ کھڑا ہونے پر رضامند کرلیا۔ چنانچہ جب انھوں نے امرتسر کے شہری حلقے سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا۔ تو ایک پبلک جلسے میں لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کس ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں؟" تو انھوں نے جواب دیا۔ "کچلو ٹکٹ۔"

سر سکندر مسلم لیگ کے دو امیدواروں کے سخت خلاف تھے۔ ایک ملک برکت علی۔ دوسرے زمان مہدی۔ اور دونوں کو شکست دینے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ زمان مہدی کے خلاف۔ تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ تحصیل حافظ آباد میں جن لوگوں کی امداد و اعانت کے وعدے پر زمان مہدی کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک ایک کرکے دوگردانی اختیار کرلی۔ البتہ ملک برکت علی کا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا۔ سر سکندر نے پہلے اس حلقے سے مولوی غلام محی الدین قصوری کو کھڑا کرنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ اُن کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ تو پھر بڑی کوشش سے جالندھر چھاؤنی کے ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ کو یونینسٹ پارٹی کا امیدوار بنایا گیا۔

علامہ اقبال مرزا حمید اللہ بیگ کو جانتے تھے۔ انھوں نے ایک آدمی بھیج کر حمید اللہ بیگ کو لاہور بلوایا۔ اور خود اُن سے درخواست کی کہ ملک برکت علی کا مقابلہ نہ کریں۔ لیکن مرزا حمید اللہ بیگ نے یہ کہہ کر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ کہ سر سکندر اُن سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے چکے ہیں۔ کہ وہ ملک برکت علی کے مقابلے سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔ اخبار نے بھی

اِس حلقے سے اپنا اُمیدوار کھڑا کر دیا تھا۔ یہ فیروز پور کے ایک وکیل شیخ غلام حیدر تھے۔

جُوں جُوں الیکشن کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ لیگی کارکنوں کی قلت کو ہم بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ بڑے بڑے جادو بیان خطیب اور بیشتر مقرر مجلسِ احرار میں تھے یا مجلسِ اتحادِ ملت میں۔ اُدھر گورنر سے لے کر پٹواری تک سرکار کا پُورا خانوادہ۔ یونینسٹ پارٹی کی پشت پر تھا۔ البتہ مولانا شوکت علی اپنی بے شمار مصروفیتوں میں سے ایک ہفتے کی مہلت نکال کر لاہور تشریف لائے۔ اور اُنھوں نے ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین اور ڈاکٹر کچلو کی حمایت میں امرتسر۔ جالندھر۔ لاہور۔ فیروزپور۔ ہوشیارپور وغیرہ شہروں کا دورہ کیا۔ علامہ اقبال نے بھی لیگی اُمیدواروں کی تائید میں بار بار اعلان شائع کئے۔ جو روزنامہ احسان میں بالالتزام چھپتے رہے۔ اور پوسٹروں کی صورت میں اُمیدواروں کے انتخابی حلقوں میں بھی تقسیم کئے جاتے تھے۔

حکومتِ پنجاب کا ریونیو ممبر ہونے کے باوجود سرسکندر کُھلم کُھلا یونینسٹ اُمیدواروں کی حمایت میں صوبے بھر کا دَورہ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک طرف تو ہندو سبھا پارٹی کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ کے حریف سیٹھ ڈالمیا کو بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا تاکہ راجہ صاحب بلامقابلہ منتخب ہو سکیں۔ اور دوسری طرف ہر قابل مسلمان اُمیدوار کے خلاف اپنے آدمی کھڑے کر کے راستہ روکنے کی کوشش کی۔

اِس الیکشن میں مجھے اور غلام رسول خاں کو شب و روز کام کرنا پڑا۔ پمفلٹ

پوسٹر۔ اور اخباری بیان لکھنے کا سارا کام میرے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ بڑے بڑے مجمعوں میں الیکشن کی تقریریں بھی کرنا پڑیں۔ میں اس فن سے بالکل بے گانہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے کبھی کبھی لاہور کے وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں ادبی موضوعات پر تقریریں کرنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن سقفِ آسمان کے نیچے۔جاڑے کی راتوں میں دس دس ہزار انسانوں کے مجمع میں، جہاں حامیوں کے نعرہ ہائے تحسین کے علاوہ مخالفوں کی آوازے بازی بھی سمع خراشی کرتی تھی، الیکشن کی ہنگامی سیاست پر تقریریں کرنا۔میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ پھر سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لوگ مسلم لیگ کے نام اور کام سے قطعاً ناآشنا تھے۔جناح کا نام بھی اکثر لوگوں نے نہیں سنا تھا۔ البتہ اقبال کا نام ایک ایسا کھرا سکہ تھا۔جسے ہم بے دریغ چلاتے تھے۔ میں نے اُنہی دنوں محسوس کیا۔کہ اقبال صرف پڑھے لکھے لوگوں ہی میں نہیں، بلکہ عوام میں بھی کتنا مقبول تھا۔مجھے رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ کاش ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی ہوتی۔اور وہ پنجاب کے چند بڑے بڑے شہروں کا ایک دفعہ دورہ کر لیتے۔تو فضا بالکل صاف ہو جاتی۔خود ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک دن زمان مہدی کے سامنے بڑی حسرت سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

۱۸ جنوری سے ۲۸ جنوری ۱۹۳۷ء تک مجھے مسلسل ملک برکت علی کے حلقۂ انتخاب کا دورہ کرنا پڑا۔اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سر سکندر حیات اور اُن کے حواریوں نے کس شدت سے مخالفت کا طوفان کھڑا کیا تھا۔نواب ممدوٹ مرحوم نے قصور اور فیروزپور میں ڈیرے

ڈال رکھے تھے۔ جہاں اُنھوں نے اپنے اثر و رسوخ۔ اور اپنی کوششوں کا آخری شمّہ تک مسلم لیگ کی مخالفت میں صرف کر دیا تھا۔

۲۷ جنوری سے جالندھر شہر میں پولنگ شروع ہونے والا تھا۔ اور ۲۶ کی شام کو سر سکندر اپنی موٹر میں وہاں پہنچے۔ جالندھر کے چودھری عبدالحمید ہمارے بہت بڑے معاون اور سرگرم کارکن تھے۔ سر سکندر نے اُنھیں چکمہ دے کر موٹر میں بٹھا لیا۔ اور راتوں رات بھگا کر لاہور لے گئے جہاں چودھری شہاب الدین نے اُنھیں اپنے بنگلے میں بند کر کے ایک طویل درس دیا۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ ملک برکت علی ہرگز اس قابل نہیں ہیں۔ کہ کوئی بھلا آدمی اُن کی مدد کرے۔ دوسرے دن جب سر سکندر کو یقین ہوگیا۔ کہ اب چودھری عبدالحمید اُن کے بتائے ہوئے پروگرام سے منحرف نہیں ہوں گے۔ تو اُن کو چھٹی دی گئی۔ اور وہ بمشکل غروب آفتاب کے بعد واپس جالندھر پہنچ سکے۔ جہاں اُنھوں نے ہمارے پاس آکر۔ اور ایک مجمع کے رُوبرو۔ یہ سارا واقعہ بیان کیا۔

جالندھر گویا پورے حلقۂ انتخاب کا مرکزِ اعصاب تھا۔ اور اس مرکز میں ہماری کامیابی اگر کسی شخص کی ہمّت و کوشش کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہے تو وہ قاضی بشیر حسین صدر میونسپل کمیٹی جالندھر تھے۔ قاضی صاحب صدرِ بلدیہ کے علاوہ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ اور اس لحاظ سے گورنر سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک ہر افسر کا دباؤ اُن پر ڈالا گیا۔ پہلے اُنھیں مختلف قسم کے انعام اکرام کا لالچ دیا گیا۔ جب وہ اس دامِ ہمرنگِ زمیں میں قدم رکھنے پر تیار نہ

ہوئے۔ تو پھر دستخطوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آنریری مجسٹریٹی سے برطرفی اور صدارت سے برخاستگی کی دھمکی بھی دی گئی۔ لیکن قاضی صاحب کے قدم پھر بھی نہ ڈگمگائے۔

اب سر سکندر کو ایک اور چال سوجھی۔ اُن کے بڑے بھائی سر لیاقت حیات خاں بھوپال میں وزیر تھے۔ چنانچہ سر لیاقت کے ذریعے سے نواب بھوپال سے کہا گیا۔ کہ وہ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی سیّد وزیر علی کو، جو بسلسلۂ ملازمت بھوپال ہی میں مقیم تھے، قاضی بشیر حسین کے پاس بھیجیں۔ سیّد وزیر علی نے کرکٹ میں جس قدر ترقی کی تھی۔ وہ تمام تر قاضی صاحب کی مُربیانہ شفقت اور توجہ کا نتیجہ تھی۔ جالندھر کے گورنمنٹ ہائی سکول سے لے کر علی گڑھ تک قاضی صاحب سیّد وزیر علی کی سرپرستی کرتے رہے تھے۔ وزیر علی نے بادلِ ناخواستہ جالندھر آکر یہ ناگوار فرض ادا کیا۔ لیکن قاضی صاحب پھر بھی اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ سیّد وزیر علی سے بعد میں بھی دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۷ء کے دسمبر میں کرکٹ کا میچ کھیلنے کے لیے لاہور آئے۔ تو یہ سارا واقعہ انھوں نے خود مجھ کو سنایا تھا۔

اب تک قاضی صاحب پسِ پردہ رہ کر مدد کر رہے تھے۔ لیکن ۲۸ جنوری کو وہ تمام مصلحتوں کو پسِ پشت پھینک کر، ایک رضاکار کی طرح، ہمارے پولنگ سٹیشن پر آکر کھڑے ہو گئے، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اہلِ جالندھر کو ادھر ہی کا رخ کرنا ہوگا۔ چنانچہ ۲۸ جنوری کے پولنگ نے الیکشن کا فیصلہ کر دیا۔ اور ملک برکت علی صرف نوّے ووٹوں کی اکثریت سے

جیت گئے۔

میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ اگر ہمیں اِس الیکشن میں بھی ناکامی ہوتی تو پنجاب میں مسلم لیگ کا کیا حشر ہوتا۔ ملک برکت علی کی کامیابی ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک کا ایک ایسا انقلاب آفریں موڑ ہے۔ جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اُس دور کا مورّخ ہی کر سکتا ہے۔

۹ر فروری کی سہ پہر کو جالندھر سے ٹیلی فون پہ ملک برکت علی کی کامیابی کا مُژدہ موصول ہوا۔ اور ساتھ یہ پیغام بھی پہنچا۔ کہ اُسی شام اہلِ جالندھر ایک بہت بڑا جلوس نکال رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں فوراً وہاں پہنچ جانا چاہیئے ہم لوگ اُسی وقت موٹر میں روانہ ہو گئے۔ لیکن پہلے علّامہ اقبال کے دولتکدے پر حاضر ہونا ضروری سمجھا۔ تاکہ یہ خوش خبری اُن کو سنا دی جائے۔ جاوید منزل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی بے اختیار ہمارے منہ سے زندہ باد کے نعرے نکل گئے۔ ڈاکٹر صاحب اندر کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ یہ شور سُن کر فوراً باہر برآمدے میں آ گئے۔ اور ملک برکت علی سے بغل گیر ہو گئے۔ شدتِ جذبات اور فرطِ مسرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تھی۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سات اُمیدواروں میں سے صرف دو کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں عبدالمجید کی کامیابی بظاہر یقینی نظر آتی تھی۔ لیکن بعض وجوہ سے آخری روز پولنگ تسلی بخش نہ ہوا اور وہ ڈھائی سو ووٹوں سے ہار گئے۔ اب قاعدے کی رُو سے ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ لیگ کے دونوں کامیاب اُمیدوار مل کر بیٹھتے۔ اور پارلیمنٹری بورڈ

کے مشورے۔ اور علامہ اقبال کی ہدایت سے۔ آئندہ طرزِ عمل اور طریقِ کار کا فیصلہ کرتے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے تعجب انگیز واقعہ یہ ہے۔ کہ راجہ غضنفر علی خاں نے اپنی کامیابی کے بعد بورڈ کے دفتر میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ سیدھے یونینسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے۔ اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔

راجہ صاحب کے اس فعل سے لیگی حلقوں میں حیرت اور افسوس کی لہر پھیل گئی۔ مسلم لیگ کے مخالف اخباروں نے اس پر خوشیاں منائیں شروع کیں اور تمسخر و استہزا سے بھرپور نظمیں شائع کیں۔ راجہ صاحب نے یونینسٹ پارٹی میں شامل ہوتے وقت جو اعلان کیا۔ اس میں انھوں نے مسلم لیگ کو ترک کرنے کی دو[2] وجوہ بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ بحالاتِ موجودہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی سے بہتر جماعت اور کوئی نہیں۔ دوسری یہ کہ جہاں تک سیاسی پروگرام کا تعلق ہے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔

اگر بات یہیں تک رہتی۔ تو معاملہ زیادہ شرمناک صورت اختیار نہ کرتا۔ لیکن ستم یہ ہوا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اسی جلسے میں راجہ غضنفر علی خاں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سر سکندر حیات خاں نے جو تقریر کی۔ اس میں انھوں نے فرمایا کہ:

> "راجہ صاحب میری مرضی اور منشا سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شروع ہی سے انھوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے فوراً بعد وہ

یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے"

سوال یہ ہے کہ اگر راجہ صاحب کے نزدیک یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے پروگرام یکساں تھے۔ تو پھر انھوں نے اُس جماعت کو کیوں ترک کیا۔ جس کے ٹکٹ پر وہ کامیاب ہوئے تھے۔ مزید برآں انھوں نے ابتدا ہی میں اپنی مقدر آزمائی کے لیے یونینسٹ پارٹی کو کیوں پسند نہ فرمایا۔

سر سکندر نے یہ کہہ کر کہ شروع ہی سے راجہ صاحب نے اُن کو اپنے خفیہ ارادوں سے مطلع کر رکھا تھا۔ گویا ایک شرمناک راز سے پردہ اُٹھا دیا تھا اِس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہفتہ وار نیو ٹائمز نے لکھا:

"...... یہ صاف سیدھا فریب اور دھوکا ہے۔ اگر مسلم لیگ کو معلوم ہوتا کہ راجہ غضنفر علی خاں اور سر سکندر کے درمیان کوئی عہد پیمان قائم ہیں۔ تو پارلیمنٹری بورڈ کبھی ایسے شخص کو ٹکٹ نہ دیتا۔ جو فریقِ مخالف کے لیڈر کے ساتھ خفیہ ساز باز میں شریک تھا..... ایک غضنفر علی کا کیا ذکر ہے مسلم لیگ افراد کے بل بوتے پر نہیں۔ بلکہ اپنے اصولوں کی بنا پر زندہ رہے گی۔ اور جب تک یہ جماعت اُن اصولوں پر قائم ہے، جو ہمیشہ اُس کے لیے موجبِ افتخار رہے ہیں، وہ ہر قسم کی منافقت کا پردہ چاک کر کے۔ اور ہر قسم کے فریب سے بے نیاز ہو کر۔ اُس راستے پر گامزن رہے گی۔ جو آزادیٔ وطنی اور استقلالِ قومی کی منزل کی طرف جاتا ہے"۔[1]

---

[1] نیو ٹائمز۔ مورخہ ۲۲۔ فروری ۱۹۳۷ء

انتخابات کے دوران میں مسٹر جناح نے بار بار اِس طرف اشارہ کیا تھا۔ کہ اگرچہ مسلم لیگ کانگرس کے ساتھ ہر قسم کا اتحاد کرنے کو تیار ہے۔ لیکن مسلمان کانگرس میں جذب ہو کر۔ اپنی جداگانہ قومی ہستی کو مٹا دینے پر تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے ۲ر جنوری ۱۹۳۷ء کو ناگپور میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ محاذ قائم کرنا چاہیئے تاکہ دونوں فرقے اکٹھے ہو کر اِس صوبے کی خدمت کر سکیں اور مادرِ وطن کی آزادی کی جد و جہد میں بھی حصّہ لیں۔ مسلم لیگ کے پیشِ نظر آزادی اور ترقی پسندی کا پروگرام ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ نئی لیجسلیٹو اسمبلیوں میں ایسے آدمی بھیجے جائیں جو دوسرے ترقی پسند گروہوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی فلاح و بہبود اور آزادی کے حصول کی کوشش کریں۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو جو آزادی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ہرگز اسمبلیوں میں نہ جانے دیں۔ جب تک لیڈرشپ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو انفرادی جتھہ بندی کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے اور ہندوستان کی یگانگت کے وسیع مقاصد کو نظر انداز کرتے ہیں اُس وقت تک ترقی کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی"۔

۸ر جنوری ۱۹۳۷ء کو انھوں نے ڈھاکہ میں فرمایا کہ:

"جداگانہ انتخاب کے باوجود اور اُن مشکلات کے باوجود جن کا

آج ملک کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر ایک پارٹی بنا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ایک ایسی مشترکہ پالیسی اور پروگرام وضع کر سکیں جن پر ہندو اور مسلمان اسمبلیوں کے اندر اور باہر عمل پیرا ہو سکیں۔ آج یہ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے"۔[1]

حقیقت یہ ہے۔ کہ جب سے مسٹر جناح انگلستان سے واپس آئے تھے اُن کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ کہ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ کی طرح کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی پائیدار مفاہمت ہو جائے۔ تاکہ ہندو اور مسلمان مل کر استخلاصِ وطن کی جدوجہد میں حصہ لے سکیں۔ لیکن اس ضمن میں انھیں سب سے زیادہ مایوسی پنڈت جواہر لال نہرو کی ضد اور تیز زبانی سے ہوئی۔

جب ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل ایوارڈ) کا سوال پیش ہوا تھا۔ تو مسٹر جناح کی کوشش اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی ہوش مندی سے کانگرس نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔

اس سے قبل ڈاکٹر انصاری کی ذاتِ گرامی سے مرعوب ہو کر۔ کانگرس کی مجلسِ عاملہ بھی اس ضروری معاملے میں غیر جانب داری اختیار کر چکی تھی۔ لیکن اب کہ انتخابات کے موقع پر کانگرس نے اپنا مینی فسٹو شائع کیا۔ تو یہ

---

[1] روزنامہ سٹیٹسمین کلکتہ۔ مورخہ ۳ اور ۹ جنوری ۱۹۳۷ء

غیر جانب داری ختم ہوگئی - اور مینی فسٹو میں یہ شق بڑھادی گئی - کہ کانگرس فرقہ دارانہ فیصلے کو ختم کر کے دم لے گی -

پنڈت نہرو نے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء کو بابو جگت نارائن لال (پٹنہ) کو اپنے خط میں صاف لکھا تھا - کہ "فرقہ دارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس ایک غیر جانبدارانہ اور مبہم رویہ اختیار نہیں کر سکتی - ..... اور جیسا کہ مینی فسٹو میں ظاہر کیا جا چکا ہے - ہم اس فیصلے کو بالکل قبول نہیں کرتے "

اس کے علاوہ جب مسلم لیگ نے الیکشن میں حصہ لینے کا عزم کیا - تو پنڈت نہرو نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے - انتہائی تبختر سے اعلان کیا کہ " آج ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں - یعنی نیشنل کانگرس اور برطانوی حکومت - باقی جتنی جماعتیں ہیں - اُن کو کانگرس کے پیچھے چلنا پڑے گا - یا حکومت کا ساتھ دینا ہو گا "

اس قسم کی افسوسناک اور لاطائل باتوں کے جواب میں مسٹر جناح کو مجبوراً اعلان کرنا پڑا کہ " ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں - نیشنل کانگرس برطانوی حکومت اور مسلمان - ہم نہ کانگرس کے خیمہ بردار بننے کو تیار ہیں - اور نہ حکومت کی کاسہ لیسی کرنے پر آمادہ ہیں - ہماری اپنی قومی پالیسی اور اپنا قومی پروگرام ہے "

مسٹر جناح نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا - کہ کانگرس خواہ مخواہ مسلم لیگی اُمیدواروں کے مقابلے میں - اپنے اُمیدوار کھڑے کر رہی ہے - ..... کانگرس کو چاہیئے کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں دخل نہ دے - ورنہ

بدمزگی پیدا ہو گی۔

پنڈت نہرو اِس پر سخت گرجے اور برسے۔ اُنھوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک طویل بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح پر ناروا حملے کیے۔ اور کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی ایک لایعنی اور مضحکہ انگیز دعویٰ ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ جس کا نام ہندوستانی ہے۔ اور تنہا کانگرس اس کی نمائندگی کا استحقاق رکھتی ہے۔ اور بیان کے آخر میں کہا:

"...... مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف اُس گروہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ جو متوسط طبقے کے بالائی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ مسلمان عوام کے ساتھ جس قدر مجھے ربط و ضبط رہا ہے مسلم لیگ کے اکثر لیڈروں کو نصیب نہیں ہوا۔ مسلمان عوام کے افلاس مصائب اور فاقہ کشی کا علم جس قدر مجھے ہے۔ آنسا ان لیگی لیڈروں کو ہرگز نہیں۔ جو اسمبلی کی نشستوں اور ملازمتوں کے بٹوارے کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں۔ کانگرس کے صدر کی حیثیت سے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دُکھ درد۔ افلاس اور فاقہ زدگی کی یکساں نمائندگی کا دعویدار ہوں۔"

جب پنڈت نہرو کی ضد نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو خواہ مخواہ ناراض کر کے حالات و واقعات کا رُخ بدلنے کی کوشش کی تو علامہ اقبال نے اِس افسوسناک کیفیت کو شدت سے محسوس کیا۔ وہ جواہر لال کے مداح تھے۔ اور کانگرس کے ہندو لیڈروں میں جواہر لال کو غنیمت

سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اِس صورتِ حال سے متاثر ہو کر حسبِ ذیل بیان جاری کیا۔ جو سول کے علاوہ نیو ٹائمز میں بھی شائع ہوا تھا۔

"...... میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزت ہے۔ انھوں نے آزادیِ وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کئے۔ اور قربانیاں گوارا کی ہیں۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ انھوں نے بلا وجہ مسٹر جناح کے ساتھ اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے۔ اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے۔ وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں۔ لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اِسی لیے اُن کی قوم پرستی اور حُب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔

"مسٹر جناح کا آخر قصور کیا ہے۔ جس پر پنڈت نہرو اس قدر طیش میں آرہے ہیں؟ صرف یہی کہ انھوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس کی اِس روش کو غلط قرار دیا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کے حلقوں میں اپنے اُمیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ مسٹر جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ اپنے خیالات و عقائد اور مطمحِ نظر کے اعتبار سے کانگرس سے بے حد قریب ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ جہاں تک مجالسِ قانون ساز

ہیں مسلمانوں کے نمائندے بھیجنے کا سوال ہے - کانگریس اِس مسئلہ میں دخل نہیں دے گی - بلکہ یہ معاملہ کلیتہً مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کیا جائے گا -

"اگر کانگریس مسلمانوں میں بھی اُتنی ہی مقبول ہوتی - جتنی کہ ہندوؤں میں ہے - تو پھر پنڈت نہرو کو یقیناً یہ حق حاصل تھا - کہ کانگریسی ٹکٹ پر مسلمان امیدوار کھڑے کرتے - لیکن یہ ایک اظہر من الشمس اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے - کہ ابتدا سے رہی کہ اب تک صرف گنتی کے چند مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت گوارا کی ہے - مسلمان عوام ہمیشہ کانگریس سے الگ تھلگ رہے ہیں مسلمانوں کے اِس طرزِ عمل سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے - کہ وہ خدانخواستہ جذبۂ آزادی سے محروم ہیں - بلکہ یہ امر اس بات کا ثبوت ہے - کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بعض بنیادی اختلافات ہیں - اور جب تک اُن اختلافات کو باہمی افہام و تفہیم سے رفع نہیں کیا جائے گا مسلمان اور ہندو کانگریس کے پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے -

"یہ صحیح ہے - کہ مسٹر سی - آر - داس ایسے فراخ دل انسان نے مسلمانوں کے خدشات کو دور کرنے کی بڑی قابلِ تحسین کوشش کی تھی - لیکن اُن کے انتقال کے فوراً بعد پنڈت مالوی اور ڈاکٹر مونجے کے تعصب نے اُس رواداری کا خاتمہ کر دیا - ہیں یہ بھی تسلیم کرتے

کو تیار ہوں ۔ کہ پنڈت جواہر لال نہرو واقعی کچھ عرصہ مالوی اور موبخے کی ذہنیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن حال ہی میں اُنھوں نے فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق کانگرس کی غیر جانبداری کو جس طریقے سے ختم کیا ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بھی آخر کار مہا سبھا کے روز افزوں اثر سے مغلوب ہو گئے ہیں ۔ پنڈت نہرو کے اِس طرزِ عمل کو دیکھ کر اب مسلمانوں کو اُن پر بھی چنداں اعتماد نہیں رہا ۔

" علاوہ ازیں پنڈت نہرو کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ اِس بات کا شور مچانے بیٹھیں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ یا مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ۔ یا یہ کہ وہ (پنڈت نہرو) ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں ۔

" میں پوچھتا ہوں کیا خود پنڈت نہرو ہندوؤں کے متوسط درجے کے بالائی اور متمول طبقے سے تعلق نہیں رکھتے ؟ افلاس اور بھوک کا نام لے لے کر خلطِ مبحث کرنے ۔ اور ماسکو سے مانگی ہوئی زبان میں باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے ۔ مسٹر جناح اپنے اِس دعوے میں بالکل حق بجانب تھے کہ کانگرس کو مسلمانوں کے انتخابی حلقوں میں اپنے امیدوار نہیں کھڑے کرنا چاہئیں ۔ اِس نصیحت سے ناراض ہونے کی بجائے

کانگرس کا فرض تھا۔ کہ اِس پر عمل پیرا ہوتی۔

"مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اِس بات کا احساس ہو جائیگا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں۔ اور اِس کے بعد وہ مسٹر جناح کو ناراض کرنے کی بجائے۔ اُن کی امداد و اعانت سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے جیسا کہ مرکزی اسمبلی کے کانگرسی لیڈر اب تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔

"مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ممکن ہے پنڈت نہرو اِس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے۔ جنّت الحمقا میں رہنا پسند کریں۔ اور یہ اصرار کئے جائیں۔ کہ مسلمانوں کی نیابت کا حق بھی کانگرس ہی کو حاصل ہے اگر اُنھوں نے ایسی ضد کی۔ تو خود اپنے ہاتھوں سے ہندوستان کی آزادی کے راستے میں روڑے اٹکائیں گے۔ پنڈت نہرو کو چاہیئے۔ کہ مسٹر جناح سے معذرت کر کے۔ اُس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ جو اُن کی جلد بازی اور ناتجربہ کاری نے پیدا کر دی ہے"

اُسی موضوع پر مولانا شوکت علی نے ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو جو بیان دیا تھا۔ اُس کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ

"پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح میں جو بحث چل نکلی ہے مجھے اُس سے بہت تکلیف ہوئی ہے۔ میری پنڈت نہرو سے

درخواست ہے کہ اس بحث سے باز آجائیں۔ انھیں مسلمانوں کے ساتھ اتنا ربط و ضبط نہیں جتنا مسٹر جناح کو ہے۔

میں ہندوستان بھر کا دورہ کر رہا ہوں۔ اور مسلمانوں کو اس خیال کے پیشِ نظر منظم کر رہا ہوں کہ تمام فرقوں کے ترقی پسند عناصر متحد ہو کر ایک مشترکہ محاذ قائم کر سکیں۔ اس قسم کی بحث سے، جو پنڈت نہرو نے شروع کر دی ہے، نقصان پہنچے گا اور مختلف فرقوں کا آبرومندانہ اتحاد قائم نہیں ہو سکے گا۔ پنڈت نہرو چاہتے ہیں کہ سب لوگ ہندوؤں کے ترقی پسند عنصر یعنی کانگرس کے ساتھ شامل ہو جائیں تاکہ عمل میں یکسانیت پیدا ہو۔ اُن کی یہ رائے درست ہے کہ ملک میں دو فریق ہیں۔ ایک حکومت اور دوسرا ہندوستانی عوام۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عوام سے مراد صرف کانگرس ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ بھی ہے۔ جو آج بلاشبہ مسلمانوں اور بالخصوص ترقی پسند مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندہ ہے۔ میں حیثیت القوم آج مسلمانوں کو کانگرس پر کوئی اعتماد نہیں۔ ایک پُرانے کانگرسی کی حیثیت سے میں پنڈت نہرو سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بحث کو بند کر دیں۔ اگر انھوں نے اسے طول دیا اور بلا وجہ اُس شخص کو ناراض کر لیا جو آج اس کوشش میں مصروف ہے کہ تمام ترقی پسند گروہوں کو ملا کر ایک متحدہ محاذ بنایا جائے تو سخت غلطی کا ارتکاب کریں گے۔"[1]

---

[1] ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا۔

دسواں باب

"مسلم رابطۂ عوام" کی تحریک

جب مسٹر جناح کو پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی کی اطلاع دی گئی۔ تو انھوں نے جواب میں صوبائی لیگ کے سیکرٹری کو ذیل کا حوصلہ افزا گرامی نامہ بھیجا:

"ڈیئر مسٹر غلام رسول۔ آپ کا خط ملا۔ میں ممنون ہوں۔ کہ آپ نے پنجاب کی صورتِ حال کو واضح اور مفصل طریق پر بیان کیا ہے۔ سر محمد اقبالؒ کا والا نامہ بھی ملا تھا۔ جس کا جواب میں نے بھیج دیا ہے۔ اس جواب کی ایک نقل آپ کو بھیجتا ہوں۔ میں آپ کی بہادرانہ اور بے باکانہ مساعی کی داد دیتا ہوں۔ آپ کو ناکامی کی پروا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارے معاملے میں پنجاب کی شکست دراصل ہماری فتح ہے۔ یہ کچھ کم نہیں۔ کہ آپ نے پنجاب کی سرزمین میں مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں۔ کہ ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کوئی ذی شعور انسان پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں معجز نمائی

کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور ہمیں تو ایک عظیم الشان مہم درپیش ہے

میں آپ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح"

ہندوستان کے چھ صوبوں کے الیکشن میں کانگرس کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مدراس میں ایوان کی کل نشستیں ۲۱۵ تھیں۔ جن میں سے کانگرس نے ۱۵۹ پر قبضہ کیا۔ بہار میں ۱۵۲ نشستوں میں سے ۹۸ کانگرس کے حصے میں آئیں۔ صوبجاتِ متوسط میں ۱۱۲ میں سے ۷۰، بمبئی میں ۱۷۵ میں سے ۸۶، یو۔ پی میں ۲۲۸ میں سے ۱۳۴۔ اور اڑیسہ میں ۶۰ میں سے ۳۶ نشستوں پر کانگرس کا قبضہ ہو گیا۔ البتہ پنجاب۔ بنگال۔ سرحد۔ سندھ اور آسام میں کانگرس کو ایسی کامیابی نہ ہو سکی۔ پنجاب میں ایوان کی کل نشستیں ۱۷۵ تھیں۔ جن میں سے صرف ۱۸ کانگرس کے حصے میں آئیں۔ بنگال میں ۲۵۰ میں سے ۵۴۔ سرحد میں ۵۰ میں سے ۱۹۔ سندھ میں ۶۰ میں سے ۱۳۔ اور آسام میں ۱۰۸ میں سے ۳۳ نشستوں پر کانگرس قبضہ کر سکی۔

کانگرس کی اس فتح پر ایک نظر ڈالتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ کانگرس کو اُن کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی کل نشستوں کی مجموعی تعداد ۵۰۰ تھی۔ جن میں سے صرف ۲۵ پر کانگرس قبضہ کر سکی اور اِن ۲۵ میں سے ۱۵ نشستیں صوبہ سرحد میں شامل تھیں۔ گویا صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے

برِ عظیم میں کانگرس کو صرف ۱۰ مسلمان اپنے حامی و مددگار مل سکے۔ مدراس میں چار۔ بہار میں چار اور پنجاب میں دو مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ یو۔پی۔ صوبجاتِ متوسط۔ بنگال۔ سندھ۔ اُڑیسہ اور آسام میں ایک مسلمان بھی کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب نہ ہو سکا۔

پنجاب کے کامیاب اُمیدواروں میں ایک تو میاں افتخار الدین تھے۔ جو تحصیل قصور (ضلع لاہور) سے کھڑے ہوئے تھے۔ اور دوسرے چودھری محمد حسن جو لدھیانہ کے دیہی حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ اِن دونوں اُمیدواروں کی کامیابی میں کانگرس کو رتی برابر بھی دخل نہیں تھا۔

میاں افتخار الدین کی کامیابی کے تین اسباب تھے۔ اوّل اُن کی برادری۔ دوم اُن کی دولت اور سوم یہ کہ اُن کا مقابلہ ایک ایسے شخص سے آ پڑا تھا۔ جسے سر سکندر حیات لامحالہ شکست دینا چاہتے تھے۔ میاں افتخار الدین کے مقابلے میں خان بہادر سردار حبیب اللہ تھے۔ جو ۱۹۲۳ء سے مسلسل پنجاب کونسل کے ممبر چلے آ رہے تھے۔ سردار حبیب اللہ سر فضلِ حسین کی پارٹی کے زبردست رُکن تھے۔ اور وزارت سازی میں سر سکندر کے حریف سمجھے جاتے تھے اس لیے سر سکندر کو اُن سے ہمیشہ خطرہ رہتا تھا۔ چنانچہ اِس الیکشن میں سر سکندر نے اپنے سرکاری اثر و رسوخ کو کام میں لا کر سردار حبیب اللہ کو ایک ایسے شخص سے شکست دلائی جو بادی النظر میں کانگرس کا اُمیدوار تھا۔

چودھری محمد حسن کا معاملہ مختلف تھا۔ چودھری صاحب لدھیانہ میں وکیل تھے اور اپنے کردار کی بلندی اور عمل کی بے لوثی کے باعث ہر کہ و مہ میں بے حد مقبول

تھے۔ ضلع کے سرکش حکام کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ عوام کی مدد کرتے تھے۔ غربا کے مقدموں میں بغیر فیس کے، مفت پیروی کرنے سے بھی انہیں دریغ نہ تھا.....

دیانت داری اور اخلاص میں بھی اُن کا پایہ بے حد بلند تھا۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث وہ ہر جگہ عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ یونینسٹ پارٹی نے اُن کے خلاف ایک نہایت معمولی اور بے حیثیت آدمی کھڑا کیا تھا۔ پھر اپنے حلقۂ انتخاب میں چودھری محمد حسن کی برادری بھی خاصی تھی۔ لوگوں میں سیاسیات کا شعور بالکل نہیں تھا۔ اس لیے چودھری صاحب آسانی سے کامیاب ہو گئے۔

الیکشن کے نتائج برآمد ہونے کے بعد۔ جب کانگریس کو اپنی طاقت اور قوت کا احساس ہوا۔ تو پنڈت نہرو نے ۱۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں ایک آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقد کی۔ جہاں ہندوستان کی تمام صوبائی اسمبلیوں کے اُن آٹھ سو ممبروں کو، جو کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، مدعو کیا۔ اس کنونشن میں پنڈت نہرو نے جو تقریر کی۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ گویا اٹھارویں صدی کی مرہٹہ یلغار کی طرح دہلی تک تو ہندوستان کو فتح کر چکے ہیں۔ اور اب عنقریب اپنی فتوحات کا رُخ ایک طرف بنگال و آسام اور دوسری طرف لاہور و پشاور کی طرف پھیرنے والے ہیں۔

فتح و نصرت کے اس نقشہ میں جواہر لال کو صرف ایک محاذ ایسا نظر آتا تھا جو اُن کی یلغار کے سامنے ابھی تک سرنگوں نہیں ہوا تھا۔ وہ محاذ ہندوستان کے مسلمانوں کا تھا۔ اگر اس برعظیم کے مسلمان بھی اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے کانگریس میں

جذب ہو جاتے، تو آج جواہر لال ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ کانگریس کی ساری کوششوں کے باوجود مسلمان اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم تھے۔

تاہم جواہر لال مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے۔ اپنے نطق کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیرا۔ تو فرمانے لگے۔

"ہم لوگ مدت تک اس وہم میں مبتلا رہے۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں سے مفاہمت یا سمجھوتہ کرنے سے مسائل کا تصفیہ ہو جائے گا۔ اس چکر میں پڑ کر ہم نے عوام کو نظر انداز کئے رکھا یہ طرز عمل غلط اور یہ پالیسی بے کار تھی۔ آئندہ ہم کبھی اس طرف رجوع نہیں کریں گے تعجب ہے۔ کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو مسلمانوں کو ایک الگ گروہ تصور کر کے ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ انداز فکر قرون وسطیٰ میں رائج ہو تو ہو۔ موجودہ زمانے میں اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج کل ہر چیز پر اقتصادی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک افلاس، بے کاری اور قومی آزادی کا سوال ہے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہیں، چوٹی کے فرقہ پرست لیڈر ہر وقت جھتے، بکھرے اور بٹوارے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کہ اُن کی قوم کو ملازمتوں میں کتنا حصہ ملے گا۔ اور اسمبلی میں کتنی نشستیں حاصل ہوں گی۔ ان لیڈروں کو چھوڑ کر جب ہم براہ راست عوام سے ملتے ہیں۔ تو ہمیں وہی منتشر کرنے والے مسائل کار فرما نظر آتے ہیں۔ جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ یعنی افلاس، بیکاری

اور قومی آزادی کی لگن۔ اس نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کا بھی یہی طریقہ ہے۔ کہ لیڈروں کو نظرانداز کر کے۔ براہِ راست عوام سے ربط و ضبط پیدا کیا جائے۔

"عہدِ حاضر میں ہمارے ہاں جو حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں، کیا تعلیم یافتہ اور کیا جاہل، اضطراب کی ایک وسیع لہر چل نکلی ہے کوئی اچھی اور معقول قیادت میسّر نہ آنے کی وجہ سے یہ لوگ ہوا کے جھونکے کی طرح، اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس وقت وہ اپنی موجودہ بے بسی کے احساس سے سخت دل گرفتہ ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں نے انھیں سیاسی اعتبار سے سخت کمزور کر دیا ہے۔ اگرچہ برطانوی ملوکیت نے انھیں قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے۔ کچھ نہایت معمولی اور ادنےٰ قسم کی مراعات عطا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

"تمام مسلمان، کیا بڈھے اور کیا جوان، اور کیا اُن کے اخبارات آج اپنے خیالات و اعمال کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اس جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ کہ فرقہ پرستی کی لعنت سے دامن چھڑا کر۔ اپنے آپ کو حرّیت و ترقی کی تحریکوں سے وابستہ کریں۔ وہ دیکھ رہے ہیں۔ کہ کانگرس کے ریلے نے کس طرح ہندوؤں کی فرقہ وارانہ جماعتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر عوام کے دل و دماغ

پر اپنا سکہ بٹھا دیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر مسلمان اُداس اور مغموم ہو رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گویا لاوارث سمجھنے لگے ہیں۔ اُن کا بھی جی چاہتا ہے۔ کہ آج کی کامیابیوں میں حصّہ دار بنیں اور مستقبل کی کامرانیوں میں شریک ہوں۔ نہ صرف کامیابی و کامرانی میں شریک ہوں۔ بلکہ وہ ذمّہ داریوں اور فرائض کا بوجھ اُٹھانے میں بھی شرکت کرنا چاہتے ہیں۔

"اگرچہ الیکشن میں ہمیں ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے حلقوں سے اپنے امیدوار منتخب نہیں کرا سکے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان عوام میں ہم کامیاب و سُرخرو ہیں۔ یہ لوگ یقیناً فرقہ پرستی کی لعنت کو ترک کرنے پر کسی حد تک آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے۔ کہ اِن حالات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور مسلمان عوام، اور اُن کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے۔ ملک کو ہر نوع کی فرقہ پرستی سے پاک کر دیں۔" [1]

قطع نظر اور امور سے۔ جواہر لال نے اپنی تقریر میں یہ بات بالکل دُرست کہی تھی۔ کہ کانگرس کی کامیابی نے ہندوستان کے مسلمانوں میں، ایک ہمہ گیر اُداسی پریشانی اور بے بسی کا احساس طاری کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو گویا لاوارث سمجھنے لگے تھے۔ ہندوستان میں کانگرس کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۳۷ء جلد اوّل۔

اُس کا ایک مرکزی نظام تھا۔ جس کے تحت پشاور سے مدراس تک نہایت طاقت ور شاخوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ کانگرس کے صدر کے ایک اشارے پر یہ پورا نظام حرکت میں آ جاتا تھا۔ اور جگہ جگہ جلسے اور مظاہرے شروع ہو جاتے تھے۔ مسلمان اس قسم کی مرکزیت سے محروم ہو گئے تھے۔ پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور سرحد اگرچہ اُن کی اکثریت کے صوبے تھے۔ لیکن یہاں ہر صوبے میں الگ الگ جماعتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ جن کے درمیان کوئی باہمی ربط و ضبط موجود نہیں تھا۔ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اور کوئی مرکزی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ اندیشہ تھا کہ یہ جگہ جگہ بکھری ہوئی مسلمانوں کی ٹولیاں کانگرس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے اندر بہ جائیں گی۔

اِن حالات میں علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو دو خط لکھے۔ پہلا خط ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا ہے۔ یعنی دہلی کنونشن کی کارروائی پڑھتے ہی۔ اُنھوں نے یہ خط لکھا جس میں فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبۂ صدارت ملاحظہ فرمایا ہو گا۔ جو انھوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے اس خطبے میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُس کو بھی آپ نے بخوبی محسوس کیا ہو گا۔ آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو۔ کم از کم اس بات کا ایک نادر موقع ضرور دیا ہے۔ کہ وہ ہندوستان اور اسلامی ایشیا میں رُونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اپنی

قومی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔

"اس لیے میری رائے ہے۔ کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں۔ جس میں شرکت کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ۔ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تحدی کے ساتھ۔ یہ حقیقت بیان کیجیئے۔ کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ سیاسی ہستی کے مالک ہیں۔ اور اس حیثیت سے اُن کا سیاسی مطمحِ نظر کیا ہے۔

"یہ امر بے حد ضروری ہے۔ کہ اندرون و بیرونِ ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے۔ کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو مسلمانانِ ہند کے لیے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے بہر حال کلچر کا مسئلہ کسی طرح بھی اقتصادی مسئلہ سے کم اہم نہیں ہے۔"

"اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی۔ تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ

اِس طرح اُن مسلمان ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا۔ جنہوں نے مسلمانانِ ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ جماعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی۔ اور وہ اپنی جداگانہ تمدنی ہستی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں چند روز میں دہلی آ رہا ہوں پھر اِس موضوع پر آپ سے زبانی گفتگو ہوگی۔[1]

دوسرا خط ۲۲ر اپریل ۱۹۳۷ء کا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں:

"میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرا وہ خط جو میں نے دم منتے ہوئے لکھا تھا آپ کی خدمت میں پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو دہلی کے پتہ سے بھیجا تھا۔ اور جب میں نے دہلی پہنچ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

" میں نے اُس خط میں یہ تجویز پیش کی تھی۔ کہ ہمیں فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کر کے۔ حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

" حالات نازک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اور بعض ایسے وجوہ سے، جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ پنجاب کے

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (شیخ محمد اشرف)

مسلمانوں کا رجحان بڑی سرعت سے کانگرس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اس لیے میری درخواست ہے۔ کہ آپ جلد از جلد غور فرما کر اس تجویز کا فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو آئندہ اگست تک ملتوی ہو چکا ہے۔ اور ادھر حالات ایسے ہیں کہ مزید انتظار یا تامل کئے بغیر مسلمانوں کی قومی پالیسی کا دوبارہ اعلان کر دینا بے حد ضروری ہے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے چند بڑے بڑے مسلمان لیڈر ملک کا دورہ کر لیں۔ تو کنونشن بہت کامیاب رہے گی"۔ [1]

علامہ اقبال بیمار تھے۔ اور دہلی صرف اس لیے گئے تھے۔ کہ اپنے معالج حکیم نابینا صاحب کو نبض دکھا سکیں۔ لیکن انہیں پنڈت نہرو کی کنونشن سے اس قدر تشویش تھی۔ کہ بڑی شدت اور اصرار سے مسٹر جناح کو بار بار لکھتے ہیں کہ اسی نہج پر خود مسلمان ممبروں کی بھی کنونشن ہونی چاہیئے۔

مسٹر جناح جن مشکلات میں اس وقت گھرے ہوئے تھے۔ ان کا صحیح اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تن تنہا آل انڈیا مسلم لیگ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے مستعفی ہو جانے کے بعد لیگ کا کوئی سیکرٹری نہیں تھا۔ ساری خط و کتابت مسٹر جناح کو خود کرنا پڑتی تھی۔ ان کے پاس کوئی ٹائپسٹ بھی نہیں تھا۔ خطوط اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ پھر ستم یہ ہوا کہ اقلیت کے

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (ریشخ محمد اشرف)

صوبوں میں۔ کانگرس کی عظیم الشان کامیابی نے وہاں کے مسلمانوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ جگہ جگہ یہ آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کہ اب مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ اپنی جداگانہ تنظیموں کو توڑ کر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ خود کانگرسی لیڈر اِس یقین میں مگن تھے۔ کہ اب کوئی دن کی بات ہے یہ جداگانہ انتخاب، یہ فرقہ وارانہ فیصلہ اور یہ اقلیتوں کے تحفظات ختم کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر کانگرس پورے برِّ عظیم کی واحد نمائندہ جماعت بن کر۔ اپنی مرضی اور اپنی شرائط پر برطانوی حکومت سے گفت و شنید کرے گی۔

اِن حالات میں جناح کا سب سے پہلا کام یہ تھا۔ کہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہونے سے بچائیں اور انھیں مرکزیت سے اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ دیں۔ چنانچہ عین جس وقت علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی۔ مسٹر جناح لکھنؤ پہنچ کر اِس کوشش میں مصروف ہو چکے تھے۔ کہ یو۔ پی اسمبلی کے تمام مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیں۔

میرے سامنے اِس وقت ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا روزنامہ سٹیٹسمین ہے جس میں اخبار مذکور کے نامہ نگار کے قلم سے یہ روئداد درج ہے:

"گذشتہ اتوار کو مسٹر جناح نے یو۔ پی اسمبلی کے اُن مسلمان ممبروں سے جو انڈی پنڈنٹ یا نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے مفصل گفتگو کی تھی۔ مسٹر جناح بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں۔ کہ تمام مسلمان ممبر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مسلم لیگ پارٹی کا ایک اجتماع سلیم پور ہاؤس میں ہوا تھا۔ جہاں اسی موضوع

پر دیر تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ آخر رات کے ساڑھے گیارہ بجے مسٹر جناح وہاں سے اٹھ کر نواب سر محمد یوسف کے بنگلہ پر گئے۔ جہاں غیر لیگی ممبر اُن کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر جناح نے اُن کو وہ شرائط پیش کیں۔ جو مسلم لیگ پارٹی نے مرتب کی تھیں آخر کار اس بات پر سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ غیر لیگی ممبر اپنی اپنی جماعتوں سے مستعفی ہو کر۔ اور مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ یہ معاملہ تقریباً رات کے ایک بجے طے ہوا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر مسٹر جناح واپس سلیم پور ہاؤس گئے۔ تاکہ لیگ پارٹی کو یہ خوشخبری سنا سکیں "

غور فرمایئے۔ مسٹر جناح کی عمر۔ اُس وقت ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ انھوں نے ساری زندگی آرام و راحت اور تموّل میں گذاری تھی۔ وکالت کے ابتدائی دو، چار برسوں کی مشقت کے بعد قدرت نے اُنھیں زندگی کی تمام آسائشیں اور نعمتیں بڑی فراخ دلی اور فیاضی سے مہیا کر دی تھیں۔ مدت سے اُن کا معمول چلا آرہا تھا۔ کہ گرمیوں میں سیر و تفریح کے لیے یورپ چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن اب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر، جب قوائے انسانی کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، انھوں نے شب بیداریاں شروع کر دی تھیں۔

پنجاب میں سر سکندر نے اپنی وزارت قائم کر لی تھی جس میں خود اُن کے

علاوہ پانچ آدمی شریک تھے مسلمانوں میں سے ملک خضر حیات ٹوانہ اور میاں عبدالحی۔ ہندوؤں میں سے چودھری چھوٹو رام اور سر منوہر لال۔ اور سکھوں میں سے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ لیے گئے تھے۔ سکھوں کی دو مختلف جماعتیں اسمبلی میں تھیں۔ ایک اکالی پارٹی تھی۔ جس کے دس ممبر تھے۔ اور دوسری کا نام خالصہ نیشنل پارٹی تھا۔ جس کے تیرہ ممبر تھے۔ سر سکندر نے خالصہ نیشنل پارٹی کے لیڈر سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کو اپنی وزارت میں شامل کیا تھا۔ اس کے علاوہ دو سکھ یونینسٹ پارٹی۔ اور چار سکھ کانگرس پارٹی میں بھی شامل تھے۔ سر سندر سنگھ کو وزارت میں جگہ دینے سے یہ بات واضح ہو گئی تھی۔ کہ یونینسٹ پارٹی سکھوں کی نمائندگی کا دعوےٰ نہ کر سکتی تھی۔

ہندو ممبروں میں سے کانگرس کے علاوہ دس آدمی یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے۔ جو تمام کے تمام گوڑگانوہ، رُہتک اور حصار کے جاٹ تھے۔ ان کے لیڈر چودھری چھوٹو رام تھے۔ دس ہندو ممبروں کی ایک الگ جماعت بھی تھی جس کا نام ہندو الیکشن بورڈ پارٹی تھا۔ اس کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ تھے۔ سر منوہر لال کو اسی جماعت کے نمائندے کی حیثیت سے وزارت میں شامل کیا گیا تھا۔ سر منوہر لال کی شرکت اس بات کا ثبوت تھی۔ کہ یونینسٹ پارٹی کلیتہً ہندوؤں کی بھی نمائندگی کا دعوےٰ کرنے کے قابل نہ تھی۔

۸۔ اپریل ۱۹۳۷ء کو پنجاب اسمبلی کے سپیکر کا انتخاب ہونے والا تھا۔ اور علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ چودھری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو کھڑا کیا جائے۔ ڈاکٹر کچلو انڈی پنڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے

منتخب ہوئے تھے۔ اور اپنے ایثار و قربانی اور کردار کی بلندی کے اعتبار سے اسمبلی کے پورے ایوان میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہی ایک شخص تھے۔ جو سیاسی عقائد سے قطع نظر۔ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں میں یکساں مقبول تھے۔ اگر انتخاب میں پارٹی کی بے جا پابندیاں عائد نہ کر دی جاتیں۔ تو خود یونینسٹ پارٹی کے بہت سے ممبر چودھری شہاب الدین کے مقابلے میں ڈاکٹر کچلو کو ووٹ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور چودھری شہاب الدین کامیاب ہو گئے۔

دہلی کی آل انڈیا نیشنل کنونشن کے ختم ہوتے ہی پنڈت نہرو نے اپنی ساری توجہ مسلمانوں کی طرف مبذول کر دی۔ اُن کو اس بات کا وہم ہو گیا تھا کہ مسلمان عوام تو دل سے کانگرس کے ساتھ ہیں۔ یہ محض چند سر پھرے مسلمان لیڈروں کی شرارت ہے۔ کہ انھیں بہکا کر غلط راستے پر ڈال رہے ہیں چنانچہ پنڈت نہرو نے مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کرنے کے بعد۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر دفتر الہ آباد میں ایک الگ محکمہ قائم کر دیا۔ جس کا نام مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹیکٹ) رکھا گیا۔ اس محکمے کے نگراں میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر محمد اشرف مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر اشرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اور بہت معقول تنخواہ لیتے تھے۔ لیکن اپنے سیاسی عقائد اور جذبۂ ایثار کے تحت اُنھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سکرٹریٹ میں صرف چھہتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کر لیا۔

کانگرس کی اس نئی تحریک یعنی مسلم رابطۂ عوام کی غرض و غایت۔ اور

اُس کے طریقِ کار کو اپنی عبارت میں بیان کرنے کی بجائے۔ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ خود جواہر لال کے الفاظ یہاں نقل کر دیئے جائیں۔ تاکہ اصل تصویر سب کی آنکھوں کے سامنے آ جائے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنڈت نہرو نے ہندوستان کی تمام صوبائی کانگرس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔

"الیکشن کے ہنگامے کے دوران میں۔ اور اُس کے بعد بھی ہمارے ہاں اکثر اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی ہے۔ کہ مسلمان عوام کے ساتھ کانگرس کا رابطہ کیونکر اُستوار کیا جائے۔ ہمیں اپنے دورے کے سلسلہ میں جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ مسلمانوں میں اِس بات کی بڑی خواہش پائی جاتی ہے۔ کہ وہ کانگرس کا پیغام سُنیں۔ اور کانگرس کی تحریک آزادی میں شرکت بھی کریں۔ لیکن چونکہ بدقسمتی سے ہم نے مسلمانوں کو اب تک نظر انداز کئے رکھا ہے۔ اور یوں بھی کانگرس میں تجربہ کار مسلمان کارکنوں کا سخت قحط ہے۔ اِس لیے مسلمان عوام کے اِس شوق اور بیداری کا ہم کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔

"اسی وقت سے کانگرس کے بڑے بڑے رہنما اِس مسئلہ پر غور و خوض کر رہے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو کانگرس میں کیوں نہ شامل کیا جائے۔ تاکہ ہماری تحریک آزادی پہلے سے بھی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جائے۔ اور مسلمان اپنی حیثیت اور اہمیت کے

مطابق کانگرس کے کاموں میں حصّہ لے سکیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب ہم ملک کے بنیادی مسائل۔ مثلاً آزادی حاصل کرنے کی تڑپ۔ یا افلاس اور بے کاری کو دُور کرنے کی خواہش پر غور کرتے ہیں۔ تو صاف نظر آتا ہے کہ اِن مشترکہ معاملات میں ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور مسیحیوں میں کوئی باہمی اختلاف نہیں۔ جھگڑا صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب گنتی کے چند بڑے بڑے لیڈر فرقہ وارانہ حقوق کے بٹوارے کی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

"اندریں حالات سب سے مقدم اور ضروری کام یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو کانگرس کا ممبر بنایا جائے۔ جب اُن کی ایک کثیر تعداد کانگرس میں شامل ہو جائے گی۔ تو وہ لوگ خود بخود کانگرس کے کاموں میں حصّہ لیں گے۔ اور اِس طرح اپنی کارکردگی سے کانگرس کی پالیسی پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ میں آپ کی صوبائی کانگرس کمیٹی سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ اس معاملہ پر خصوصیت سے توجہ کرے۔ اور مسلمان ممبر بھرتی کرنے کا کام فوراً تن دہی سے شروع کر دیا جائے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ بے شمار مسلمان کانگرس کی رکنیت قبول کرنے کو تیار ہیں۔ صرف اُن تک پہنچنا آپ کا کام ہے۔

"میری رائے میں ہندوستان کے ہر صوبے کی کانگرس کمیٹی کو چاہیے...

کہ اپنے ہاں مسلم رابطہ عوام کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کرے جس کے نگران اور کارکن شہروں اور دیہات میں پھیل جائیں۔ اور مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کریں۔ ہم اس کے لیے کوئی صاف واضح اور معین لائحہ عمل تجویز نہیں کر سکتا۔ یہ کام آپ کی صوبائی کمیٹی کا ہے۔ کہ مقامی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر جو طریق عمل موزوں سمجھے اختیار کرے۔ بہرحال یہ ضروری ہے۔ کہ مسلمان ممبروں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیا جائے۔ اور کانگرس کے کاموں میں مسلمانوں کی دلچسپی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ کانگرس کے مسلمان ممبر اپنی الگ دلچسپیاں مہیا کریں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مجموعی طور پر کانگرس ایسا پروگرام اختیار کرے جس سے مسلمان بھی خاص دلچسپی کا اظہار کریں۔

" آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر دفتر الٰہ آباد میں اس غرض کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی جملہ صوبائی کانگرس کمیٹیوں میں مسلم رابطہ عوام کی جتنی شاخیں کھولی جائیں گی وہ سب کی سب الٰہ آباد کے مرکزی محکمے کے تحت کام کریں گی۔ مناسب یہی ہے کہ آپ مرکز کو اپنی کارگزاریوں کی باقاعدہ اطلاع بھیجتے رہیں۔ ہم آپ کو اس کام کے لیے مختلف پوسٹر اور پمفلٹ بھی مہیا کرتے رہیں گے۔

" اسی سلسلہ میں ایک اور ضروری گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے

مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔ کہ کانگرس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اُردو میں شائع نہیں کیے جاتے۔ اور اس طرح مسلمانوں کو کانگرس کے جلسوں، جلوسوں کی اطلاع نہیں ہونے پاتی یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے صوبے کی ضلع وار اور مقامی کانگرس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کر دیجئے۔ کہ وہ آئندہ اُردو میں بھی اشتہار شائع کیا کریں۔ بالخصوص پنجاب، یو۔پی اور دہلی کے صوبوں۔ اور ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری ہے!" [1]

جواہر لال نے مسلم ماس کانٹکٹ کا محکمہ قائم کر کے۔ اور کانگرس کمیٹیوں کے نام یہ گشتی مراسلہ جاری کر کے۔ گویا اعلان کر دیا تھا۔ کہ اب کانگرس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی۔ اور اس کے بجائے وہ براہ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی۔ اور انھیں بہلا پھسلا کر۔ ڈرا دھمکا کر۔ ورغلا کر۔ بہکا کر۔ چکمے دے کر اور ہر قسم کے سبز باغ دکھا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی

جواہر لال کے مزاج میں ضد اور تیز زبانی کے علاوہ ایک اور عنصر بھی شامل ہے جس کا نام ہے فریبِ نفس۔ وہ بعض اوقات صاف اور بدیہی حقائق کو دیکھنے سے محض اس لیے انکار کر دیتے ہیں۔ کہ ان کے نہاں خانۂ دماغ میں۔ ان کے تصورات و توہمات نے جو دنیا تعمیر کر رکھی ہے۔ وہ خارجی حقائق سے مختلف ہے۔

---

[1] روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۷ء

ہندوستان کے اچھوتوں کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امبیدکر، پنڈت نہرو کی اس نئی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مسلم رابطہ عوام کی تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے۔ یا اُن سے بے نیاز و بے پرواہ ہو کر۔ عام ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی یگانگت پیدا کی جائے۔ اگر اس تحریک کی تحلیل اور تجزیہ کیا جائے۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا یہ برطانیہ کی قدامت پسند جماعت (کنزرویٹو پارٹی) کا منصوبہ تھا۔ کہ "ٹوریوں کی دولت" سے لیبر پارٹی کو خرید لیا جائے۔ یہ تحریک جتنی فتنہ انگیز تھی۔ اتنی ہی بے معنی بھی تھی۔ کانگرس نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا۔ کہ دنیا میں بعض ایسی گراں بہا چیزیں بھی ہیں۔ جن کا مالک اُن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہونے کے بعد کبھی اُن کو اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اگر کسی طرح دھوکہ اور فریب دے کر۔ اُس شخص سے وہ متاعِ عزیز ہتھیا لی جائے۔ تو سخت رنجش اور کشیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

"قوموں کی زندگی میں سب سے بیش قیمت سرمایہ اُن کا سیاسی اقتدار ہے۔ بالخصوص ایسی قوم کے لیے جسے آئے دن غنیم کے حملوں کا ہدف بننا پڑے اور جسے اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لیے ہمہ اوقات جد و جہد میں مصروف رہنے کی ضرورت پیش آئے

یہ سیاسی قوتِ جان سے بھی زیادہ عزیز چیز ہے۔ یہی سیاسی قوت ایک ایسا حربہ ہے۔ جس سے یہ قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر غلط پراپاگنڈے کے زور سے۔ یا واقعات و حقائق کو مسخ کر کے۔ یا اعزاز و مناصب کا لالچ دے کر۔ یا سیم و زر کی جھلک دکھا کر۔ کسی قوم سے اُس کی سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کی جائے گی۔ تو اِس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ اُس قوم سے گویا حفاظت خود اختیاری کا تمام اسلحہ چھین لیا گیا ہے۔ اور آئندہ اُسے ہمیشہ کے لیے مغلوب و محکوم بنا کر۔ اُس کی خودداری سلب کر لی جائے گی۔

"ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ اِن ہتھکنڈوں سے ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا خیال بالکل غلط اور فساد انگیز ہے۔ مکر و فریب کی ان مکروہ چالوں سے فریقِ مخالف کی آواز کو دبایا تو جا سکتا ہے لیکن اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ اتحاد کی بجائے عداوت، کدورت اور مخالفت کی آگ پہلے سے بھی زیادہ تُندی کے ساتھ بھڑک اُٹھے گی۔ کانگرس کی جاری کردہ تحریک مسلم رابطۂ عوام نے یہ تمام فتنے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لیے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ مسلمانوں میں پاکستان کا تصور پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری اِسی احمقانہ تحریک

کے سر عائد ہوتی ہے"۔ ؎

ڈاکٹر امبیدکر بہر حال سیاسی آدمی تھے۔ اب میں ایک ایسے شخص کی رائے پیش کرتا ہوں۔ جو اہلِ علم کے طبقے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اور جنہوں نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک پر بالکل غیر جانبدارانہ انداز سے غور کیا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

"...... انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد۔ جب کانگرس کو کچھ صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرنے کی امید نظر آنے لگی۔ تو اُس نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمان عوام کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ اِس تحریک کی بنیاد اِس مفروضہ پر تھی۔ کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ اقتصادی اور سیاسی ہے لہذا کانگرس کو سب قوموں کی نمائندہ جماعت بن جانا چاہیئے۔ مسلم لیگ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ کانگرس کے برسرِ اقتدار ہو جانے کے بعد، کیا صوبائی حکومتیں اور کیا مرکز کی وفاقی حکومت دونوں جگہ سے لیگ کو بے دخل کر دیا جائے گا۔ کانگرس کے ہائی کمان کا ضابطہ اِس قدر سخت۔ اور گرفت اِس قدر مضبوط تھی۔ کہ خود کانگرس کے اندر کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہونے کا قطعاً احتمال نہیں تھا۔ اس لیے

؎ "PAKISTAN OR THE PARTITION OF INDIA" By Dr. Ambedkar, Page 337

کولیشن قسم کی وزارتیں بننے کی بھی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

کانگرس کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا۔ کہ اقتصادی اور سیاسی پروگرام کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیئے تاکہ اس طرح مسلم لیگ کے پاؤں کے نیچے سے خود بخود زمین نکل جائے یہ درست ہے کہ کانگرس نے اقتصادی اصلاح کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن کانگرسی لیڈر اِس حقیقت کو فراموش کر گئے۔ کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا"۔ [1]

آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی کی اِس بارے میں رائے ملاحظہ فرمایئے:

"کانگرس نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے۔ ایک اور غلطی کا ارتکاب کیا۔ اِس تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے مسلمان عوام سے براہِ راست درخواست کی جائے کہ وہ کانگرس میں شریک ہو جائیں۔ ظاہر ہے اِس تجویز پر عمل کرنے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ کہ مسلمانوں کا قومی شیرازہ منتشر ہو۔ اور اُن کے انتشار سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کو کانگرس میں جذب کر لیا جائے۔

---

[1] INDIA'S HINDU MUSLIM QUESTION, 1946ء
By BENI PRASAD (Page 74)

"فرض کیجئے کہ ہندوستان کو سوراج مل جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آپ کسی غیر ملک، مثلاً جاپان سے گفت و شنید کرتے ہیں، اس صورت میں جاپان کی حکومت کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ آپ بالا بالا جاپان کے عوام کے پاس جا کر۔ اُن سے معاملہ طے کریں۔ اگر آپ نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی۔ تو جاپانی حکومت یہ کہے گی۔ کہ میں جاپان کے عوام کی نمائندہ ہوں۔ جو کچھ کہنا سُننا چاہتے ہو۔ مجھ سے کہو۔ اور اگر تم نے مجھ کو پس پُشت ڈال کر۔ براہِ راست عوام پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ تو میں تمہارے سفیر کو بیک بینی و دو گوش یہاں سے نکال دوں گی۔" [1]

اِن سب باتوں کے باوجود پنڈت نہرو بدستور اِس فریب میں مبتلا تھے کہ مسلمان عوام دل و جان سے کانگرس کے حامی ہیں۔ بس ایک مرتبہ اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھنے کی دیر ہے۔ وہ خوشی سے لبیک کہتے ہوئے بھاگے آئیں گے۔

مسٹر جناح اب بھی کانگرس سے آبرومندانہ مفاہمت کے خواہاں تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کانگرس اور لیگ کو مل کر حکومت چلانے کا موقع ملے گا تو فرقہ وارانہ رنجشیں ختم ہو جائیں گی۔ ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ آگے بڑھیں گے۔ اور اس طرح ہندوستان کی آزادی

---

[1] "CONGRESS IN OFFICE"
By Dr. C. R. Reddy (Page 60)

کی منزل روز بروز قریب آنا شروع ہو جائے گی۔ اُنھوں نے ۹ر مارچ ۱۹۳۷ء کو ایک اخباری بیان میں کہا :

"ہماری پالیسی بالکل صاف ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ آئین سے چاہے وہ جیسا کچھ بھی ہے، حتی الامکان پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس پالیسی کے اندر رہ کر ہم ہر ترقی پسند جماعت کے ساتھ اشتراک کرنے کو تیار ہیں۔ مسٹر راج گوپال اچاری نے حال ہی میں جس پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ لیگ کی پالیسی اُس سے مختلف نہیں۔ ہم یقیناً یہ چاہتے ہیں۔ کہ مختلف صوبوں میں وزارتیں اور حکومتیں اس طرح چلائی جائیں۔ گویا گورنروں کے خاص اختیارات کا وجود نہیں ہے۔"[1]

۲۰ر مارچ کو انھوں نے پھر فرمایا :

"اس وقت ہم ملک میں قومی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ اور کانگرس کا اتحاد کچھ مشکل نہیں۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ لیگ کا پروگرام قوم پرستی اور وطن دوستی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ہم کانگرس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے۔ اور کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ لیکن اگر کانگرس نے انفرادی طور پر اِکا دُکا مسلمان کو انعام و اکرام

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۳۷ء

کا لالچ دے کر، اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ تو اس کے نتائج چنداں خوشگوار نہیں ہوں گے۔" [1]

مسٹر جناح کے اِس انتباہ کے باوجود کانگرس نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ مسلمانوں میں انتشار پھیلا کر، اُن کی صفوں کو درہم برہم کرے گی۔ چنانچہ سب سے پہلا حملہ یو۔ پی پر ہوا۔ اور تجویز یہ قرار پائی کہ یو۔ پی کی مجلسِ قانون ساز کی کانگرس پارٹی کے جلسے میں۔ اُن مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا جائے۔ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے اور پھر باہمی گفت و شنید کے بعد۔ وہیں اُن سے کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کروا لیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیگ اُس وقت اپنی ترقی و تنظیم کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گذر رہی تھی۔ اور خود مسلمانوں کو اِس بات کا یقین نہیں تھا۔ کہ کانگرس کی روز افزوں طاقت کے سامنے مسلم لیگ ٹھہر سکے گی۔ چنانچہ شکست خوردگی کے اس عالم میں بعض لوگ علانیہ کہنے لگے تھے۔ کہ اب کانگرس سے الگ رہ کر کام کرنا یا زندہ رہنا محال ہے۔

مسٹر جناح تنہا اِس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی کوئی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) نہیں تھی۔ جس کے ممبروں سے بوقتِ ضرورت مشورہ کر لیا جاتا۔ لیگ کے سالانہ اجتماع کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے ہندوستان بھر میں صرف جناح کی ایک آواز تھی، جو اِن حالاتِ نامساعد میں کبھی کبھی بلند ہوتی۔ اور مسلمان یہ محسوس کرتے تھے کہ اُن کی

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء

طرف سے بولنے والا بھی کوئی شخص موجود ہے۔ جب یو۔پی کی کانگرس پارٹی کی مذکورہ بالا سازش کی اطلاع مسٹر جناح کو ملی۔ تو انھوں نے فرمایا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یو۔پی کی کانگرس پارٹی کے ایک اجلاس میں جو ۲/۳ مئی کو ہونے والا ہے۔ بعض ایسے مسلمان ممبروں کو بھی مدعو کیا گیا ہے جو یو۔پی کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ اس چال کی غرض وغایت سے میں بالکل بے خبر ہوں۔ تاہم یہ واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ اگر کسی فرد یا چند افراد نے کسی فریق کے ساتھ۔ یا بحدِ آخر کسی پورے صوبے کے ساتھ بھی۔ کوئی سمجھوتہ کر لیا۔ تو یہ سمجھوتہ عام مسلمانوں کو قطعاً پابند نہیں کر سکے گا۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ کہ اس قسم کی قابلِ اعتراض اور ناپسندیدہ حرکتیں محض اس لیے کی جا رہی ہیں۔ کہ مسلمانوں کی قومی جمعیت میں انتشار پیدا ہو۔ ایسے لوگوں کے ساتھ گفت وشنید کرنا۔ جو جلبِ منفعت کے لیے آج مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ اور جنھیں اپنے ذاتی مفاد کے لیے۔ کل کانگرس میں شامل ہونے سے بھی دریغ نہیں۔ قطعاً سود مند نہیں۔

" مجھے یقین ہے کہ یو۔پی کے مسلمان اس نازک وقت میں مسلمانانِ ہند سے غداری نہیں کریں گے۔ فریقِ ثانی کے ساتھ محض چند افراد کا سمجھوتہ، ہر چند کہ اس سے دو ایک آدمیوں کو ذاتی فائدہ پہنچنے کا امکان بھی کیوں نہ ہو، ہمارے قومی مسائل کا حل نہیں ہے۔ یو۔پی

اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر خلیق الزمان نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اپنے ہاں کے حالات سے مجھے مطلع کریں گے۔ میں اُن کو اس سلسلہ میں کئی بار یاد دہانی بھی کرا چکا ہوں۔ لیکن گذشتہ تین ہفتوں کے مسلسل انتظار کے باوجود انھوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں اُن کی اس پُر اسرار خاموشی کا مطلب سمجھنے سے معذور ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ فریقِ ثانی کے ساتھ ایسی کوئی مفاہمت نہیں کریں گے جسے انجام کار اُن کے صوبے ہی کے مسلمان نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان رُد کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

"محض چند متفرق افراد یا چند افراد کے کسی گروہ کے ساتھ قومی مسائل کے تصفیے کی گفت و شنید کرنے کا نتیجہ سوائے اِس کے اور کچھ نہیں نکلے گا۔ کہ مسلمان قوم کی پوری جمعیت کو درہم برہم کر کے اُسے مختلف گروہوں اور صوبائی حد بندیوں میں تقسیم کر دیا جائے"۔[1]

چھ صوبوں میں کانگرس کی واضح اکثریت کے باوجود آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے فیصلہ کر دیا تھا۔ کہ جب تک اِن صوبوں کے گورنر صاف، واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے۔ کہ وہ اپنے اُن اختیارات کو، جو از روئے آئین اُنھیں حاصل ہیں، استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے۔ کانگرس اِن چھ صوبوں میں وزارتیں مرتب نہیں کر سکے گی۔ وہ خاص اختیارات کیا تھے؟ صرف یہ کہ گورنر

---

[1] منقول از "نیو ٹائمز"۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۷ء

اس بات پر نگاہ رکھے۔ کہ اکثریت کے ہاتھ سے اقلیت کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔ اور اگر کسی صوبے کی وزارت اپنی اکثریت کے زعم میں۔ کوئی ایسا قانون نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ جس سے اقلیت کے حقوق کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو تو گورنر بطور مصلحت اُس قانون کے نفاذ کو روک سکے۔

میری رائے ہے کہ اس بارے میں گورنر مجبور تھے۔ اُن کے اختیاراتِ خصوصی ۱۹۳۵ء کے دستور کا ایک جزو تھا۔ جس سے چشم پوشی یا صریح انکار آئینی لحاظ سے بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وائسرائے اور وزیرِ ہند دونوں نے کانگرس کے اس مطالبہ کو ناجائز قرار دے کر۔ اِس قسم کا وعدہ کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگرس نے، اپنی اکثریت کے باوجود، وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور ایک نئی کشمکش پیدا ہو گئی۔ جو مسلسل تین مہینے چلتی رہی۔ بالآخر، ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو وائسرائے کے ایک بیان سے مطمئن ہو کر کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے صوبائی وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ وائسرائے نے اپنے اِس بیان میں اگرچہ صاف، واضح اور قطعی الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ صوبوں کے گورنر اپنے اختیاراتِ خصوصی استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے لیکن انھوں نے اتنا ضرور کہہ دیا تھا۔ کہ صوبائی نظم و نسق کی حقیقی ذمہ داری وزیروں پر عائد ہوتی ہے۔ اور گورنر ایک آئینی حکمران کی حیثیت سے وزارت کے فیصلے کا پابند سمجھا جائے گا۔ باقی رہا اختیاراتِ خصوصی کا دائرہ۔ اِس دائرہ میں گورنر حتی الوسع یہی کوشش کرے گا کہ اُس کے اور صوبائی وزیروں کے درمیان کوئی غیر ضروری نزاع پیدا نہ ہونے پائے۔

مسٹر جناح نے کانگرس کے اس تازہ فیصلے کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور فرمایا:

"میں خوش ہوں۔ کہ کانگرس نے صوبائی وزارتیں مرتب کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں تو گذشتہ ڈیڑھ سال سے بار بار یہ کہہ رہا ہوں۔ کہ بحالاتِ موجودہ صوبائی آئین پر کاربند ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جہاں تک اپنے ابنائے وطن کا سوال ہے۔ کانگرس اپنے راستے میں کسی بیکار اور غیر ضروری وقار کے احساس کو حائل نہیں ہونے دے گی اور صوبوں کی مجالسِ قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ بخوشی اشتراک و تعاون کرے گی۔ میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ ہمارا ہاتھ جو دوستی، تعاون اور اخوت کا ہاتھ ہے۔ ہر وقت حاضر ہے۔ ہم کانگرس کے ہر اس پروگرام میں شریک ہونے کو تیار ہیں۔ جس کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہے۔ خواہ وہ پروگرام مجالسِ قانون ساز کے اندر رہ کر چلایا جائے۔ یا مجالسِ قانون ساز کے .... باہر اس کا نفاذ کیا جائے۔ آج ہندوستان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔"[1]

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۳۷ء

جناح کی نیک نیتی، خلوص، حبِ وطن اور سیاسی دور اندیشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ کہ وہ بار بار اپنا ہاتھ کانگرس کی طرف بڑھاتا ہے۔ اور دوستی تعاون، اخوت اور متحدہ محاذ کا واسطہ دے دے کر درخواست کرتا ہے۔ کہ آؤ ہم سب مل کر اپنے وطنِ عزیز کی خدمت کریں۔ آؤ! ایک مشترکہ پروگرام بنائیں جس سے عوام کی مصیبتیں رفع ہوں۔ آؤ! ایک ایسا محاذ قائم کریں۔ جہاں ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ کھڑے ہو کر بدیشی حکومت کا مقابلہ کر سکیں۔

ہندوستان کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ کانگرس نے طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر۔ جناح کی اس پیش کش کو رد کر دیا۔ اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے ارمغانِ اخوت کو ٹھکرا دیا۔ کانگرسی لیڈر مسلم رابطہ عوام کی تحریک میں مست تھے اور خیال کر رہے تھے۔ کہ اب جناح سے بات کرنا بے سود ہے۔ عنقریب خود مسلمان جناح کی قیادت کو رد کر کے۔ کانگرس کے حلقہ بگوش بن جائیں گے۔

مسلم رابطہ عوام کی تحریک کا پہلا ثمر یہ تھا۔ کہ کانگرس نے فیصلہ کیا کہ اگر مسلمانوں کے کسی حلقے میں ضمنی انتخاب ہوا۔ تو وہ پورے جوش و خروش سے اپنا امیدوار کھڑا کر کے مسلم لیگ کا مقابلہ کرے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا معرکہ بہرائچ (یو۔ پی) میں ہونے والا تھا۔ جہاں سے عام انتخاب میں مسلم لیگ کے ایک ممبر ٹھاکر اصغر علی کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں داخل ہونے سے قبل ہی فوت ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بیّن انداز میں فرمایا تھا۔ کہ یہ نشست مسلم لیگ کی ہے۔ اور ہم اسے اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

"بہرائچ کی نشست مسلم لیگ نے جیتی تھی۔ لیکن مجھے سخت افسوس ہے کہ جو ممبر اس حلقے سے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہمیں اس نشست پر لازماً قبضہ کرنا چاہیئے۔ اس لیے ہم نے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ کانگرس بھی اس حلقے سے اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر کانگرس نے ایسا کیا تو وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرے گی۔ اب چونکہ آئین جدید کو توڑنے کی شق کانگرس کے پروگرام سے خارج ہو چکی ہے۔ اس لیے مسلم لیگ اور کانگرس کے پروگرام میں عملاً کوئی فرق باقی نہیں رہا۔" [1]

مسٹر جناح کے اس واضح اور غیر مشتبہ اعلان کے باوجود کانگرس نے اپنے ٹکٹ پر رفیع احمد قدوائی کو بہرائچ کے اس ضمنی انتخاب میں کھڑا کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ یو۔پی مسلم لیگ نے کانگرس کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلم لیگ کی یہ سو فی صد یقینی نشست بلا مقابلہ کانگرس کے حوالے کر دی۔

یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ یو۔پی مسلم لیگ نے اپنی جیتی ہوئی نشست کیوں مفت میں کانگرس کی جھولی میں ڈال دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت عام طور پر یہ افواہ مشہور تھی۔ کہ چودھری خلیق الزمان کی در پردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی

---

[1] نیو ٹائمز۔ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۷ء

کامیاب ہوئے ہیں - اور چودھری خلیق الزماں ہی کے ایما سے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا -

چونکہ اس واقعہ کو بیس بائیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے اس لیے یہ کتاب لکھتے وقت مجھے اندیشہ ہوا - کہ مبادا میرے ذہن سے بعض باتیں نکل گئی ہوں چنانچہ میں نے ڈاکٹر اشرف کو دہلی خط لکھ کر اس بارے میں مزید تصدیق کی - انھوں نے جواب دیا - کہ :

"رفیع احمد قدوائی عام انتخابات کے بعد ایک حلقے سے چنے گئے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے اُن کی مخالفت نہیں کی تھی - خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کی کامیابی میں خلیق صاحب کو بھی دخل تھا"

اسی طرح الہ آباد کے حاجی سید محمد حسین نے، جو اُس زمانے میں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے، اپنے ایک طویل بیان میں جو اپریل ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں ہندوستان کے بعض روزانہ اخبارات میں شائع ہوا تھا - چودھری خلیق الزماں پر یہی الزام عائد کیا تھا [۱]

بہرحال اس سے بحث نہیں - کہ کس شخص کے ایما سے مسلم لیگ نے اپنا امیدوار کھڑا نہ کیا - یا کس شخص کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے - واقعہ یہ ہے - کہ رفیع قدوائی کے اسمبلی میں داخل ہو جانے کے بعد سیاسیات نے ایک ایسا رخ بدلا تھا - جو ہر اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے پریشان کن

---

[۱] لیڈر - مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۷ء

اور مسلم لیگ کے لیے نقصان رساں ثابت ہوا۔[1]

جولائی ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں ایک اور ضمنی انتخاب یو۔پی میں ہوا۔اب کی یہ معرکہ جھانسی میں تھا۔یہاں کانگرس نے نثار احمد شروانی اور مسلم لیگ نے رفیع الدین کو کھڑا کیا تھا۔مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی ہوئی۔اور نثار شروانی کم و بیش ایک ہزار ووٹ سے ہار گئے۔

لیگ اور کانگرس کی اس باہمی کشمکش سے دونوں فریقوں میں بدمزگی بڑھنے لگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے جس متحدہ محاذ کا خواب مسٹر جناح نے دیکھا تھا وہ اس روز افزوں کشمکش میں پریشان ہوتا نظر آرہا تھا۔بعض دردِ دل رکھنے والے لوگوں نے اخبارات کے ذریعے سے پنڈت نہرو کو تنبیہہ کی۔کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔رابطۂ عوام کی تحریک بند کر دو۔اور براہِ راست مسٹر جناح سے مفاہمت کر لو۔لیکن افسوس کہ اِس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہُوا۔

مئی ۱۹۳۷ء میں مسلم رابطۂ عوام کی تحریک نے پنجاب کا رُخ کیا۔اُس کی

---

[1] رفیع احمد قدوائی کے مقابلے میں مُسلم لیگ کا اُمیدوار نہ کھڑا کرنے کا جو سبب چودھری خلیق الزمان صاحب نے اپنی انگریزی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں بیان فرمایا ہے۔وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے۔اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ چودھری صاحب نے یو۔پی کی کانگرس کمیٹی کے ایما پر مُسلم لیگی اُمیدوار کھڑا کرنے سے انکار کیا تھا تاکہ رفیع قدوائی بلا مقابلہ کامیاب ہو سکیں۔حالانکہ یہی رفیع قدوائی عام انتخابات میں کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہو کر شکست کھا چکے تھے۔

صورت یہ ہوئی۔ کہ خالد لطیف گابا چونکہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے اس لیے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں اُن کی نشست خالی ہو گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس نشست کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا کی شخصیت عظمت اور قومی خدمات کے پیشِ نظر پنجاب کے کسی مسلمان کو اُن کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہو سکی۔ امرتسر کے شیخ محمد صادق بیرسٹر اور شیخ حسام الدین بھی اِس نشست کے امیدوار تھے۔ لیکن جونہی اُنھیں معلوم ہوا۔ کہ مولانا کھڑے ہو رہے ہیں۔ ان دونوں نے اپنے نام واپس لے لیے۔

البتہ اس موقع پر انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ، کانگرس آگے بڑھی اور اُس نے مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے میں اپنا اُمیدوار کھڑا کر دیا۔ یہ اُمیدوار کون تھا؟ سُنیئے۔ لاہور میں ٹمپل روڈ پر ایک بزرگ خان بہادر میاں چراغ الدین رہتے تھے۔ جو نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ایک ریٹائرڈ افسر تھے۔ اُن کے صاحبزادے میاں عبدالعزیز کانگرس کے اُمیدوار بن کر سامنے آ گئے۔ خان بہادر میاں چراغ الدین ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ جن کے پورے خاندان کو سیاسیات سے دُور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ میاں عبدالعزیز ٹھیکیداری کرتے تھے۔ اور بہت مال دار آدمی تھے تعلیم کے لحاظ سے وہ مڈل پاس بھی نہیں تھے۔ متموّل رئیس ہونے کی وجہ سے بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ اور کچھ ہی تھوڑا عرصہ قبل آنریری مجسٹریٹ بننے کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ میاں عبدالعزیز کو یکایک اِس اَمن پسند اَچھوتے اور سرکار پرستی کے خول سے نکالنے اور مولانا ظفر علی خاں کے مقابلے پر کانگرسی امیدوار بنا دینے کا سہرا میاں افتخار الدین کے سَر تھا۔

میاں افتخار الدین اُس زمانے میں نئے نئے کانگرس میں شامل ہوئے تھے۔ اور حُسنِ خدمات کے بدلے میں جواہر لال سے جلد از جلد خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میاں عبدالعزیز چونکہ ارائیں تھے۔ اس لیے میاں افتخار الدین نے یہی مناسب خیال کیا کہ سب سے پہلے اپنی ہی برادری پر سیاسی ڈاکہ ڈالیں چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال سے کہہ سُنکر میاں عبدالعزیز کو کانگرس کا ٹکٹ دلوا دیا۔ مجھے پختہ یقین ہے۔ کہ گوپی چند بھارگو اور ستیہ پال اِس واقعہ سے قبل۔ میاں عبدالعزیز کے نام، کام اور شکل و صورت سے بھی واقف نہ تھے۔ خود میاں افتخار الدین کی اُس وقت حالت یہ تھی۔ کہ صرف دو سال قبل اپنی تعلیم ختم کرکے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ اور سن و سال کے اعتبار سے ہنوز اُسی منزل میں تھے جسے بقول شخصے "جوانی کی راتیں مرادوں کے دن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ سیاسیات کے اُتار چڑھاؤ، مسلمانوں کے قومی مزاج، اور مولانا ظفر علی خاں کے شاندار ماضی سے قطعاً بے خبر تھے۔ اسی لیے اُن سے ایسی حرکت سرزد ہو گئی۔ جس سے پُورے پنجاب کے مسلمانوں کا سر شرم و ندامت سے جُھک گیا۔ اور مسلمہ غم و غصہ کا محشرستان بن گیا۔

پنجاب کی ساری ارائیں برادری نے متفقہ طور پر مولانا ظفر علی خاں کی امداد کا وعدہ کیا۔ اور کانگرس کے فریب خوردہ لیڈروں کو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ قبائلی عصبیت کے نام سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق کا بیج نہیں بو سکیں گے۔ اِدھر علامہ اقبال نے خان بہادر میاں چراغ الدین کو بار بار پیغام بھیجا کہ خدارا اپنے صاحبزادہ کو سمجھایئے کہ ہندوؤں کا آلہ کار نہ بنے۔ میاں چراغ دین بڑے ہوش مند بزرگ تھے۔ انھوں

نے فوراً ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ رسمی طور پر چند آدمیوں کا ایک بورڈ بنا دیجئے۔ جو مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کے معاملے میں ثالث یا بجیر بن کر فیصلہ کرا دے۔

ظاہر ہے میاں عبدالعزیز تو اس غیر مساوی مقابلے سے دست بردار ہونے کو بالکل آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اُن کی یہ خواہش بے جا نہ تھی کہ اس قسم کا ایک ثالثی بورڈ بن جائے۔ جو فریقین میں تصفیہ کرا دے چنانچہ علامہ اقبال نے ملک برکت علی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء اور بیگم شاہ نواز پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا۔ جس نے اپنا فیصلہ مولانا ظفر علی خاں کے حق میں صادر کیا۔ اور وہی انجام کار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔[1]

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد نے اِس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا ہے کہ "مولوی ظفر علی اگر چلے گئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ عبدالعزیز چلے گئے تو کون سی جیت ہو جائے گی ؟ پہلے "علامہ" کیا ہو گئے تھے تو کون سا انقلاب رُونما ہو گیا تھا؟ علاوہ بریں کسی ایک انتخاب کی کامیابی و ناکامی سے صورتِ حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا (نقشِ آزاد صفحہ ۱۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ مُسلم رابطۂ عوام کی تحریک مولانا ابوالکلام اور جواہر لال کے باہمی مشورے سے جاری کی گئی تھی جس کو معرضِ عمل میں لانے کی اہم ترین شق یہ تھی کہ اسمبلیوں کے ہر ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرس کے امیدوار کھڑے کئے جائیں۔ مسٹر جناح بار بار کانگرس سے کہتے تھے کہ مسلمانوں کے حلقوں میں امیدوار

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کانگرس کی اِس حرکت سے دو فائدے یقیناً ہوئے۔ ایک یہ کہ جہاں تک مسلمان عوام سے رابطہ اُستوار کرنے کا تعلق تھا۔ کانگرس کی جہالت، خود فریبی اور ابن الوقتی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹا۔ جو جماعت اپنے آپ کو انقلاب کی حامی اور برطانوی ملوکیت کی دشمن ظاہر کرتی تھی، اور جس کا دعوےٰ تھا۔ کہ وہ مفلس و پس ماندہ عوام کی رہنمائی کرتی ہے۔ اُس نے اسمبلی کے انتخاب میں مولانا ظفر علی خاں ایسے بطلِ حریت کے مقابلے میں اُس شخص کو اپنا ٹکٹ دیا، جو ابھی چند مہینے قبل آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ جسے عوامی یا سیاسی زندگی سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور جس کی سب سے بڑی

مت کھڑے کرو۔ اس طرح بدمزگی اور بدمزگی سے بڑھ کر مخالفت پیدا ہو گی۔ لیکن کانگرس کو ضد تھی کہ ہم مسلم لیگ کو نیچا دکھانے اور اُس سے مسلمانوں کی نمائندگی کا پروانہ چھیننے کے لیے اپنے اُمیدوار ضرور کھڑے کریں گے۔ حافظ محمد ابراہیم کے اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ضمنی انتخاب سے لے کر آخر وقت تک کانگرس شدت سے اس پالیسی پر کاربند رہی۔ مولانا ابوالکلام اِس پالیسی کی رُوح رواں تھے۔ اور سب کچھ اُنھی کے ایما سے ہو رہا تھا۔ تعجب ہے یہی مشورہ اُنھوں نے کانگرس کو کیوں نہ دیا کہ "مولوی ظفر علی اگر چلے گئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ عبدالعزیز چلے گئے تو کون سی جیت ہو جائے گی؟ علاوہ بریں کسی ایک انتخاب کی کامیابی و ناکامی سے صورتِ حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

خوبی یہ تھی کہ دولت مند تھا۔ اور کانگرس اُس کی دولت کی آڑ میں اپنا داؤ کھیلنا چاہتی تھی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا۔ کہ سر سکندر نے صریحاً محسوس کر لیا۔ کہ اگر کانگرس کی نئی تحریک یعنی رابطہ عوام نے مسلمان قوم کے گھر میں نقب لگائی۔ تو یونینسٹ پارٹی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یونینسٹ پارٹی ایک مخلوط جماعت تھی۔ جو ایک خاص قسم کے اقتصادی پروگرام پر قائم کی گئی تھی۔ اُدھر کانگرس بھی ایک مخلوط جماعت ہونے کا دعوے کرتی تھی۔ جس کا پروگرام اقتصادی اور سیاسی تھا۔ دونوں جماعتیں اپنے آپ کو فرقہ پرستی سے بالاتر سمجھتی تھیں۔ ظاہر ہے کانگرس اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی مقابلہ میں۔ یونینسٹ پارٹی کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسی لیے جب کانگرس نے پنجاب کے مسلمانوں پر یہ پہلا حملہ کیا۔ تو سر سکندر نے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ اس معرکے میں صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کو بچا سکے گی چنانچہ مولانا ظفر علی خاں اور میاں عبدالعزیز کی اس چپقلش کے دوران میں سر سکندر کے آدمی بار بار اُن کا پیغام لے کر ہمارے دفتر میں آتے رہے۔ اور سر سکندر نے۔ اس سلسلہ میں ملک برکت علی سے خود ملنے اور مشورہ کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا نتیجہ برآمد ہونے۔ اور صوبائی وزارت بن جانے کے بعد۔ جب فضا کسی قدر صاف ہوئی۔ تو ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ اس صوبے میں مسلم لیگ کی حیثیت کیا ہوگی۔ کیا لیگ محض اُوپر کے طبقے کے لوگوں کا ایک ادارہ بن کر رہ جائے گی۔ یا کسی عوامی جماعت کی صورت اختیار

کرے گی ؟

الیکشن کے دوران میں ہم نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ مسلم لیگ کا عوام کے ساتھ کوئی ربط وضبط نہیں تھا اور اکثر وبیشتر لوگ لیگ کے نام اور کام سے بالکل ناآشنا تھے۔ حالات اس سُرعت سے بدل رہے تھے۔ اور واقعات کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی تھی۔ کہ اب کسی سیاسی جماعت کا عوام سے الگ تھلگ ہو کر رہنا قطعاً ناممکن تھا۔ مشکل یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی نظام اُس وقت تک منظم نہیں ہوا تھا۔ اور خود مسٹر جناح کی مصروفیتیں اس قدر زیادہ تھیں۔ کہ وہ ہنوز اس کام کی تفصیلات وجزئیات کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم علامہ اقبال کی رائے اس بارے میں بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ لیگ کو جلد از جلد ایک عوامی ادارہ بن جانا چاہیئے۔ اور لیگ کی آواز کا ایک ایک بچے تک پہنچ جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اِس سلسلہ میں ۲۸ رمئی ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو بھی لکھا تھا کہ :

" ...... لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا۔ کہ کیا وہ بدستور ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی۔ یا اُن مسلمان عوام کے ایک اجتماعی ادارے کی صورت اختیار کرے گی۔ جنھوں نے اب تک، بعض معقول وجوہ کی بنا پر۔ لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اُس سیاسی جماعت کے زندہ رہنے کا اب کوئی امکان نہیں جو عامۃ المسلمین کی حالت سُدھارنے یا اُن کی فلاح وبہبود کے کاموں

کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرتی ہے ...... اگر لیگ نے مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ نہ کی۔ تو مجھے یقین ہے۔ کہ مسلمان عوام بدستور سابق لیگ سے بے تعلق اور غافل رہیں گے"۔ [1]

انہی خیالات کے پیشِ نظر علامہ اقبالؔ نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں، مسلم لیگ کے چند کارکنوں کو اپنے دولت کدے پر بلایا۔ اور بعض امور کے متعلق مشورہ کرنے کے بعد۔ صوبائی لیگ کے جنرل سیکرٹری کو تاکید کی۔ کہ پنجاب کے مختلف شہروں کا فوراً دورہ شروع کر دیا جائے۔ تاکہ جگہ جگہ لیگ کی مقامی شاخیں قائم کی جا سکیں۔

۲۲ اپریل کو غلام رسول خاں نے پنجاب صوبائی لیگ کا ایک اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں کیا۔ جہاں ملک زمان مہدی خاں کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا فرض تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی ضلع وار اور مقامی شاخیں قائم کرنے۔ اور عوام سے لیگ کا ربط و ضبط بڑھانے کی ایک جامع سکیم جلد از جلد مرتب کرے۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں یہ سکیم مرتب ہو گئی۔ جسے علامہ اقبالؔ نے منظور فرمایا اور مئی کے دوسرے ہفتے سے ہم نے پنجاب کا دورہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں بہت سی مشکلات سدِ راہ تھیں۔ سب سے بڑی مشکل روپے کی کمی تھی۔ دوسری

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

مشکل یہ تھی۔ کہ ہم میں سے کوئی شخص پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور سیاستدان نہیں تھا ہر ایک کو اپنی اپنی روٹی کمانے کا دھندا درپیش تھا۔ اور عام لیڈروں کی طرح مسلسل دو دو تین تین ہفتے سفر میں رہنا۔ ہمارے لیے بالکل ناممکن اور خارج از بحث تھا۔ تاہم جون کے آخر تک ہم نے امرتسر۔ جالندھر۔ فیروزپور۔ رہتک۔ لدھیانہ پانی پت۔ انبالہ۔ جہلم۔ کیمبل پور۔ گوڑگانوہ کا دورہ کر لیا۔ اور ان مقامات پر لیگ کی ضلع وار مقامی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ اس دورے میں میاں فیروزالدین احمد مرحوم (خادمِ خلافت) بے حد مفید اور کارآمد ساتھی ثابت ہوئے۔ وہ برسوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے ہمراہ رہ کر۔ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے طور طریقوں سے خوب واقف ہو چکے تھے۔

جولائی کے شروع میں میں اور ملک برکت علی ڈلہوزی چلے گئے۔ زمان مہدی اپنے گاؤں تشریف لے گئے۔ غلام رسول خاں کا ارادہ تھا کہ جولائی کا مہینہ لاہور میں ٹھہر کر اگست میں کشمیر چلے جائیں گے۔ ہمیں ڈلہوزی گئے ہوئے مشکل سے دو ہفتے گذرے تھے کہ غلام رسول خاں کا تار گیا۔ کہ فوراً لاہور پہنچو۔ ہم واپس لاہور آئے تو معلوم ہوا کہ فلسطین کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو رائل کمشن مقرر کیا تھا اُس کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے۔ جس میں کمشن نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی ہے۔ علامہ اقبال اس فیصلے سے سخت مغموم اور رنجیدہ تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ فوراً لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کر کے اس تجویز کی مخالفت کرے۔ خود علامہ مرحوم نے رائل کمشن کے اس فیصلے کے خلاف ایک زبردست بیان انگریزی میں لکھا تھا اور آپ کا ارشاد تھا۔ کہ یہ بیان جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا

جائے۔

عجیب اتفاق ہے کہ اب تک مسلم لیگ کے اہتمام سے لاہور میں کوئی جلسۂ عام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ یہ جلسہ جو ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء کو ملک برکت علی کے زیرِ صدارت موچی دروازے کے باغ میں منعقد ہوا۔ لیگ کی عوامی تحریک کا سب سے پہلا اور بڑا کامیاب جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں فلسطین کے متعلق برطانوی حکومت کے رویے کی مذمت کرنے کے علاوہ حکومتِ پنجاب سے آغا عبدالکریم شورش اور مولانا عبدالکریم آصف کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

شورش میرے کرم فرمائے قدیم ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے اپنی زبانِ قلم و زبانِ دہن کو میرے خلاف استعمال کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن انھیں شاید یہ حقیقت معلوم نہیں۔ کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اُن کی قید و بند کے خلاف پہلی اور آخری مرتبہ جو صدائے احتجاج بلند ہوئی تھی۔ وہ قرار داد میں نے ہی پیش کی تھی۔

فلسطین کے متعلق علامہ اقبال کا بیان آج بلاشبہ "تبرکات" میں شامل کرنا چاہیے۔ یہ بیان اُن کی زندگی کے آخری سال کی اہم ترین تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے اصل بیان انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن جلسۂ عام میں غلام رسول خاں نے اُس کا اُردو ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ انگریزی بیان سوائے ٹیوٹائمز کے اور کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اب اُس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

"میں آپ لوگوں کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں۔ کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے۔ میں اُس کو اسی شدت سے محسوس کرتا ہوں جس شدت سے ہر وہ شخص اُسے محسوس کرتا ہے۔ جسے مشرقِ قریب

کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے نہیں گذرنے پایا۔ اور انگریز قوم کو بیدار کر کے۔ اِس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اُن وعدوں کو پورا کرے، جو اُس نے انگلستان کے نام پر عربوں کے ساتھ کئے تھے۔ بہر حال یہ امر کسی حد تک موجبِ اطمینان ہے۔ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اِس موضوع پر، حال ہی میں جو بحث ہوئی ہے۔ اُس میں تقسیمِ فلسطین کے مسئلے کا کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا گیا۔ لہذا اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانانِ عالم کو چاہیئے۔ کہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کریں۔ کہ برطانیہ کے مدبّرین جس عُقدے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُس کا تعلق صرف فلسطین تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک، پورے عالمِ اسلام کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے۔

"اگر تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ یہ معاملہ خالصتہً اور کلیتہً مسلمانوں کا معاملہ ہے تاریخ اِس بات پر شاہد ہے۔ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ بیت المقدس تشریف لے گئے تھے ـــــ اور اِس واقعہ پر بھی آج تیرہ سو برس کا عرصہ گذر چکا ہے ـــــ تو اُن کی تشریف آوری سے مدتوں پہلے یہودیوں کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہودیوں کو فلسطین سے زبردستی نہیں نکالا گیا تھا۔ بلکہ جیسا کہ پروفیسر ہاکنگز کی رائے ہے، وہ اپنی خوشی سے دوسرے ممالک میں

پہلے گئے تھے۔ اور اُن کے صحفِ مقدس کا بیشتر حصہ بھی فلسطین سے باہر ہی قلم بند کیا گیا تھا۔ یہ بھی امرِ واقعہ ہے۔ کہ فلسطین کا سوال کبھی مسیحیوں کا مسئلہ نہیں بنا تھا دورِ حاضر کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں تو راہب پیٹر کا وجود بھی مشتبہ اور غیر یقینی نظر آنے لگا ہے۔ اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ صلیبی جنگوں کی غرض وغایت یہ تھی۔ کہ فلسطین کو مسیحی مسئلہ بنایا جائے۔ تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ صلاح الدین کی فتوحات نے ایسی تمام کوششوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا۔ لہٰذا میری نگاہ میں فلسطین کا مسئلہ سراسر اور کلیتہً مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔

"مشرقِ قریب کے مسلمانوں کے بارے میں۔ برطانوی شہنشاہیت کے مذموم ارادوں کو جس بری طرح رائل کمشن نے اس رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے۔ اس کی مثال پہلے کبھی نظر نہیں آئی فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس مقدس اور مذہبی سرزمین پر۔ اپنا مستقل انتداب قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لیے ایک بیٹھنے کا ٹھکانہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ اقدام ایک خطرناک تجربہ ہے۔ اور برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے بھی اس کو خطرناک تجربے ہی سے تعبیر کیا ہے۔ بحرِ روم میں برطانیہ کو جو مشکلات درپیش ہیں۔ یہ تجربہ ان کو رفع نہیں کر سکے گا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کہ ان مشکلات کو رفع کرتے

کی جائے۔ یہ تجویز برطانوی شہنشاہیت کے لیے بہت سے نئے مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

۵۔ عربوں کو جس جس طریقے سے تنگ کر کے اپنی ارضِ مقدس جس پہ مسجدِ عمرؓ قائم ہے، فروخت کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو مارشل لا جاری کر دینے کی سخت دھمکیاں ہیں اور دوسری طرف عربوں کی قومی فیاضی اور اُن کی روایتی مہمان نوازی کے جذباتِ لطیف کو برانگیختہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طرزِ عمل گویا اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ برطانوی تدبّر کا اب دیوالہ نکل چکا ہے۔ یہودیوں کو زرخیز اراضی کی پیش کش کر کے۔ اور عربوں کو پتھریلی بنجر زمین کے ساتھ کچھ نقد رقم دے کر راضی کرنے کی کوشش قطعاً کسی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادنےٰ درجے کی حقیر سودے بازی ہے۔ جو یقیناً اُس عظیم الشان قوم کے لیے موجبِ ننگ اور باعثِ شرم ہے۔ جس کے نام پر عربوں سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ اُن کے درمیان ایک مشترکہ و متحدہ وفاق قائم کر دیا جائے گا۔

۶۔ میں اس مختصر سے بیان میں رائل کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کرنے سے معذور ہوں۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی ایشیا کو زمانۂ حال کی تاریخ سے بعض بے حد اہم سبق ضرور سیکھنا چاہئیں۔ تجربے نے یہ بات روزِ روشن کی طرح

واضح کر دی ہے کہ مشرق قریب کے لوگوں کی سیاسی زندگی کی بقا صرف اس راز میں مضمر ہے۔ کہ ترکوں اور عربوں کا اتحاد جلد از جلد قائم ہو جانا چاہیئے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترکوں کو عالم اسلام سے جدا کرنے کی سازشیں بدستور جاری ہیں۔ گاہے گاہے اس قسم کی خبریں بھی سننے میں آجاتی ہیں۔ کہ ترک اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی بولا گیا ہو گا۔ اس نوع کے شرارت انگیز اور فتنہ پرور پراپاگنڈے کا شکار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جنھوں نے اسلامی فقہ اور اسلامی اصولِ قانون کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا۔

" یہ عرب ہی تھے۔ جن کے مذہبی شعور نے اسلام کو جنم دیا تھا جس نے آگے چل کر ایشیا کی مختلف قوموں کو متحد و مربوط کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ اِس لیے عربوں کو چاہیئے۔ کہ اُن نتائج کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ انھوں نے اِبتلا اور مصیبت کے وقت ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

" دُوسرا سبق یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ عربوں کو چاہیئے۔ کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں۔ کیونکہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اِس قابل نہیں کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی

میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔

"تیسرا سبق یہ ہے۔ کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی حمیت و غیرت کا امتحان ہے۔ خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب ـــ منصب خلافت کی تنسیخ کے بعد عالم اسلام کے لیے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے۔ اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔

"بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اس اینگلو فرانسیسی ادارے سے، جسے غلطی سے جمعیت اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بدگمان و برگشتہ کر دے۔ کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔"

گیارھواں باب

کانگرسی راج

جب مئی ۱۹۳۷ء میں ہم نے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا کہ مسلم لیگ کا وہ کون سا پیغام اور پروگرام ہے۔ جو عوام تک پہنچایا جانے گا۔ الیکشن ختم ہو چکے تھے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہو گئی تھی۔ اور کانگرس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اِن حالات میں بظاہر ہمارا سب سے بڑا ہدف یونینسٹ پارٹی ہی کو ہونا چاہیئے تھا۔ الیکشن کے دوران میں ہمارا مقابلہ صرف یونینسٹ پارٹی سے تھا مسٹر جناح نے بھی انتخابات کے معرکے کا افتتاح کرتے وقت یونینسٹ پارٹی ہی کو مسلم لیگ کی حریف جماعت قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ یونینسٹ پارٹی ہی تھی۔ جو مخلوط جماعت ہونے کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کا دعوےٰ کرتی تھی۔ اِس دوران میں البتہ ایک تبدیلی ایسی ضرور ہوئی تھی۔ جس نے ہماری توجہ کو یونینسٹ پارٹی سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیا تھا۔ اُس تبدیلی کا مفصل

ذکر گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ یعنی کانگرس نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے۔ اور اُن کی جمعیّت میں رخنہ ڈالنے کی مذموم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ان کوششوں کا ازالہ بھی بے حد ضروری تھا۔

باایں ہمہ جب ہم نے مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کی غرض سے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔ تو ہم اپنی تقریروں میں التزاماً یونینسٹ پارٹی ہی کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتے تھے۔ ہمیں یقین تھا۔ کہ کانگرس سے نپٹ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں سب سے بڑا فتنہ یونینسٹ پارٹی کا وجود تھا۔ جس نے پندرہ سال سے پنجاب کے مسلمانوں کو سیاسی بیداری سے محروم کر رکھا تھا۔ اور جس نے شہری اور دیہاتی کی مصنوعی تقسیم پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ کھڑا کر دیا تھا اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یقین تھا۔ کہ جب تک یونینسٹ پارٹی کی قسم کی مخلوط جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کو کانگرس کی یورش سے بچانا آسان نہیں۔ بہرحال جون کے آخر تک ہم نے جگہ جگہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف تقریریں کیں۔ اِس پارٹی کی ہیئتِ ترکیبی اور پالیسی کی جی کھول کر مذمّت کی۔ اور اس کو مسلمانوں کی قومی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ اِن جلسوں میں عوام بڑی خوشی سے شریک ہوتے۔ اور غور سے ہماری تقریریں سُنتے تھے۔ جلسے کے بعد بعض لوگ سوال بھی کرتے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ عوام میں سیاسی شعور پیدا ہو رہا تھا۔ سر سکندر حیات خاں تک اِن جلسوں اور تقریروں کی سرکاری رپورٹیں باقاعدہ پہنچ رہی تھیں۔ اور وہ سخت متفکّر تھے۔ کہ اگر مسلم لیگ کے کارکنوں کو یُونہی کھُلی چھُٹی ملی رہی۔ تو یہ لوگ اندر ہی اندر اُن کی وزارت اور

یونینسٹ پارٹی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔

یہ صورتِ حال تھی۔ جب کانگرس نے ہندوستان کی بساطِ سیاست پر ایک ایسی خطرناک اور غلط چال چلی۔ جس نے حالات و واقعات کا رُخ یکسر بدل دیا۔ ۹ رجولائی ۱۹۳۷ء کو کانگرس نے وزارتیں قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اب یُو۔ پی۔ سی، پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس اور اڑیسہ میں کانگرس کو موقع حاصل تھا۔ کہ اپنی اُس قومی پالیسی کا نفاذ کرے۔ جس کا وہ برسوں سے دعوے کرتی آرہی تھی۔ الیکشن سے پہلے کانگرس اور مسلم لیگ نے جو مینی فسٹو شائع کئے تھے۔ اُن سے صاف عیاں ہوتا تھا۔ کہ ان دونوں جماعتوں کے تعمیری اور سیاسی پروگرام میں چنداں فرق نہیں ہے۔ خود مسٹر جناح وضاحت سے فرما چکے تھے کہ مسلم لیگ کانگرس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہے۔

پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں کہ :۔

"مسلم لیگ نے اپنے مینی فسٹو میں جس معاشرتی پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا، وہ کانگرس کی معاشرتی پالیسی سے چنداں مختلف نہیں تھا صنعت و حرفت کی ترقی۔ دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور کاشتکاروں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کا پروگرام اِن تمام اُمور میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کلی اتفاق تھا سیاسی اُمور میں بھی اِن دونوں جماعتوں کے درمیان بظاہر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ کانگرس کی طرح مسلم لیگ بھی شخصی آزادی کی علم بردار۔ اور تمام جابرانہ و متشددانہ قوانین کی تنسیخ کی حامی تھی۔ فیڈریشن کی مخالفت

ہیں بھی۔ مسلم لیگ نے کانگریس کی طرح پوری شدت سے آواز بلند کی تھی۔ صوبوں کی حکومت خود اختیاری پر بھی مسلم لیگ نے قوم پرستانہ نقطۂ نگاہ سے سخت اعتراض کئے تھے۔ اگرچہ وہ اس بات کی حامی تھی۔ کہ یہ حکومت خود اختیاری، بُری بھلی جیسی بھی ہے، اس سے پورا فائدہ اُٹھا لینا چاہیئے "

آگے چل کر پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ:

"مسلم لیگ کے مینی فسٹو کا اہم حصہ وہ تھا۔ جہاں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ لیگ کانگریس کے ساتھ اشتراک و تعاون کرکے۔ ملک کو غلامی سے آزاد کرائے گی۔ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کو نہ صرف ہندوستان کی دستوری دائینی تاریخ کا ایک درخشاں باب قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ یہ میثاق گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ ماضی میں ہندوستان کی دو سب سے بڑی جماعتوں نے فکر و عمل کی وحدت اور اشتراک و تعاون کا کیسا زبردست نمونہ پیش کیا تھا۔ اس میثاق کے بعد مسلمانوں نے ہمیشہ آزادیٔ وطن کی تحریک میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ حصہ لیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ نئے دستور میں ایک اقلیت کی حیثیت سے انہیں تحفظات درکار ہیں یقیناً فرقہ پرستی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص تاریخِ عالم سے واقف ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ مطالبہ بالکل طبعی اور فطری تھا۔ جسے قبول کر لینا اس لیے بھی ضروری تھا

کہ اقلیتوں کا دلی تعاون - اور اُن کی خیر سگالی حاصل کرنے کا اِس سے بہتر طریقہ ہو ہی نہیں سکتا - مقصد بہر حال یہ تھا کہ اقلیتیں پُورے اطمینان سے اکثریت پر اعتماد کر کے اپنی تقدیر اُس کے ہاتھوں میں سونپ سکیں -

"جو لوگ میثاقِ لکھنؤ کی غرض و غایت سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں - کہ کانگرس نے اِس موقع پر مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کی رعایت منظور کر دی تھی - وہ مسلم لیگ کے مینی فسٹو سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھے - کہ ۱۹۱۶ء کی طرح مسلم لیگ پھر کانگرس سے رشتۂ اُخوت اُستوار کرنے کی خواہاں تھی - مسٹر جناح کو ایک مرتبہ خود کانگرسی لیڈروں نے "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا - کیا یہ حقیقت نہیں - کہ آج وہی جناح اُن سے صرف ایک رعایت کا طلبگار تھا - تاکہ ہندوستان کی اِن دو سب سے بڑی جماعتوں میں مضبوط و مستحکم اتحاد قائم ہو سکے؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کو جو خوشگوار فضا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی - اُس فضا کو صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟ کیا اِس قسم کے خوش آئند اقدام سے ہندوستان کی وحدت اور انجام کار ہندوستان کی آزادی کے حصُول کا سب سے بڑا مرحلہ طے نہ ہو جاتا؟

"یہ ایک امرِ واقعہ ہے - کہ مسلم لیگ کا مینی فسٹو اشتراک و تعاون

کی ایک کھلی ہوئی دعوت تھی - اور اگر کانگرسی لیڈر اس دعوت کو قبول کر لیتے تو آئندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات - اور ہندوستان کے دستوری معاملات بالکل مختلف صورت - اور قطعی طور پر جداگانہ رنگ اختیار کر لیتے - یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ انتخابات سے قبل کانگرس اور لیگ کے باہمی اتحاد کی توقعات بہت ہمت افزا تھیں - اگرچہ کانگرس اپنی قومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کی نمائندگی کا بھی دعوے کرتی تھی - لیکن کم از کم انتخابات کے دوران میں لیگ - اور کانگرس کے درمیان مفاہمت پیدا ہو گئی تھی - صوبجات متحدہ میں تو لیگی اور کانگرسی لیڈر بہت یگانگت آمیز طریقے سے ایک ہی پلیٹ فارم پر کام کرنے لگے تھے"! [۱]

پروفیسر کوپ لینڈ کوئی سیاسی آدمی نہیں ہیں - وہ آکسفورڈ میں تاریخ کے معلم تھے - اور اُن کی ساری زندگی علمی کاموں میں بسر ہوئی ہے - انھوں نے ہندوستان بالخصوص برطانوی دور کے ہندوستان پر جو تاریخی تحقیقات کی ہے - اُس کا خلاصہ نہایت قابلِ قدر کتابوں کی صورت میں موجود ہے اُن کا اندازِ فکر محققانہ اور غیر جانبدارانہ ہے - تاہم میں اس ضمن میں دو ایک باتوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں - پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ بالا اقتباس میں ایک یہ فقرہ

---

۱ INDIAN POLITICS (1936-1942)

By SIR REGINALD COUPLAND pages 14-15

بھی موجود ہے۔ لہ:

"کیا یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو خوشگوار فضا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اُس فضا کو اب صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا۔؟"

یہ فقرہ بڑا بلیغ، معنی خیز اور حقائق آموز ہے جس کے پیچھے ہندوستان کے ایک خوشگوار دور کا ایک نہایت زرّیں باب ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔ اور جب تک ہم اُس باب کا اچھی طرح مطالعہ نہ کر لیں۔ ہم پر ایک طرف تو جناح کی عظیم الشان شخصیت کے بعض دلآویز پہلو منکشف نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف ہم اُس ٹریجڈی سے بھی کماحقہٗ آشنا نہیں ہو سکتے۔ جو کانگرسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی، ضد اور مصلحت ناشناسی سے ہندوستان پر نازل ہوئی۔

مسٹر جناح پہلی گول میز کانفرنس سے فارغ ہو کر واپس ہندوستان نہیں آئے تھے بلکہ انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور غالباً اُن کا ارادہ وہیں مستقل قیام کرنے کا تھا۔ ایک طرف وہ برطانوی حکومت کے ہتھکنڈوں سے سخت نالاں تھے۔ دوسری طرف ہندو مسلم مناقشے نے انہیں بہت آزردہ کر رکھا تھا۔ تاہم بعض حالات و اتفاقات کی بنا پر وہ ۱۹۳۴ء کے آخر میں واپس ہندوستان تشریف لائے۔ اور آتے ہی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی انڈی پینڈنٹ پارٹی کو دوبارہ زندہ کیا۔

۱۹۳۴ء کی مرکزی اسمبلی میں مختلف پارٹیوں کے ممبروں کی تعداد حسبِ ذیل تھی:۔

کانگرس	۴۴	نیشنلسٹ پارٹی	۱۱
انڈی پنڈنٹ پارٹی	۲۲	یورپین	۱۱
سرکاری بلاک	۲۶	نامزد ممبر	۱۳

اس نقشے کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔ تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ کانگرس اور نیشنلسٹ پارٹی کی مجموعی طاقت ۵۵۔ اور حکومت کے حامیوں کی (جن میں یورپین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں) ۵۰ ممبر تھے۔ کانگرس اور حکومت کی اس باہمی آویزش میں مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ اگر یہ پارٹی حکومت کا ساتھ دیتی۔ تو کانگرس کو کسی معرکے میں بھی کامیابی نہ ہو سکتی تھی۔ اور اگر یہ پارٹی حکومت کے خلاف ووٹ دیتی۔ تو کانگرس کو ہر قدم پر کامیابی نصیب ہوتی۔

آئیے دیکھیں۔ کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی پارٹی نے کیا روش اختیار کی۔ اور کیا اُس روش کو وطن دوستی و قوم پرستی کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض کہا جا سکتا ہے۔ یا فخر و مباہات کی مستحق؟

اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ۲۱ جنوری سے ۹ اپریل ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ اور اس اجلاس میں ہندوستان کے قوم پرست عنصر نے (جس میں جناح اور کانگرس دست بدست شامل تھے) حکومت کو پے در پے شکستیں دیں۔ پہلی شکست مسٹر سرت چندر بوس کی نظربندی کے خلاف تحریکِ التوا پر ہوئی۔ دوسری شکست انڈو برٹش تجارتی معاہدہ کی تنسیخ پر ہوئی۔ تیسری شکست خدائی خدمتگاروں کی تحریک کو خلاف قانون قرار دیئے جانے پر ہوئی۔ چوتھی شکست ریلوے بجٹ پر تخفیف زر

کے سلسلے میں ہوئی۔ پانچویں شکست کراچی میں پبلک پر گولی چلائے جانے کے خلاف ہوئی۔ چھٹی شکست سالانہ بجٹ کو مسترد کئے جانے پر ہوئی۔ اور ساتویں شکست وائسرائے کے اختیاراتِ خصوصی سے منظور شدہ بجٹ کو دوبارہ مسترد کئے جانے پر ہوئی۔

جب اسمبلی کے پہلے اجلاس ہی میں حکومت کو یکے بعد دیگرے سات شکستیں ہوئیں۔ تو نئی دہلی سے لے کر لندن کے وائٹ ہال تک ایک کھلبلی مچ گئی حکومت پریشان تھی اور ہر طرف کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح جناح کو کانگرس سے علیحدہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے پنجاب کے دو مسلمان ممبر بڑی آسانی سے حکومت کے ہاتھ بک گئے۔ لیکن اس کے باوجود مسٹر جناح نے اپنی پارٹی کے شیرازے کو بڑی ہنرمندی سے مجتمع کیے رکھا۔ سٹیٹسمین جیسا بادفادار اخبار بھی اِس صورتِ حالات پر بوکھلا گیا تھا۔ اُس نے جناح کے خلاف ایک اداریہ لکھتے ہوئے۔ نہایت اوچھے انداز میں کہا کہ:

"۔۔۔ ہمیں اس بین اور نمایاں حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کے سیاست دانوں اور صنعت کاروں کا ایک زبردست طبقہ برطانیہ کے خلاف ہے یہ طبقہ برطانیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کا حامی نہیں۔ اور نہ تجارتی اور کاروباری معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ رنج و بغض کی بنا پر ذاتی فوائد سے دستبردار ہونے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کانگرس پارٹی کو ملک

ہمہ دانی حاصل ہے۔ لیکن اس پارٹی کا سب سے بڑا حربہ نسلی منافرت کا جذبہ ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ کانگریس کو وقتاً فوقتاً ایسے حامی بھی مل جاتے ہیں۔ جو برطانیہ کے ساتھ دشمنی رکھنے کی بنا پر کانگریس کے ہم خیال سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً مسٹر جناح۔ جو ابتدا میں گول میز کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن۔ اور فیڈریشن کے بڑے پُرجوش حامی تھے۔ لیکن چونکہ انھیں گول میز کانفرنس کے آخری اجلاسوں میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے اب وہ حکومت سے ناراض ہیں۔ مسٹر جناح بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہیں۔ اُن کا ذاتی رجحان مخلوط انتخاب کی طرف ہے۔ اور اُن کی خواہش ہے کہ نشستوں کے تحفظ کا اصول منوا کر ہندوؤں سے مخلوط انتخاب کی بنا پر مفاہمت کر لی جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے لیڈر بھی ہیں۔ اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اور نہ کانگریس کے ساتھ مل کر اصلاحات کی مخالفت کرنا انھیں منظور ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اُن چودہ نکات کے حامی ہیں۔ جو مسٹر جناح کے نام سے منسوب تو ہو چکے ہیں لیکن جنھیں مسٹر جناح کی ذات کے ساتھ چنداں مناسبت نہیں۔"[1]

---

[1] روزنامہ سٹیٹسمین مورخہ ۲ فروری ۱۹۳۵ء

اسمبلی کا دوسرا اجلاس ۱۶ ستمبر ۱۹۳۵ء سے ۱۵ ستمبر تک صرف ۲۴ روز جاری رہا۔ اس میں بھی حکومت کو دو شکستیں ہوئیں۔ پہلی شکست قبائلی علاقے پر بم باری کے خلاف۔ اور دوسری شکست مسودۂ قانون فوجداری کی ترمیم پر ہوئی۔ مسودۂ قانونِ فوجداری کی ترمیم پر ایوان میں تین روز بحث ہوتی رہی۔ حکومت نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے بعض مسلمان ممبروں کو اپنے ساتھ ملانے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن جناح کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ آخر اکہتر اور اکسٹھ ووٹوں کی تقسیم سے حکومت کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۹۳۶ء کا اجلاس بھی بڑا پُرخروش تھا۔ جس میں حکومت کو یکے بعد دیگرے چھ شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک شکست سوبھاش چندر بوس کے بارے میں ہوئی۔ جن کا ہندوستان میں داخلہ حکومت نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ دوسری اہم شکست اٹاوہ پیکٹ کو ختم کرانے کی تحریک پر ہوئی۔ قانونِ فوجداری کے ترمیم شدہ مسودے کی طرح حکومت نے اٹاوہ پیکٹ کو بچانے کی بھی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ لیکن مسٹر جناح کی دھواں دھار تقریر کے بعد انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ہر رکن نے حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ اور انجام کار صرف پانچ ووٹوں کی کثرت سے حزبِ مخالف کو فتح ہوئی۔ بجٹ اس مرتبہ بھی مسترد کر دیا گیا تھا۔ جسے وائسرائے نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے منظور کیا۔ پروفیسر کوپ لینڈ اس صورتِ حال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ:

"۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں دونوں مرتبہ اسمبلی نے بجٹ مسترد کر دیا تھا۔ اور مجبوراً وائسرائے کو اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام

لے کر بجٹ منظور کرنا پڑا۔ اِن دو برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے
متحد ہو کر جس شدت سے حکومت کی مخالفت کی۔ اور جس بُری طرح
اُسے پریشان کیا۔ اُس کی مثال پہلے کبھی ہندوستان کے قوم پرست
طبقے نے پیش نہیں کی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک چودہ ۱۴
مواقع ایسے پیش آئے ہیں۔ جب اسمبلی کے مسترد کیے ہوئے قوانین
کو حکومت نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لے کر منظور کیا ہو۔
اِن چودہ میں سے آٹھ مواقع صرف ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں
رُونما ہوئے۔

" ہر چند کہ اِس دفعہ ہندو یا مسلمان لیڈروں نے فرقہ وارانہ اتحاد
کے لیے کوئی اپیل شائع نہیں کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان
کے دارالسلطنت دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد
قائم ہو گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ قبل ازیں جب کبھی ہندوستان
میں نئی اصلاحات کے نفاذ کا وقت قریب آتا تھا۔ تو حقوق کے
بٹوارے کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ کشمکش تیز
ہو جاتی تھی۔ لیکن اب کہ صوبوں میں پہلی مرتبہ مکمل اور مرکز میں جزوی
طور پر ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی صورت پیدا ہو رہی تھی۔
فرقہ وارانہ تعلقات میں کسی قسم کی غیر معمولی تلخی کے آثار نظر نہیں آتے
تھے۔"[1]

---

[1] INDIA: A R STATEMENT, Page 151

پروفیسر کوپ لینڈ کی حیرت بجا ہے کہ گاندھی اور جواہر لال دونوں خاموش تھے۔ کسی نے بھی ہندو مسلم اتحاد کی اپیل شائع نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود مرکز سلطنت دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا آفتاب طلوع ہو گیا تھا۔ جس کی زندگی بخش شعاعیں خود بخود ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں پھیل رہی تھیں۔

راقم التحریر کو ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کا زمانہ یاد ہے۔ جب پورا ہندوستان جناح کی آواز پر کان لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ جب جناح قوم پرست ہندوؤں کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ اور جب مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس پارٹی کی تمام کامیابیوں کا سہرا مسٹر جناح کے سر باندھا تھا۔

اس ماحول اور اس فضا میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپریل ۱۹۳۶ء میں اپنا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کیا۔ جہاں صدر محترم نے اپنے خطبے میں فرمایا۔ کہ

"...... برطانوی پارلیمنٹ زبردستی ہم پر ایک ایسا آئین ٹھونس رہی ہے۔ جسے کوئی شخص نہ پسند کرتا ہے۔ اور نہ منظور کرتا ہے۔ مسلسل کئی سال تک حکومت نے ہمیں کمیٹیوں، کانفرنسوں، رپورٹوں اور کمشنوں کے چکر میں الجھائے رکھا۔ اور اب اس چکر میں سے ایک ہوا نکلا ہے۔ جسے کانسٹی ٹیوشن ایکٹ کا لباس پہنا کر ہندوستان کو پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ آئین سراسر غیر جمہوری ہے جس سے ہندوستان کے رجعت پسند عنصر کے ہاتھ پہلے سے بھی

زیادہ مضبوط ہو جائیں گے، اور بجائے اس کے کہ ہم آئندہ ترقی پسندانہ راستے پر گامزن ہو سکیں۔ یہ آئین جمہوریت اور آزادی کی ساری روح کو کچل کر رکھ دے گا۔"

کیا کانگرس کا بڑے سے بڑا "باغی صدر" بھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بارے میں اس سے زیادہ تلخ لہجہ یا اِن سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتا تھا؟ خود مسٹر جناح نے ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں، اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ

"...... برطانوی حکومت نے ہم پر یہ آئین ٹھونسنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ حالانکہ جس طرح میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں، اسی طرح خود برطانوی حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں، کہ یہ نیا آئین اُس آئین سے جو اس وقت رائج ہے۔ کہیں زیادہ لغو ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کیوں اس آئین کو ہماری مرضی کے خلاف ہم پر مسلط کرنے پر تلی ہوئی ہے؟

"اگر یہ آئین جدید ہمارے ملک میں رائج ہو گیا۔ تو مجھے یقین ہے کہ اس کے نتائج نہایت خراب نکلیں گے۔ برطانوی ہند اُس تمام ترقی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جو اُس نے اب تک اپنے یہاں نمائندہ حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں کی ہے۔ اس آئین کے بارے میں ہندوستان کے کسی صوبے سے بحیثیت موجودہ مشورہ نہیں کیا گیا۔ نہ کسی صوبے سے استفسار کیا گیا ہے۔ کہ آیا وہ ہندوستان کے

متحدہ وفاق میں اُن شرائط پر شریک ہونے کو تیار ہے۔ جو والیانِ ریاست یا حکومتِ برطانیہ۔ اپنی صوابدید سے وضع کی ہیں.... حقیقت یہ ہے کہ یہ آئین اس قدر ناقص ہے۔ کہ اس سے نہ تو کسی کی تسلی ہوتی ہے۔ اور نہ کسی کے قلیل ترین مطالبات منظور ہوتے ہیں......

"جنابِ والا! اگرچہ ہم بے بس ہیں۔ لیکن ہماری خودداری کا تقاضا ہے۔ کہ ہم آگے قدم بڑھائیں۔ ہم نے اس سکیم کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور ہم اسے کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ میں اپنی رائے کے اظہار میں کسی قسم کے تامل یا پس و پیش کو روا نہیں رکھتا۔ مجھ کو یہ کہہ کر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ کہ کیا تم ہمیشہ تاریکی میں ٹامک ٹوئیے مارنا پسند کرو گے؟ میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی دھمکیاں بے کار ہیں۔ ممکن ہے کہ حکومت پھر پوچھے۔ کہ بہت اچھا۔ بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟ میرا جواب سُن لیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبائی حکومت کی مجوزہ سکیم میں ترمیم کی جائے۔ مرکزی حکومت کی سکیم کو یک قلم ترک کر دیا جائے۔ اور ہندوستان کے اہل الرائے اصحاب کے مشورے سے پوری سکیم پر اس طرح نظرِ ثانی کی جائے۔ کہ برطانوی ہند میں جلد از جلد مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہو سکے۔"

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو مردود و متھور قرار دینے۔ اور ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کے لیے۔ مسٹر جناح کانگرس کے ہم نوا تھے۔ اگرچہ ۱۹۲۸ء میں وہ کانگرس

کی احسان فراموشی، تنگ دلی اور ہندوانہ ذہنیت کے شکار ہو چکے تھے۔ اِس کے باوجود اب تک اِس بات کے آرزومند تھے کہ مسلمانوں کے لیے چند تحفظات منظور ہو جائیں۔ تو وہ دل و جان سے کانگرس کے ساتھ مل کر آزادیٔ وطن کا متحدہ محاذ قائم کریں۔ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اُس میں آگے چل کر اُنھوں نے کہا:

"...... میرے معزز دوست نے فرمایا ہے۔ کہ پہلے اقتدار حاصل کر لیا جائے۔ پھر اُس کا بٹوارہ بھی ہوتا رہے گا۔ معاف فرمائیے گا۔ یہ رائے میرے نزدیک درست نہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ نہیں۔ کہ پہلے حصول اور پھر تقسیم ہو۔ ہم یقیناً اراضی کا کوئی قطعہ نہیں خرید رہے۔ نہ کوئی تجارتی یا کاروباری مہم شروع کر رہے ہیں۔ کہ بعد میں اُس کا منافع تقسیم کرنے بیٹھیں گے۔ اگر معاملہ یہی ہوتا کہ پہلے مطلوبہ چیز حاصل ہو۔ اور پھر اُس کے حصے بخرے کیے جائیں۔ تو بتائیے کہ مہاتما گاندھی نے مَرن برت کیوں رکھا تھا؟ کیوں انھوں نے ہندوستان کے تمام لیڈروں کی رضامندی اور منظوری سے اچھوتوں کے ساتھ وہ معاہدہ کیا تھا جو پونا پیکٹ کے نام سے مشہور ہے؟ (نعرہ ہائے تحسین) کیوں اچھوتوں سے صاف صاف نہیں کہہ دیا گیا تھا کہ پہلے آزادی حاصل کر لینے دو۔ بٹوارہ بعد میں ہوتا رہے گا؟

(نعرہ ہائے تحسین)

"میں سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی اپنے اِس فعل میں بالکل حق بجانب تھے

وہ جانتے تھے۔ کہ یہ پانچ چھ کروڑ انسان دراصل ہندو قوم ہی کا ایک جزو ہیں۔ میں نے خود انگلستان میں مہاتما گاندھی سے درخواست کی تھی کہ اچھوتوں کے ساتھ مفاہمت کر لیجئے۔ انھوں نے ابتدا میں میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اچھوتوں سے الگ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس طرح ہندو سماج میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔ میں نے بار بار درخواست کی۔ اور یقین کیجئے۔ کہ میں نے مسلمانوں سے زیادہ اچھوتوں کے لیے مہاتما گاندھی سے التجائیں کی تھیں۔ شروع میں تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ آخر کار انھوں نے معاملہ کی اہمیت سمجھ لی تو آمادہ ہو گئے۔ میں اپنے ہندو بھائیوں کو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ کہ انھوں نے قومی تحفظات عطا کر کے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور یہ کس قدر خوشی کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی اب بھی ان کی بہتری کے لیے کام کر رہے ہیں۔

"میں آپ سے کہتا ہوں۔ کہ ہمارے ساتھ بھی اسی رواداری اور محبت کا سلوک کیجئے۔ ہمارا ہاتھ حاضر ہے۔ یہ دوستی اور رفاقت کا ہاتھ ہے۔ آپ بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے۔ ہم اتحاد کے لیے بالکل تیار ہیں"۔ ¹

---

¹ مسٹر جناح نے اپنی اس تقریر میں گاندھی جی کے لیے التزاماً اور احتراماً مہاتما کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ہندوؤں کو وہ HINDU BRETHREN کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ اس کو محض ایک سرسری بات سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ یہ چیز مسٹر جناح کے اس وقت کے جذبات و خیالات کی آئینہ داری کے لیے کافی ہے۔

مجھے لندن میں دو بڑے ذمہ دار انگریزوں سے ملنے ۔ اور مسٹر جناح کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ اُن میں ایک لارڈ جوئٹ[1] اور دوسرے لارڈ ٹمپل وُڈ ہیں لارڈ جوئٹ انگلستان کے بڑے نامور قانون دان تھے اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک لیبر حکومت کے زمانے میں لارڈ چانسلر کے معزز ترین عہدے پر فائز رہے تھے۔[2] ۱۹۳۱ء میں جب مسٹر جناح لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ تو لارڈ جوئٹ بھی اُن دنوں یہاں پریکٹس کرتے تھے۔ اور مسٹر جناح سے اُن کے مراسم نہایت اچھے تھے۔ اگست ۱۹۵۷ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

میں نے لارڈ جوئٹ سے ایک ملاقات میں یہ دریافت کیا تھا۔ کہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک جب آپ کو مسٹر جناح سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ تو مسٹر جناح کے سیاسی خیالات کس قسم کے تھے؟

لارڈ جوئٹ نے جواب دیا۔ کہ مسٹر جناح برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور میں نے تین سال کے عرصے میں کبھی اُن کی زبان سے مہاتما گاندھی۔ انڈین نیشنل کانگرس یا ہندو قوم کے خلاف ایک لفظ نہیں سُنا۔ وہ ہمیشہ برطانوی حکومت کی

---

[1] LORD JOWITT

[2] انگلستان میں دارالعوام کے صدر کو سپیکر اور دارالامرا کے صدر کو لارڈ چانسلر کہتے ہیں لارڈ چانسلر کی حیثیت سے وہ پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کی صدارت بھی کرتا ہے۔ اور دارالامرا کی اُس منتخب کمیٹی کا، جو انگلستان کی سب سے اعلیٰ عدالت اپیل ہے، صدر بھی وہی ہوتا ہے۔ ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر اُس کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے مجسٹریٹوں کا تقرر براہ راست وہ خود کرتا ہے۔

پالیسی کی مذمت کرتے تھے"۔

کم و بیش انہی خیالات کا اظہار مجھ سے لارڈ ٹمپل ووڈ نے کیا تھا جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک سر سیموئیل ہور کے نام سے وزیر ہند رہ چکے ہیں۔ میں لارڈ جوٹ اور لارڈ ٹمپل ووڈ کی رائے کو بالکل صحیح اور درست سمجھتا ہوں ۱۹۳۴ء کے آخر میں جب مسٹر جناح واپس ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ تو برطانوی حکومت سے سخت نالاں تھے اور اس عزم صمیم کے ساتھ وطن گئے تھے۔ کہ کانگرس سے جلد از جلد سمجھوتہ کر کے برطانوی حکومت کے خلاف محاذ قائم کریں گے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں انھوں نے مرکزی اسمبلی کے اندر اپنے اس عزم صمیم کو عملی جامہ پہنا کر۔ دنیا کو دکھا دیا تھا۔ کہ آئندہ وہ ہندوستان کی سیاست کو کس رُخ پر چلانا چاہتے ہیں۔

اندریں حالات بقول پروفیسر کوپ لینڈ کے "کیا یہ ممکن نہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندو مسلم اتحاد کی جو خوشگوار فضا مسٹر جناح کی کوششوں سے پیدا ہو چکی تھی اُس فضا کو اب صوبائی حکومتوں تک بھی وسیع کیا جاتا؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ اس فضا کو یقیناً صوبائی حکومتوں تک وسیع کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے آخر میں جب ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ تو عام خیال تھا کہ نئے دستور کے تحت جب صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوگا۔ تو کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندے مل کر وزارتیں مرتب کریں گے۔ اور اُس رجعت پسند عنصر کو ایوانِ حکومت سے خارج کر دیں گے۔ جو ۱۹۲۱ء سے اب تک ہندوستان کی سیاست پر قابض چلا آ رہا تھا۔ مسٹر جناح نے ایک دیانتدار کھلاڑی کی طرح، جس کا دامن ہر قسم کے مکر و فریب سے پاک تھا، اپنے پتے مرکزی

اسمبلی میں سب کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ اب یہ فریق ثانی یعنی کانگرس کا کام تھا۔ کہ وہ بھی دیانت دار کھلاڑی کی حیثیت سے مسٹر جناح پر اعتماد کرتی۔

متعدد وجوہ سے یو۔پی کو ہندوستان کے تمام صوبوں میں قلب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اوّل اس لیے کہ یہ علاقہ تین سو سال تک مغلیہ حکومت کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کے آثار یہاں کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ دوم اس لیے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کی صحیح تہذیب اور ادب نے اسی خطے میں فروغ پایا تھا۔ سوم اس لیے کہ یو۔پی کے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن۔ علم و ادب اور قومی و ملی روایات میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے تھے۔ چہارم اس لیے کہ یہ صوبہ نہرو خاندان کا وطن ہونے کی وجہ سے کانگرسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ انہی وجوہ سے سارے ہندوستان کی نظریں یو۔پی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو معاملہ وہاں طے ہوگا۔ اسی کا عکس پورے برعظیم پر پڑے گا۔

۱۹۳۶ء میں یو۔پی میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک غیر رسمی سی مفاہمت ہو گئی تھی۔ کہ دونوں جماعتیں الیکشن میں ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔ چنانچہ جگہ جگہ کانگرسی اُمیدواروں نے لیگی اُمیدواروں کی حمایت کی۔ اور لیگی کارکنوں نے کانگرسی اُمیدواروں کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح سیاسی فضا نہایت خوشگوار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں۔ کہ :

"...... یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کا پہلو تقریباً یہ نہیں

بلکہ دوستانہ تھا۔ اور جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ یہ توقعات تھیں۔ بلکہ بعض افراد نے ہمت افزائی بھی کی تھی۔ کہ مشترکہ وزارت بنے گی۔ البتہ کوئی معاہدہ نہ تھا۔" [1]

ڈاکٹر اشرف کی رائے درست ہے۔ کہ کوئی معاہدہ نہ تھا اور ایسا معاہدہ اُس وقت ممکن بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ کانگرس کو ہرگز اُمید نہ تھی کہ اسمبلی میں اُسے اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو جائے گی کہ آئندہ وزارت سازی کے لیے اُسے کسی دوسرے گروہ کا محتاج نہیں بننا پڑے گا۔ اس لیے ۱۹۳۶ء میں کانگرسی لیڈروں کا رویہ دوستانہ تھا۔ اور وہ سوچ رہے تھے۔ کہ اگر مختلف صوبوں میں وزارتیں مرتب کرنے کی نوبت آئی۔ تو مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہو گا۔

لیکن ہُوا کیا؟ جب ۱۹۳۷ء کے اوائل میں الیکشن کے نتائج برآمد ہوئے۔ اور کانگرس کو چھ صوبوں میں خلافِ توقع بہت بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔ تو اُس تنگ دست لیکن کم ظرف انسان کی طرح، جسے عمر بھر کے انتظار کے بعد یکایک لاٹری سے بہت سی دولت ہاتھ آجائے۔ کانگرس کا دماغ اِس کامیابی سے چل گیا مفاہمت کی جگہ حقارت نے لے لی۔ دوستی کی بجائے نفرت پیدا ہو گئی اور تعاون کی جگہ رعونت آگئی۔ وہی جناح جو کل تک آزادی و حریّت کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ اب رجعت پسند بن گیا۔ وہی جناح جس کی مدد سے کانگرس نے مسلسل دو سال تک مرکزی اسمبلی میں حکومت کو پے در پے شکستیں دی تھیں۔ اب ایک فرقہ پرست

---

[1] ڈاکٹر اشرف کا خط اِس کتاب کے مصنف کے نام۔ مورخہ ۳۰ر اپریل ۱۹۵۷ء

لیڈر قرار دے دیا گیا۔ اور وہی جناح جس نے اپنے قول سے نہیں بلکہ فعل سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اُس وقت اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا تھا جب گاندھی اور نہرو منہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب ہندوستان کا بدخواہ سمجھا جانے لگا۔ یہ سب کچھ اُس اقتدار کے طفیل ہوا۔ جو کانگرس کو یک لخت چھ صوبوں میں حاصل ہو گیا تھا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے

باده نوشیدن و ہشیار نشستن سہل است

چوں بدولت برسی مست نگردی، مردی

جولائی ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے چھ صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ تو ایک یہ سوال بھی درپیش تھا۔ کہ کیا اِن وزارتوں میں مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں صوبائی گورنروں کے نام جو ہدایات موجود تھیں۔ اُن میں درج تھا۔ کہ ہر صوبے کے گورنر کا فرض ہے۔ کہ اپنے صوبے کے کابینہ میں اقلیت کے نمائندوں کو بھی شریک کرے۔ اِس لحاظ سے ضروری تھا۔ کہ کانگرسی صوبوں کی وزارتوں میں مسلمان بھی شامل کئے جائیں۔ یو۔ پی کی اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد چھیاسٹھ تھی جن میں سے پینسٹھ غیر کانگرسی ممبر تھے اور صرف رفیع احمد قدوائی ایک ضمنی انتخاب میں کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے۔ تمام غیر کانگرسی مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگی بن چکے تھے۔ اور اُن کے لیڈر چودھری خلیق الزمان تھے۔

گذشتہ دو سال کے واقعات کے پیشِ نظر ہر شخص کو یہی توقع تھی۔ کہ آئندہ

صوبائی حکومتوں میں کانگرس اور لیگ مل جل کر کام کریں گی ۔ لیکن جب وزارت سازی کا وقت آیا تو یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جن کو کانگرس نے یو۔پی۔ بنگال ۔ پنجاب اور سرحد کے پارلیمنٹری امور کا سربراہ بنادیا تھا چودھری خلیق الزّمان کو خط لکھ کر چند شرائط پیش کیں ۔ اور فرمایا کہ اگر یہ شرطیں ماننے کو تیار ہو ۔ تو ہم مسلم لیگ کے کسی ممبر کو وزارت میں جگہ دے سکتے ہیں :

وہ شرطیں کیا تھیں ؟ ملاحظہ فرمائیے :

اوّل : یو۔پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر بالکل ختم کر دیا جائے ۔

دوم : مسلم لیگ پارٹی کے تمام ممبر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر کے کانگرسی بن جائیں ۔ اس طرح یہ لوگ کلیتہً کانگرس کے نظم وضبط اور قواعد وضوابط کے تحت آجائیں گے ۔ اور آئندہ اپنے تمام اعمال و افعال کے لیے کانگرس کے سامنے جوابدہ ہوں گے ۔ کانگرس پارٹی کے جلسوں میں ان لوگوں کو شریک ہونا ہوگا ۔ جہاں دیگر کانگرسی ممبروں کی طرح یہ لوگ بھی ہر معاملہ میں ووٹ دیں گے ۔

سوم : کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے مختلف اسمبلیوں کے کانگرسی ممبروں کے لیے جو ضابطۂ عمل تیار کیا ہے مسلم لیگ کے اِن ممبروں کو (جو آئندہ کانگرس کے ممبر سمجھے جائیں گے) اُس ضابطے پر باقاعدہ عمل کرنا ہوگا ۔

چہارم : مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دیا جائے گا ۔ اور آئندہ کسی انتخاب میں مسلم لیگ کو اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کی اجازت نہیں ۔

ہو گی۔ یہ کام کانگریس کے ذمے ہو گا۔ کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں اپنے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے کرے۔

پنجم: تمام ممبروں کو کانگریس کے لائحہ عمل پر کار بند ہونا پڑے گا۔ اور کانگریس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں ہر ممکن کوشش کرنا ہو گی۔

ششم: اگر کانگریس نے کبھی وزارت یا اسمبلی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا تو ان ممبروں کو بھی اس فیصلے کی پابندی کرنا پڑے گی۔

غور فرمائیے۔ کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے کانگریس کا نقیب بن کر جو شرائط پیش کی تھیں۔ کیا وہ مسلم لیگ کو اشتراک و تعاون کی دعوت تھی یا اس بات کی للکار تھی کہ ہتھیار ڈال کر گھٹنے ٹیک دو اور کانگریس کی غلامی کا پٹہ گردن میں ڈال کر ہماری بارگاہ پر سر بسجود ہو جاؤ؟ کیا کوئی خود دار سیاسی جماعت اِن ذلت آمیز شرائط کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول کرنے پر تیار ہو سکتی تھی؟ چنانچہ جونہی مسٹر جناح کو اطلاع ملی، انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم ایک مساوی فریق کی حیثیت سے تعاون کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن اپنی جداگانہ قومی ہستی کو ختم کر کے اپنے آپ کو مٹا دینے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

کاش مولانا ابو الکلام آزاد اس موقع پر اس جرأت و ہمت اور غیرت و حمیت کا ثبوت دیتے۔ جو کسی زمانے میں ڈاکٹر انصاری کا شیوۂ خاص تھا!

۱۹۳۲ء میں جب کانگریس فرقہ وارانہ فیصلے کی مخالفت کرنے پر تلی ہوئی تھی تو ڈاکٹر انصاری نے وہیں آ کے گاندھی جی کو تار دیا تھا۔ کہ فرقہ وارانہ فیصلے کا بدل صرف ایک متفقہ فیصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک ایسا متفقہ فیصلہ ہندوؤں

اور مسلمانوں پر نہ ہو جائے۔ کمیونل ایوارڈ کو برقرار رکھا جائے گا۔ اور اگر کانگرس نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ تو وہ کانگرس سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر انصاری[1] کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ اور متعصب سے متعصب کانگرسی بھی اُن کے سامنے جھک جانے پر مجبور تھا۔ چنانچہ اُن کے اس انتباہ کے معاً بعد کانگرس نے کمیونل ایوارڈ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی زندگی میں لاکھوں روپے کمائے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے والیانِ ریاست اُن کے زیرِ علاج رہتے تھے۔ اور وہ ایک ایک معالجہ کی فیس ہزاروں روپے وصول کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے جو کچھ کمایا بے دریغ کانگرس پر خرچ کر دیا۔ وہ جب تک زندہ رہے۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہمیشہ اُن کے مکان پر ہوتے تھے اُن کے فوت ہونے کے بعد یہ اجلاس وردھا میں ہونے لگے تھے۔ واقفِ حال لوگ جانتے ہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے ایک اجلاس پر میزبان کے ہزاروں روپے اُٹھ جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری نہایت خندہ پیشانی سے یہ تمام مصارف برداشت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے انتقال پر دہلی کے دریا گنج والے مکان کے سوا اُن کے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ حالانکہ اُن کے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔

---

[1] ڈاکٹر انصاری کا پورا نام مختار احمد انصاری تھا۔ وہ مئی ۱۹۳۶ء میں دہلی میں سفر کرتے ہوئے عارضۂ قلب سے فوت ہو گئے تھے۔

جب مسلم لیگ نے اپنی جداگانہ قومی ہستی کو ختم کرنے سے انکار کیا۔ تو یو۔پی

میں کانگرس نے رفیع احمد قدوائی کو وزارت کا منصب سونپ دیا۔ اور ساتھ

حافظ محمد ابراہیم کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، یہ لالچ دیا کہ اگر

وہ لیگ سے مستعفی ہو کر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انہیں وزارت

عطا کر دی جائے گی۔ چنانچہ حافظ صاحب اِس لالچ کا شکار ہو گئے۔ یہی حربہ

کانگرس نے مدراس، بمبئی، صوبجاتِ متوسط اور بہار میں استعمال کیا۔ مدراس

میں سیٹھ یعقوب حسن اور بہار میں ڈاکٹر سید محمود کو وزیر بنا دیا گیا۔ بمبئی اور

صوبجاتِ متوسط میں کوئی مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب نہیں ہوا تھا یہاں

بھی وہی حافظ ابراہیم والا کھیل کھیلا گیا اور یٰسین نوری اور محمد یوسف شریف

کو لیگ سے توڑ کر کانگرس میں شامل کیا اور انہیں علی الترتیب بمبئی اور صوبجات

متوسط کا وزیر بنا دیا گیا۔

یہ سب کچھ گویا اس بات کا اعلان تھا۔ کہ آئندہ کانگرس کے علاوہ ہندوستان

میں کسی اور جماعت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہو گا۔ اور اگر مسلمان اس ملک میں

زندگی کا سانس لینا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی جداگانہ قومی تنظیم کو ختم کر کے

کانگرس میں جذب ہو جانا پڑے گا۔

میری ناچیز رائے میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد۔ ہندوستان کے مسلمانوں

کے لیے اس سے زیادہ پُر آشوب زمانہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز نے

تیغ و تفنگ سے مسلمانوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔ یہ سخت جان قوم اُس ابتلا سے

پژمردہ و پریشان تو ضرور ہوئی تھی۔ لیکن انجام کار زندہ بچ نکلی تھی۔ اب ہندو

نے اقتدار کے نشے میں مست ہو کر مسلمانوں کے قومی وجود کو سرے ہی سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اپنی اکثریت کے سیلاب میں مسلمانوں کو بہا لے جانے کا مصمّم ارادہ کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ اس برِّ عظیم کے مسلمان ایک عجیب قسم کی بھول بھلیّاں میں پڑ گئے۔ اُنھوں نے بڑی کوشش اور کاوش سے اپنے لیے جُداگانہ انتخاب کا حق منظور کرایا تھا۔ اب وہی جداگانہ انتخاب جسے وہ اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کانگرس کی ایک شاطرانہ ضرب سے پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حالیہ انتخاب میں بالاتفاق کانگرس کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اور صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے مُلک میں صرف دس مسلمان کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کانگرس نے اعلان کر دیا تھا کہ تنہا وہی مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض انجام دے گی۔

یو۔پی میں حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی۔ بمبئی میں یٰسین نوری۔ مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن۔ بہار میں سیّد محمود اور سی پی میں یوسف شریف کو محض اس لیے وزارت میں جگہ دی گئی تھی۔ کہ مسلمان تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے اپنے صوبے کی کابینہ میں کس کی نمائندگی کرتے تھے۔ یقیناً یہ نمائندگی مسلمان قوم کی نہیں تھی۔ یو۔پی کی مجلسِ قانون ساز کے مسلمان ممبروں کی تعداد ۶۶ تھی۔ جن میں سے ۶۴ حافظ ابراہیم اور رفیع قدوائی کو اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ بمبئی اسمبلی میں مسلمان کل ۳۰ تھے جن میں سے ۲۹ کو یٰسین نوری پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں تھا۔ مدراس اسمبلی میں

مسلمانوں کی تعداد ۲۸ تھی - جن میں سے ۲۳ کو سیٹھ یعقوب حسن پر کوئی اعتماد نہیں تھا -

اسی طرح بہار صوبجات متوسط کی مجالس قانون ساز میں علی الترتیب مسلمان ۴۰ - اور ۱۴ تھے - لیکن بہار کے ۳۶ - اور صوبجات متوسط کے تیرہ ممبر سیّد محمود اور یوسف شریف کو اپنا اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے - پھر کانگرس نے ان نام نہاد مسلمان وزیروں کو کس قوم کا نمائندہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگا رکھا تھا ؟

کانگرس نے ہمیشہ انگریز کے خلاف یہ الزام لگایا تھا - کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کر کے - اپنے جی حضوریوں کو اسمبلی اور کونسل میں نامزد کرتی ہے - لیکن اب کیا ہو رہا تھا؟ خود کانگرس نے انگریز کی جانشین بن کر مسلمانوں کے جائز، صحیح اور مستند قومی نمائندوں کو نظر انداز کر کے - اپنے چند جی حضوریوں کو وزارت کے منصب پر بٹھا دیا تھا -

پنڈت نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں گول میز کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے اُس کانفرنس کے نمائندوں کا ذکر نہایت حقارت آمیز طریقے سے کیا ہے - فرماتے ہیں - کہ

" یہ لوگ جنھیں برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا - سوائے اپنی ذات کے اور کسی کی نمائندگی کا دعوےٰ نہ کر سکتے تھے - بحیثیت مجموعی یہ لوگ اُن مفاد کی نمائندگی کرتے تھے - جو ہندوستان میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ ہیں - انگریزی حکومت کے نامزد کئے ہوئے

اِن ممبروں پر ہندوستان کے باشندوں کو قطعاً کوئی اعتماد نہیں تھا''۔ [1]

کیا پنڈت نہرو کے یہی الفاظ اُن مسلمان وزیروں کے متعلق نہیں کہے جا سکتے جنہیں کانگرس نے محض اپنے مفاد کی نمائندگی کرنے کے لیے نامزد کر دیا تھا؟ کیا یہ مسلمان وزیر مسلمان قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ کر سکتے تھے؟ اور کیا اِن مسلمان وزیروں کو مسلمان ممبروں کی خواہش کے خلاف، کانگرس نے زبردستی اُن پر مُسلّط نہیں کیا تھا؟

سوال یہ نہیں۔ کہ راج گوپال اچاری۔ ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد زیادہ لائق تھے۔ یا گول میز کانفرنس کے ہندو ممبر تیج بہادر سپرو۔ سری نواس شاستری اور ایم۔ آر۔ جیکر زیادہ قابل تھے۔ جواہر لال نہرو کو سپرو۔ شاستری اور جیکر ایسے عظیم المرتبت انسانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ اِن کو ہندوستان کے باشندوں نے اپنا نمائندہ منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی پشت پر قوم کی آواز نہ ہو۔ وہ قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔

کیا رفیع قدوائی۔ حافظ ابراہیم۔ سید محمود۔ یٰسین نوری۔ یعقوب حسن اور یوسف شریف کی پشت پر اُن کی قوم کی آواز تھی؟ اگر نہیں تھی۔ تو جواہر لال نے کس منطق، کس فلسفہ، کس دلیل، کس قاعدہ اور کس اصول سے اُن کو مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے کر وزارتوں میں جگہ دی تھی؟

---

[1] صـ ۲۹۳ (طبع ۱۹۴۹ء)

بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ کانگرس تو یو۔پی میں مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ تھی۔ لیکن جھگڑا صرف اس بات پر ہو گیا تھا۔ کہ لیگ ۲ دو وزارتیں مانگتی تھی۔ اور کانگرس صرف ایک وزارت دینے کو تیار تھی۔ یہ بات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اس باب میں کانگرس کی طرف سے جو باضابطہ تحریر چودھری خلیق الزمان کو بھیجی تھی۔ وہ لکھنو کے انگریزی روزنامہ پائنیر مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء میں چھپ گئی تھی۔ اور مولانا کا یہ خط ہم نے وہیں سے نقل کر کے اوپر درج کیا ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب کانگرس مسلمانوں کے ساتھ یہ کھلی ناانصافی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دھاندلی کر رہی تھی۔ تو صوبوں کے گورنروں نے مداخلت کیوں نہ کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انگریز کی ابن الوقتی نے محسوس کر لیا تھا کہ مداخلت کرنے سے "ڈیڈ لاک" پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اور برطانوی حکومت ہر قیمت پر اس "ڈیڈ لاک" سے بچنا چاہتی تھی۔ یو۔پی۔ سی۔پی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں کانگرس کو اتنی بڑی اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ کہ ایوان کی باقی تمام پارٹیاں مل کر بھی اس کی برابری نہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے اگر گورنر مسلمانوں کے دادرس اور خیر خواہ بن کر۔ کانگرس کی اس پالیسی میں مداخلت کرتے۔ تو کانگرس اس فعل کے خلاف بطور احتجاج مستعفی ہو جاتی۔ اس صورت میں باقی جماعتیں مل کر بھی متبادل وزارت بنانے کی طاقت نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ چھ صوبوں میں یقیناً "ڈیڈ لاک" پیدا ہوتا۔ اور برطانوی حکومت دنیا بھر میں بدنام ہو جاتی۔ اس مخمصے میں پھنس کر۔ انگریز کے سامنے ایک طرف تو مسلمانوں کی

حق تلفی تھی۔ اور دوسری طرف کانگریس کی خوشنودی کو انگریز نے ابن الوقتی کی دیرینہ روایات پر عمل کرتے ہوئے حد درجہ خیرہ چشمی سے کام لیا۔ اور مسلمانوں کی حق تلفی کو تو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ لیکن کانگریس کو ناراض کرنا گوارا نہ کیا۔

مسٹر جناح نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ کے موقع پر، اپنے خطبۂ صدارت میں، وزیرِ ہند لارڈ زٹلینڈ۔ وائسرائے اور گورنروں پر کھلے الفاظ میں یہ الزام عائد کیا تھا۔ کہ

"۔۔۔۔۔ اِن لوگوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر۔ اُن مسلمانوں کو وزارت کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ جن کے متعلق اُن کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اُن افراد کو مسلمان قوم کی قطعاً تائید اور حمایت حاصل نہیں۔ جب اِس کام میں گورنروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر کے یہ ثابت کر دیا ہے، کہ وہ اقلیت کے اُن حقوق کی حفاظت کرنے سے قطعاً معذور ہیں۔ جس کا ذِمّہ برطانوی حکومت نے اُٹھایا تھا۔ تو آئندہ اُن سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر بیسیوں نہیں سینکڑوں ایسے مسائل پیش آئیں گے۔ جب اقلیتوں کو اپنے حقوق کی پاسداری کے لیے اُن کی امداد و اعانت درکار ہوگی اُس وقت بھی یہ لوگ اِسی طرزِ عمل کا ثبوت دیں گے"!

مہاتما گاندھی ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ کہ جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہو جاتا ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری رہے گی۔ گاندھی جی اِس

حقیقت سے بھی واقف تھے کہ جنگ کے وقت ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں، اپنے باہمی اختلافات کے باوجود، غنیم کے خلاف ہمیشہ مشترکہ حکومت اور مشترکہ وزارت بنایا کرتی ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں برطانیہ کی تمام پارٹیوں نے مل کر جرمنی کے خلاف متحدہ وزارت قائم کی تھی۔ پھر جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی۔ تو لیبر اور ٹوری نے اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور دشمن سے نبرد آزما ہونے کی خاطر۔ قومی حکومت قائم کر لی تھی۔ تاکہ ملک کے تمام عناصر یکجا ہو کر وطن کی مدافعت کر سکیں۔ کیا ایسی حالت میں۔ کہ ابھی ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی کیفیت جاری تھی۔ اور غنیم بدستور ہمارے سامنے کھڑا دندنا رہا تھا۔ یہ مصلحت کا تقاضا نہ تھا۔ کہ مسلم لیگ اور کانگرس مل کر قومی حکومت قائم کرتیں؟

انہی دنوں سردار سردول سنگھ کویشر نے مہاتما گاندھی کو خط لکھ کر بڑی دردمندی سے التجا کی تھی کہ خدا کے لیے صوبائی وزارتوں میں مسلم لیگ کو شامل کر کے متحدہ محاذ قائم کیجیے۔ سردار سردول سنگھ کویشر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے بڑے پرانے رکن تھے۔ لیکن چونکہ وزارتیں قبول کرنے کے حامی نہیں تھے۔ اس لیے جب اس مسئلہ پر اُن کا کانگرس سے اختلاف ہوا۔ تو انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا تھا۔ تاہم کانگرس کے بالائی حلقوں میں اُن کا وقار بدستور قائم تھا۔ سردار کویشر نے گاندھی جی کو لکھا تھا۔ کہ

۱: جب کانگرس مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں قطعاً کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ تو یہ کہاں کا اخلاق اور انصاف ہے کہ آپ اکا دکا مسلمان

ممبر کو وزارت کا چکمہ دے کر کانگرس میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور پھر اُس کو مسلمان قوم کا نمائندہ قرار دے کر بڑے فخر سے اُس کی نمائش کرتے پھرتے ہیں

۲:۔ جب کانگرس نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو منظور کرتے ہوئے یہ الیکشن لڑی ہے۔ تو جداگانہ انتخاب کا تقاضا ہے۔ کہ اُسی مسلمان کو وزارت میں جگہ دی جائے جس پر اُس کی قوم کو اعتماد ہے۔

۳۔ جہاں تک تعمیری اور سیاسی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے مینی فسٹو میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے مسلم لیگ کے ممبروں کو لیگ سے منحرف کر کے کانگرس میں شامل کرنے کی جدوجہد بیکار ہی نہیں بلکہ شرانگیز ہے۔ اس طرح مسلمان ہمارے دشمن بن جائیں گے۔

۴۔ جب مسلم لیگی ممبر کانگرس کے پروگرام پر عمل کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ تو انہیں کیوں ورغلا کر۔ کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے اس خط کا جواب دیا تھا۔ کہ

"آپ کا خط، آپ ہی کی طرح مدلل اور دوسروں کو قائل کر دینے والا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں نے آپ کا خط بالائی حلقوں میں بھیج دیا ہے"

سردار سردول سنگھ کویشر نے اپنا خط اور مہاتما گاندھی کا جواب دونوں اُسی زمانے میں اخباروں میں شائع کرا دیئے تھے۔ کویشر کے علاوہ ایم۔ این رائے بار بار اپنے اخبار انڈی پینڈنٹ انڈیا میں کانگرس کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے تھے

اور گاندھی جی سے درخواست کرتے تھے۔ کہ صوبوں میں مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ وزارتیں بنایئے۔ خود کانگرسی حلقوں میں۔ ایک اچھا خاصا طبقہ کانگرس کی اِس پالیسی کے خلاف تھا۔ لیکن ضابطے کی پابندی کی وجہ سے زبان بند رکھنے پر مجبور تھا۔ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی، آر، ریڈی نے اُسی زمانے میں بار بار اپنی تقریروں میں اِس اہم مسئلہ پر بحث کی تھی۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں:۔

"...... جداگانہ انتخاب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی حکومت پر اعتماد نہیں۔ لیکن یاد رکھیئے۔ تنہا جداگانہ انتخاب مسلمانوں کے جملہ خدشات کو رفع کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ صرف اُن مسلمانوں کو وزارت میں شامل کیا جائے۔ جو جداگانہ انتخاب کے تحت اپنی قوم کا اعتماد حاصل کر کے اسمبلی میں آئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ ایوان کی سب سے بڑی پارٹی کے رُکن ہیں یا نہیں ...... فرض کیجئے کہ مسلمانوں کے لیے بیس نشستیں محفوظ ہیں۔ انتخاب کے وقت کانگرس ان بیس نشستوں سے اپنے اُمیدوار کھڑے کرتی ہے۔ لیکن صرف پانچ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اگر کانگرس اِن پانچ اُمیدواروں میں سے ایک کو وزارت کا منصب بخش کر یہ خیال کرتی ہے۔ کہ اُس کا نامزد کیا ہُوا مسلمان وزیر مسلمانوں کے حقوق کا محافظ تصوّر کیا جاتا چاہیئے۔ تو یہ طرزِ عمل جمہوری اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔

"ایک صوبے میں، جہاں کانگرس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوا تھا، ایک انڈی پنڈنٹ مسلمان کو گھیر گھار کر اُس سے کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کروائے۔ اور اُسے فوراً وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیا اِسی کا نام جمہوریت ہے؟ کیا جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

"اب یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے۔ کہ اقلیتوں کے تحفظات اور جداگانہ انتخاب کو کانگرس کے اس طرزِ عمل نے تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔ مسلمانوں نے آئین اور دستور میں اپنے لیے جو مقام حاصل کیا تھا اُسے بالکل توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔ اندریں حالات کیا آپ توقع رکھ سکتے ہیں۔ کہ مسلمان آپ کی اِس کارگذاری سے مطمئن ہوں گے؟ یہی وجہ ہے کہ اُن کے جذبات میں اضطراب اور ہیجان پیدا ہو رہا ہے اور وہ آئندہ کسی بہتر اور زیادہ مُوثر دستور کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

"میں خود ایک زمانے میں اِس بات کا حامی تھا۔ کہ نشستوں کے تحفظ کے ساتھ ملک میں مخلوط انتخاب رائج ہونا چاہیے۔ لیکن کانگرس کا موجودہ رویّہ اور اُس کا طریقِ عمل دیکھنے کے بعد۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامّل نہیں کہ آئندہ ہندوستان میں مخلوط انتخاب جاری ہونے کا قطعاً کوئی امکان باقی نہیں رہا۔" لے

لے Congress in office (1940) By C.R. Reddy, Page 82

سر پرسیول گرفتھس، جو ایک زمانے میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں یورپین گروپ کے لیڈر تھے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"..... کانگرس ہائی کمان نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرس اور لیگ کی مشترکہ وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی وزارتوں کو صرف کانگرس پارٹی کے ممبروں تک محدود رکھا۔ مثلاً جب یو۔پی میں وزارت سازی کا وقت آیا۔ تو مسلمانوں سے کہا گیا۔ کہ اگر وہ مسلم لیگ کو توڑ کر انفرادی اور مجموعی طور پر کانگرس میں جذب ہو جائیں تو انھیں وزارت میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ باقی صوبوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

" بلاشبہ کانگرس کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ لیگ اور کانگرس کے معاشرتی اور سیاسی پروگرام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسی لیے اگر کانگرس لیگ سے مل کر مشترکہ وزارتیں بنا لیتی۔ تو ایسی وزارتیں نہایت آسانی سے کام کر سکتی تھیں۔ بجا سہی یا بے جا مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ انھیں اقتدار سے صرف اس لیے محروم رکھا گیا ہے کہ کانگرس سراسر ہندوانہ جماعت ہے"۔ [1]

سید طفیل احمد منگلوری مرحوم، جو مسلم لیگ کے سخت مخالف اور کانگرس کے بہت

---

[1] The British Impact on India By Sir Percival Griffiths, Page (340)

بڑے معاون تھے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

"...... مسلم لیگ کے مینی فسٹو میں مسلمانوں کی مخصوص ضروریات میں سے صرف مذہب، زبان اور رسم الخط کی حفاظت درج تھی۔ اُس کے بعد ملکی ترقی کے کاموں۔ اور عوام الناس کے فوائد کے بارے میں مسلم لیگ نے کانگرس کا پروگرام اختیار کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ہر جگہ کانگرس نے انتخاباتِ اسمبلی میں مدد دی اُس وقت معلوم ہوتا تھا۔ کہ بیس سال بعد قران السعدین واقع ہوگا۔ اور مسلم لیگ اور کانگرس یک جان و دو قالب ہو کر ملکی کام کریں گی۔ مگر فلکِ کج رفتار کو کب گوارا تھا۔ کہ یہ دونوں جماعتیں پھر دوش بدوش کام کریں۔ چنانچہ انتخابات میں کانگرس کی غیر معمولی کامیابی کے ساتھ ہی مسلم لیگ سے اُس کی بدمزگی ہو گئی۔ بدمزگی کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ کانگرس نے اپنی اکثریت دیکھ کر اپنے وزرا میں مسلم لیگ کے لوگوں کو شامل کرنے سے انکار کر دیا۔" [1]

سید طفیل احمد منگلوری نے کانگرس کی رعونت اور بے تدبیری کی ذمے داری "فلکِ کج رفتار" پر ڈال دی ہے۔ یہ سیاست نہیں شاعری ہے۔

ایڈورڈ ٹامسن، جو گاندھی، جواہر لال، راج گوپال اچاری اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ذاتی دوست تھے۔ اور انگلستان میں سالہا سال تک کانگرس کا پراپگنڈہ

---

[1] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از سید طفیل احمد منگلوری صفحہ ۵۹

کرتے رہے تھے۔ اسی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" اگر آپ مجلسِ قانون ساز میں۔ کسی جماعت کے لیے جداگانہ نشستیں محفوظ کرنے کا قاعدہ اختیار کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اس قاعدے کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ جماعت کابینہ میں بھی اسی نسبت سے اپنے لیے جداگانہ نمائندگی کا مطالبہ کرے گی۔ اور اگر آپ یہ مطالبہ پورا کرنے سے انکار کریں گے۔ تو وہ جماعت یہ کہنے پر مجبور ہوگی۔ کہ اس قسم کی جداگانہ نیابت۔ جو اُسے طاقت اور اقتدار سے محروم رکھتی ہے محض ایک فریب ہے۔

" کانگرس نے اپنے مختصر سے کابینہ میں، جو صرف چھ آدمیوں پر مشتمل تھا، کسی مسلم لیگی کو شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا اس طرح مسلم لیگ میں غم و غصّہ کی ایک شدید لہر پھیل گئی۔ موجودہ ہندو مسلم کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ یہی ایک واقعہ ہے مسلم لیگ نے جب دیکھا کہ اُسے سیاسی طاقت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ تو وہ صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ سخت مخالفت پر اُتر آئی۔

" بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ یہ کانگرس کی غلطی تھی جب تک انتخاب کا طریقہ قائم ہے۔ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ فرقہ دارانہ اصولوں پر پارٹیاں بنائی جائیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا۔ کہ جب تک جداگانہ انتخاب ختم نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں مشترکہ وزارتیں (کولیشن) ہی قائم ہونی چاہییں۔ کانگرسی لیڈر اب اپنی غلطی

کو محسوس کر رہے ہیں"۔ [1]

بمبئی کے مشہور قومی رہنما کانجی دوارکا داس نے یہ تمام دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے جس انداز سے اس پر تبصرہ کیا ہے وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

"کانگرس کو صوبائی اسمبلیوں میں قطعی اکثریت ہونے کی امید نہیں تھی زیادہ سے زیادہ جو امید اسے ہو سکتی تھی یہ تھی کہ کانگرس پارٹی ایوان میں سب سے بڑی پارٹی ہو گی۔ اور اگر وزارت سازی کا وقت آیا تو اسے کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر کولیشن بنانی پڑے گی۔ اس خیال کے پیشِ نظر کانگرس نے انتخابات سے پہلے مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کر لی تھی۔ تحریری معاہدہ البتہ کوئی نہیں تھا لیکن یو۔پی میں جواہر لال نہرو اور خلیق الزماں کا سمجھوتہ ہو گیا تھا کہ وہ اکٹھے بدیشی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں گے۔

---

[1] ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)
By Edward Thompson, Page 56

ایڈورڈ تھامسن یہ حکایت مشہور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ کہ علامہ اپنی وفات سے قبل نظریہ پاکستان کے مخالف ہو گئے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں اس کتاب میں آگے چل کر۔ ایڈورڈ تھامسن اور اس کی اس حکایت پر تفصیلی بحث کروں گا۔

لیگ اور کانگریس کا یہ سمجھوتہ سیاست میں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس سے قبل موتی لال نہرو اور جناح لیجسلیٹو اسمبلی میں متحد ہو کر کام کرتے رہے تھے۔ پھر آگے چل کر بھولا بھائی ڈیسائی --- اور لیاقت علی خاں نے بھی مرکزی اسمبلی میں متحد ہو کر کام کیا تھا۔ ظاہر ہے جب موتی لال اور جناح ایسے انسانوں کا اتحاد ہو جائے تو یہ اتحاد کس قدر طاقت ور ہو گا۔

انتخابات کا نتیجہ نکلنے پر معلوم ہوا کہ کانگریس کو مدراس۔ یو۔ پی۔ سی، پی۔ بہار اور اڑیسہ میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی ہے۔ اور بمبئی۔ بنگال۔ آسام اور شمال مغربی صوبہ سرحد میں وہ سب سے بڑی پارٹی ہے۔

بمبئی کے نامزد وزیر اعظم بی۔ جی۔ کھیر نے اپنا کابینہ مرتب کرنے سے پہلے جناح سے مل کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مسلم لیگ پارٹی کے دو ممبروں کو اپنی وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ ہے۔ جناح نے بخوشی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور کانگریسی وزارت کے ساتھ مکمل تعاون کرنے کا یقین بھی دلایا۔ کھیر نے خود یہ واقعہ مجھے سنایا تھا۔ اور بعد میں جناح نے اس کی تصدیق بھی کی تھی۔ لیکن کانگریس کے ہائی کمان، بالخصوص سردار پٹیل نے کھیر کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی کہ وہ کیوں جناح کے پاس گیا تھا۔ کانگریس کا ہائی کمان جناح سے کوئی بات چیت کرنے کا روادار نہ تھا۔

چنانچہ ہوا یہ کہ مسلم لیگ کے دو ممبروں کو وزارت میں جگہ دینے کی بجائے کانگرس نے اُلٹا یہ مطالبہ کیا کہ یہ ممبر مسلم لیگ سے مستعفی ہوکر کانگرس میں شامل ہو جائیں تو انھیں کابینہ میں جگہ دی جاسکے گی۔

مسلم لیگ کے لیے یہ نہایت توہین آمیز مطالبہ تھا۔ اور جناح یقیناً بُرا ماننے میں حق بجانب تھا چنانچہ اُس نے یہ شرط ماننے سے انکار کردیا۔ وہ کانگرسی وزارت کے ساتھ تعاون کرنے کو تو تیار تھا۔ لیکن اِس تعاون کی خاطر اپنی پارٹی توڑ کر اُسے دفن کرنے کو تیار نہ تھا۔

یو۔پی میں نہرو نے بھی اِسی قسم کی غلطی کا ارتکاب کیا۔ کانگرس کی خلافِ توقع کامیابی سے اُس کا ذہنی توازن قائم نہ رہ سکا۔ اور جو سمجھوتہ اُس نے خلیق الزمان کی اس درخواست کو کہ مسلم لیگ کے دو ممبروں کو کانگرسی وزارت میں شامل کر لیا جائے ٹھکرا دیا گیا۔ حالانکہ یہ خلیق الزمان ہی تھا جس کی مدد سے رفیع احمد قدوائی جیسے کانگرسی کو اسمبلی کا ممبر منتخب کیا جاسکا تھا۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر ۱۹۳۷ء میں کانگرس عقل مندی، شرافت اور سیاسی دور اندیشی سے کام لے کر جناح اور مسلم لیگ کا خوش دلانہ تعاون حاصل کر لیتی۔ اور بمبئی اور یو۔پی۔ جیسے دو بڑے صوبوں میں کانگرس اور لیگ مل کر کام کرتیں تو آج ہندوستان کی کیا حالت

ہوتی۔

جہاں جہاں کانگریس نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس قدر مضبوط اور طاقت ور ہے کہ براہِ راست برطانوی حکومت سے سودے بازی کر سکتی ہے وہاں اُس نے جناح اور مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا۔ کانگریس کو یہ غرور تھا کہ اُسے مسلمانوں کے تعاون کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہذا اب وہ آسانی سے جناح کو ذلیل کر سکتی ہے۔

کانگریس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں جس رعونت اور سیاسی بے تدبیری کا مظاہرہ کیا تھا، آئندہ دس سال میں بار بار اُس کا اعادہ کیا گیا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ ملک ہندوستان اور پاکستان دو جداگانہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو کے سوانح نگار مائیکل بریشر نے اپنی کتاب میں اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"انتخابات کے دوران میں دونوں پارٹیوں (کانگریس اور مسلم لیگ) کے درمیان کسی حد تک اشتراک و تعاون ہو گیا تھا۔ بالخصوص یو۔پی میں تو ایک نوع کا بین السطور سمجھوتہ تھا کہ کولیشن وزارت بنے گی۔ یہ انتخابات سے پہلے کی صورت تھی جب کانگریس کو واضح اکثریت

1- "India's Fight For Freedom" by Kanji Dwarka Das (1966) Pages 464-467.

حاصل ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ الیکشن کے بعد یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں۔ لیگ کے دستِ تعاون کو نفرت سے جھٹک دیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ کانگرس نے قطعی انکار نہیں کیا تھا۔ لیکن جو شرطیں اُس نے لیگ کو پیش کی تھیں وہ بالکل ناقابلِ قبول تھیں۔ مثلاً یہ کہ کہ مسلم لیگ کے جن ممبروں کو کابینہ میں شامل کیا جائے گا وہ لیگ کی رکنیت ترک کر کے کانگرس کے ممبر بن جائیں۔ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی توڑ دی جائے اور اس کے تمام ممبر کانگرس میں شامل ہو جائیں آئندہ صوبے کے کسی ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کو اپنا اُمیدوار کھڑا کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔

یہ شرطیں دراصل مسلم لیگ کو ایک قسم کا الٹی میٹم تھا کہ اپنی جداگانہ تنظیم توڑ دو۔ جناح کے نزدیک کانگرس کا یہ مطالبہ بالکل اعلانِ جنگ تھا چنانچہ اُس نے جواب بھی اُنہی الفاظ میں دیا۔ جولائی کے آخر میں اُس نے اپنی قوم کو آئندہ جدوجہد کے لیے ایک مرکز پر جمع ہو جانے کی نصیحت کی۔ پھر اُس نے مُلک بھر کا دورہ کر کے مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد کا سبق دیا۔ یُوں کہنا چاہیئے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی جنگ میں مخالف فریقوں نے پہلی گولی چلا دی تھی۔ اور آگے چل کر اس جنگ کے شعلوں نے پُورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تا آنکہ برِ عظیم تقسیم ہو گیا۔" سلہ

سلہ "Nehru! A Political Biography" by Michael Brecher (Page 231).

ڈاکٹر شنشادھر سمہنا، جو کلکتہ کے مشہور اخبار ہندوستان سٹینڈرڈ کے ایڈیٹر اور حکومتِ ہند کے پبلیکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ کانگریس کی اِس پالیسی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اگر کانگریس عقل سے کام لیتی اور لیگ کے ساتھ مفاہمت کر کے کولیشن قائم کر لیتی۔ جس میں مثلاً لیاقت علی خاں کو، جو آگے چل کر پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم بنے، وزارت کا عہدہ دے دیا جاتا۔ تو آج ہندوستان کی حالت یہ نہ ہوتی جو ہے۔ یو۔ پی میں اِس قسم کی کولیشن کے قائم ہونے کی واحد صورت یہ تھی کہ مسلم لیگ کی جداگانہ اور خودمختار حیثیت کو تسلیم کر لیا جاتا۔ بجائے اس کے اُلٹا یہ احمقانہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلم لیگ اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے کانگریس میں جذب ہو جائے تو اُسے وزارت میں شامل کیا جائے گا۔

عملی نقطۂ نگاہ سے یہ پالیسی ہرگز قابلِ پذیرائی نہ تھی کیونکہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن چکی تھی جس کی مُلک بھر میں شاخیں موجود تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کولیشن کے لیے ضروری تھا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جاتا۔ اور لاریب ۱۹۳۷ء میں لیگ کی یہی حیثیت تھی۔ ماضی میں خواہ اُس کی حیثیت کچھ اور ہی رہی ہو۔

یہ طرزِ عمل کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کہ لیگ کے دو، ایک

اہم ممبروں کو اُن کی جماعت سے توڑ کر اُس کابینہ میں جگہ دے دی جائے جو سراسر کانگریسی کابینہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس وقت جو شخص باقاعدہ مسلم لیگ کا ممبر نہیں تھا اور لیگ کے ضابطے کے تحت کام نہیں کرتا تھا۔ وہ کبھی اپنی قوم کی نمائندگی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا تھا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے لیگ اُس وقت مسلمانوں کی مجموعی زندگی کا مرکز اور محور بن چکی تھی۔

مسٹر نہرو کا یہ دعوےٰ بالکل غلط اور بے معنی ہے کہ صرف کانگرس حبِّ وطن کی اجارہ دار ہے۔ اور جو شخص کانگرس میں شامل نہیں تھا وہ رجعت پسند۔ حبِّ وطن سے عاری۔ موقع پرست اور فیوڈل تھا"۔ [1]

ہندوستان کے ایک بہت بڑے قانون دان اور کانسٹی ٹیوشن کے ماہر اور حکومتِ بنگال کے سابق وزیر سر دیجے پرشاد سنگھ رائے نے اپنی ایک کتاب میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ:

"مسٹر جناح نے، ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل، جس مفاہمت اور مصالحت کی سپرٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ قابلِ تحسین تھا۔ اگر ہم اُن کی اُن

---

[1] "Indian Independence in Perspective" by Sasadhar Sinha (1964) Page 110.

تقریروں اور بیانوں کا تجزیہ کریں جو اُنھوں نے صوبائی خودمختاری کے نفاذ سے قبل دیئے تھے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے لیے مکمل، جمہوری اور ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اس بات کے حامی تھے کہ اسمبلیوں میں دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کسی مشترکہ پروگرام پر عمل کیا جائے۔ وہ اس امر کے بہت خواہش مند تھے کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر اور ایک مشترکہ محاذ قائم کر کے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے جدّوجہد کریں اُنھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مسلم لیگ کا مقصد یہ ہے کہ مادرِ وطن کی ترقی اور آزادی کی راہیں استوار کی جائیں۔ اور سعیٔ پیہم سے لائق اور قابل افراد کو آگے بڑھا کر اُن لوگوں کو ہٹایا جا سکے جو آزادی کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ایک تقریر میں اُنھوں نے نہایت خوبصورت انداز میں یہ کہا تھا کہ ہماری جماعت (مسلم لیگ) کسی قسم کی مخالفت، مزاحمت یا عداوت کی تحریک نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر قوم کے لیے پیغامِ صلح ہے۔ ہم ایسے ہر گروہ بلکہ متعدد گروہوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کو تیار ہیں جن کا مطمحِ نظر اور مقاصد ہمارے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ مسٹر جناح نے اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے باشندوں کے لیے مکمل سیلف گورنمنٹ کے حصول کی خواہاں ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں مسلمانوں اور دیگر

اقلیتوں کی باہمی مفاہمت ہی وہ بنیاد ہے جس پر ہندوستان کے اکتیس کروڑ باشندوں کے لیے قومی سیلف گورنمنٹ کی عمارت کھڑی کی جاسکے گی۔

انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے مطمح نظر میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی مکمل آزادی کا حصول ہے۔ کوئی خود دار اور غیرت مند ہندوستانی ایسا نہیں جو بدیشی راج کو پسند کرتا ہو یا اپنے ملک کے لیے مکمل آزادی اور سیلف گورنمنٹ کے حصول کا مخالف ہو۔ مسٹر جناح چاہتے یہ تھے کہ اسمبلیوں میں سچے، پکے نیشنلسٹ اور محبِ وطن بھیجے جائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا بہترین عنصر اسمبلیوں میں داخل ہوگا اور باہمی افہام و تفہیم سے کوئی مشترکہ پالیسی وضع کر کے اُس پر عمل پیرا ہوگا تو یقیناً آزادی کی منزل روز بروز قریب آنا شروع ہوگی۔

اُن دنوں مسٹر جناح کے پروگرام کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب۔ کلچر۔ زبان اور سیاسی حیثیت کے لیے آئینی اور پختہ تحفظات حاصل ہوجائیں اور جملہ اقلیتوں کا مسئلہ تسلی بخش طریقے سے طے ہوجائے تو ہندوستان کی آزادی کا معاملہ بڑی حد تک حل ہوجائے گا۔ مسٹر جناح یہ بھی کہتے تھے کہ اگر وہ مسلمانوں کی پوزیشن کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ

وہ ایک فرقہ پرست لیڈر رہیں۔ امر واقع بھی یہ ہے کہ کانگرس پارٹی کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں جو گرانقدر امداد و اعانت مسٹر جناح نے دی تھی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر جناح رجعت پسند نہ تھے۔

مسٹر جناح کے خیالات اور نقطۂ نگاہ میں جو آگے چل کر تبدیلی ہوئی وہ حالات و واقعات کا نتیجہ تھی۔ ہندوستان کے اکثر صوبوں کی مجالسِ قانون ساز میں جب کانگرس کو اکثریت حاصل ہوئی تو اُس نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں سے اچھا سلوک نہ کیا۔ اور مسلمانوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ صوبائی خود مختاری کے نظام کے تحت وہ کانگرسی صوبوں میں بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر ہمروجے پرشاد سنگھ رائے نے کسی قدر تفصیل سے یو۔ پی کے حالات بیان کئے ہیں۔ کہ وہاں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کانگرس کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کو بالکل تیار تھا۔ اور کانگرس کے اقتصادی اور سیاسی پروگرام پر عمل کرنے کو بھی آمادہ تھا۔ لیکن جب مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ شرطیں پیش کیں کہ مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ کے تمام ممبر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دیا جائے۔ اور آئندہ مسلمانوں کے حلقوں سے امیدوار کھڑے کرنے کا کام بھی کانگرس کے ذمے ہوگا۔ تو مسلم لیگ میں غم و غصہ کے جذبات پیدا ہو گئے۔

اُس کے بعد ہمروجے پرشاد لکھتے ہیں :۔

یہ شرطیں جو کانگریس نے مسلم لیگ کو پیش کی تھیں، گویا قیمت تھی اس بات کی کہ اگر مسلم لیگ والے کانگریسی وزارت میں جگہ لینی چاہتے ہیں تو یہ قیمت ادا کریں۔ ظاہر ہے کانگریس کا رویہ حد درجہ متکبرانہ اور غیر مصالحانہ تھا۔ امرِ واقع یہ ہے کہ کانگریس دیگر تمام سیاسی جماعتوں کے وجود کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ مفاہمت اور مصالحت کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ مشترکہ وزارتیں بنانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اکثریت کسی قسم کی وسعتِ قلب کا اظہار کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا رویہ ڈکٹیٹرشپ کی صورت اختیار کر گیا تھا جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مسلم لیگ اور دوسری غیر کانگریسی پارٹیوں کے رویے میں بھی سختی پیدا ہو گئی۔ کانگریس صرف اُن مسلمانوں کو وزارت میں شامل کرنے کو تیار تھی جو مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر کانگریس کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کی وزارت ایک پارٹی کی وحدانی حکومت بن گئی تھی۔ اور حزبِ مخالف کو خواب میں بھی یہ اُمید نہ ہو سکتی تھی کہ کبھی متبادل وزارت بنا سکے گی۔ اِن حالات میں پارلیمنٹری نظامِ حکومت کے پنپنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کانگریس کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا گویا وہی ہندوستان کی تنہا نمائندہ جماعت ہے۔ اور جو پارٹیاں کانگریس کے خلاف تھیں اُن کو کانگریسی اخبار وطن کا غدار کہتے تھے پنڈت جواہرلال نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ملک میں صرف

دو پارٹیاں ہیں۔ ایک کانگرس اور دوسری حکومت"۔ ؎۱

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ مسلم لیگ نے صرف چھ عدد وزارتوں کے لیے ہندوستان بھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔ یہ اندازِ فکر غلط، گمراہ کن اور سیاسی حقائق سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ سوال چھ عدد وزارتوں کا نہیں تھا۔ بلکہ سوال یہ تھا کہ کیا ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومی ہستی کے مالک ہیں یا نہیں؟ انگریز نے ۱۹۰۶ء میں جداگانہ انتخاب کا اصول منظور کرکے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور کانگرس نے ۱۹۱۶ء میثاقِ لکھنؤ پر دستخط کرکے اسی جداگانہ قومی ہستی کی تصدیق کر دی تھی میثاقِ لکھنؤ بدستور قائم تھا۔ جس کے بوجھ سے لیگ اور کانگرس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ پھر کانگرس کس منہ سے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی سے انکار کر سکتی تھی؟

کانگرس نے جب کھلے میدان میں شکست کھائی۔ تو چور دروازہ سے داخل ہو کر مسلمانوں کے قومی شیرازہ کو منتشر کرنا شروع کیا۔ گاندھی جی ہمیشہ صداقت، اخلاق اور اصول کا پرچار کرتے تھے۔ لیکن اُن کے حواریوں نے، اُن کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کو وزارت کی رشوت دے دے کر۔ اپنی قوم سے غداری کرنے کا سبق سکھانا شروع کیا۔ کسی مسلمان کو پارلیمنٹری سیکرٹری بنانے کا چکمہ دیا گیا کسی سے نوکری کا وعدہ کیا گیا۔ اور کسی کو ممبری کا لالچ دیا گیا۔ لیکن ہر جگہ شرط یہ رکھی گئی کہ پہلے مسلم لیگ کو چھوڑ کر۔ کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرو۔ پھر سب

؎۱ "Parliamentary Government In India" By Sir B. P. Singh Roy. Page 366-67

کچھ مل جائے گا۔

یہ تو وہی پرانے ہتھکنڈے تھے۔ جو انگریز برتا کرتا تھا۔ اور اب چونکہ انگریز کے "امپیریلزم" کی جگہ کانگرس کا "امپیریلزم" قائم ہو گیا تھا۔ اس لیے پرانی شراب نئے گلاسوں میں تقسیم ہونے لگی تھی۔

کانگرس نے اعلان کر دیا تھا۔ کہ وہ کسی صوبے میں کسی غیر کانگرسی کو اپنی وزارت میں جگہ نہیں دے گی۔ ہندو اقلیت کے صوبوں میں جہاں غیر کانگرسی حکومتیں قائم تھیں، کانگرس نے وزارتوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے جب وزارت مرتب کی۔ تو اُن کی خواہش تھی کہ کانگرس بھی اُس میں شرکت کرے۔ لیکن کانگرس نے اس بنا پر اس پیش کش کو رد کر دیا کہ وہ کسی غیر کانگرسی وزارت کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنا گناہ سمجھتی ہے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم کی وزارت کو حزبِ مخالف کے ہاتھ سے شکست ہوئی۔ لیکن اسمبلی کے ایوان میں، جس کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۵۰ تھی۔ کانگرسی ممبر صرف ۱۹ تھے۔ اس لیے تنہا کانگرس اپنے بل بوتے پر نئی وزارت بنانے کے قابل نہ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو صوبہ سرحد کے انچارج تھے۔ جھٹ حکم دے دیا کہ غیر کانگرسی عناصر کو ساتھ لے کر وزارت بنائی جائے۔ چنانچہ چار ممبر ڈیموکریٹ پارٹی کے۔ دو انڈی پینڈنٹ اور دو مہاسبھائی ممبروں کو شریک کر کے ڈاکٹر خان صاحب نے "کانگرسی وزارت" قائم کر لی۔ سر عبدالقیوم کے کابینہ میں تین وزیر تھے۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے ڈیموکریٹ پارٹی کا ایک غیر کانگرسی وزیر بھی شامل کر لیا اور

وزرا کی تعداد تین کی بجائے چار کر دی گئی۔

یو۔پی۔ سی۔پی۔ بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں کانگرس کا اصول تھا کہ کسی غیر کانگرسی کو وزارت میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ پارلیمنٹری جمہوریت کا تقاضا ہے۔ کہ صرف ایک پارٹی کی حکومت ہو۔ لیکن جب صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں باہمی انتشار پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ تو فوراً یہ ناقابلِ ترمیم و تبدیل اصول بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اور مشترکہ وزارت (کولیشن) بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ اس روز اتفاق سے ایوان میں صرف ۷۰ ممبر موجود تھے۔ چنانچہ سات کانگرسی۔ آٹھ مہاسبھائی اور آٹھ یونائیٹڈ پارٹی کے مسلمان ممبروں نے اکٹھے ہو کر حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔ تین ممبر غیر جانبدار رہے۔ اس طرح دو ووٹوں کی کمی سے سر غلام حسین کی وزارت ٹوٹ گئی۔

سندھ اسمبلی میں کانگرسی ممبروں کی تعداد صرف نو تھی۔ ظاہر ہے اس قلیل تعداد سے کانگرس مشترکہ وزارت تو بنا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے کانگرس کے ہائی کمان نے حکم دیا۔ کہ مسلمانوں کی باہمی پھوٹ سے جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اٹھایا جائے۔ چنانچہ کانگرس نے سر غلام حسین کے حریف خان بہادر اللہ بخش کو مدد دینے کا پورا وعدہ کیا۔ اس طرح اللہ بخش نے یونائیٹڈ پارٹی کے اٹھارہ مسلمان، مہاسبھا کے گیارہ ہندو اور کانگرس کے نو ممبروں کو اپنے ساتھ ملا کر وزارت قائم کر لی۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو آسام میں سر سعد اللہ کی وزارت کو شکست ہوئی۔ آسام اسمبلی

کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۱۰۸ تھی۔ جن میں سے ۳۴ مسلمان تھے اور ۳۳ کانگرسی ہندو تھے۔ سعد اللہ نے غیر کانگرسی ارکان کو اپنے ساتھ ملا کر ایک اچھی خاصی مضبوط حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن کانگرس اندر ہی اندر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انجام کار یہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور کانگرس پارٹی لیڈر گوپی ناتھ باردولائی نے غیر کانگرسی ہندوؤں۔ اور سعد اللہ کے مخالف مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر متبادل حکومت قائم کر لی۔ سعد اللہ کے کابینہ میں پانچ وزیر تھے۔ لیکن باردولائی نے وزیروں کی تعداد کو بڑھا کر آٹھ کر دیا۔ جن میں چار کانگرسی اور چار غیر کانگرسی تھے۔ ان میں تین وزراء مسلمان تھے۔ جو تینوں کے تینوں غیر کانگرسی تھے۔[۱]

---

[۱] بعض لوگ کہتے ہیں کہ آسام میں سعد اللہ کی وزارت تڑوانے اور گوپی ناتھ باردولائی کی وزارت بنوانے میں براہِ راست مولانا ابوالکلام آزاد کا ہاتھ نہیں تھا۔ ان لوگوں کے انشراحِ صدر کے لیے میں روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کی یہ خبر جو ایسوسی ایٹڈ پریس کی معرفت تمام اخباروں میں شائع ہوئی تھی نقل کرتا ہوں

شیلانگ۔ ۱۷ ستمبر
صوبے کی کانگرسی وزارت کے ارکان کا آخری انتخاب کرنے سے پہلے کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس اور کانگرس کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کے ممبر مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹیلی فون کے ذریعے سے بابو راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل سے طویل گفتگو کی۔ مسٹر باردولائی دو گھنٹے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس سے واپس آئے تو مولانا ابوالکلام آزاد

(بقیہ حاشیہ ص۴۹۳ پر)

یہ سب کچھ "امام الہند" مولانا ابوالکلام آزاد کی آنکھوں ہی کے سامنے نہیں بلکہ اُن کی شبانہ روز کوشش اور محنت سے ہو رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اب مولانا کا صرف یہ کام رہ گیا تھا۔ کہ جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ وہاں اُن کی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے انھیں ہندو اکثریت میں مدغم کر دیا جائے۔ اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں سازشوں۔ ریشہ دوانیوں اور افترا پردازیوں کے جال پھیلا کر۔ اُن کی قومی جمعیت کو پارہ پارہ کیا جائے۔ تاکہ اغیار کو حکمرانی کے مواقع مہیا ہوتے رہیں۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

بدرالدین طیب جی سے لے کر تصدق احمد خاں شروانی تک ہندوستان کے بیسیوں مسلمان اکابر وقتاً فوقتاً کانگرس میں شریک رہ چکے تھے۔ جن میں محمد علی ایسے آتش نفس، انصاری ایسے ایثار پیشہ، جناح ایسے آئین پسند، حسن امام ایسے قانون داں اور حسرت موہانی ایسے رئیس المتغزلین سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔ لیکن مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس بے حسی بلکہ سنگدلی سے قربان کرنے کا شرف حضرت "امام الہند" کے حصے میں آیا تھا۔ وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

نے اخبارات کے نامہ نگاروں کو بتایا کہ مسٹر باردولائی نے اپنے مجوزہ کابینہ کے پانچ ہندو وزیروں کے نام گورنر کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ گوپی ناتھ باردولائی۔ کامنی کمار سین۔ اکشوئے کمار داس۔ رام ناتھ داس۔ روپ کمار برہما۔ تین مسلمان وزرا کے نام کل گورنر کو پیش کیے جائیں گے۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ کل شام تک مکمل کابینہ کے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا جائے گا۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد۔ کانگرس کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ہر ناجائز وسیلہ اختیار کر کے۔ اور ہر شرمناک حرکت کو کام میں لا کر مسلم لیگ کا زور توڑ دے۔ تاکہ مسلمانوں کو، سیاسی اعتبار سے بے والی و لاوارث بنایا جا سکے کانگرس پورے برِ عظیم ہند کی شہنشاہی کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اس خواب کی حسبِ منشا تعبیر جب ہی ممکن تھی۔ کہ مسلمانوں کا کانٹا نکل جائے۔ مسلمانوں کی اقلیت کے صوبوں میں تو کانگرسی راج، بلا شرکتِ غیرے قائم ہو چکا تھا۔ البتہ پنجاب۔ بنگال۔ سندھ اور سرحد کا مغلوب و مفتوح ہونا باقی تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہاں غیر کانگرسی وزارتوں کے مخالفوں کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور حامیانِ وزارت میں پھوٹ ڈالی جائے۔ مسلم لیگ کا زیادہ زور اقلیت کے صوبوں میں تھا۔ کانگرس محسوس کر رہی تھی کہ اگر اقلیت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو کچل دیا گیا۔ تو باقی صوبوں میں اس کا زور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چونکہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں تھی۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے۔ اس لیے لیگ کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا بے والی و لاوارث ہو جانا یقینی تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگرسی حکومت قائم ہو ہی چکی تھی۔ پنجاب اور بنگال میں اگرچہ کانگرس کا برسرِ اقتدار ہونا

بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر ان صوبوں کے مسلمانوں کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ تو پھر کانگرس ان میں ہر صوبے کے لیڈروں سے الگ الگ مفاہمت کر کے۔ اور انھیں چند تحفظات عطا کر کے اپنی بالادستی قائم کرے گی۔" [1]

پروفیسر کوپ لینڈ کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد غور فرمائیے۔ کہ جب اٹھارھویں صدی میں مغلیہ حکومت کا مرکزی نظام کمزور ہو گیا تھا۔ تو کیا انگریز نے بتدریج ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے۔ من و عن یہی طریقے اختیار نہیں کئے تھے؟ جونہی ہندوستان کے تمام صوبوں کو مجتمع کرنے والی مرکزی طاقت، باقی نہ رہی۔ انگریز نے سراج الدولہ کے بنگال سے لے کر دلیپ سنگھ کے پنجاب تک ایک ایک صوبے کو آسانی سے ہضم کر لیا تھا۔ کانگرس بھی انگریز کے "امپیریلزم" کو اپنے لیے نمونۂ عمل قرار دے کر۔ اسی راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب اُس کی انتہائی کوشش تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانانِ ہند کے مرکزی نظام کو جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ تھا پاش پاش کیا جائے۔

ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی وائس چانسلر آندھرا یونیورسٹی فرماتے ہیں:۔

"کانگرس نے مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لیے جو طریقے اور حربے اختیار کئے تھے اُن میں سب سے پہلا حربہ یہ تھا۔ کہ تمام فرقہ وارانہ جماعتوں کو ختم کر دیا جائے۔ تاکہ کانگرس کا یہ دعوےٰ صحیح ثابت ہو سکے کہ وہی

---

[1] INDIAN POLITICS (1936-1942), Page 181

ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ جو برطانوی امپیریلزم کے ساتھ گفت و شنید کا استحقاق رکھتی ہے۔

۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ کانگرس نے اپنی مذکورہ بالا پالیسی کے پیش نظر مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کیا۔

۱:۔ مسلم رابطۂ عوام کی تحریک جاری کر کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اپنا رہنما تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

۲:۔ الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگرسی امیدوار کھڑے کئے گئے۔

۳:۔ کانگرسی وزارتوں میں اُن مسلمانوں کو شامل کرنے سے انکار کیا گیا۔ جنہیں جداگانہ انتخاب کی رُو سے اپنی قوم کا اعتماد حاصل تھا اور جو اپنی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔

۴:۔ اسمبلی کے اُن ممبروں کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یا انڈیپنڈنٹ منتخب ہو کر آئے تھے، وزارتوں اور عہدوں کا لالچ دے کر، کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اور جب انھیں اس قسم کے ہتھکنڈوں سے خرید لیا گیا۔ تو شرافت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر انھیں دوبارہ الیکشن لڑنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔

۵:۔ ہر چند کہ کانگرس کا یہ دعوےٰ تھا۔ کہ وہ کسی غیر کانگرسی فریق

کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت نہیں بنائے گی۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت
کے صوبوں میں کانگرس نے اِس اصول کو آسانی سے ترک کر دیا۔ اس
نے پہلے تو مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالی۔ پھر اُن کے باہمی اختلافات
سے فائدہ اُٹھاکر اُن کی وزارتوں کو توڑا۔ اور اپنی مخلوط وزارتیں
قائم کیں۔

۲:۔ کانگرس نے اقلیتوں کے آئینی تحفظات کا قلع قمع کر دیا۔
اور صوبوں میں وحدانی وزارتیں قائم کرکے، نیز دوسرے قابلِ
اعتراض ذرائع اختیار کرکے، ایسی جمہوری حکومتوں کے قیام کے
تمام امکانات کو ختم کر دیا، جن میں باہمی مشاورت اور یگانگت سے
نظامِ سلطنت چلایا جاتا ہے۔ بقول مسٹر جناح کے کانگرس نے
اس طرح اپنی فسطائیت کا ثبوت دیا" [1]

مسٹر جناح ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ۔ اور مخلوط انتخاب قبول کرنے پر
بالکل آمادہ تھے۔ لیکن صرف یہ چاہتے تھے۔ کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی
آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے
اس نازک موقع پر۔ سخت بے دردی سے جناح کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور یہ معمولی سی
ترمیم منظور کرنے پر بھی راضی نہ ہوئے۔

مسلسل آٹھ برس تک حالاتِ ناسازگار کا شکار رہنے کے بعد بھی جناح نے

---

[1] CONGRESS IN OFFICE, Page 135

ہمت نہیں ہاری تھی۔ اب ۱۹۳۷ء میں اُنھوں نے پھر کانگرس کی طرف اخوت و محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن موتی لال کے جواں بخت و جواں سال صاحبزادے نے حد درجہ تلخی و حقارت سے کام لے کر۔ اُس ہاتھ کو پھر جھٹک دیا۔ اور علی الاعلان کہا۔ کہ ہم جناح کے تعاون کے محتاج نہیں۔ ہم تو مسلم لیگ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر دم لیں گے۔

تعجب ہے کہ وہ نامور باپ اور یہ نامور بیٹا۔ دونوں گنگا نہا کر قوم پرست کے قوم پرست۔ اور محبِّ وطن کے محبِّ وطن بنے رہے۔ اور جناح غریب پر فرقہ پرستی اور وطن دشمنی کا الزام لگ گیا ؎

طعنہ بر فیضی مزن زاہد بپرس از کُم خاں
پاکدامانیِ رندانِ گریبان چاک را

بارھواں باب

سکندر جناح پیکٹ

(۱)

گزشتہ باب میں کانگرس کی جن سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کا اثر پنجاب پر بھی پڑا۔ اس بارے میں مسلم لیگ کی پوزیشن بالکل صاف تھی۔ ہم لوگ کھلے میدان میں کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ کانگرس خواہ کسی پہلو اور کسی زاویئے سے حملہ آور ہوتی۔ اور جو حربہ چاہتی استعمال کرتی۔ لیگ مسلمانانِ پنجاب کی مدافعت کے لیے ہمہ اوقات مستعد تھی۔ فکر سر سکندر حیات کو تھی۔ جن کی یونینسٹ پارٹی کے نوے فی صد ارکان مسلمان تھے۔ اور جو اِن مسلمانوں کو اپنی جماعت میں شامل رکھنے کے لیے۔ ایک ایسی مخلوط پارٹی کے محتاج تھے۔ جو بزعمِ خود چند سیاسی اور اقتصادی اصولوں پر کھڑی کی گئی تھی اب کانگرس کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی کے سیاسی اور اقتصادی پروگرام سے ہونے والا تھا اگر اس مقابلے میں یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبر

کٹ کر کانگرس میں شامل ہو جاتے۔ تو یونینسٹ پارٹی ختم ہو جاتی۔ اور اگر سندھ، سرحد اور آسام کی طرح خود مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ کانگرس کا ہم نوا بن جاتا۔ تو بھی یونینسٹ پارٹی کے مٹ جانے میں کوئی شک باقی نہ تھا۔ سر سکندر گویا ایک مخمصے میں گرفتار تھے۔ اگر وہ کھلے بندوں کانگرس کے مقابلے میں مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے میدان میں اُتر آتے تو یونینسٹ پارٹی کا بھرم قائم نہیں رہ سکتا تھا اور اگر وہ خاموشی سے تماشا دیکھتے اور محض اپنے اقتصادی پروگرام پر اعتماد کر کے بیٹھ رہتے۔ تو کانگرس کی یلغار کے سامنے ان کی وزارت کا بہت دنوں تک قائم رہنا محال تھا۔ صوبے کے تمام ہندو اخبار کانگرس کی پشت پر تھے۔ اور ہندوؤں کی بے اندازہ دولت۔ کانگرس کو اپنے پراپاگنڈے کے لیے ہر وقت میسر آ سکتی تھی۔ مسلمان اخباروں میں سے صرف روزنامہ انقلاب یونینسٹ پارٹی کا حامی تھا۔ زمیندار، احسان اور سیاست اس پارٹی کے ہم نوا نہیں تھے۔ اِن حالات و خطرات کو دیکھ کر یونینسٹ پارٹی کے بعض ذمہ دار ارکان نے دبی زبان سے مسٹر جناح کی تعریف و توصیف اور مسلم لیگ کی حمایت شروع کر دی۔ چنانچہ حکومتِ پنجاب کے چیف پارلیمنٹری سیکرٹری میاں احمد یار خاں دولتانہ نے اس تعریفی مہم کا آغاز کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانانِ ہند نے اپنے لیے جو سیاسی تحفظات حاصل کیے ہیں اُنھیں یقیناً اُس وقت تک قائم رہنا چاہیے۔ جب تک کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مستقل مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ اس بارے میں تمام مسلمان متحد اور ہم خیال ہیں۔ اس لیے کیا یونینسٹ اور

کیا غیر یونینسٹ۔ پنجاب کے تمام مسلمان۔ آل انڈیا مسائل میں مسٹر جناح کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر بالکل آمادہ ہیں۔ مسٹر جناح سے ہمارا جھگڑا صرف اِس وجہ سے ہوا تھا۔ کہ ہم ایک ایسی غیر فرقہ وارانہ جماعت کو توڑنے پر تیار نہ تھے۔ جو مدت سے ہمارے صوبے میں قائم چلی آرہی تھی۔ اور جس کے ذریعہ سے ہم بلا امتیاز مذہب و ملت، عوام کے حقوق کی نگہداشت بہترین طریقے سے کر سکتے ہیں۔ آل انڈیا مسائل میں، ہماری کوئی جداگانہ پالیسی نہیں۔ اِس لیے اگر مسٹر جناح یونینسٹ پارٹی کا نقطہ نگاہ تسلیم کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ تو ہم اِس جھگڑے کو ختم کرنے پر تیار ہیں۔ سیاسی تحفظات کو مفاہمت کی بنیاد قرار دے کر جس فرقہ وارانہ سمجھوتے کی کوششیں مسٹر جناح کر رہے ہیں۔ ہم اُن کوششوں میں اُن کے شریک و سہیم بننے کو آمادہ ہیں۔"[1]

یہ "آل انڈیا مسائل" اور "صوبائی مسائل" کی تقسیم بالکل بے معنی تھی۔ کانگرس کا ایک "آل انڈیا" نظام تھا۔ جس کے تحت اُس نے ہندوستان کے تمام ہندوؤں کو متحد و منظم کر رکھا تھا۔ اس نظام میں کوئی رخنہ بندی، کوئی تفرقہ پسندی یا کوئی صوبہ پرستی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کی مجموعی طاقت اس قدر زبردست تھی۔ کہ اُس کے دبدبے کے سامنے سندھ، سرحد اور آسام کے صوبے ایک ایک

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۷ رمئی ۱۹۳۷ء

کر سکے جو ہو گئے۔

کانگرس کے اِس "ہندوستان گیر" نظام کا جواب صرف آل انڈیا مسلم لیگ کا "ہندوستان گیر" نظام ہی ہو سکتا تھا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق اور پنجاب میں سر سکندر حیات آہستہ آہستہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے جا رہے تھے۔

پنجاب کا دَورہ کرتے وقت اور عوام تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہوئے ہم ہمیشہ یونینسٹ پارٹی پر سخت اعتراض کرتے تھے۔ اور اُس کے وجود کو مسلمانوں کی قومی تنظیم کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتے تھے۔ لیکن اب کانگرس کی رَوش نے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا تھا۔ کہ مسلمانانِ پنجاب کو اُس خطرے سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ جو کانگرس کی یورش سے چاروں طرف پیدا ہو رہا تھا۔

ہمیں دس دس، پندرہ پندرہ ہزار کے مجمع میں تقریریں کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لوگ ہماری تقریریں سُن کر سوچتے تھے۔ کہ اگر کانگرس نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تو اِس کا جواب کیا ہونا چاہیئے؟ اگر کانگرس نے جداگانہ انتخاب کو اپنی شاطرانہ چالوں سے کالعدم کر کے رکھ دیا ہے۔ تو آئندہ جداگانہ انتخاب کا بدل کیا ہو گا؟ اگر کانگرس نے وزارتوں کی رشوت اور عہدوں کا لالچ دے دے کر۔ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ جیسی قومی جماعت سے غداری کرنے کا سبق سکھایا ہے۔ تو اس قسم کے ناقابلِ اعتبار ممبروں کو قومی زندگی سے کیونکر خارج کیا جا سکے گا؟ اگر سندھ، سرحد اور آسام میں کانگرس اپنے اصولوں سے منحرف ہو کر مسلمانوں کی قومی جمعیت کو پارہ پارہ کر سکتی ہے

تو پنجاب کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا کیا طریقہ ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ سادہ، ناخواندہ اور سیاسی مسائل سے بے خبر مسلمان عوام کو یہ سمجھانا مشکل تھا۔ کہ مخلوط یا "کولیشن" وزارت کسے کہتے ہیں۔ اور ایک پارٹی کی وحدانی حکومت کیا چیز ہوتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت کیا شے ہے اور آیا جداگانہ انتخاب کی موجودگی میں اس قسم کی پارلیمنٹری جمہوریت قائم بھی رہ سکتی ہے یا نہیں۔ تاہم جب عوام کو صاف، سیدھی زبان میں یہ بتایا جاتا تھا۔ کہ کانگرس نے اُن مسلمانوں کو وزارت کی گدّی پر بٹھا دیا ہے۔ جن کو سو میں سے ننانوے مسلمان اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ تو بات فوراً اُن کی سمجھ میں آجاتی تھی۔

۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں احتجاج ہوا تھا۔ تو احتجاج کرنے والوں میں تعلیم یافتہ لیڈروں کے پہلو بہ پہلو عوام بھی شامل تھے۔ اُس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف ہندوستان کی مرکزی کونسل کے تمام منتخب شدہ ممبروں نے ووٹ دیا تھا۔ کرنل ویجوڈ اس بات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے۔ کہ ہندوستانی عوام کا اگر جائزہ لیا جائے۔ تو ایک لاکھ میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا۔ جسے یہ معلوم ہو۔ کہ رولٹ ایکٹ کیا چیز ہے۔ تاہم وہ لوگ یہ ضرور جانتے ہیں۔ کہ جن ممبروں کو انھوں نے منتخب کر کے کونسل میں بھیجا تھا۔ اُن میں سے سو فی صد نے بلا استثنا اس ایکٹ کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

لیکن اِس کے باوجود حکومت نے اِس قانون کو ملک پر ٹھونسنے سے دریغ نہیں کیا۔ عوام کا یہی احساس گذشتہ فسادات کا سب سے بڑا سبب تھا"۔ ؎۱

کم و بیش یہی حقیقت ہم مسلمان عوام کے ذہن نشین کرتے تھے۔ کہ کانگرس نے مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا ہے۔ اور مسلمان قوم کے نمائندوں کے احتجاج کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی، اپنی صوابدید اور اپنی ہٹ دھرمی سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔

صوبائی خود مختاری کے نفاذ کے بعد۔ ہندوستان میں ایک وفاق یعنی فیڈریشن قائم ہونے والا تھا۔ ظاہر ہے کہ اِس وفاق میں بھی کانگرس کو ناقابلِ ترمیم اور مستقل اکثریت حاصل ہونے کا یقین تھا۔ اُس صورت میں کانگرس وہاں بھی مسلم لیگ کے ساتھ وہی سلوک کرتی۔ جو اُس نے چھ صوبوں میں کیا تھا۔ اِن حالات میں صاف نظر آرہا تھا۔ کہ مستقبل نہایت تلخ اور یاس انگیز ہے۔ اب صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا ہم شکست قبول کرتے۔ اور گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتے۔ یا غنیم کا چیلنج قبول کرتے۔ اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ جنگ جاری رکھتے۔ ہم نے دوسری صورت کو زیادہ عزیز اور آبرومندانہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ۔ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

؎۱ "THE LAST OF THE RADICALS."
BY C. V. WEDGWOOD, Page 130

"۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگرسی وزارتیں مرتب کیں۔ اور اس کے ساتھ مسلم رابطۂ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی۔ تو مسلمانوں کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان اسباب نے مل کر مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ لیگ نے کانگرس کے اس چیلنج کو، جو اس کے نزدیک تکبر و غرور اور نشۂ اقتدار کا نتیجہ تھا، بخوشی قبول کر لیا۔۔۔۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوے کیا۔ اور کانگرس کو ایک سراسر ہندوانہ جماعت قرار دیا۔" [1]

ہندوستان کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک وسیع لہر جاری تھی جب کہ ۱۵ تا ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا اس اجلاس میں وہ مشہور زمانہ تحریر معرض رقم میں آئی۔ جس نے بعد ازاں سکندر جناح پیکٹ کے نام سے خاص قسم کی شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ تحریر، جسے اس وقت قومی اتحاد کی ایک گراں مایہ دستاویز سمجھ کر، اہلاً و سہلاً کہا گیا تھا، آگے چل کر پنجاب

---

[1] "INDIA'S HINDU-MUSLIM QUESTION"
BY BENI PRASAD, Page 76

کی سیاسیات میں ایک اہم اور فیصلہ کن حصہ لینے والی تھی۔

تمام حالات و واقعات کو جرح و تنقید کی عینک سے دیکھنے کے بعد۔ میں آج اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ سکندر جناح پیکٹ ایک ایسی تحریر تھی۔ جس کے نتائج بڑے افسوسناک ثابت ہوئے۔ اسی تحریر نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو عملاً ختم کر کے رکھ دیا۔ اسی تحریر نے لیگ کو ایک عوامی جماعت بننے سے روک دیا۔ اسی تحریر نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی تحریر کا سہارا لے کر ۱۹۴۴ء میں ملک خضر حیات ٹوانہ نے مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پنجاب کے مسلمان عین اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہو گئے جب انہیں اتحاد و اتفاق کی سخت ضرورت تھی۔

اگر ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں پنجاب کے مسلمانوں میں باہمی نفاق پیدا نہ ہوتا تو ہماری قومی تاریخ کے اوراق پر نئی داستان لکھی جاتی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ میں بالواسطہ اسے بھی سکندر جناح پیکٹ ہی کا نتیجہ قرار دیتا ہوں۔ ایک فریق اس پیکٹ کے وجود ہی سے انکار کرتا تھا۔ اور دوسرا فریق اس کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

ملک خضر حیات نے جو کچھ کیا۔ کیا وہ غلط تھا یا صحیح؟ اس پیکٹ کی جو تعبیر وہ کرتے تھے۔ کیا اس میں وہ حق بجانب تھے یا فریقِ مخالف راستی پر تھا؟ میں سرِ دست اس مسئلہ سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ دونوں طرف ضد کار فرما تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ضد میں انسان کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں شکست کھانے کے باوجود۔ خضر حیات نے ہندوؤں اور سکھوں کے

ساتھ مل کر وزارت بنا ڈالی - یہی وزارت آنے والے فسادات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی - اور یہی فسادات تقسیم پنجاب کا سبب بنے - اور یہی تقسیم پنجاب تقسیم ہندوستان کا موجب بنی - اور یہ سب کچھ بالواسطہ سکندر جناح پیکیٹ ہی کا نتیجہ تھا -

علامہ اقبال ۷ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو لکھتے ہیں :

"اہلِ پنجاب کی ایک بہت بڑی جمعیت مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے لکھنؤ پہنچ رہی ہے - یونینسٹ مسلمان بھی سر سکندر حیات کے زیرِ قیادت اجلاس میں شریک ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں - لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لیے میں اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے مسٹر غلام رسول کو دے دوں گا - وہ یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے - مجھے اُمید ہے کہ آپ بڑے غور سے اِن اٹھائیس ممبروں کا انتخاب کریں گے - ہمارے آدمی ۱۲ر کو لاہور سے روانہ ہوں گے"! [1]

ڈاکٹر صاحب نے اٹھائیس آدمیوں کی جس فہرست کا ذکر کیا ہے - میں پہلے اُس کی وضاحت کر دوں - واقعہ یہ ہے - کہ ۸ر جون ۱۹۳۶ء کو جب لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے تھے - تو یونینسٹ پارٹی نے کھلم کھلا لیگ کے خلاف بغاوت کی تھی - اس وقت ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح سے کہا تھا - کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کو - جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر بھی ہیں - کونسل سے خارج کر دیا جائے - لیکن

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

مسٹر جناح نے بعض مصلحتوں سے اُن باغی ممبروں کو سزا دینا مناسب نہ سمجھا۔ اب کہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے باغی ممبروں کو، جن کی تعداد اٹھائیس تھی۔ لیگ کونسل میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لیے اُن کی جگہ اٹھائیس مخلص آدمیوں کو نامزد کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اِن اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے غلام رسول خاں کو دی تھی۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے یہ اٹھائیس ممبر بدستور لیگ کونسل میں شریک رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے از راہِ لطف و کرم جن لوگوں کے بارے میں "ہمارے آدمی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُن میں ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین۔ میاں عبدالمجید۔ ملک زمان مہدی۔ خلیفہ شجاع الدین اور یہ خاکسار شامل تھے۔ ہمارے ساتھ راجہ عبدالعزیز اور اللہ بخش سلیم بھی لکھنؤ گئے تھے۔ راجہ عبدالعزیز کے متعلق میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ ہائی کورٹ کے بار روم میں ہیڈ کلرک تھے۔ لیکن فرصت کے اوقات میں لیگ کے دفتری امور میں ہمارا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اور انگریزی مسودے ٹائپ کرنے کا سارا کام اُن کے سپرد تھا۔ اللہ بخش سلیم پنجاب مسلم لیگ کے دفتر میں کلرک تھے۔ اور زندگی و زندہ دلی کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ اور بہت سی خوبیوں کے مالک انسان تھے۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں پنجاب سے اکثر لوگ شریک ہوئے تھے مثلاً مسٹر حمید نظامی، جو اُس وقت، اسلامیہ کالج لاہور میں طلبہ کی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں۔ میاں فیروز الدین احمد۔ ملک لال دین قیصر

میاں بشیر احمد - حاجی امین الدین صحرائی وغیرہ - یونینسٹ پارٹی کا جو لشکر لکھنؤ پہنچا تھا - اُس میں سر سکندر - ملک خضر حیات ٹوانہ - میاں عبدالحی - نواب نثار علی خاں - میاں احمد یار خاں دولتانہ - راجہ غضنفر علی خاں - میاں امیر الدین - بیگم شاہنواز - سیّد امجد علی - نواب زادہ خورشید علی خاں - میر مقبول محمود - سیّد افضال علی حسنی - نواب محمد وٹ - میاں غیاث الدین - سر شیر محمد خاں - نواب مظفر خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں - ان کے علاوہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے نامہ نگار میر نور احمد بھی تھے جو یونینسٹ پارٹی کے حسبِ منشا اور سر سکندر کے حسبِ خواہش خبریں مرتب کر کے اپنے اخبار کو بھیجتے تھے -

۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو محمود آباد ہاؤس میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا - اور صدارت کی کرسی پر مسٹر جناح کی بجائے نواب اسمٰعیل خاں بیٹھے تھے - جلسے کی کارروائی بڑی بے کیف ہو گئی تھی - میں اُٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر آ گیا - اتنے میں غلام رسول خاں میرے برابر سے گزرے - میں نے پوچھا - کہاں کے دھاوے ہیں؟ کہنے لگے "مسٹر جناح کے کمرے میں سر سکندر حیات سے کچھ لکھت پڑھت ہونے لگی ہے - وہیں جا رہا ہوں - تم بھی آ جاؤ"

ہم مسٹر جناح کے کمرے میں داخل ہوئے - تو سامنے میز کے گرد مسٹر جناح سر سکندر - ملک برکت علی اور میر مقبول محمود بیٹھے تھے - دروازے کے قریب دو کرسیاں پڑی تھیں - غلام رسول خاں اور میں وہیں بیٹھ گئے - ملک برکت علی کچھ لکھنے میں مصروف تھے - جب لکھ چکے تو انھوں نے کاغذ مسٹر جناح کو دے دیا مسٹر جناح نے پڑھ کر وہی کاغذ سر سکندر کے حوالے کر دیا - سر سکندر نے جب

مسودہ پڑھا۔ تو غصے میں آ کر کہنے لگے "ہم نہیں مانتے۔ ملک صاحب تو ہماری وزارت توڑنے کے درپے ہیں"۔ اس پر ملک برکت علی، سر سکندر اور میر مقبول محمود کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ اب مسٹر جناح نے سر سکندر سے لکھنے کو کہا۔ انھوں نے میر مقبول محمود سے کہا۔ جب میر مقبول محمود لکھ چکے تو مسودہ باری باری سے مسٹر جناح، ملک برکت علی اور سر سکندر نے پڑھا۔ ملک برکت علی نے چند اعتراض کیے۔ اور شاید مسودے میں کہیں ایک آدھ جگہ کچھ تبدیلی بھی کی گئی۔ اس ساری کارروائی میں خاصا وقت خرچ ہوا۔ میرا خیال ہے اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ مسٹر جناح فارغ ہو کر سیدھے لیگ کونسل میں چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد سر سکندر بڑی گرم جوشی سے ملک برکت علی سے بغل گیر ہو گئے۔ ؎

؎ میر نور احمد صاحب نے اپنی کتاب مارشل لا سے مارشل لا تک کے صفحہ ۱۹۰ پر سکندر جناح پیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے ایک سراسر فرضی کہانی لکھ دی ہے کہ "راجہ غضنفر علی خاں وہ ٹائپ شدہ کاپیاں لے کر مسٹر جناح کی خواب گاہ میں پہنچے۔ لیمپ روشن تھا اور مسٹر جناح شب خوابی کے لباس میں تھے اور انھوں نے فرمایا کہ سب ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

راجہ صاحب مسلم لیگ سے قطع تعلق کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہونے اور سر سکندر کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری بن جانے کے باعث مسٹر جناح سے اس قدر خائف اور نادم تھے کہ انھیں تین چار سال تک مسٹر جناح کو اپنی صورت دکھانے کا بھی حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں سکندر جناح پیکٹ کی ترتیب و تحریر کے دوران میں راجہ صاحب کہیں موجود نہیں تھے۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس منٹ بعد۔ ہم پانچوں آدمی بیک وقت لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ جونہی سر سکندر نے اندر قدم رکھا۔ سارا پنڈال تالیوں اور نعروں۔ سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ تو اپنا جوشِ مسرت ضبط نہ کر سکے۔ اور بے تابانہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس رویے نے اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو ایک خاص قسم کی وحشت اور سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور وہ بڑے ہراساں ہو کر۔ اسلامی اکثریت کے صوبوں کی طرف امداد و اعانت کے لیے دیکھ رہے تھے۔ سر سکندر کی ذات گویا اس بات کی علامت بن گئی تھی کہ ہندوستان کا "بازوئے شمشیر زن" پنجاب اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کی پشت پناہ بنے۔ اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کو تیار ہے اسی احساس نے اس وقت لیگ کونسل کے پنڈال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ مسرت و شادمانی کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔

مسٹر جناح نے کھڑے ہو کر سر سکندر کو خوش آمدید کہا۔ اور فرمایا۔ کہ سر سکندر نے اعلان کیا ہے کہ وہ اور ان کی جماعت کے تمام ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔

مسٹر جناح کے اس ارشاد پر پھر پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ اور حاضرین کے چہروں پر ایک ایسی مسرت و طمانیت کے آثار نظر آنے لگے۔ جیسے میدانِ جنگ میں تازہ دم کمک کے پہنچ جانے سے تھکی ہوئی فوج کے اندر نئی زندگی کی رَو دوڑ جاتی ہے۔

سر سکندر نے پلیٹ فارم پر جا کر ایک نہایت تلی اور موزوں تقریر کی۔

اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اپنی جماعت سمیت مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ پھر ذیل کی تحریر پڑھ کر سنائی گئی۔ جو ابھی نصف گھنٹہ قبل مسٹر جناح کے کمرے میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔

سکندر جناح پیکٹ

(ا) سر سکندر حیات خاں واپس پنجاب جا کر، اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے جس میں پارٹی کے اُن تمام مسلمان ممبروں کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے، ہدایت فرمائیں گے۔ کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اندریں حالات وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہو گا۔

(ب) اس معاہدے کے قبول کر لینے کے بعد۔ آئندہ مجلسِ قانون ساز کے عام اور ضمنی انتخابات میں وہ متعدد فریق۔ جو موجودہ یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

(ج) یہ کہ مجلسِ قانون ساز کے وہ مسلم ارکان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں۔ یا اب لیگ کی رکنیت قبول کرتے ہیں۔ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی۔ کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ

کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے۔ اِس قسم کا تعاون انتخابات کے ماقبل یا مابعد۔ ہر دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی۔

د:- مذکورہ بالا معاہدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل ازسرِنو عمل میں لائی جائے گی۔"

مذکورہ بالا تحریر، جو آگے چل کر سکندر جناح پیکٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ خالص قانونی یا عدالتی اصطلاح میں معاہدہ نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس پر مسٹر جناح کے دستخط نہیں تھے۔ یہ ایک بیان تھا۔ جو سر سکندر کی طرف سے لیگ کونسل میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ سر سکندر نے اپنے اور اپنی جماعت کے آئندہ طرزِ عمل کے بارے میں۔ چند وعدے کئے تھے۔ اور ان وعدوں کا لیگ کونسل میں اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے سکندر جناح پیکٹ کا جو مسودہ مرتب کیا تھا۔ اس پر مندرجہ ذیل سطریں تمہید کے طور پر درج تھیں۔

"آج سر سکندر حیات خاں اور مسٹر جناح کے درمیان تبادلۂ خیالات ہوا۔ جس کے بعد اول الذکر دعوتِ خصوصی پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شامل ہوگئے۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل اعلان کیا گیا۔"

یہ پیکٹ بڑا مبہم، غیر واضح اور گومگو تھا۔ جس میں نہ مسلم لیگ کی حیثیت واضح کی گئی تھی۔ اور نہ یونینسٹ پارٹی کا موقف کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ سر سکندر اپنی

جگہ خوش تھے۔ کہ انھیں کانگریس کے مقابلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ اور اب کانگریس اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو برگشتہ نہیں کر سکے گی۔ ادھر مسٹر جناح اپنی جگہ مطمئن تھے۔ کہ پنجاب کا وزیر اعظم لیگ میں شامل ہو گیا ہے۔ لہذا لیگ کی نمائندہ حیثیت مسلّم ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ کانگریس مسٹر جناح کو بار بار طعنہ دیتی تھی۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کو کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ صرف اسلامی اقلیت کے صوبوں کا شور و غوغا ہے۔ اس طعنے کا بہترین جواب یہی تھا۔ کہ پنجاب اور بنگال کے وزراء اعظم مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیں۔ چنانچہ لکھنؤ کے اسی اجلاس میں مولوی فضل الحق اور سر محمد سعد اللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں:

ان تینوں مسلمان وزرائے اعظم کی شرکت نے مسلم لیگ میں زندگی کی جوش پھونکی۔ وہ تمام پرجوش تقریروں سے زیادہ تھی۔ مسٹر جناح کا شمار اگرچہ ہمیشہ ہندوستان کی صف اوّل کے لیڈروں میں ہوتا رہا ہے لیکن انھیں اب تک اپنی قوم کی مجبوئی اور غیر مشروط تائید کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے قائد اعظم ہونے کی بجائے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ انھیں سیاسیات کے بائیں بازو کا ایک ایسا لیڈر خیال کیا جاتا تھا۔

جو برطانوی اقتدار کا سخت مخالف اور ہندوستانی قومیت کا بے خوف علمبردار تھا - انہی خصائص کی بنا پر قدامت پسند مسلمان اُنھیں کانگرس کا حامی سمجھنے پر مجبور تھے - لیکن اب جناح کی حیثیت یہ نہیں رہی تھی وہ مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں میں سے ایک لیڈر نہیں تھے - بلکہ پوری قوم کے تنہا اور واحد نمائندہ لیڈر بن گئے تھے"۔ ؎

سکندر حیات، فضل الحق اور سعد اللہ کی شرکت نے لکھنؤ کے اس اجلاس کو قومی اتفاق و اتحاد کا بڑا دل خوش کن منظر بنا دیا تھا - لیگ کی حیثیت یقیناً بہت بلند ہو گئی تھی - اور اِدھر کانگرس کے سوراج بھون اور اُدھر برطانوی حکومت کے ایوان میں بھی ہلچل مچتی نظر آنے لگی تھی - لیکن جوش و خروش اور اتفاق و اتحاد کے ان روح پرور مناظر میں کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا - کہ یہ تحریر جو سکندر جناح پیکٹ کے نام سے موسوم کی جا رہی ہے - آگے چل کر کن حوادث کا موجب اور کن پریشانیوں کا سبب بننے والی ہے -

اِس جگہ یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے - کہ لکھنؤ میں کسی شخص نے اِس تحریر کو پیکٹ یا میثاق قرار نہیں دیا تھا - تمام لوگ اُسے سر سکندر حیات خاں کا ایک اعلان سمجھتے تھے - سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار پہلے شخص تھے - جنھوں نے اپنے اخبار کو مراسلہ بھیجتے وقت اِس دستاویز کو سکندر جناح پیکٹ

؎ INDIAN POLITICS (1936 – 1942) Page 183

کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ بعد میں یہ لفظ اس قدر چل نکلا۔ کہ اپنے اور بیگانے، دوست اور دشمن حتیٰ کہ اقبالؔ اور جناحؔ بھی اُسے سکندر جناح پیکٹ کہنے لگے تھے۔

جب ہم واپس لاہور آئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ مسلم لیگ کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کے حلقے میں اِس پیکٹ پر سخت رنج اور افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے، خود ڈاکٹر صاحب بھی مطمئن نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ اِس پیکٹ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ اور لیگ کو ثانوی حیثیت ملی ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی اِس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا۔ لیکن مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا۔ کہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُس سے حتی الوسع بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

سکندر جناح پیکٹ کی روشنائی بھی ہنوز خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ سر سکندر۔ چودھری چھوٹو رام۔ راجہ غضنفر علی خاں اور میر مقبول محمود نے اُس کی عجیب و غریب تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ لوگ لکھنؤ میں جو کچھ کر کے آئے ہیں۔ محض دکھاوے کا ایک کھیل تھا۔ ورنہ وہ یونینسٹ پارٹی کی اجارہ داری میں رتّی برابر کمی کرنے کو تیار نہ تھے۔ سب سے پہلے سر سکندر نے لب کشائی کی۔ اور فرمایا۔ کہ

"جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ یہ معاہدہ مختلف جماعتوں پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ اور اِن جماعتوں کی موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کو،

جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں۔ مشورہ دیا جائے گا۔ کہ وہ لیگ کی ممبرشپ بھی قبول کر لیں۔

"جہاں تک عام یا ضمنی انتخابات کا تعلق ہے۔ اس معاہدے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ وہ مسلمان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ انھیں الیکشن سے پہلے اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد۔ وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح الیکشن میں انھیں یونینسٹ پارٹی کی مدد بھی حاصل ہوگی۔

"ان باتوں سے صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ پنجاب میں اس وقت جو جماعتیں جس جس طرح کام کر رہی ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں آئے گا"[1]

سر سکندر کے اس بیان سے پہلے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار نے لکھنؤ سے جو رپورٹ اپنے اخبار کو بھیجی تھی۔ وہ اپنے مطالب و معانی کے لحاظ سے بڑی عجیب و غریب تھی۔ انھوں نے لکھا تھا۔ کہ:

"...... سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ کے بھی ممبر بن جائیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی۔ اور اس بورڈ پر عملاً یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ یہ بورڈ تمام ضمنی

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیدوار کھڑے کرے گا۔ اور آئندہ عام انتخابات میں مسلمان اُمیدواروں کو اسی شرط پر مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے گا۔ کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے غیر مسلم اُمیدواروں کی بھی مدد کرے گا۔ اِسی طرح یونینسٹ پارٹی لیگی اُمیدواروں کی بھی ہر طرح امداد و اعانت کرے گی'' [1]

راجہ غضنفر علی خاں نے اس پیکٹ کی جو تعبیر کی۔ اُسے بے ربطی بیان اور ژولیدگیٔ فکر کا شاہکار کہنا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا۔ کہ

''۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اِس معاہدے کی عبارت اس قدر صاف ہے۔ کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش ہو نہیں سکتی۔ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز میں۔ اِس وقت جو جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ اُن کی حیثیت من و عن یہی رہے گی۔ اور سکندر جناح پیکٹ اُس میں قطعاً کوئی رَدّ و بدل نہیں کرے گا۔ اقتصادی پروگرام کے اعتبار سے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ مسلم لیگ کے پروگرام کی ایک بنیادی شق ہے اسی طرح یونینسٹ پارٹی بھی اقلیتوں اور پس ماندہ اقوام کے مفاد

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء

کی نگہداشت کو اپنا اولین مقصد سمجھتی ہے۔ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ خود مختار و قائم بالذات ہیں۔ اور ان دونوں جماعتوں کو صوبائی اسمبلی میں اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اندریں حالات یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کے رویّے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو گی۔ اور یونینسٹ پارٹی اور موجودہ وزارت کے دوسرے فریقوں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔[1]

اصل بات یہ ہے۔ کہ جب دل ہی چور ہو۔ نیت ہی فتور ہو اور عمل میں کھوٹ ہو تو الفاظ کی بڑی سے بڑی جادوگری بھی حقیقت پر نقاب نہیں ڈال سکتی۔ یہی کچھ حال یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کا تھا۔ وہ اپنے قول و فعل کے تضاد کو قسم قسم کے پردوں میں چھپانا چاہتے تھے۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنتی تھی۔ ایک طرف انھیں یہ خطرہ لاحق تھا۔ کہ اگر مسلم لیگ کے دامن میں پناہ نہ لی۔ تو کانگرس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے یونینسٹ پارٹی کے جزوِ اعظم یعنی مسلمان ممبروں کو مجتمع رکھنا محال ہو جائے گا۔ دوسری طرف وہ چودھری چھوٹو رام سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ کہ کہیں مسلم لیگ کی شرکت کی وجہ سے اُن پر فرقہ پرستی کا الزام نہ لگ جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ لکھنؤ کا ڈرامہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو گیا ہے۔ پنجاب میں اُس کا چرچا نہیں ہونا چاہیئے۔

اب چودھری چھوٹو رام آگے بڑھے۔ اور اُنھوں نے ایک طویل بیان میں سکندر جناح پیکٹ کی تعبیر فرمائی۔

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء

چودھری چھوٹو رام کا بیان

"سر سکندر حیات کا جو بیان ۱۵ ر اکتوبر کے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔
اُس سے حاسدوں اور بدخواہوں نے تین نتیجے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے
اور اِن نتیجوں اخذ کردہ نتائج کو دیکھ کر مجھے وہ پُرانا مقولہ یاد آ گیا ہے۔ کہ
خیال دراصل خواہش کی پیداوار ہے۔

وہ تین نتائج جو دشمنوں نے اِس بیان سے اخذ کئے ہیں۔
درج ذیل ہیں :-

(ا) سر سکندر نے مسٹر جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

(ب) سکندر جناح پیکٹ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا جائے گا۔

(ج) مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو کانگرسی صوبوں میں ہے۔

گذشتہ سال یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے درمیان جو بلا نتیجہ گفت و شنید ہوتی رہی تھی مجھے اُس کا حال معلوم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر کس طرح اس بات کے دل سے خواہش مند ہیں۔ کہ مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر آل انڈیا مسائل میں اتفاق و اتحاد اور یک جہتی قائم کرنے کے کس درجہ خواہاں ہیں۔ اپنی انہی معلومات کی بنا پر میں نے

مذکورہ بالا تینوں نتائج کو درخورِ اعتنا سمجھنے سے اِنکار کر دیا تھا۔
چنانچہ سر سکندر نے لکھنؤ سے رخصت ہونے وقت جو بیان اخباروں
کو دیا تھا۔ اُس سے میرے اِن خیالات کی کلی تصدیق ہو گئی ہے۔

با ایں ہمہ۔ اگر سر سکندر کے صرف پہلے بیان ہی پر غور کیا جائے۔
تو اُس سے بھی حاسدوں کی مطلب براری نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ میں جانتا
ہوں۔ کہ سر سکندر نے یہ بیان نہایت روا روی اور جلدی میں دیا
تھا۔ جس سے اُن کا مفہوم بخوبی ظاہر نہیں ہو سکا۔ لہذا یہ کہنا کہ سر سکندر
نے مسٹر جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ ایک ارزاں قسم کا
عامیانہ مذاق ہے۔ باقی رہی یہ بات۔ کہ یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا
جائے گا۔ اُس کے متعلق مجھے اپنے سیاسی حریفوں سے صرف اتنا
عرض کرنا ہے۔ کہ وہ اطمینان رکھیں۔ اُن کی یہ آرزو کبھی بر نہیں آئے گی۔
اور اُن کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ سر سکندر کے بیان میں
اِس امر کا اشارہ تک بھی نہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے صاف کہا
ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی قائم و دائم رہے گی۔ سر سکندر نے اپنے اس
بیان میں تین مختلف موقعوں پر ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن کا
مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے۔ اور کسی شک و شبہ کی گنجائش
باقی نہیں رہ سکتی۔ مثلاً:-

(۱) یہ پیکٹ موجودہ کولیشن یعنی یونینسٹ پارٹی کی ہستی پر قطعاً اثر انداز
نہیں ہو گا۔

(ب) آئندہ ضمنی اور عام انتخابات میں وہ متعدد فریق، جو یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ متحد ہو کر، اُن امیدواروں کی مدد کریں گے۔ جن کو یہ فریق کھڑا کریں گے۔

(ج) موجودہ مشترکہ پارٹی کا نام بدستور یونینسٹ پارٹی رہے گا۔

اب آئیے۔ اِس قیاس اور امکان کی طرف کہ مسلم لیگ کو پنجاب میں وہی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو کانگرسی صوبوں میں ہے۔ اس بارے میں میں صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جس شخص کو سیاسیات کا ذرا سا شعور ہے۔ وہ ایسی صورت حال کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کانگرس کو کانگرسی صوبوں میں جو اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ وہ صرف اس حد تک محدود نہیں کہ ایک سیاسی پالیسی مرتب کر کے وزراء کے سپرد کر دی جائے۔ بلکہ کانگرس اِن صوبوں کی حکومت۔ اور اُس حکومت کے جملہ محکموں کی ایک ایک تفصیل پر کڑی نظر رکھتی ہے اور خفیف سے خفیف جزئیات بھی کانگرس کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہو سکتیں مجھے اِس بات کا علم ہے کہ کانگرسی وزارتیں کانگرس کی اس روزمرہ مداخلت سے سخت نالاں ہیں۔ اور اگر کانگرس نے اپنے رویئے میں تبدیلی نہ کی۔ تو بہت ممکن ہے کہ کانگرسی وزارتیں یا تو علم بغاوت بلند کر دیں گی یا اِس ناجائز خارجی دباؤ کے تحت اپنی ہستی ہی کو ختم کر ڈالیں گی۔

"میں سمجھتا ہوں۔ کہ اگر ہندوستان کے کسی صوبے میں مسلم لیگ کو قطعی اکثریت بھی حاصل ہو جائے۔ تو بھی مسٹر جناح ایسا عقلمند اور تجربہ کار آدمی کبھی اُس غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ جو کانگرس سے سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ کانگرس کو حکمرانی کے طور طریقوں کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں۔ پنجاب میں نہ مسلم لیگ کو، نہ یونینسٹ مسلمانوں کو اور نہ مجموعی طور پر تمام مسلمانوں کو۔ ایسی اکثریت حاصل ہے۔ کہ تنہا اپنے بل پر حکومت کا نظم و نسق چلا سکیں۔ اس لیے یہاں وزارت چار عناصر پر مشتمل ہے۔ یعنی یونینسٹ مسلمان۔ یونینسٹ غیر مسلم۔ پروگریسو نیشنلسٹ اور خالصہ نیشنلسٹ۔ تعجب ہے کہ ان حالات میں مسلم لیگ کو پنجاب میں وہ حیثیت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ جو کانگرسی صوبوں میں کانگرس کو حاصل ہے۔ ہر چند کہ لیگ کانگرس کی غلطی کا اعادہ کرنے ہی پر کیوں نہ آمادہ ہو جائے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو بیان جاری کیا ہے۔ اُس کے آخر میں درج ہے کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد اُن لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیئے۔ جو یہ مشہور کر رہے ہیں۔ کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے گی۔ یا یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

"سر سکندر کے دوسرے بیان نے تو پوری صورتِ حال کو اظہر من الشمس

کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ "اِس پیکٹ کا پنجاب کی موجودہ پارٹیوں پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اور وہ پارٹیاں جوں کی توں قائم رہیں گی۔" آئندہ عام اور ضمنی انتخاب کا ذکر کرتے ہوئے سر سکندر نے کہا ہے کہ "اُن مسلمان امیدواروں کو، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد۔ وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح اُنھیں الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کی حمایت بھی حاصل ہو گی۔" آخر میں سر سکندر فرماتے ہیں کہ "جہاں تک پنجاب کی موجودہ جماعتوں کے باہمی اشتراک یا اُن کی ترتیب کا تعلق ہے۔ اُس میں ہرگز کوئی ردّ و بدل نہیں کیا جائے گا۔"

"کیا اِن واضح الفاظ کے بعد بھی۔ اِس بات کے باور کرنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے۔ کہ اِس پیکٹ کے باوجود یونینسٹ پارٹی زندہ و سلامت اور قائم و دائم رہے گی اور اسی پارٹی کے جھنڈے کے نیچے وہ تمام لوگ جمع ہوں گے۔ جو ناتوانوں، غریبوں، کمزوروں اور فلاکت زدوں کی امداد و اعانت کو اپنا مسلک قرار دیتے ہیں؟

"سر سکندر کے واپس لاہور تشریف لانے پر مجھے اِس معاملے کے متعلق اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ اُنھوں نے مجھے یقین دلایا ہے۔ اگرچہ اُن کے دوسرے بیان کے بعد۔ اِس یقین دہانی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کہ حسبِ سابق یونینسٹ

پارٹی پنجاب کی سیاسیات کا ایک مستقل عنصر رہے گی۔ اور اسمبلی کے اندر اور باہر۔ دونوں جگہ یہ جماعت ہمیشہ غیر فرقہ دارانہ اصولوں پر اپنا کام جاری رکھے گی۔ ہاں فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ اب یہ جماعت پہلے سے زیادہ جوش و خروش اور مستعدی و گرم جوشی سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو گی۔ غالباً ہمارے اس عزم صمیم ہی نے بدخواہوں پر ہراس طاری کر دیا ہے۔ اور اسی ہراس کی وجہ سے وہ قسم قسم کی افواہیں اڑانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

" اگر محض قوم پرستانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو فانی طور پر میں اس پیکٹ کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ کہ یہ پیکٹ حالات و واقعات کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اس لیے قابلِ درگذر بھی ہے۔ کانگرس۔ ہندو سبھا اور تمام ہندو اخبارات نے ہندوستان کے ان دو بڑے صوبوں کی حکومتوں کے خلاف جہاں مسلمانوں کی جزوی اکثریت ہے۔ جس شدت سے پراپاگنڈا جاری کر رکھا ہے یہ پیکٹ اس کا ایک لازمی ردّ عمل ہے ـــ مسلم اکثریت کے ان دو بڑے صوبوں کے مسلمانوں میں کچھ باہمی اختلافات بھی ہیں (جو یقیناً نہیں ہونے چاہئیں) کانگرس اور ہندو سبھا ان اختلافات سے ہر ممکن فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں۔ ظاہر ہے۔ ایسا ہونا کچھ بعید از فہم بھی نہیں۔ کیونکہ سیاسیات میں ہر فریق اپنے حریف کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا کرتا ہے۔ ان حالات میں مسٹر جناح

اور سر سکندر ایسے تجربہ کار سیاست دانوں کی یہ کوشش بالکل فطری اور طبعی ہے کہ غنیم کے مقابلہ میں اپنی قوم کے اختلافات کو رفع کر کے اُس میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔ میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اس پیکٹ سے یونینسٹ پارٹی کو بھی ایک ضمنی فائدہ پہنچے گا۔ وہ یہ کہ اس سے قبل مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان چپقلش جاری تھی۔ وہ اب ختم ہو جائے گی اور ہم اپنی مجموعی کوششوں کو۔ آپس میں سب و شتم کرنے کی بجائے تعمیری کاموں پر صرف کر سکیں گے۔

"یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یونینسٹ مسلمان اب کی پہلی مرتبہ مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے۔ بلکہ اُن میں سے اکثر و بیشتر اس سے قبل بھی مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ اور اُن کی رکنیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ گذشتہ الیکشن میں جب لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ تو آپس کے تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ ہمارے وزیر اعظم اب یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیئے۔ اور جو لوگ لیگ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ بخوشی شامل ہو جائیں۔

"ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں۔ کہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد یونینسٹ مسلمان بیک وقت دو ایسی متضاد جماعتوں کے ساتھ اپنی وفاداری کیونکر نبھا سکیں گے۔ جن میں سے ایک خالص فرقہ وارانہ

ہے - اور دوسری غیر فرقہ وارانہ - اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی پروگرام کا تعلق ہے۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں چنداں فرق نہیں - اسی لیے یہاں باہمی تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ باقی رہے خالص فرقہ داری اور مذہبی مسائل - اِس بارے میں جو دقت مسلمانوں کو پیش آئے گی - وہی دِقت یونینسٹ پارٹی کے ہندوؤں کو بھی پیش آرہی ہے - تاہم اِس سلسلہ میں ہمارا مسلک بالکل صاف ہے - ہم اِس نوع کے تمام اختلافات کو باہمی رواداری سے برداشت کرنے کے قائل ہیں - اور ایک فریق کو زبردستی دوسرے پر اپنے عقائد مسلط کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

" دو مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ بیک وقت اپنی وفاداری نبھانے کا مسئلہ صرف یونینسٹ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اِس قسم کی اور بھی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں - کانگرس۔ ہندو سبھا اور ہندو اخباروں کو اس بارے میں ہم پر طعنہ زنی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے صوبجات متوسط کے کانگرسی ہندوؤں کو یہ مشورہ دیا تھا۔ کہ ہندو سبھا کے سالانہ اجلاس میں شرکت نہ کریں - تو ہندو سبھا کے لوگ پنڈت نہرو پر بُری طرح برسے تھے - گویا ہندو سبھا کے حامیوں کے نزدیک یہ فعل بالکل جائز اور مستحسن ہے - کہ ایک شخص بیک وقت ہندو سبھا اور کانگرس ایسی دو متحارب جماعتوں کا ممبر بنا رہے -

"اگر کانگرس کے موجودہ صدر کے خیالات وعقائد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے۔ تو بھی اس بات کے بہت سے ثبوت ہمارے پاس موجود ہیں کہ لوگ بیک وقت ایک فرقہ وارانہ جماعت کے ممبر ہوتے ہوئے بھی کانگرس کے ممبر رہے ہیں۔

"۱۹۲۳ء کے انتخاب میں سکھ لیگ اور ۱۹۲۶ء کے انتخاب میں اکالی پارٹی نے اپنے امیدواروں کو جو ٹکٹ دیئے تھے انھیں کانگرس نے باضابطہ منظور کر لیا تھا۔

"یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ خالص فرقہ وارانہ جماعتوں کے ٹکٹ قبول کرنے میں کانگرس نے کسی قسم کے تامل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لوکمانیہ تلک۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ لالہ لاجپت رائے۔ سوامی شردھانند۔ ڈاکٹر مونجے۔ اور مسٹر کیلکر ایسے نامور لوگوں کو ہمیشہ کانگرس میں بلند سے بلند منصب عطا ہوتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ہندو سبھا کے کرتا دھرتا تھے۔

"مسٹر وزیر حسن اور سیٹھ یعقوب حسن (جو مدراس کی کانگرسی حکومت میں وزیر ہیں) عرصہ دراز تک بیک وقت کانگرس اور مسلم لیگ میں شریک رہے ہیں۔

"مذکورہ بالا مثالیں معترضین کو دنداں شکن جواب دینے کے لیے کافی ہیں۔ اگر ان مثالوں کے باوجود کانگرس یا ہندو سبھا یا ان جماعتوں کے لگے بندھے بدستور یونینسٹ پارٹی پر یہ اعتراض کریں۔ کہ اس

پارٹی کے بہت سے ممبروں کی وفاداری دو حصوں میں منقسم ہے۔ تو ایسے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کو صرف یہی جواب دیا جائے گا۔ کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو!!" [1]

میں نے چودھری چھوٹو رام کا مکمل بیان اِس لیے درج کیا ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے نفسِ ناطقہ چھوٹو رام تھے۔ سکندر حیات خاں نہ تھے۔ چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے سنگِ بنیاد تھے۔ اور اُن کے بغیر یہ پارٹی شاید ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتی۔

چودھری چھوٹو رام نے اِس بیان میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ یقیناً سر سکندر کے مشورے اور ایما سے کہا ہوگا۔ سر سکندر جو باتیں اپنی زبان سے کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہی انھوں نے چھوٹو رام کی زبان سے بے محابا کہلوا دیں۔

جب سر سکندر۔ راجہ غضنفر علی خاں اور چودھری چھوٹو رام کے بیان یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ تو پنجاب کے مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا کہ یہ کیا تماشا ہے کہ سکندر جناح پیکٹ نے مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ لیگ کے دفتر میں پے بہ پے شکایتیں اور استفسار آنا شروع ہو گئے۔ ہر شخص پوچھتا تھا۔ کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ آخر غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے مجبور ہو کر حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا۔ پہلے غلام رسول خاں نے اپنا مختصر سا بیان شائع کیا۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳ء

غلام رسول خاں کا بیان

"۱۴ اکتوبر کو لکھنؤ میں جو سکندر جناح پیکٹ مرتب ہوا تھا۔ اُس کی مختلف تاویلیں کی جا رہی ہیں۔ جنھوں نے قسم قسم کی غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں۔ پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے میں اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں۔ کہ اصل صورتِ حال بیان کر کے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دوں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ ۱۴ اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں سر سکندر کو خاص طور پہ مدعو کیا گیا تھا۔ جہاں انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں حسبِ ذیل اعلان کیا تھا۔

(ا) وہ مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔

(ب) واپس پنجاب جا کر۔ وہ پنجاب اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر کے لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ اس طرح یہ تمام مسلمان ممبر مجموعی طور پر مل کر پنجاب اسمبلی کے ایوان میں مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور یہ پارٹی آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈوں کے قواعد و ضوابط کی پابند ہو گی۔

(ج) اس طرح اسمبلی میں جو مسلم لیگ پارٹی معرضِ وجود میں آئے گی۔

اُسے اِس امر کی آزادی ہوگی - کہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں ایک کولیشن بنائے - اس کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہوگا۔ لیکن یہ کولیشن اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی جداگانہ حیثیت کو قطعاً کوئی گزند نہیں پہنچائے گی -

مذکورہ بالا اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ایسی کولیشن انتخاب سے پہلے بھی وجود میں آسکتی ہے اور انتخاب کے بعد بھی -

(د) اس معاہدہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آئندہ ضمنی اور عام انتخابات کے لیے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی " ؎

ملک برکت علی کا بیان

" آنریبل سر چھوٹو رام نے سکندر جناح پیکٹ کے عنوان سے جو بیان اخبارات میں شائع کیا ہے - اس میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ

" ایسوسی ایٹڈ پریس نے جو بیان جاری کیا ہے اُس کے آخر میں درج ہے کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یہ یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا - اس خبر کو پڑھنے کے

؎ سول اینڈ ملٹری گزٹ - مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء

بعد - اُن لوگوں کا منہ بند ہو جانا چاہیے - جو یہ شور کر رہے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے گی - یا یہ کہتے پھرتے ہیں - کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں "

معلوم ہوتا ہے کہ سر چھوٹو رام نے پیکٹ کا بغور مطالعہ نہیں کیا اس پیکٹ کا مسودہ میں نے اور سر سکندر نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے زیر ہدایت اکٹھے بیٹھ کر مرتب کیا تھا - میں آنریبل سر چھوٹو رام کو ناراض نہیں کرنا چاہتا - لیکن اُن کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا بے حد ضروری ہے - کہ نہ اصل پیکٹ میں اور نہ ایسوسی ایٹڈ پریس کے بیان میں کہیں یہ الفاظ درج ہیں - کہ

"پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا "

یہ الفاظ دراصل سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کی خانہ ساز اختراع ہیں - اُنھوں نے ۱۴ اکتوبر کو لکھنؤ سے جو پیغام اپنے اخبار کو بھیجا تھا اُس میں بلاوجہ یہ الفاظ درج کر دیئے تھے - حالانکہ جس وقت سول کے نامہ نگار نے یہ پیغام بھیجا ہے اُس وقت سکندر جناح پیکٹ کا مسودہ لکھا بھی نہیں گیا تھا - پیکٹ کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

" اس معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل ہو گی "

ظاہر ہے کہ جب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر۔ آل انڈیا مسلم لیگ
میں شامل ہو جائیں گے۔ تو اُنہیں لامحالہ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری
بورڈ میں نمائندگی ملنی چاہیئے۔ معاہدہ کی یہ شق اسی غرض کے لیے
رکھی گئی ہے۔ لیکن پورا معاہدہ پڑھ جائیے۔ آپ کو کہیں بھی یہ نظر
نہیں آئے گا۔ کہ پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی
کا قبضہ ہو جائے گا۔

سر چھوٹو رام کو ایک اور غلط فہمی ہوئی ہے۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ
بھی ہے۔ کہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے مسلمان ممبر آئندہ اسمبلی کے
اندر مسلم لیگ پارٹی کہلائیں گے۔ اور یہ مسلم لیگ پارٹی آل انڈیا مسلم لیگ
کے مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈوں کے تابع اور اُن کے قواعد و
ضوابط کی پابند ہوگی۔

معاہدے کی ایک شق یہ بھی ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کے وہ یونینسٹ
ممبر جو سر سکندر کے مشورے سے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔ اسمبلی
کے واحد مسلم لیگی ممبر کے ساتھ مل کر، مسلم لیگ پارٹی بنائیں گے۔ تو اس
پارٹی کو اِس امر کی آزادی ہوگی۔ کہ ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ
مل کر، جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں۔ ایک کولیشن
بنائے۔ اِس قسم کی کولیشن انتخاب سے پہلے بھی وجود میں آسکتی ہے
اور انتخاب کے بعد بھی۔ یہ کولیشن بدستور اپنا نام یونینسٹ پارٹی
رکھ سکتی ہے۔

سر چھوٹو رام ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ اس معاہدہ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کی ہیئت ترکیبی یکسر بدل جائے گی۔ آئندہ یونینسٹ پارٹی مندرجہ ذیل اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہو گی۔

(ا) اسمبلی کی وہ مسلم لیگ پارٹی جو اس معاہدے کی رُو سے وجود میں آئے گی۔ اور جو آل انڈیا مسلم لیگ کے تابع۔ اور اُس کے قواعد و ضوابط کی پابند ہو گی۔

(ب) سر چھوٹو رام کا گروپ یا کوئی اور گروپ۔ جو مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن بنانے پر رضامندی کا اظہار کرے گا۔

ظاہر ہے، اِن حالات میں یونینسٹ پارٹی پہلے کی طرح ایک مستقل اور قائم بالذات پارٹی نہیں رہے گی۔ بلکہ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اُس کولیشن کے لیے استعمال ہو گا۔ جس میں مسلم لیگ پارٹی اور سر چھوٹو رام کا گروپ شامل ہوں گے۔ مسلم لیگ پارٹی اپنے اعمال و افعال کے لیے مسلم لیگ کے سامنے جواب دہ ہو گی۔ اور اس پارٹی کے ممبروں کی وفاداری صرف لیگ سے وابستہ ہوگی۔ اگر کبھی ایسی صورتِ حال پیش آئی۔ کہ مسلم لیگ کے بنیادی اغراض و مقاصد۔ اور کولیشن کے دوسرے گروپ (خواہ وہ گروپ چھوٹو رام کا ہو یا کوئی اور) کے اغراض و مقاصد کے درمیان تصادم ہوا۔ تو مسلم لیگ پارٹی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے احکام کی پابند ہو گی۔

در ہیت بیٹھئے۔ کہ ہم ابھی سے کسی ایسے تصادم کا تصور کئے بیٹھے

ہیں۔ یا ایسے تصادم کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ ہم تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر معمولی عقل اور رواداری سے کام لیا جائے تو روزمرہ کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں۔ اور نظم و نسق کی گاڑی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ بایں ہمہ کسی شخص کو اس کولیشن کے متعلق جو مسلم لیگ پارٹی اور سر چھوٹو رام کے گروپ کے اتحاد سے رونما ہوگی۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ ہر چند کہ اس کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہی کیوں نہ ہو۔"[1]

مذکورہ بالا بیانات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کی تاویل و تعبیر کے بارے میں دونوں فریقوں میں بنیادی اختلاف تھا۔ سر سکندر اور اُن کے حواری کہتے تھے۔ کہ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی ادارہ کی حیثیت سے۔ اسمبلی کے اندر اور باہر دونوں جگہ بدستور قائم رہے گی۔ اور مسلم لیگ کو محض اپنی اغراض کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس کے برعکس ملک برکت علی اور غلام رسول خاں کا خیال تھا۔ کہ پرانی یونینسٹ پارٹی جس کے ٹکٹ پر ابھی چند مہینے قبل انتخابات کی جنگ لڑی گئی تھی۔ ختم ہو گئی ہے۔ اب یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کے بعد خود بخود ایک مسلم لیگ پارٹی کی صورت اختیار کر لیں گے۔ جو صرف آل انڈیا مسلم لیگ

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء

کے تابع فرمان ہوگی۔ یونینسٹ پارٹی کا نام صرف اس کو لیشن کے لیے استعمال ہوگا۔ جو اس نوزائیدہ مسلم لیگ پارٹی اور چودھری چھوٹو رام کے گروپ کے تعاون سے پیدا ہوگی۔

افسوس ہے کہ فریقین کے اس باہمی نزاع میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ہماری کوئی رہنمائی نہ کی۔ اور بجائے اس کے کہ اس قضیئے کو کسی قطعی اور دو ٹوک فیصلے سے حل کر دیا جاتا۔ مرکز نے ڈھیل دے کر حالات کو اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔

علامہ اقبال کے خطوط :

۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھا کہ :

"عام افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہے۔ سر سکندر اور اُن کی جماعت نے اب تک اس پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے آج صبح معلوم ہوا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک اسی طرح ٹال مٹول کرتے رہیں گے۔ خود یونینسٹ پارٹی کے ایک رکن نے مجھ کو بتایا ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کا اصل مقصد یہ ہے۔ کہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ بہر حال چند روز تک آپ کو پورے کوائف سے مطلع کروں گا۔ اور پھر آپ کی رائے درکار ہوگی۔ کہ آئندہ ہم کس طرح کام جاری رکھیں۔ مجھے امید ہے کہ لاہور میں لیگ کے اجلاس کے انعقاد سے قبل آپ کم از کم دو ہفتوں کے لیے ہمارے

صوبے کا دورہ کر سکیں گے۔" [1]

اگلے ہی روز یعنی یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے اسی موضوع پہ ایک اور خط مسٹر جناح کو لکھا۔ جو درج ذیل ہے:

"ڈیئر مسٹر جناح!

سر سکندر حیات خاں کل مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اُن کے ہمراہ اُن کی جماعت کے بھی چند ارکان تھے۔ ہمارے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ موضوع وہی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی اختلافات تھے۔ دونوں فریقوں کی طرف سے اخباری بیان شائع ہو چکے ہیں اور ہر فریق سکندر جناح پیکٹ کے بارے میں اپنی الگ تاویل کرتا ہے اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ میں انشاء اللہ چند روز میں آپ کو اُن تمام بیانات کی نقول ارسال کر دوں گا۔ سر دست اتنا عرض کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر مجھے فی الفور اُس معاہدے کی ایک نقل بھیج دیجئے۔ جس پہ سر سکندر کے دستخط ثبت ہیں۔ اور جو غالباً آپ کے پاس موجود ہے۔

" ایک اور امر بھی وضاحت طلب ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اس بات پر رضامندی کا اظہار فرمایا تھا کہ لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا؟ سر سکندر

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ (شیخ محمد اشرف)

مجھ سے کہتے ہیں۔ کہ آپ اس بارے میں اپنی منظوری دے چکے ہیں اور اسی بنا پر وہ اصرار کر رہے ہیں۔ کہ اس بورڈ کے ارکان میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے سکندر جناح پیکٹ میں۔ اس قسم کی کوئی شق موجود نہیں۔ مہربانی فرما کر اس خط کا جواب جلد از جلد عنایت فرمایئے۔

"ہمارے آدمی بدستور صوبے کے دورے میں مصروف ہیں جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔ گذشتہ رات ہم نے لاہور میں ایک بڑا کامیاب جلسہ کیا تھا۔ جلسوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔"[1]

مذکورہ بالا خط کے ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۰ نومبر کو ڈاکٹر صاحب کے زیر ہدایت غلام رسول خاں نے ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا۔

"ڈیر مسٹر جناح:

آپ نے ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا اس کے پیش نظر انھوں نے مجھے ہدایت فرمائی ہے۔ کہ آپ کو اطلاع دے دوں کہ

(۱) لکھنؤ میں آپ کے اور سر سکندر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ صوبے بھر میں شدید اختلافات کا پیش خیمہ بنا ہوا ہے۔ سر سکندر نے

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

پنجاب واپس آتے ہی ایک بیان شائع کر دیا تھا کہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے۔ سابقہ صورتِ حال ہنوز قائم اور بحال ہے۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں مشورہ دیا جائے گا۔ کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم امیدوار لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ انھیں یہ عہد کرنا ہو گا۔ کہ کامیاب ہونے کے بعد وہ یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے اس کے عوض انتخابات کی جنگ میں انھیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہو گی۔

سر سکندر کی جماعت کے بعض دیگر ارکان نے بھی اس قسم کے بیان شائع کئے ہیں کہ سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں چلا جائے گا۔

سر چھوٹو رام نے اپنے دستخط سے ایک بیان اخبارات کو دیا ہے جس میں انھوں نے بھی یہ لکھا ہے۔ کہ آئندہ لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی اور وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن کر رہ جائے گی۔

یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی ان تصریحات سے مسلمانانِ

پنجاب میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ سخت حیران ہیں کہ ایسا معاہدہ کیوں کیا گیا ہے۔ جس کے تحت لیگ کی مستقل حیثیت کالعدم ہو گئی ہے۔ اور وہ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت جماعت بنادی گئی ہے۔ حالانکہ عوام کی نگاہ میں یونینسٹ پارٹی بدترین رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے مشورے سے ایک بیان شائع کیا جس کا مقصد پنجاب مسلم لیگ کے متعلق جدید غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے محض سکندر جناح پیکٹ کی اہم شقوں کو نقل کر دیا۔ اور دہرایا کہ اس معاہدے کی رُو سے۔ جو مسلم لیگ پارٹی معرضِ وجود میں آئیگی وہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اور مسلم لیگ پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کے قواعد و ضوابط کے تحت ہو گی۔ اسی ضمن میں ملک برکت علی ایم۔ ایل۔ اے نے بھی ایک بیان شائع کیا ہے۔ جس میں انھوں نے معاہدے کی شرائط کو نقل کر کے واضح کر دیا ہے۔ کہ مجلسِ قانون ساز کے اندر صرف مسلم لیگ پارٹی کو یہ حق حاصل ہو گا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور لائحہ عمل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی دوسرے گروہ سے مل کر کولیشن بنائے۔ یا کسی کولیشن کو قائم رکھے۔

ان ہر دو بیانات کی نقول ارسال خدمت ہیں۔

مسلمان عوام پر اِن بیانات کا خوشگوار اثر ہوا ہے۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے متعدد ارکان اِن کی اشاعت سے برہم ہو گئے ہیں۔ روزنامہ ٹریبیون نے اِن بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی ارسالِ خدمت ہے۔

(۲) ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے سر سکندر کی خدمت میں رکنیت کے نوّے فارم بھیجے۔ اور یہ درخواست کی۔ کہ اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے ان پر دستخط کروا لیے جائیں۔ کیونکہ اُن ایّام میں وائسرائے[1] کی آمد کے سلسلہ میں تمام ارکان لاہور میں موجود تھے مگر اس وقت تک ایک فارم پر بھی دستخط نہیں ہوئے۔ اور نہ کوئی فارم ہمیں واپس کیا گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو خود میں نے اسمبلی کے بعض مسلم ارکان سے ان فارموں پر دستخط کرنے کو کہا تھا اُن میں سے بعض نے بڑی مسرت سے میری درخواست کو شرفِ قبول بھی بخشا۔ لیکن سر سکندر نے اسمبلی کے ارکان کو پیغام بھیج

---

[1] وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سرکاری دورے پر لاہور آئے ہوئے تھے انھوں نے ۲۲ر اکتوبر کو قلعہ شاہی کے دیوانِ عام میں دربار کیا۔ اور ۲۳ کو اُن کے اعزاز میں روسائے پنجاب نے شالامار باغ میں ایک بہت بڑی گارڈن پارٹی دی تھی۔

دیا کہ ان فارموں پر دستخط نہ کئے جائیں۔۔۔۔۔ یہ ہے ہماری موجودہ پوزیشن!

سر سکندر اور اُن کے بعض دوست یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ موجودہ یونینسٹ پارٹی کے قبضۂ اقتدار میں آگئی ہے۔ اور سکندر جناح پیکٹ کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی میں لیگ کا واحد نمائندہ۔ مسلم لیگ بلاک کے وجود میں آنے کے بغیر ہی وزارتی پارٹی میں شامل ہو جائے گا۔

لہذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سکندر جناح پیکٹ سے آل انڈیا مسلم لیگ کی شہرت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا۔ تو لیگ سے مسلمانان پنجاب کی تمام ہمدردی ختم ہو جائے گی۔ میں یہ بھی واضح کر دوں۔ کہ اگر ہم یہ بیانات شائع نہ کرتے۔ تو آل انڈیا مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھوکر لگتی۔

(۳) آپ کو یہ سن کر مسرت ہو گی۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک وفد (جس میں خان بہادر ملک زمان مہدی۔ ملک برکت علی۔ مسٹر ہاشم جیسی بٹالوی اور راقم الحروف کے علاوہ بعض دیگر ارکان بھی شامل ہیں) پنجاب کا دورہ کر کے مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر رہا ہے۔ ان مقامات پر مسلمان عوام نے آل انڈیا مسلم لیگ۔ اور پنجاب پراونشل مسلم لیگ سے جس خلوص اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ واقعی حیرت انگیز

ہے۔ ہماری کوششوں سے اِس وقت تک ۲۸ شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور مزید شاخیں قائم ہو رہی ہیں۔ مگر چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے۔ اس لیے ہم اپنا دورہ ملتوی کرنے پر مجبور ہیں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہے کہ سر سکندر کی پارٹی کے ایک ممبر نے بھی ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

(۴) میر مقبول محمود نے ملک برکت علی کو سکندر جناح پیکٹ کی نقل مہیا نہیں کی۔ اس لیے اِس کے متعلق آپ کو تار دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بھی سر سکندر حیات کو پیغام بھیجا تھا کہ معاہدۂ مذکورہ کی ایک نقل بھیج دیں۔ سر سکندر نے نقل بھیج دی ہے۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ نقل اصل کے مطابق ہے۔ یا نہیں۔ کیونکہ میر مقبول محمود نے مجھے بتایا ہے کہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو گیارہ بجے رجبکہ معاہدے کی تمام شرائط آپ کے کمرے میں طے ہو چکی تھیں۔ سر سکندر نے بعض ترمیمیں پیش کیں۔ اور بالآخر وہ معاہدہ مرتب ہوا۔ جس کی نقل ڈاکٹر سر محمد اقبال کو بھیج دی گئی ہے۔ چونکہ ہمیں اُن ترمیموں کا کوئی علم نہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ اُس معاہدہ کی جو آپ کے پاس موجود ہے ایک نقل ہمیں ارسال فرما دیجیے۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے میر مقبول محمود سے یہ نقل مانگی تھی۔ تو اُنھوں نے جواب دیا تھا۔ کہ مطلوبہ نقل آپ کو بھیج دی گئی ہے۔

(۵) اب میں اُن امور کی طرف آتا ہوں جن کے متعلق آپ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مشورہ طلب کیا ہے۔

(ا) فروری ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاسِ خصوصی لاہور میں منعقد کرنے کے متعلق جہاں تک سر سکندر کی دعوت کا تعلق ہے ہم اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن ہم اُس وقت تک کوئی تجویز پیش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جب تک کہ اس قسم کا واضح اور غیر مبہم سمجھوتہ نہ ہو جائے کہ سر سکندر کی پارٹی کے مسلمان ارکان کسی مزید تاخیر کے بغیر مسلم لیگ کے حلف نامے اور فرطاسِ رکنیت پر دستخط کر دیں اور اعلان کریں۔ کہ اسمبلی کے اندر بھی اُن کی جماعت مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی۔ جہاں تک صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ سر سکندر حیات خاں کی طرف سے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اِس پوزیشن کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔

(ب) جہاں تک آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کا سوال ہے۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کہ پراونشل مسلم لیگ اس وقت موجود ہے اور ہم ہر ضلع، ہر تحصیل اور اکثر دیہات میں لیگ کی مقامی شاخیں قائم کر رہے ہیں۔ اس لیے پنجاب میں کسی آرگنائزنگ کمیٹی کی ضرورت نہیں۔

(ج) جہاں تک مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا تعلق ہے

ہماری تجویز ہے۔ کہ پنجاب کو پانچ نشستیں دی جائیں ڈاکٹر
سر محمد اقبال کی درخواست ہے۔ کہ وہ خرابیٔ صحت کی بنا پر
اس قابل نہیں ہیں کہ مجلسِ عاملہ کے جلسوں میں شریک ہو سکیں
اس لیے اُن کی جگہ ملک برکت علی ورکنگ کمیٹی
پراونشل مسلم لیگ کو دے دیا جائے ملک برکت علی ورکنگ کمیٹی
میں بدستور شامل رہیں اور مسٹر غلام رسول خاں بیرسٹرایٹ لاء
کا نام بھی شامل کر لیا جائے۔ جہاں تک سر سکندر اور میاں
احمد یار خاں دولتانہ کا تعلق ہے اس مسئلے کے حل کا انحصار بیشتر
اُن کے اس فیصلے پر ہے۔ کہ وہ لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کر دیں
اور کسی مزید تاخیر کے بغیر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام
کا اعلان کر دیں۔ اگر وہ اِس معاہدے پر عمل کریں تو یہ خیال رکھا
جائے۔ کہ اُن کی نیابت کسی صورت میں موجودہ مسلم لیگ پارٹی کی
نیابت سے تجاوز نہ کرنے پائے۔"

آپ کا مخلص

(غلام رسول)

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبال)

تیرھواں باب

سکندر جناح پیکٹ

(۲)

علامہ اقبال کا خط :۔

۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کو ایک اور خط لکھا۔ جو درج ذیل ہے ۔

"مائی ڈیئر مسٹر جناح :

سر سکندر اور اُن کے احباب سے متعدد ملاقاتیں کرنے کے بعد میں قطعی اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں ۔ کہ سر سکندر مسلم لیگ اور پراونشل پارلیمنٹری بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اُن کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا۔ اُس میں درج ہے کہ پارلیمنٹری بورڈ کی نئے سرے سے تشکیل کی جائے گی اور اُس میں یونینسٹ پارٹی کے آدمیوں کو اکثریت عطا ہوگی میں نے پچھلے دنوں آپ کو خط لکھ کر

دریافت کیا تھا۔ کہ کیا واقعی یہ درست ہے۔ کہ آپ پارلیمنٹری بورڈ میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت دینے کا وعدہ کر چکے ہیں؟ اب تک آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔

ذاتی طور پر مجھے سر سکندر کی اس خواہش کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ اس معاہدے کی شرائط سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ لیگ کے تمام عہدیداروں میں ان کے حسب منشا ردوبدل کیا جائے۔ بخصوصیت سے موجودہ سیکرٹری کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ لیگ کی ترقی اور تنظیم میں ہمارے سیکرٹری نے انتہائی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ سر سکندر کی یہ بھی خواہش ہے کہ لیگ کا فنڈ اور سارا حساب کتاب ان کے آدمیوں کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اس تمام کارروائی سے ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ کسی نہ کسی طرح لیگ پر قابض ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیں۔ کم از کم میرا اندازہ تو یہی ہے۔

میں اپنے صوبے کی رائے عامہ کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس لیے میں لیگ کو سر سکندر اور ان کے احباب کے حوالے کرنے کی ذمہ داری لینے پر بالکل تیار نہیں ہوں۔ سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اور اگر یونینسٹ پارٹی کے موجودہ ہتھکنڈے جاری رہے تو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ

ہے۔ یونینسٹ پارٹی کے ممبروں نے ابھی تک مسلم لیگ کے حلف نامہ
پر دستخط نہیں کئے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ وہ دستخط کرنا
بھی نہیں چاہتے۔ اب وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ مسلم لیگ کا آئندہ
اجلاس لاہور میں فروری کی بجائے اپریل میں ہونا چاہیئے۔

میرا خیال ہے کہ اس لیت ولعل سے ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ
آہستہ آہستہ ان کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ آپ کو
شاید معلوم نہیں۔ کہ لکھنؤ سے واپس آکر سر سکندر نے پنجاب میں
ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے۔ اور اب اس کی شاخیں صوبے
کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ براہِ کرم مجھے اطلاع
دیجئے۔ کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اگر تکلیف نہ ہو
تو بلا توقف تار دے دیجئے۔ اور اگر تار ممکن نہ ہو۔ تو جلد از جلد
ایک مفصل خط لکھیئے۔

آپ کا مخلص[1]

محمد اقبال"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس گرامی نامے میں پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کی
برطرفی کے جس مطالبہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ سر سکندر
اپنے دو تین احباب کے ہمراہ ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "آپ لوگ مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کیوں نہیں کرتے؟"

سر سکندر نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے جواب دیا کہ "ہم غلام رسول خاں کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ وہ بہت تیز مزاج آدمی ہیں۔ آپ کسی اور شخص کو لیگ کا سیکرٹری مقرر کر دیجیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "بہت اچھا! میں برکت علی سے کہوں گا کہ یہ کام سنبھال لیں۔"

سر سکندر نے عرض کیا "ہمیں ملک صاحب بھی منظور نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "خلیفہ شجاع الدین کو سیکرٹری بنا دوں؟"

سر سکندر نے خلیفہ صاحب کے نام پر بھی رضامندی ظاہر نہ کی۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "آپ خود کوئی آدمی کیوں تجویز نہیں کرتے؟"

جواب میں سر سکندر نے نواب زادہ خورشید علی خاں کا نام پیش کیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب سخت غصے میں آ گئے اور انھوں نے یہ نام منظور کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔[1]

---

[1] میرے دوست راجہ حسن اختر صاحب اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ سر سکندر خود تشریف نہیں لائے تھے۔ بلکہ انھوں نے میر مقبول محمود کو یہ پیغام دے کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

ملک برکت علی کا خط :-

۳ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو ملک برکت علی نے ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا :-

ڈیئر مسٹر جناح !

آپ کا گرامی نامہ محررہ ۲۰ر نومبر ۱۹۳۷ء مجھے وقت پر مل گیا تھا خدا کا شکر ہے۔ کہ آپ کی طبیعت اب بہتر ہے۔ اور تکلیف رفع ہو گئی ہے آپ کے مزاج کی ناسازی سراسر اُس محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ جو اجلاسِ لکھنؤ کے بعد آپ کو برداشت کرنا پڑی۔

میں نے آپ کا خط ڈاکٹر سر محمد اقبال اور غلام رسول خاں کو دکھا دیا ہے۔ اس بارے میں مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔ کہ جوں ہی کوئی مسلمان لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے اس کا ممبر بنتا ہے۔ وہ اپنے حقوق و فرائض کے لحاظ سے لیگ کے پرانے ممبروں کے ہم پلّہ ہو جاتا ہے۔

میرے تمام احباب اس حقیقت کو بخوشی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ سر سکندر اور اُن کے رفقا نے ابھی تک لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے۔ اس کے برعکس وہ مسلسل یہ پراپاگنڈہ کئے جا رہے ہیں۔ کہ لکھنؤ جانے سے قبل جو حالت

پنجاب میں تھی۔ وہ بعینہٖ برقرار ہے۔ اور اُس میں رتّی برابر فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اس باہمی آویزش میں یونینسٹ پارٹی کو فتح اور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ مسلم لیگ یونینسٹ پارٹی کی ایک ماتحت شاخ کی حیثیت سے کام کرے گی۔

اگر سر سکندر اور اُن کے رفقا لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ تو انھیں لیگ کے تمام معاملات میں حصّہ لینے کی پوری آزادی ہوگی۔ اور اگر وہ لیگی ممبروں کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ تو انھیں یقیناً یہ اختیار ہوگا کہ لیگ کی پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکیں۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہ وہ نہ لیگ میں شامل ہونے میں اور نہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہیں۔ یہ طرزِ عمل تو معاہدہ لکھنؤ کے صریح خلاف ہے۔

سر سکندر اس بات پر بھی مُصر ہیں۔ کہ لیگ کے موجودہ عہدیداروں کو برطرف کر کے اُن کی جگہ اُن کے یعنی سر سکندر کے آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوگا وہ لیگ کی رکنیت قبول نہیں کریں گے۔ سر سکندر کا یہ مطالبہ تمام جمہوری قواعد کے خلاف ہے ہم کسی عہدیدار کو مستعفی ہونے پر مجبور نہیں کر سکتے البتہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات طے کرنے پر ہمیشہ آمادہ ہیں۔

مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اُسے ایک مُردہ جماعت بنا دینے کی پالیسی کی ہم کبھی تائید نہیں کریں گے۔ بلکہ ہر شخص جو لیگ کے آئین کو تمام دوسری باتوں پر مقدم رکھتا ہے کبھی اس پالیسی کی حمایت نہیں کرے گا۔ ہاں اگر آپ لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہمیں حکم دیں۔ کہ لیگ کو کلیتہً یونینسٹ پارٹی کے حوالے کر دیا جائے تو ہمیں آپ کے ارشاد کی تعمیل میں قطعاً کوئی عذر نہیں ہوگا۔ لیکن اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ کہ پنجاب میں لیگ کو ختم کرنے اور اسے موت کی نیند سلا دینے کی اس سے زیادہ مؤثر تجویز اور کوئی نہ ہو گی۔

ذاتی طور پر میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ تمام معاملات خوش اسلوبی اور دوستانہ طریقے سے طے ہو جائیں۔ اور ہمارا متحدہ محاذ ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن اس ضمن میں سر سکندر اور میر مقبول محمود نے لکھنؤ سے واپس آنے کے بعد جو اخباری بیانات شائع کئے ہیں۔ وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ آپ کی اُن بیانوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے صوبے کے عوام نے سکندر جناح پیکٹ پر جو اعتراضات کئے ہیں۔ وہ آپ کی نظر سے گذرے ہیں یا نہیں۔ عوام نے اس پیکٹ پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اُن کی رائے ہے۔ کہ اس پیکٹ کی رُو سے لیگ کو یونینسٹ پارٹی کے حوالے کر دیا

گویا لیگ کی موت کے محضر پر خود اپنے ہاتھوں سے مُہر ثبت کرنے کے برابر ہے۔

میری آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ بہت جلد سر سکندر اور اُن کے احباب کو مشورہ دیجئے۔ کہ وہ مزید تاخیر کے بغیر لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر دیں۔ اور اپنے خلوص کا اولین ثبوت یہ پیش کریں۔ کہ مجلس قانون ساز کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیں اگر سر سکندر ایسا کر دیں۔ تو ہم کھلے دل سے اُن کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ لیگ کی جمہوری حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ اور وہ بدستور مسلمانانِ پنجاب کے عزائم اور اُن کی آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی کا فرض ادا کرتی رہے۔

جہاں تک مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا تعلق ہے میری درخواست ہے کہ مہربانی فرما کر۔ اصحاب ذیل کو اُس کے ممبر نامزد کر دیجئے۔

مسٹر غلام رسول خاں۔ خلیفہ شجاع الدین۔ میاں عبد المجید بیرسٹرایٹ لاء۔ حافظ محمد عبد اللہ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی) اور مسٹر عاشق حسین بٹالوی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال علالت کی وجہ سے اِس بورڈ کی رکنیت قبول کرنے سے معذور ہیں۔

آپ کے مکتوبِ گرامی کا جواب بھیجنے میں جو تاخیر ہوئی ہے اُس کے

لیے دوبارہ معذرت پیش کرتا ہوں ۔ وجہ صرف یہ تھی ۔ کہ میں مسجد شہید گنج کے مقدمے میں سخت مصروف تھا ۔ وہ مقدمہ کل ختم ہوا ہے ۔ آپ کو یہ سُن کر مسرت ہو گی ۔ کہ پنجاب میں لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے ۔ اور اُس کی شاخیں جا بجا قائم کی جا رہی ہیں جن میں مقامی مسلمان بڑے جوش و خروش سے حصہ لے رہے ہیں ۔

آپ کا مخلص

برکت علی "

ممکن ہے بعض لوگ سوال کریں ۔ کہ مسٹر جناح نے سر سکندر کے ساتھ ایسا قابلِ اعتراض معاہدہ کیوں کیا ۔ میری ذاتی رائے ہے ۔ کہ مسٹر جناح اُس وقت دو مختلف محاذوں پر لڑنا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے تھے ۔ کانگرس اس شدت سے مسلمانوں کی قومی جمعیت کو تہس نہس کرنے پر تُلی ہوئی تھی ۔ کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ کہ ہم اپنے گھر کے اندرونی اختلافات کو کسی نہ کسی طرح ختم کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے ۔ مسٹر جناح نے یہی کچھ کیا ۔

اگر سکندر جناح پیکٹ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان جنگ جاری رہتی ۔ اس جنگ کی شدت اور طوالت کے متعلق آج کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی ۔ مسلم لیگ اُس وقت کمزور تھی ۔ اور یونینسٹ پارٹی طاقتور تھی ۔ ممکن ہے یہ دونوں جماعتیں مسلسل دو تین سال تک ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتیں لیکن مجھے یقین ہے ۔ کہ جنگ خواہ کتنی ہی طویل ہو جاتی فتح انجام کار لیگ کی ہوتی

ملک برکت علی نے ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو، پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن میں، تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"......اس وقت پنجاب میں ایک نہایت غلط قسم کی دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ اگرچہ اصطلاحی معنوں میں اب دفتری حکومتیں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن پنجاب پر بدستور یہ لعنت مسلط ہے اس لعنت سے نجات پانے اور اس طلسم کو ہمیشہ کے واسطے پاش پاش کر دینے کے لیے ہمارے صوبے کو سر توڑ محنت کرنا پڑیگی۔ یہ حکومت ایک کابوس کی طرح ہم پر سوار ہے جس نے ہماری اُن تمام کوششوں کو بیکار بنا رکھا ہے جو ہم اُس مبارک دن کی آمد آمد کے لیے کر رہے ہیں۔ جب ہمارا صوبہ اُن بندھنوں اور زنجیروں سے آزاد ہو گا۔ جنھوں نے ماضی میں ہم کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔"

وزیر اعظم (سر سکندر حیات خاں): "بلی تھیلے سے باہر نکل آئی۔"

ملک برکت علی:-

"ہاں۔ بلی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے۔ اور یہ بھی سن لیجیے کہ کیوں باہر نکلی ہے۔ اس وقت پنجاب میں ایک بدترین قسم کی رجعت پسند حکومت قائم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس حکومت کی کمزوریوں کو واشگاف طور پر بیان کر کے اُسے ختم کرنے کی کوشش کریں تاکہ آلام و مصائب کی یہ اندھیری رات جو اس وقت ہمارے صوبے پر چھائی ہوئی ہے۔ کسی طرح ختم ہو۔ اور تاریخ پنجاب کا یہ افسوسناک

باب اپنے انجام کو پہنچے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے سامنے اکثریت کی ایک سنگین دیوار کھڑی ہے جو ان لوگوں سے تعمیر کی گئی ہے جن میں خطاب یافتہ رئیس۔ بڑے بڑے زمیندار آنریری مجسٹریٹ آنریری سب رجسٹرار۔ ذیلدار اور دفتری حکومت کے پرانے ہوا خواہ اور کاسہ لیس شامل ہیں۔ لیکن کچھ پروا نہیں خواہ اس دیوار کو پاش پاش کرنے کے لیے ہمیں برسوں کیوں نہ سر ٹکرانا پڑے۔ ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔"

مسٹر جناح اگر سر سکندر سے مفاہمت نہ کرتے تو ہماری جد و جہد یقیناً جاری رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ لیگ کی مالی حالت سخت مخدوش تھی۔ دیہاتی آبادی کو یہ کہہ کر کہ لیگ شہری مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ ہم سے بدگمان کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں زمیندارہ لیگ قائم کر کے گاؤں کے لوگوں کو بھڑکانے کی کوششیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کانگرس کی یلغار سے شہری اور دیہاتی مسلمان دونوں پریشان ہو رہے تھے اور اُن کی پریشانی کا مداوا صرف مسلم لیگ کے پاس تھا۔ مسٹر جناح کو انجام کار یونینسٹ پارٹی کے خلاف لڑنا ہی پڑا۔ اگرچہ یہ لڑائی چھ سال بعد ہوئی اور میری رائے میں نامناسب موقع پر۔ نامناسب اسباب اور نامناسب حالات میں ہوئی۔ تاہم یہ سب کچھ اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ کہ سکندر جناح پیکٹ ایک غلط اور نقصان دہ معاہدہ تھا۔

اجلاس لکھنؤ کے بعد اگرچہ پنجاب میں سکندر جناح پیکٹ کا قضیہ شروع

ہو گیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا حکم تھا۔ کہ اس قضیئے سے آنکھیں بند کر کے ہمیں اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ لکھنؤ سے واپس آتے ہی ہم پھر دورے میں مصروف ہو گئے۔

اسمبلی کے الیکشن کے دوران میں ہم نے پراونشل مسلم لیگ کے دفتر کے لیے ایڈورڈز روڈ پر ایک کرائے کا مکان لے لیا تھا۔ لیکن اب مسلم لیگ کا سرمایہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اور آئندہ کہیں سے روپیہ دستیاب ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں تھی۔ اس لیے ایڈورڈز روڈ کا مکان چھوڑنا پڑا۔ اور لیگ کا دفتر غلام رسول خاں کے مکان ۱۲ امپیئل روڈ پر آ گیا۔

الیکشن ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے غلام رسول خاں کو ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا۔ اور اسی روپے سے اب تک لیگ کا کام چل رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ایک ہزار روپیہ ڈاکٹر صاحب کو کس شخص نے دیا تھا۔ غالباً کوئی سرکاری ملازم تھے۔ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ غلام رسول خاں کو اُن کا نام معلوم تھا۔ لیکن میں نے کبھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

جب حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ تو ہم نے مجبوراً لیگ کے دفتری کلرک اللہ بخش سلیم کو بھی جواب دے دیا۔ اُنھیں غالباً تیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن سلیم محض کلرک ہی نہیں۔ بلکہ ہمارے دوست بھی تھے۔ اور اُن کی علیحدگی ہم سب کو شاق گذری۔

اب فیصلہ یہ ہوا کہ لیگ کے دفتر کا سارا کام میں خود سنبھال لوں۔ چنانچہ

صبح سے شام تک مجھے لیگ کے دفتری امور میں سر کھپانا پڑتا تھا۔ راجہ عبد العزیز شام کو ہائی کورٹ کی ملازمت سے واپس آتے تو انگریزی کے خطوط اور مسودے ٹائپ کر دیتے تھے۔ دورے کے مصارف بھی کچھ دیر لیگ کے فنڈ سے ادا ہوتے رہے۔ لیکن جب لیگ کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ تو یہ خرچ بھی ہم میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر خود برداشت کرنا پڑا۔

مختلف اضلاع کے صدر مقامات میں لیگ کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں اور ان کے تحت ابتدائی شاخیں بھی کام کر رہی تھیں۔ ان شاخوں کے عہدیداروں میں اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے۔ تو ان کو نپٹانے کے لیے ہم میں سے کسی نہ کسی کو خود وہاں جانا پڑتا تھا۔ پھر آئے دن باہر سے پراونشل مسلم لیگ کے وفد کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں۔ خصوصاً ملک برکت علی کے پاس تو ہر جگہ سے پُر اصرار بُلاوا آتا تھا۔ لیکن وہ اپنی بے شمار مصروفیتوں کی وجہ سے تمام دعوتیں قبول کرنے سے معذور تھے۔ اندریں حالات اکثر و بیشتر موقعوں پر مجھے اُن کا قائم مقام بن کر جانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کی شاخوں کا بھی یہ اصرار تھا۔ کہ ان کو لیگ کے تازہ بتازہ حالات سے باخبر رکھا جائے تاکہ تحریک میں کمزوری نہ آنے پائے۔ ان تمام اغراض کے لیے روپیہ درکار تھا۔

انہی دنوں میں نے اور غلام رسول خاں نے ایک تجویز مرتب کی۔ کہ پنجاب مسلم لیگ کے زیر اہتمام مہینے میں دو بار ایک رسالہ شائع ہونا چاہیئے۔ جس میں ہندوستان کے تمام صوبوں کی مسلم لیگی اور کانگرسی سرگرمیوں کے مفصل

حالات درج ہوں۔ تاکہ پنجاب کے مسلمان ہندوستان کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر رہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ یہ رسالہ کم از کم ایک ہزار کی تعداد میں چھپوا کر صوبے کی تمام شاخوں میں مفت تقسیم کیا جائے گا۔ غلام رسول خاں نے یہ تجویز ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کی۔ تو انھوں نے اسے پسند فرمایا۔ بلکہ اُن کا خیال تھا۔ کہ اس رسالہ کی اشاعت کے بعد لیگ کے وفد کو بار بار دورہ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی۔ اور اس کی بجائے تمام حالات مطبوعہ صورت میں لیگ کی شاخوں کے پاس پہنچ جایا کریں گے۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کہ اس تجویز کی تکمیل کے لیے بھی روپیہ درکار تھا۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب نے غلام رسول خاں سے کہا۔ کہ "کوٹ فتح خاں کے رئیس سردار محمد نواز خاں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے اُن سے لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا تھا۔ وہ مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ اُن سے فلیٹی ہوٹل میں جا کر ملیے۔"

دوسرے روز ملک برکت علی اور غلام رسول خاں۔ سردار محمد نواز خاں سے ملے۔ اور لیگ کی مالی امداد کا ذکر کیا۔ سردار محمد نواز خاں کے جتنے مقدمات ہائی کورٹ میں پیش ہوتے تھے۔ اُن کی پیروی ملک برکت علی کرتے تھے۔ اس لیے ملک صاحب سے اُن کی کوئی بیگانگی نہ تھی۔ سردار محمد نواز خاں نے پہلا سوال یہ کیا کہ "مسلم لیگ اور سر سکندر حیات کے تعلقات کیسے ہیں؟"

غلام رسول خاں نے صاف کہا "اس وقت تو ہمارے تعلقات خوشگوار

نہیں ہیں۔ اگر سر سکندر نے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم نہ کی۔ تو ہم اُن کی مخالفت جاری رکھیں گے۔"

اِس پر سردار محمد نواز خاں نے بھی صاف گوئی سے کام لیا۔ اور فرمایا کہ "دیکھئے! میرے موجودہ حالات اس قسم کے ہیں کہ میں سر سکندر کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے خانگی معاملات میں قدم قدم پر حکومتِ پنجاب کی مدد درکار ہے۔ اگر میں لیگ کو روپیہ دوں تو ظاہر ہے کہ آپ اس پیسے کو سر سکندر اور اُن کی جماعت کے خلاف پراپاگنڈے پر صرف کریں گے۔ سر سکندر کو یہ سب کچھ معلوم ہو گا۔ تو مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس لیے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اِس کے بعد سردار محمد نواز خاں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ "اس وقت میری فلاں اپیل (اپیل کا نام لیا۔ جو مجھے یاد نہیں) ہائی کورٹ میں دائر ہے آپ اُس کی ڈگنی فیس مجھ سے لے لیجئے۔ اور جی چاہے تو اس روپے کو لیگ کے کام پر صرف کر ڈالیے۔ مجھے کچھ اعتراض نہیں ہو گا۔"

ملک صاحب نے ہنس کر کہا: "حضرت! یہ تو ایک بددیانتی ہے جس کا میں بحیثیت ایک قانون دان اور وکیل کے مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

اِس مختصر سی گفتگو کے بعد غلام رسول خاں اور ملک برکت علی اٹھ کر واپس چلے آئے۔ اور روپیہ حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی ناکام رہی۔

اُنہی دنوں ایک روز ڈاکٹر صاحب نے میجر ملک ممتاز نوانہ کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ "وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اور میں نے اُن سے لیگ کی مالی امداد کا

ذکر کیا تھا۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ دیں گے۔ آپ ایک وفد بنا کر سرگودھا جائیے"۔

غلام رسول خاں نے مجھ کو یہ قصہ سنایا۔ تو میں نے مایوسی کا اظہار کیا مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ یہ بڑے بڑے زمیندار مسلم لیگ کو ایک پیسہ بھی دینگے میجر ممتاز ٹوانہ سے میری بالمشافہ ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں نے اُن کی خوبیوں کا ذکر سُن رکھا تھا کہ بڑے پڑھے لکھے اور با اخلاق آدمی ہیں اور ادب کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ زمان مہدی خاں سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ زمان مہدی خاں میجر صاحب سے مل کر کوئی تاریخ مقرر کریں اور اُس تاریخ کو لیگ کا وفد لاہور سے چل کر سرگودھا پہنچ جائے۔

ہم دسمبر میں سرگودھا گئے۔ وفد میں ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان مہدی اور راقم التحریر شامل تھے۔ ہم نے تین روز میجر ممتاز ٹوانہ کے دولت کدے پر قیام کیا۔ شہر میں ایک پبلک جلسہ بھی ہوا۔ جہاں ہم نے خوب تقریریں کیں۔ میجر صاحب نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ دونوں وقت دسترخوان کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھر دیا جاتا تھا مرغ مسلّم ماہی بریاں۔ بط دم پخت۔ حلوائے گندر۔ اور مزعفر تاریخ کی بھری ہوئی قابیں آتی تھیں۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی بسیار خور نہیں۔ اس لیے جنّتِ نگاہ کے اس سامان کا بیشتر حصّہ واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن جس غرض کے لیے ہم نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ افسوس کہ اُس میں قطعاً کامیابی نہ ہوئی۔ اور تین روز کے بعد ہم خالی ہاتھ واپس لاہور آ گئے۔

اُس زمانے میں ایک تکلیف یہ بھی تھی کہ مسلم لیگ میں کام کرنے والوں کی سخت کمی تھی۔ جس مہم کو ہم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اور جس قسم کے حالات و واقعات درپیش تھے۔ اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے پاس کم از کم نصف درجن کے قریب۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان موجود ہوتے۔ جنہیں تحریر و تقریر کے فن پر پورا عبور رہتا۔ اور جو صوبے کے طول و عرض میں گھوم کر تحریک میں نئی جان ڈال دیتے۔ ہمارے پاس ایسا ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ ایم۔ اے۔ اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد بہت سے مسلمان نوجوان بے کار پھر رہے تھے۔ لیکن انہیں پیٹ کے دھندے نے مجبور کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے پاس سوائے ایثار، قربانی، قومی جدّوجہد اور حکومت کے عتاب کے رکھا ہی کیا تھا۔ پھر تعلیم یافتہ نوجوان اس طرف کیوں رُخ کرتے۔ بہت سے نوجوانوں کو یونینسٹ پارٹی نے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اور وہ اس اُمید پر کہ زُود یا بدیر اُنہیں یونینسٹ لیڈروں کے طفیل سرکاری ملازمت مل جائے گی۔ اِس پارٹی کے صدر دفتر میں کام کر رہے تھے۔

یہ صحیح ہے۔ کہ مسلمان نوجوانوں کو عدم تعاون کی تحریک میں تعلیم ترک کرنے کا جو تلخ تجربہ ہُوا تھا اُس کے بعد کوئی شخص اُن کو کسی سیاسی تحریک میں شرکت کی دعوت دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس دور میں بھی، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ہماری قوم کے بعض نوجوانوں نے ایثار و قربانی کا ایسا بلند معیار پیش کیا تھا۔ جس کی مثال خود ہندوؤں کے ہاں بھی نہیں تھی۔ رنج اِس بات کا ہے کہ اُن کی قربانیوں سے سراسر اغیار نے

فائدہ اٹھایا اور ہم محروم رہے۔

ڈاکٹر محمد اشرف کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی پروفیسری چھوڑ کر کانگریس میں کام کرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد (زین العابدین احمد) نے علی گڑھ سے اقتصادیات میں ایم۔ اے کیا تھا۔ پھر لندن سے اقتصادیات۔ بی۔ ایس۔ سی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ وطن واپس آنے کے بعد انھیں محکمہ تعلیم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن انھوں نے نوکری چھوڑ دی۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا منظور کیا۔ صاحبزادہ محمود الظفر نے انگلستان کے پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ پھر کیمبرج سے ڈگری لی تھی۔ ہندوستان واپس آکر انھیں بھی معقول ملازمت مل گئی تھی لیکن انھوں نے بھی یہ ملازمت ترک کر کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں پچھتر روپے ماہوار پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ باتیں اس لیے رنج دہ ہیں کہ ؎

سیاہ بختی ازاں بیشتر نمی باشد
کہ مجلسِ دگرے روشن از چراغ من است

تاہم اس بات کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہیں۔ کہ ہماری خاکستر میں اب بھی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ ہمارے ملک میں وکالت ایک ایسا پیشہ ہے جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس پیشے میں انسان اپنی آزادی اور خودداری کو قائم رکھ کر سیاسیات میں بے دریغ حصہ لے سکتا ہے۔ اس امر سے

بھی انکار محال ہے کہ ہندوستان کی سیاسیات میں ہمیشہ وکلاء نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ اور یہی لوگ سیاسی تحریکوں میں آگے رہے ہیں۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے عروج کے زمانے میں خود مسلمان وکلا کا بہت بڑا طبقہ اِس پارٹی کا حلقہ بگوش بن گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں پراونشل مسلم لیگ کا وفد منٹگمری جانے والا تھا۔ شام کو غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ ہم لوگ صبح منٹگمری جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ کہ منٹگمری میں کہاں ٹھہریں گے آپ؟ غلام رسول خاں نے ایک وکیل صاحب کا نام لیا۔ کہ اُن کے ہاں قیام کرنے کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہ نام سُن کر خاموش ہو گئے۔ پھر بولے: "کہیں اور کیوں نہیں آپ ٹھہرتے"؟ غلام رسول خاں نے جواب دیا۔ کہ اُن وکیل صاحب کو اطلاع کر چکے ہیں۔ اب کہیں اور ٹھہرنا مناسب نہیں۔

زمان مہدی خاں بھی اُس وقت موجود تھے۔ انھوں نے بتایا۔ کہ اپنی ملازمت کے زمانے میں اُنھوں نے وکیل صاحب سے بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ اس لیے اب اُن کے ہاں ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اِس تجویز سے خوش نہیں ہیں۔

دوسرے روز جب ہم منٹگمری پہنچے۔ تو وکیل صاحب غائب تھے۔ تاہم ڈاکٹر صاحبزادہ ارشاد علی اور دُوسرے احباب نے وفد کی پذیرائی انتہائی گرمجوشی اور خوش اسلوبی سے فرمائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وکیل صاحب خود اُن دنوں خطاب اور جاگیر کے حصول کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ اور چونکہ یہ دونوں

چیزیں سراسر پنجاب کے وزیر اعظم کی خوشنودی سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو لیگ کے وفد سے وابستہ کرنے کی غلطی نہ کی چنانچہ انھیں خطاب بھی عطا ہوا۔ اور جاگیر بھی ملی۔

البتہ اِس دوران میں ملتان کے اُس خانوادۂ رشد و ہدایت نے جسے عرفِ عام میں گیلانی خاندان کہا جاتا ہے۔ جس خلوص و محبّت اور استقلال و پامردی سے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ اُس کی یاد آج بھی میرے لیے سرمایۂ انبساط اور موجبِ فخر و مُباہات ہے۔ سیّد محمد رضا شاہ گیلانی مرحوم اور سید ولایت حسین شاہ گیلانی مرحوم۔ دونوں اسمبلی کے رُکن تھے۔ وہ اگرچہ ایوان کے اندر یونینسٹ پارٹی کے حلقے میں بیٹھتے تھے۔ لیکن انھوں نے بارہا ہم سے کہا تھا۔ کہ جس دن آپ حکم دیں گے۔ ہم وزارتی پارٹی کو چھوڑ کر الگ بیٹھ جائیں گے۔ ملتان شہر میں لیگ کے بڑے بڑے شاندار جلسے ہوئے۔ جن کی تمام تر کامیابی انہی اصحاب کی کوشش کا نتیجہ تھی۔

ایک پبلک جلسے کی صدارت تو خود حضرت مخدوم پیر صدرالدین شاہ صاحب گیلانی نے بہ نفسِ نفیس فرمائی تھی۔ حضرت کا سن شریف اُس وقت اسی کے لگ بھگ تھا۔ اور مدّت سے خانہ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا کہ آج قوم کو اُن کی رہنمائی کی ضرورت ہے تو بے دریغ گوشۂ عزلت سے نکل کر میدان میں آگئے۔

ہفتہ وار نیو ٹائمز کو جاری ہوئے بھی سال بھر ہو چکا تھا۔ اور اس ایک سال کے عرصے میں اِس اخبار نے مسلمانانِ پنجاب کے انگریزی خواں طبقے کو مسلم لیگ

کے کام اور پیغام سے روشناس کرنے میں بڑا نمایاں حصّہ لیا تھا۔۔۔ اخبار کی سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا پیغام ارسال فرمایا:۔

"گذشتہ ایک سال میں نیو ٹائمز نے قوم کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ میں اُن کو بڑے اطمینان اور مسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس اخبار کے خریدار بنیں تاکہ نیو ٹائمز ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک ذمّہ دار اور باوقار ترجمان کی حیثیت اختیار کرلے۔"

۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ء کو انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں یوم اقبال کی تقریب منائی جانے والی تھی۔ جس کے لیے مسلم برادرہڈ نے بڑی گرم جوشی سے تیاریاں شروع کردی تھیں۔ بیرونِ لاہور سے بھی بعض لوگ شرکت کے لیے آرہے تھے۔ اس موقع پر سر سکندر حیات خاں نے ذیل کا بیان اخبارات میں شائع کرایا۔

"یوم اقبال کو ایک مقدّس قومی تقریب کے طور سے منائے جانے پر ہر ہندوستانی کو بالعموم اور ہر پنجابی کو بالخصوص سچّے دل سے خوش ہونا چاہیئے۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس یادگار تہوار کی مسرتیں جو ایشیا کے نامور فلسفی اور عظیم المرتبت شاعر کے نام سے منسوب ہے صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہنی چاہئیں۔ بلکہ تمام مشرقی ممالک کو اُن میں شریک ہونا چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس تقریب

کو اُس متانت، سنجیدگی اور وقار سے منائیں جس سے ایک طرف تو دُنیا پر اقبالؔ کی عظمت، اور اُس کی شاعری کی حقیقی قدر و منزلت ظاہر ہو جائے۔ اور دوسری طرف، یہ بھی واضح ہو کہ ایشیا اپنے اِس فرزندِ جلیل کے ادبی کارناموں کی قدر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

"عرصۂ دراز کی گراں خوابی کے بعد اگر آج ہمیں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نظر آتے ہیں۔ تو یہ سب کچھ اقبالؔ کی پُر جوش آواز کا اثر ہے اِدھر ہندوستان کے باشندوں میں بھی جو تڑپ اور بلند نگہی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ بھی اس نابغۂ عظیم کی مساعی کی شرمندۂ احسان ہے۔ لہٰذا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ کہ یومِ اقبالؔ کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھ کر اس میں سرگرمی سے حصّہ لے۔

"میں اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس جس شہر میں یومِ اقبالؔ منایا جائے وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ شاعرِ اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبالؔ کمیٹی کو چاہیے کہ امپیریل بینک آف انڈیا میں یومِ اقبالؔ فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبالؔ کے تلامذہ اور اُن کی شاعری کے مداحوں کا فرض ہے کہ جملہ رقوم براہِ راست بنک کو ارسال کر دیں۔ جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت

ہیں پیش کی جائیں گی۔

"علاوہ ازیں۔ میں یہ بھی درخواست کرتا ہوں۔ کہ تمام مسجدوں اور مندروں میں اقبال کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ کہ خدائے تعالیٰ اُنھیں عرصۂ دراز تک سلامت رکھے تاکہ وہ اپنی قوم اور ملک کی خدمت کر سکیں"۔ [1]

سر سکندر کی اس تجویز کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا بیان اخباروں میں شائع فرمایا۔

"سر سکندر حیات خاں نے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے نام جو پیغام دیا ہے۔ اُس میں اُنھوں نے میرے متعلق بہت سے محبت آمیز جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

"سر سکندر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جو لوگ میرے کلام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ سب مل کر مجھ کو ایک تھیلی پیش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں ہماری قوم کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کے سامنے ایک شخص کی ضرورتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں ہر چند کہ اُس شخص کی شاعری سے ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی روح کو کیسی نہ جلا بخشی ہو۔ فرد اور اُس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۳۷ء

" آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے۔ کہ اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک چیئر قائم کی جائے جہاں جدید طریقوں کے مطابق ریسرچ ہونی چاہیئے۔ اسلامی تاریخ فقہ، دینیات اور تصوف سے جس قدر جہالت پنجاب میں برتی جارہی ہے اور اس جہالت سے جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔

" اب وقت آگیا ہے کہ اسلامی فکر اور اسلامی طرزِ حیات کا بغور مطالعہ کر کے ہم عوام کو بتائیں کہ اسلام کا اصل مقصد کیا تھا اور اُس مقصد اور پیغام کو کس طرح تہہ در تہہ پردوں میں چھپا دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے اندر موجودہ اسلام کی روح کو کیونکر مسخ کیا گیا ہے۔ اِن پردوں کو اب اٹھانا چاہیئے۔ تاکہ نئی نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل و صورت سے آگاہ ہوسکیں۔

" مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی یہ ادارہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اسلام ایک طرف ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک زبردست عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے تو دوسری طرف اُس نے نوعِ انسانی کے ذہنی اور مذہبی انقلاب میں بڑا نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اس تجویز کو

پنجاب کے وزیرِ اعظم پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر و رسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش بھی کریں گے۔ تاہم میں ایک سَو روپے کی حقیر رقم اِس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔" [1]

۱۹۳۷ء کے اختتام تک یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی اور دونوں فریق اپنے اپنے راستے پر گامزن رہے۔ انہی دنوں میں نے ایک روز ملک برکت علی سے پوچھا تھا کہ "۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کی رات کو جب آپ نے سکندر جناح پیکٹ کا پہلا مسودہ مرتب کیا تھا۔ تو آپ نے اُس میں کونسی ایسی بات لکھی تھی جسے سر سکندر حیات نے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا؟"

ملک صاحب نے جواب دیا "کہ میں نے اُس میں لکھا تھا۔ کہ یہ اعلان کیا جائے۔ کہ وہ یونینسٹ پارٹی جس کی تشکیل اپریل ۱۹۳۶ء میں سر فضلِ حسین نے کی تھی۔ اور جس کے تحت ۱۹۳۷ء کی الیکشن لڑی گئی تھی ختم ہو چکی ہے۔ اور اب اس پارٹی کے مسلمان ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے مسلم لیگی بن گئے ہیں۔"

ظاہر ہے اگر ملک برکت علی کی یہ تجویز اُس وقت مان لی جاتی۔ تو سارا قضیہ ختم ہو جاتا۔ اور آئندہ کوئی جھگڑا رونما نہ ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میاں مشتاق احمد گورمانی نے پچھلے دنوں روزنامہ ٹائمز آف کراچی

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء

کے ایڈیٹر زیڈ۔ اے سلہری کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا جو استغاثہ دائر کیا تھا۔ اُس میں اُنھوں نے عدالتِ عالیہ کے روبرو شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ یونینسٹ پارٹی ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ وہ سیاسی یا قومی مفہوم کے اعتبار سے کوئی جداگانہ پارٹی نہ تھی۔[1]

میں سمجھتا ہوں کہ گورمانی صاحب کی یہ رائے غلط ہے۔ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی تھی۔ جس کا وجود اسمبلی سے باہر موجود تھا گورمانی صاحب خود یونینسٹ پارٹی کی وزارت میں پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اُن سے بہتر اس حقیقت سے کون واقف ہوگا۔ پھر تعجب ہے اُنھوں نے یہ کیونکر کہدیا۔ کہ یونینسٹ پارٹی محض ایک پارلیمنٹری گروپ تھا۔ اور اسمبلی سے باہر اُس کا وجود نہیں تھا۔

ممکن ہے بعض لوگ سوال کریں۔ کہ سکندر جناح پیکٹ کے متعلق پنجاب کے عام ہندوؤں کے تاثرات کیا تھے۔ عام ہندوؤں سے مراد اگر غیر کانگرسی ہندو ہیں تو اُن کا بیشتر حصّہ ہندو سبھا سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے ترجمان پروفیسر گلشن رائے تھے۔ پروفیسر گلشن رائے ۱۹۲۲ء سے سر فضلِ حسین کی پالیسی کے سب سے بڑے نکتہ چیں اور معترض چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ تحریر و تقریر سے فضلِ حسین کی پالیسی کو ہدفِ طعن بنائے رکھا تھا۔ ہندوؤں کا یہی طبقہ تھا جس نے چودھری چھوٹو رام کو اس شرط پر وزارت کی

---

[1] روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۸ء

پیش کش کی تھی۔ کہ وہ فضل حسین کا ساتھ چھوڑ کر ہندو سبھا میں شامل ہو جائیں۔

پروفیسر گلشن رائے کے نزدیک یونینسٹ پارٹی سراسر مسلمانوں کے مفاد کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ اور اس پارٹی کا غیر فرقہ وارانہ بہروپ صرف ہندوؤں کو فریب دینے کی ایک چال تھی۔ لیکن عجیب بات ہے۔ کہ جونہی سکندر جناح پیکٹ مرتب ہوا۔ پروفیسر گلشن رائے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کہ اب یونینسٹ پارٹی کی غیر فرقہ وارانہ روح سلب ہو گئی ہے۔ اور آئندہ پنجاب پر مسلم لیگ ایسی فرقہ پرست جماعت کی حکومت ہو جائے گی۔ اس موضوع پر اس کا ایک مضمون جو ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو لاہور تشریف لائے۔ اور جاوید منزل میں علامہ اقبال سے بھی ملے۔ پنڈت نہرو کی تشریف آوری کی وجہ بڑی دلچسپ تھی۔ ۷ر مئی ۱۹۳۷ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں میاں احمد یار خان دولتانہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ کانگرس ہائی کمان نے پنجاب کے مسلمانوں میں کانگرس کا پراپاگنڈہ کرنے کے لیے ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور عنقریب مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائیں گے۔ تاکہ مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر ایٹ لا کے مشورے سے اس پراپاگنڈہ کا خاکہ تیار کیا جائے۔ یہ روپیہ ڈاکٹر محمد عالم کی تحویل میں رہے گا۔ جس سے وہ اردو کا ایک روزنامہ جاری کریں گے اور بہت سے تنخواہ دار آدمیوں کو پراپاگنڈے کے لیے ملازم بھی رکھیں گے۔

ڈاکٹر عالم اپنی شہرت اور نیک نامی کے بارے میں بلا وجہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ مضمون پڑھنے کے بعد سول اینڈ ملٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر اور میاں احمد یار خاں دولتانہ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا استغاثہ دائر کر دیا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کو بطور گواہ طلب کیا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اِس مقدمہ میں شہادت دینے کے لیے لاہور تشریف لائے اور میاں افتخار الدین کے دولت کدے پر فروکش ہوئے۔

علامہ اقبال نے اُنھیں پیغام بھیجا۔ کہ مجھ سے ملتے جائیے گا۔ چنانچہ پنڈت نہرو اس پیغام کی تعمیل میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پنڈت جی نے اِس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ:

"... اپنے انتقال سے چند مہینے قبل جبکہ وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ اُنھوں نے مجھے یاد فرمایا۔ اور میں نہایت خوشی سے اس ارشاد کی تعمیل میں اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا۔ اور مجھے یہ بھی محسوس ہُوا کہ اس شخص کے ساتھ کام کرنا کتنا آسان اور سہل ہے۔ وہ اُس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ اور گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ جس میں خود میں نے بہت کم حصّہ لیا۔ بلکہ زیادہ تر اُنھی کی باتیں سنتا رہا میں اُن کی شاعری کا مداح ہوں اور

مجھے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی۔ کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں"۔ ؎

پنڈت نہرو کے ساتھ میاں افتخار الدین بھی تھے۔ اور باتیں وقتی مختلف موضوعوں پر ہوتی رہیں۔ پنڈت نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پرا پاگنڈا کرنے میں مصروف تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے گذشتہ دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے۔ اور دونوں مرتبہ اپنے خطبات صدارت میں انھوں نے کہا تھا۔ کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے۔ لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل۔ راج گوپال اچاریہ اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اِس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔

دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا۔ کہ "سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں۔؟"

پنڈت جی نے جواب دیا کہ "نصف درجن کے قریب"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تعجب ہے۔ خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے۔ اودھر آپ مجھ سے یہ کہتے ہیں۔ کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں۔ تو کیا میں دس کروڑ

؎ THE DISCOVERY OF INDIA
By Jawaharlal Nehru (Page 288)

مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں۔"

اس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے۔

پھر جب ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر چھڑا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مغربی ایشیا در اصل اسلامی ایشیا ہے۔ اور آئندہ سیاسیات عالم میں مغربی ایشیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ اگر ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اور انھیں ناراض کر لیا۔ تو خود مغربی ایشیا کے ساتھ اُن کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اس لیے ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ تاکہ مغربی ایشیا کے ساتھ بھی اُن کے تعلقات اچھے رہیں۔

ابھی اِن دو عظیم المرتبت انسانوں کی گفتگو جاری تھی۔ کہ یکایک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اُٹھے کہ "ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں۔ تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔"

ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور انگریزی میں کہنے لگے "اچھا۔ تو چال یہ ہے۔ کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر۔ مسٹر جناح کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو اُن کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔"

اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ اور کمرے میں تکدّر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا۔ کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے۔ اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سُود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔[1]

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب میں جہاں اِس ملاقات کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

"اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اقبالؔ کا رجحان سوشلزم کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اشتراکی روؔس نے جو زبردست ترقی کی ہے، اُس نے اقبالؔ کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری میں بھی اب ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔"

اِس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مسلمانوں کے افلاس۔ اور اُن کی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو دولت کی اُس غیر مساویانہ تقسیم کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی۔ جس نے قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا رکھا تھا خواہ اِسے سوشلزم کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجئے۔ یہ واقعہ ہے کہ

---

[1] اس ملاقات کے وقت میرے دو دوست بھی وہاں موجود تھے ایک میاں فیروز الدین احمد مرحوم دُوسرے راجہ حسن اختر۔ چند روز بعد دونوں نے مجھے ملاقات کی پوری روئداد سُنائی تھی۔ تاہم میں نے بہ نظرِ احتیاط پچھلے دنوں راجہ حسن اختر کو لاہور خط لکھ کر اس واقعہ کی تصدیق کی تو راجہ صاحب نے ایک ایک لفظ کی تائید فرمائی۔

ڈاکٹر صاحب روز بروز اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو بھی ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ

"روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگا ہے۔ کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے بتدریج نیچے گرتا چلا جا رہا ہے مسلمان کے خیال میں اُس کا افلاس ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ پہلو ابھی اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ کہ اس افلاس کی ایک بہت بڑی وجہ بدیشی حکومت بھی ہے۔ تاہم زود یا بدیر۔ اس حقیقت کا احساس اُسے ہو کر رہے گا۔ جہاں تک جواہر لال کے اُس سوشلزم کا تعلق ہے جس کی بنیاد دہریت پر ہے مسلمان اُس طرف چنداں توجہ نہیں کریں گے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر مسلمانوں کا افلاس دُور کرنے کی اور تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟

یاد رکھیئے! مسلم لیگ کے سامنے مستقبل کا انحصار صرف اس بات پر ہے۔ کہ لیگ۔ اس سوال کا کوئی تسلی بخش حل تلاش کرے۔ اگر لیگ ایسا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ تو مسلمان عوام حسب سابق لیگ سے بے تعلق اور غافل رہیں گے"

واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمان زمینداروں نے جس طرح قومی تحریک سے بے اعتنائی اور بے رُخی برتی تھی۔ اور اس کے برعکس جس جرأت و سرفروشی سے پنجاب کے غریب مسلمانوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب

کو مجبور کر دیا تھا۔ کہ اِس غریب ۔پس ماندہ اور فاقہ کش طبقے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں اُن دنوں ایک اور جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ جسے جذبۂ سرفروشی کہنا چاہیئے۔ ایک زمانہ یقیناً ایسا بھی گذرا تھا جب اقبال کی عافیت پسندی اور اعتدال مزاجی ضرب المثل بن گئی تھی۔ اور انھوں نے ایک خط کے جواب میں اپنے ایک دوست کو بھی لکھ دیا تھا کہ :۔

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں

کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

اوّل تو وہ عرصۂ دراز تک سیاسیات سے کنارہ کش رہے۔ اور جب سیاسیات میں آئے بھی تو حد درجہ اعتدال پسندی ۔میانہ روی اور عافیت کیشی کے ساتھ لیکن اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں اقبال وہ پرانا اقبال نہیں رہا تھا۔ جو اِس خارزار میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا عادی تھا! اب اقبال سول نافرمانی میں شریک ہونے۔ قید و بند کے شدائد برداشت کرنے اور سینے پر گولی کھانے کو آمادہ تھا۔ یہ انقلاب کیونکر آیا؟ اس کے پیچھے بہت سے نفسیاتی اسباب کارفرما تھے۔

مسئلہ فلسطین پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ۷ ، اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو لکھتے ہیں :۔

"مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے۔۔۔۔ ذاتی طور پر میں ایک ایسے مسئلے کی خاطر جس کا تعلق اسلام اور ہندوستان

کے ساتھ ہے جیل جانے کو تیار ہوں۔ مشرق کے دروازے پر۔
مغربی استعمار کے اِس اڈّے کی تعمیر۔ اسلام اور ہندوستان۔
دونوں کے لیے خطرے کا باعث ہے"۔ [1]

جب ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہائی کورٹ کے فل بنچ نے مسجد شہید گنج کی اپیل خارج کر دی۔ تو مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اور بڑے بڑے احتجاجی جلوس نکلنا شروع ہوئے۔ اسی شام غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے۔ اور کہنے لگے "مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ۔ اور اُس طرف لے چلو۔ جدھر مسلمان جا رہے ہیں۔ اگر گولی چلی۔ تو میں بھی اُن کے ساتھ مروں گا"۔

یہ سب باتیں ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ اقبالؔ اپنی زندگی کے آخری دور میں کس حد تک بدل گئے تھے۔ شعر وہ اب بھی کہتے تھے۔ گریہ بے اختیار اب بھی اُن پر طاری ہوتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جُوں جُوں بیماری اُن پر غالب آ رہی تھی۔ اُسی نسبت سے وہ سیاسیات میں انتہا پسند بنتے چلے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں ڈاکٹر محمد اشرف۔ جو کانگریس کی تحریک مسلم رابطہ عوام کے نگراں تھے۔ لاہور تشریف لائے تھے۔ اور علامہ اقبال سے بھی ملے تھے۔ میں نے پچھلے دنوں انہیں خط لکھ کر اُس ملاقات کا حال دریافت کیا۔ تو انھوں

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

نے مجھ کو جو جواب دیا۔ اُس کا ایک حصّہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

"کروڑی مل کالج

دہلی یونیورسٹی

دہلی

۲ر فروری ۱۹۵۸ء

میرے مشفق۔ میرے محترم۔ آپ نے خط کیا لکھا۔ جانے کب کب کی یاد تازہ کردی۔ خدا کرے آپ مستقل طور سے لندن ہی میں رہیں۔ تاکہ علمی کام کرسکیں۔

یہ صحیح ہے۔ کہ مجھے علامہ مرحوم سے لاہور میں پہلی بار تفصیلی ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اور یہ ملاقات مجھے ساری زندگی یاد رہے گی۔ یہ زمانہ میری اور آپ کی جوانی کا تھا جسے لوگ اب "ایّامِ جاہلیت" سے تعبیر کریں گے۔ میں صرف یہی نہیں کہ قوم پرست تھا۔ بلکہ آپ کو یاد ہوگا تقسیم وطن سے پہلے ہم سب میں بلا کی خوداعتمادی تھی۔ چنانچہ میں موقع بے موقع جسارت اور شوخی سے بھی کام لیتا تھا۔ علامہ مرحوم کی ملاقات کے موقع پر۔ میں نے لاہور وارد ہونے سے پہلے اخبارات میں ایک بیان دے کر ارکانِ مسلم لیگ سے ایک متحدہ سامراج دشمن محاذ بنانے کی اپیل کی تھی۔ چنانچہ ملتے ہی علامہ مرحوم نے پہلے اس بیان کا ذکر کیا۔ اور اس کے بعد میرے خیالات کی تائید کی۔ مگر پھر کچھ افسردگی کے ساتھ فرمایا۔ کہ ہماری جماعت

(یعنی مسلم لیگ) میں قوتِ عمل کی بڑی کمی ہے۔ میں نے حال ہی میں مسٹر جناح (اُس زمانے تک قائدِ اعظم کا لقب رائج نہ ہوا تھا) کو اِس سلسلہ میں لکھا بھی ہے۔ کہ مسلمان جیسی فعال جماعت کو۔ آپ محض آئینی اور قانونی طور طریق سکھانا چاہتے ہیں۔ جس سے اُس کی قوتِ عمل مفلوج ہو جائے گی۔"

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب میں جہاں اقبالؔ سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ

"اقبال پاکستان کے اوّلین حامیوں میں تھے۔ حالانکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اِس تجویز کی لغویّت اور اُن خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ اقبالؔ نے ایک ملاقات کے دوران میں اُن سے کہا تھا۔ کہ اُنھوں نے پاکستان کی تجویز محض اس لیے پیش کی تھی۔ کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر تھے۔ لیکن اب اُن کا خیال ہے کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے سخت نقصان رساں ہو گی۔ اقبال نے غالباً بعد میں اپنا نقطۂ نگاہ بدل لیا تھا۔ یا ممکن ہے اُنھوں نے ابتدا میں اس تجویز کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت پاکستان کے تصور نے ابھی اتنی اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ حیاتِ انسانی کے متعلق اقبال کا جو نظریہ ہے وہ تقسیمِ ہند یا قیامِ پاکستان جیسی تجویز کے ساتھ قطعاً

مطابقت نہیں رکھتا۔"[1]

پنڈت نہرو کی یہ کتاب دنیا کے اکثر ممالک میں پڑھی گئی ہے اور اُن کے مذکورہ بالا الفاظ نے بہت سے لوگوں کو اِس وہم میں مبتلا کر دیا ہوگا کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دَور میں تقسیمِ ہند یا قیامِ پاکستان کی تجویز کے مخالف ہو گئے تھے۔ اِس لیے میں پنڈت نہرو کے اِس دعوے پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ جو مغالطہ اُنھوں نے پھیلا دیا ہے اُس کا ازالہ ہو سکے۔

پنڈت نہرو کے اِس دعوے کا دارومدار کلیتہً ایڈورڈ تامسن کی روایت پر ہے۔ ایڈورڈ تامسن آکسفورڈ میں تاریخِ ہند اور بنگلہ زبان کے لکچرار تھے اُنھیں ہندوستان سے خاص لگاؤ تھا۔ اور اکثر وہاں آتے جاتے رہتے تھے دو مرتبہ وہ انگلستان کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار بن کر بھی ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ مہاتما گاندھی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ جواہر لال نہرو۔ راج گوپال اچاری۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل وغیرہ سے اُن کے خاص مراسم تھے۔ اُن کا شمار اُن انگریزوں میں ہوتا تھا۔ جو کانگریس کے بہت بڑے معاون، ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر و تحریر میں ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت کی۔ ایڈورڈ تامسن کم و بیش پچپن کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ جن میں ادب۔ شعر۔ تنقید۔ تاریخ۔ سیاست۔ فلسفہ سبھی کچھ ہے۔

---

[1] THE DISCOVERY OF INDIA

اپریل ۱۹۴۶ء میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔

جس روایت پر پنڈت نہرو نے اپنے دعوے کا انحصار کیا ہے اُس کا ذکر ایڈورڈ تھامسن کی دو کتابوں میں موجود ہے۔ ایک کتاب جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی اُس میں وہ کہتے ہیں:۔

"اس بارے میں کچھ جھگڑا چلا آ رہا ہے۔ کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے کس کو سوجھا تھا۔ عام طور پر مشہور شاعر سر محمد اقبال کا نام لیا جاتا ہے۔ کہ اُنھوں نے پہلے پہل یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ اقبال میرے دوست تھے۔ اور اُنھوں نے اِس ضمن میں میرے تمام خدشات کو رفع کر دیا تھا۔ پہلے اُنھوں نے اِس بات پر تشویش کا اظہار کیا۔ کہ "میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے" پھر اُنھوں نے فرمایا کہ اُن کا خیال ہے کہ پاکستان ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لیے تباہی کا موجب ہوگا۔ اور آخر میں اُنھوں نے کہا " لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ اِس لیے میرا فرض ہے۔ کہ اس تجویز کی حمایت کروں۔"[1]

تھامسن کی اِس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے اور اقبال کے درمیان زبانی گفتگو ہوئی تھی۔ جس میں اقبال نے اپنا دردِ دل اُن کے سامنے بیان کیا تھا۔

---

[1] - ENLIST INDIA FOR FREEDOM (1940)

BY EDWARD THOMPSON PAGE 58

لیکن اُنھوں نے ایک اور جگہ اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ اقبال نے اُنھیں اس موضوع پر خط لکھا تھا۔ زبانی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"اقبال بیک وقت ایک فلسفی، شاعر، عالم دین اور سیاستدان تھے۔ اُنھوں نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے۔ جبکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ "میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے .... الخ" [1]

ایڈورڈ تامسن کی اس روایت سے تین قابلِ غور نکتے پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل : اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے جبکہ اُنھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ محسوس کر لیا تھا۔ کہ ہندوستان میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔

دوم : بدیں وجہ اُنھوں نے اِس خیال کا اظہار کیا۔ کہ پاکستان ہندوؤں مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لیے تباہی کا موجب ہو گا۔

سوم : آخر میں اُنھوں نے فرمایا "لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں اس لیے

---

[1] ETHICAL IDEALS IN INDIA TO-DAY" (1942)

میرا فرض ہے۔ کہ اِس تجویز کی حمایت کروں"۔ ؎۱

ایڈورڈ تھامسن کی اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جس وقت اقبالؔ نے اُن کو خط لکھا تھا۔ اُس وقت اقبال مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور اگرچہ وہ پاکستان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت کے لیے تباہی کا موجب خیال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے اس لیے انھیں مجبوراً تجویزِ پاکستان کی حمایت کرنا پڑی۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ اُس وقت مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان تھا۔ اور خود اقبالؔ اِس نصب العین سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ لیکن از بسکہ انھیں لیگ کی کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ لہذا اُنھیں طوعاً وکرہاً اِس نصب العین کی حمایت کرنا پڑی۔

علامہ اقبالؔ اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ مسلم لیگ کے صدر بنے تھے اور یہ واقعہ دسمبر ۱۹۳۰ء کا ہے۔ جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس الٰہ آباد میں ہوا تھا۔ اُس وقت مسلم لیگ کا نصبُ العین پاکستان نہیں تھا۔ بلکہ ہندوستان میں حکومتِ خود اختیاری کا قیام تھا۔ جس میں مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق محفوظ ہوں۔ ظاہر ہے اُس وقت اقبالؔ اپنی مرضی کے خلاف یا اپنی طبیعت پر جبر کر کے نظریۂ پاکستان کی حمایت کرنے پر قطعاً مجبور نہ تھے۔

؎۱ ایڈورڈ تھامسن نے علامہ اقبالؔ کے جو الفاظ اپنی کتاب میں درج کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

"But I am the president of the Muslim League and therefore it is my duty to support it."

ساری دنیا کو معلوم ہے۔ کہ الہ آباد کے اِسی اجلاس میں پہلے پہل اقبالؔ نے یہ خیال پیش کیا تھا۔ کہ شمالی مغربی ہندوستان کے اُن علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باہم ملا کر ایک جداگانہ مملکت بنا دیا جائے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں :-

"میری خواہش ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے۔ خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے۔ کہ اور نہیں۔ تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی"[1]

یہ تجویز سراسر اقبالؔ کا ذاتی خیال تھا۔ مسلم لیگ کی سرکاری پالیسی نہ تھی۔ خود اقبالؔ نے اپنے خطبے کے شروع میں صاف کہہ دیا تھا۔ کہ "میں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِس مسلسل و متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے، جیسا کہ مختلف زمانوں میں اُس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے۔ میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے۔ کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔"

۱۔ خطبۂ صدارت۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ اُس سے ایڈورڈ تامسن کی اِس روایت کی کھلی تردید ہوتی ہے۔ کہ اقبالؔ کو صرف اس لیے پاکستان کی حمایت کرنا پڑی کہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ لیکن اُس کے ساتھ تامسن یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ اقبالؔ نے اِن خیالات کا اظہار اُس وقت کیا تھا۔ جبکہ وہ بسترِ علالت پر دراز۔ اور دُنیا سے رخصت ہونے کے قریب تھے۔

اقبالؔ کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔ اگر ایڈورڈ تامسن کے الفاظ پر اعتبار کر لیا جائے۔ تو اقبالؔ نے اپنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے تامسن کو وہ خط لکھا ہوگا۔ جس کا حوالہ انھوں نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ لیکن جب ہم اقبالؔ کی اُن تحریروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو اُنھوں نے اپنی وفات سے صرف سال بھر پہلے سپردِ قلم کی تھیں۔ تو حیرت سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اقبالؔ اُس وقت اِس شدت اور اس غیر مشتبہ انداز سے پاکستان کی حمایت اور تبلیغ کر رہے تھے۔ کہ اُس کی نظیر خود اُن کی زندگی میں۔ اِس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو اقبالؔ، مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"شریعتِ اسلام کا طویل اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اگر اِس قانون کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر نافذ کیا جائے۔ تو کم از کم ہر شخص کو زندہ رہنے کا سامان ضرور میسر آ سکتا ہے۔ لیکن اس ملک میں شریعت کا نفاذ اُس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک کہ یہاں ایک یا ایک سے زائد آزاد و خود مختار

اسلامی مملکتیں قائم نہ ہو جائیں۔ میں کئی سال سے اس عقیدے کا حامی ہو گیا ہوں۔ اور اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ حل کرنے۔ اور ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اگر یہ طرز ناممکن ہے تو پھر دوسری صورت سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی برپا ہو...... یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی نئے سرے سے تقسیم ہو۔ اور ایک یا ایک سے زیادہ مملکتیں قائم کی جائیں۔ جہاں مسلمانوں کو قطعی اکثریت حاصل ہو کیا آپ محسوس نہیں کر رہے کہ اس چیز کا مطالبہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔" [1]

ڈاکٹر صاحب نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو ایک اور خط مسٹر جناح کو لکھا اور اس میں پہلے انھوں نے ۱۹۳۵ء کے آئین کے نقائص بیان کئے۔ کیونکہ اس آئین کی رو سے مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کو کلیتہً ہندوؤں کے رحم و کرم پر ڈال دیا گیا تھا۔ پھر انھوں نے کانگرس کے صدر کا شکوہ کیا۔ جس نے مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندو مہاسبھا کے اس اعلان کا ذکر فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم نہیں بنائی جا سکتی۔ اور آخر میں فرمایا۔

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

"۔۔۔۔۔۔ اندریں حالات یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی۔ نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ بہت سے برطانوی سیاست دان بھی اس چیز کو محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان میں لارڈ لوو تھین نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ میری یہ تجویز ہی ہندوستان کے مصائب کا مداوا بن سکتی ہے۔ لیکن اُن کے خیال میں اس تجویز پر عملدرآمد کرنے کے لیے پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔

" پنجاب کے بعض مسلمان ابھی سے یہ سوچ رہے ہیں۔ کہ شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک جداگانہ کانفرنس منعقد ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہماری قومی تنظیم ہنوز اُس منزل پر نہیں پہنچی۔ اور غالباً ابھی موزوں وقت بھی نہیں آیا۔ کہ اس قسم کی کانفرنس کا انعقاد ہو سکے۔ تاہم میری رائے ہے کہ آپ اپنے خطبۂ صدارت میں اس طرف اِشارہ ضرور کر دیجیئے۔ کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بالآخر اِس نوع کا قدم اُٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

" میں سمجھتا ہوں کہ نیا آئین جس کی رُو سے ہندوستان میں ایک متحدہ فیڈریشن قائم ہو گا۔ بالکل مایوس کُن ہے۔ میں نے سطور بالا میں جو خاکہ پیش کیا ہے۔ اُس کے مطابق جب تک

اسلامی اکثریت کے صوبوں کا ایک الگ فیڈریشن نہ قائم کیا جائے گا۔ ہندوستان میں امن برقرار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات ملے گی۔ کیا وجہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تصور کر کے انھیں حق خود ارادی نہ عطا کیا جائے۔ جیسا کہ اندرونِ ہند و بیرونِ ہند کی دوسری قوموں کو یہ حق حاصل ہے۔

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں۔ کہ بحالاتِ موجودہ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ وہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیں۔ اکثریت اور اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے باہمی مفاد کے لیے یہ طرزِ عمل بہترین ثابت ہوگا۔[1]

ڈاکٹر صاحب نے یہ خط اپنی وفات سے صرف دس مہینے پہلے لکھا تھا ایسی دو ٹوک، واضح اور غیر مشتبہ تحریر کے بعد۔ ایڈورڈ ٹامسن کا یہ بیان قطعاً قابلِ التفات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کہ "اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ دیر پہلے جبکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ اِس دُنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ" پاکستان ہندوؤں، مسلمانوں اور برطانوی حکومت تینوں کے لیے تباہی کا موجب ہوگا۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ کیونکہ میں مسلم لیگ کا صدر ہوں۔ اور میرا فرض ہے۔ کہ اس تجویز کی حمایت کروں"

چودھواں باب

مسجد شہید گنج کا قضیہ

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری دو برسوں میں مسلم لیگ کی سیاسیات کے علاوہ مسجد شہید گنج کے قضیئے نے بھی خاصی اہمیت اختیار کر لی تھی اور یہ قضیہ آخر تک ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ لاہور کے ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازے کی طرف جائیں۔ تو ٹکنیکل سکول کے عقب میں جہاں لنڈا بازار شروع ہوتا ہے۔ ایک بہت پرانی مسجد کھڑی تھی۔ جسے عام طور پر مسجد شہید گنج کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد شاہجہاں کے عہد میں ایک شخص عبداللہ خاں نے تعمیر کی تھی۔ جو دارا شکوہ کا خانساماں تھا اور اپنے آقائے نامدار کی مہربانی سے کچھ عرصے کے لیے لاہور کا کوتوال بھی بن گیا تھا جب تک لاہور پر سکھوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا مسلمان اس مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔

پنجاب کے مغل صوبیدار نواب معین الملک نے جب پنجاب سے

سکھوں کی شورش مٹانے کے لیے جنگ و جدال کا سلسلہ شروع کیا۔ تو مسجد سے متصل کوتوالی تھی۔ جہاں مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ تعزیر و تادیب کے اسی دور میں۔ ایک شخص بھائی تارو سنگھ بھی اس مقام پر مارا گیا۔ بھائی تارو سنگھ سکھوں کی نگاہ میں ایک بڑی مقدس اور برگزیدہ ہستی تھی چنانچہ سکھوں نے اس جگہ کو شہید گنج کا نام دے دیا۔ اور وہاں ایک سمادھ بھی تعمیر کر دی۔ رنجیت سنگھ کے ورود سے پہلے جب سہ حاکمانِ لاہور[1] کی حکومت قائم ہوئی۔ تو سکھوں نے بھائی تارو سنگھ کی سمادھ کے قرب سے فائدہ اٹھا کر۔ اس مسجد پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ مسجد سکھوں کے قبضے میں چلی آ رہی تھی۔

مولوی نور احمد چشتی نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی ۱۸۶۴ء میں مکمل کی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق ۱۸۶۴ء میں اس مسجد پر گنڈا سنگھ اور گورمت سنگھ دو بھائی قابض تھے۔ جو مسجد کی دکانوں کا کرایہ بھی وصول کرتے تھے۔ اور مسجد کے صحن اور دالان کو لنگر خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے

---

[1] گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ بھنگی مسل کے تین سکھ تھے انھوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۷۶۶ء سے ۱۷۹۹ء تک پورے چونتیس سال لاہور کو اس بے دردی سے لوٹا کہ اس عظیم الشان شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ تینوں لٹیرے تاریخِ پنجاب میں سہ حاکمانِ لاہور کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ مسجد کے صحن میں لوہے کی ایک بہت بڑی کڑاہی ہر وقت بھنگ سے لبالب بھری رہتی تھی۔ جہاں سکھ مسافر بیٹھ کر بھنگ پیتے تھے۔

جون ۱۹۳۵ء میں یکایک پنجاب کے مختلف حصوں سے سکھوں کے جتھے لاہور آنا شروع ہوئے۔ اور سارے شہر میں افواہ اُڑنے لگی۔ کہ سکھ مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ افواہیں پایۂ یقین کو پہنچ گئیں تو مسلمان لیڈروں کے ایک وفد نے گورنر کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس مسجد کو محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا جائے۔ اور جب تک کہ اس تجویز پر باضابطہ عمل نہ ہو۔ حکومت کو چاہیئے کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دے۔ تاکہ مسجد کا فوری انہدام رُک جائے۔ سر ہربرٹ ایمرسن پنجاب کے گورنر تھے۔ اُنھوں نے بات کو ٹال دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے وفد نے سکھ لیڈروں سے گفتگو کی۔ تو سکھوں نے کم از کم اس بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ جب تک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی مسلمانوں کی اس تجویز پر اچھی طرح غور نہیں کرے گی اُس وقت تک مسجد مسمار نہیں کی جائے گی۔

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی۔ کہ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب میں سکھوں نے یکایک مسجد کو گرانا شروع کر دیا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی۔ کہ انہدام سے قبل حکومت نے مسجد کے چاروں طرف مسلح فوج اور پولیس متعین کر دی تھی۔ تاکہ مسلمان سکھوں کے اِس فعل میں مداخلت نہ کر سکیں گویا مسجد کا انہدام فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوا۔ جب مسلمانوں نے یہ نقشہ دیکھا۔ تو بغیر کسی ضبط و نظم اور ترتیب کے مسجد کی طرف جانے لگے

فوج نے بار بار گولی چلائی۔ اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی حکومت نے مولانا ظفر علی خاں۔ ملک لال دین قیصر۔ میاں فیروز الدین احمد۔ ملک لال خاں۔ سید سرور شاہ گیلانی۔ سید حبیب۔ سید محمد شاہ وغیرہ کو گرفتار کر کے صوبے کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد یہ تحریک ذمہ دار لیڈروں کے ہاتھ سے نکل کر بعض من چلے نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ حکومت نے مسلمان اخبارات پر سنسر شپ بھی عائد کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ واقعات کی صحیح اطلاع ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

جن چند نوجوانوں کے ہاتھ میں یہ تحریک چلی گئی تھی۔ انھوں نے شاہی مسجد کو اپنا صدر مقام قرار دے کر سول نافرمانی شروع کر دی۔ دو دو۔ چار چار کی ٹولیوں میں مسلمان رضاکار شاہی مسجد سے نکل کر شہید گنج کی طرف بڑھتے تھے۔ تو پولیس انھیں گرفتار کر لیتی تھی۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل تک یہی صورت حال قائم رہی۔ اور سیکڑوں نہیں ہزاروں رضاکار جیلوں میں چلے گئے۔

اُس وقت پنجاب کی حکومت پر تین بڑے مسلمان قابض تھے۔ ایک ملک فیروز خاں نون جو وزیر تعلیم تھے۔ دوسرے نواب مظفر خاں جو سر سکندر کی جگہ ریونیو ممبر بنا دیئے گئے تھے۔ اور تیسرے چودھری شہاب الدین جو مجلس قانون ساز کے صدر تھے۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کے اندر بھی قومی حمیّت وغیرت کی رمق ہوتی، تو اس حادثہ خونچکاں سے متاثر ہو کر فوراً اپنے سرکاری منصب پر لات مار دیتا۔ لیکن یہ لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے

دیکھنے کے باوجود گورنر کے قابلِ مذمت رویے میں برابر کے شریک رہے ۔

اُس زمانے میں پنجاب کے مسلمانوں میں سب سے منظم ، ذی اثر اور فعّال جماعت مجلسِ احرارِ اسلام تھی ۔ جب مسجد کے گرائے جانے پر صوبے کے طول و عرض میں اضطراب کی لہر اُٹھی ۔ تو خیال تھا کہ احرار حسبِ معمول مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے لیکن خلافِ توقع اُنھوں نے بالکل چپ سادھ لی ۔ اور جنبش تک نہ کی بعد کو احرار لیڈروں نے اپنی اُس پُراسرار خاموشی کی مختلف توجیہیں کرنے کی کوشش کی کبھی یہ کہا گیا کہ میاں فضل حسین کے ایماء سے مسجد گرائی گئی ہے ۔ تاکہ احرار اس تحریک میں حصّہ لیں ۔ تو اُنھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جائے ۔ کبھی یہ کہا گیا کہ مسجد کا انہدام قادیان کے اشارے سے ہوا ہے ۔ تاکہ احرار کے قید و بند کا سامان آسانی سے مہیا ہو سکے ۔ غرضکہ تاویل و توجیہہ کی مختلف صورتیں پیش کی جاتی رہیں ۔ جن پر عوام میں سے مشکل ہی سے کسی کو یقین آتا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کا انہدام مجلسِ احرار کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوا ۔ اور اس جماعت نے اگرچہ جولائی ۱۹۳۵ء کے بعد سے اب تک بیسیوں دفعہ سنبھلنے اور اپنا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوششیں کی ہیں ۔ لیکن ایک مرتبہ بھی تو اسے کامیابی نہیں ہوئی ۔

۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح اس قضیے کا حل تلاش کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے ۔ اُن کی تشریف آوری کے پس منظر میں یہ بات واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ کہ انھوں نے پہلے سے اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا ۔ کہ جب تک لاہور کے مسلمان جھگڑا چکانے کے لیے اُنھیں خود دعوت نہیں کریں گے

اور اس بات کا وعدہ نہیں کریں گے۔ کہ وہ مسٹر جناح کے فیصلے کے پابند رہیں گے وہ لاہور نہیں جائیں گے۔ مشہور تو مسلم بیرسٹر خالد لطیف گابا اس زمانے میں مرکزی اسمبلی کے رکن تھے۔ انہی کے توسل سے لاہور کے مسلمان لیڈروں نے مسٹر جناح کو لاہور آنے کی دعوت ارسال کی تھی۔ مسٹر جناح اس واقعہ سے قبل ۱۹۲۹ء میں علم الدین کی اپیل کے سلسلے میں جس نے راج پال کو قتل کیا تھا۔ ہائی کورٹ میں بحث کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے تھے۔ گویا اب وہ آٹھ سال کے بعد لاہور آرہے تھے۔

لاہور پہنچنے کے بعد مسٹر جناح نے تحریک کے لیڈروں اور صوبے کے گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر نے کہا۔ کہ اگر سول نافرمانی بند کر دی جائے۔ اور مسلمان مسجد کی بازیابی کے لیے آئینی طریق سے جدوجہد کریں۔ تو وہ تمام قیدی رہا کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ تحریک کے کارکن سول نافرمانی بند کرنے پر رضامند ہوگئے۔ اور رات بھر میں جیلوں سے تمام قیدی اور دور دراز مقامات سے نظر بند لیڈر رہا ہو کر لاہور پہنچنا شروع ہوگئے۔

ساتھ ہی ساتھ مسٹر جناح نے سکھ لیڈروں سے بھی ملاقاتیں شروع کیں۔ اور انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ جذبہ مصالحت اور ہم وطنی کا خیال کر کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ مسٹر جناح نے انھیں سمجھایا۔ کہ ملکی مفاد کے پیشِ نظر فرقہ وارانہ کشیدگی نہ سکھوں کے لیے مفید ہے نہ مسلمانوں کے لیے۔ چنانچہ سکھ لیڈروں نے، جو کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے مسٹر جناح کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور انھیں اپنے ہمراہ شہید گنج

دکھانے کے لیے لے گئے۔ حالانکہ وہ کسی مسلمان کا شہید گنج کے پاس سے گذرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مسٹر جناح نے کم و بیش دو ہفتے لاہور میں قیام کیا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۶ء کو دیال سنگھ کالج کی یونین نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ کالج کا ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یونین کے صدر پروفیسر لاجپت رائے نے مسٹر جناح کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُنھیں ہندوستان کے مشہور لیڈر گوکھلے سے تشبیہ دی۔ اور کہا۔ کہ ہندوستان کی نجات کے لیے مسٹر جناح جیسا راست باز اور دلیر ڈکٹیٹر درکار ہے۔ جواب میں مسٹر جناح نے جو تقریر کی اُس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"میں اس کالج کی فضا کو اپنے لیے بالکل سازگار پاتا ہوں۔ یہ درس گاہ جیسا کہ فاضل مقرر نے ابھی کہا ہے، فرقہ پرستی کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی۔ میرا ابتدا سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی نجات۔ فرقہ پرستی کے ذریعہ سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میں ماضی میں بھی اِس عقیدے کا حامل رہا ہوں۔ اب بھی میرا یہ عقیدہ ہے۔ اور آئندہ بھی اِسی عقیدے کا پیرو رہوں گا۔ آپ نے مسولینی اور ہٹلر ایسے ڈکٹیٹروں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس ملک کا ڈکٹیٹر بننے کی دعوت دی ہے۔ بحالات موجودہ ہم ہندوستان میں ڈکٹیٹر شپ قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ملک کا حقیقی ڈکٹیٹر وہی شخص بن سکتا ہے۔ جس کے پاس ایسی قوت ہو

کہ ہر خطا کار کو سزا دینے پر قادر ہو۔ اور وطن کی خدمت کرنے والوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوّت ہم میں سے کسی شخص کے پاس بھی نہیں۔

"اس ملک میں کسی بے اصول، خائن اور بددیانت لیڈر کے لیے عوام کو اُلّو بنا لینا۔ اور اُن سے حسبِ منشا کام لینا چنداں مشکل نہیں۔ بشرطیکہ وہ اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے فن سے واقف ہو۔ اس لیے جب تک ہم عوام کے معتدبہ حصّے کی ذہنی اخلاقی اور سیاسی تربیت نہ کریں۔ اور جب تک عوام کا تربیت یافتہ عنصر صحیح لیڈر کی پہچان سے بہرہ ور نہ ہو اور خودغرض رہنماؤں کو قیادت کی گدّی سے علیحدہ کرنے کا شعور نہ رکھتا ہو۔ اُس وقت تک ہم صحیح معنوں میں نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے گوکھلے کا ذکر بھی کیا ہے کاش اس ملک میں اُس عظیم الشّان لیڈر کے پائے کے دو چار انسان اور ہوتے ۔۔۔۔ ہندوستان میں ہر چیز کی افراط ہے۔ خدا نے یہاں سب کچھ دے رکھا ہے۔ لیکن انسان نے اس خطّہ ارضی کی نیک نیتی سے خدمت نہیں کی۔ اب بھی اگر انسان ہندوستان کی بے لوث خدمت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو ہمارا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔" [1]

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۷، مارچ ۱۹۳۶ء

۲ مارچ کو باشندگانِ لاہور نے مسٹر جناح کو خوش آمدید کہنے اور اُن کی مصالحانہ کوششوں پر اظہارِ مسرت کرنے کے لیے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ جس کے صدر لاہور کے بشپ تھے۔ اِس اجتماع کو دیکھ کر جس میں ہندو، سکھ اور مسیحی بڑھ چڑھ کر مسٹر جناح کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ اِس بات کا اندازہ کرنا۔ کچھ مشکل نہیں تھا۔ کہ مسٹر جناح کس غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی حالت میں کہ شہید گنج کے حادثۂ فاجعہ کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی زوروں پر تھی۔ اور دلوں پر کدورت کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سکھوں کا مسٹر جناح کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی ـــ مقررین میں سردار سمپورن سنگھ۔ سردار اجل سنگھ۔ پنڈت نانک چند اور مسٹر کے ایل۔ رلیارام شامل تھے۔

پنڈت نانک چند نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا۔ کہ "افسوس ہے کہ مسٹر جناح کانگرس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ کانگرس میں رہتے تو ملک کی حالت یقیناً آج سے کہیں بہتر ہوتی" جواب میں مسٹر جناح نے تقریر کی۔ تو پنڈت نانک چند کے اِن الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"...... جب میں پہلی مرتبہ کانگرس میں شامل ہوا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک میرے خیالات میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ گاہے گاہے۔ مجھ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا۔ اُس میں فرقہ پرستی کی روح کارفرما نہ تھی۔ میرے پیشِ نظر صرف مادرِ وطن

کی بہتری اور فلاح و بہبود تھی۔ یقین جانیئے کہ آئندہ بھی ہندوستان ہی کی خدمت میرا مدعا و مقصود رہے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھ کو اس معین اور واضح راستے سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی" لے

مسٹر جناح ۷ مارچ کو واپس دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی سے پہلے اُنھوں نے شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے ایک کمیٹی بنا دی تھی جس کے ارکان مندرجہ ذیل اصحاب تھے۔

علامہ اقبالؔ۔ مولوی عبد القادر قصوری۔ میاں عبد العزیز بیرسٹرایٹ لا۔ راجہ نریندر ناتھ۔ پنڈت نانک چند بیرسٹر ایٹ لا۔ سردار بوٹا سنگھ ایڈووکیٹ۔ سردار اجل سنگھ۔ سردار سمپورن سنگھ میاں احمد یار خاں دولتانہ (کنوینر)۔

رخصت ہوتے وقت مسٹر جناح نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

لے سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء۔

وہاں سنگھ کالج اور ٹاؤن ہال کی تقریروں کے اقتباس یہاں درج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں مسٹر جناح کے سیاسی خیالات و عزائم کیا تھے اور وہ اپنے ملک کی خدمت کن خطوط پر کرنا چاہتے تھے صرف ڈیڑھ سال کے بعد یعنی ۱۹۳۷ء کے وسط میں کانگریس کی غلط اور تباہ کن پالیسی نے اس کوہِ پیکر شخصیت کو اس قدر مایوس کر دیا کہ اُسے مجبوراً اپنی قوم کے حفظ و بقا کے لیے نئی راہ تلاش کرنا پڑی۔

اور فرقہ وارانہ مصالحت پر زور دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا۔ کہ

"...... یہ جھگڑا دو افراد میں نہیں۔ بلکہ دو بڑے فرقوں کے درمیان ہے اس لیے دونوں فرقوں کی آراء کی جانچ تول کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس دوران میں ہمیں اپنی مصالحانہ کوششوں کو بدستور جاری رکھنا چاہیئے۔ تاکہ باہمی تصفیہ جلد از جلد ہو سکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اس غرض کے لیے مختلف قوموں کے ذمہ دار افراد پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ جس کا نام شہید گنج مصالحتی بورڈ ہو۔ اور اس بورڈ کے ذمے یہ کام ہو کہ افہام و تفہیم سے تصفیہ کا کوئی قابل قبول حل تلاش کرے۔ میری خدمات اس بورڈ کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔ اگر آئندہ میرا یہاں آنا ضروری ہوا۔ تو میں سو کام چھوڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا۔"

مسٹر جناح کی کوشش سے پنجاب میں صلح و آشتی کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے لاہور کے اینگلو انڈین اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے انگریز ایڈیٹر کو بھی یہ لکھنا پڑا۔ کہ پنجاب کے مقامی مسلمان لیڈروں کی ناکامی اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے۔ کہ مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انہیں "سرکار پرستی" کا طعنہ نہیں دے سکتا۔ انہیں ہمیشہ "بائیں بازو" (لیفٹسٹ) کا لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے "بائیں بازو" کے سیاسی رجحانات ہی کی وجہ سے بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے ان کی بات کو

کو سننا اور ماننا منظور کر لیا ہے۔[1]

سول نافرمانی ہی کے زمانے میں شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے اہتمام سے لاہور کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر تبسل کی عدالت میں دعوے دائر کر دیا گیا تھا۔ بنائے دعوے یہ تھی۔ کہ چونکہ شرع اسلام کی رُو سے مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور کوئی شخص اُس پر قابض ہو کر مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو مسجد شہید گنج میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم اِس دعوے کی پیروی کر رہے تھے۔

مسٹر جناح کے قائم کئے ہوئے مصالحتی بورڈ کے دو ایک جلسے تو ضرور ہوئے لیکن چونکہ عدالت میں دعوے چل رہا تھا۔ اور لوگ بڑے شوق سے اس کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اِس لیے بورڈ بھی کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی ختم ہو گیا۔

۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر تبسل نے مسلمانوں کا دعوے خارج کر دیا۔ اور مسجد شہید گنج پر سکھوں کا قبضۂ مخالفانہ تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کیا۔ کہ علم جائداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی فریقِ ثانی کے مخالفانہ قبضے میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

علامہ اقبال کے مشورے سے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ لیکن اپیل کی سماعت سے قبل اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ چونکہ شہید گنج کا مسئلہ اب پورے ہندوستان کے

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء

مسلمانوں کے لیے بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں بھی۔ شہید گنج کے متعلق ایک نہایت جامع قرار داد منظور کی گئی اور مسٹر جناح نے یہاں تک فرمایا کہ اگر مستقبل قریب میں شہید گنج کا کوئی حسبِ خواہش فیصلہ نہ ہوا۔ تو اِس قضیئے کا حل تلاش کرنے کے لیے مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا جائے گا۔

۳۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور کی عدالتِ عالیہ کے فل بنچ کے سامنے جس میں چیف جسٹس ینگ ۔ جسٹس بھڈے اور جسٹس دین محمد شامل تھے شہید گنج کی اپیل پیش ہوئی اور کئی روز تک بحث جاری رہی ۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو چیف جسٹس نے کہا۔ کہ بحث کے دوران میں چند نئے تنقیح طلب امور سامنے آئے ہیں جن پر عدالت عالیہ فریقین کے مزید دلائل سُننا چاہتی ہے۔

وہ چند امور یہ تھے :

۱:- اگر یہ تسلیم کر لیا جائے ۔ کہ اس دعوے پر قانون میعاد کا اطلاق ہوتا ہے تو کیا اُس تاریخ سے جب مسجد شہید گنج مسمار کی گئی تھی ۔ نئی میعاد کا آغاز ہونا چاہیئے ؟

۲:- اگر حق مولہ بالا تسلیم کی جائے ۔ تو کیا مسجد یا مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو یہ حق ہے کہ مدعا علیہم کے نام عدالت سے اِس نوع کے حکم امتناعی کے اجرا کی درخواست کریں ۔ کہ مدعا علیہم مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں۔

۳:- اگر ایسا حق موجود ہے ۔ تو کیا عدالت اِس نوع کا حکم امتناعی جاری کرنے کی مجاز ہے ؟

۴:- کیا عدالت اِس نوع کا حکمِ امتناعی جاری کر سکے گی اور کیا اِس حکمِ امتناعی پر عملدر آمد ہو سکتا ہے؟

ملک برکت علی نے آئندہ پیشی کے لیے کچھ مہلت طلب کی۔ تاکہ بیرونِ پنجاب سے کسی اچھے قانون دان کی مدد حاصل کی جا سکے۔ چیف جسٹس نے ملک صاحب سے کہا: "آپ نے اب تک نہایت فاضلانہ بحث کی ہے۔ تاہم آپ کوئی اور وکیل بلانا چاہتے ہیں۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

اب سوال یہ تھا۔ کہ باہر سے کس کو بلایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ مسٹر جناح کو تکلیف دی جائے۔ کہ وہ لاہور تشریف لا کر بحث کریں۔ چنانچہ اُن کے ایماء سے غلام رسول خاں نے ۹ر دسمبر کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا:

"ڈیئر مسٹر جناح! شہید گنج کی اپیل اب ایک نہایت اہم منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ہائی کورٹ کے سامنے بحث مکمل ہو چکی ہے۔ عدالتِ عالیہ نے بحث سننے کے بعد چند تنقیح طلب امور مرتب کئے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا مسجد کے انہدام سے از سرِ نو میعاد شروع ہوتی ہے۔ اور کیا حکمِ امتناعی کے اجرا کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا۔ ایسے حکمِ امتناعی کا اجرا ہو جانا چاہیئے۔

لاہور کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ اب کہ اُمید کی ایک کرن پھوٹتی نظر آئی ہے۔ آپ خود یہاں تشریف لائیں۔ تاکہ اِس عمارت کی آخری اینٹ آپ کے مضبوط ہاتھوں سے رکھی جائے ہماری، اور مسلمانانِ لاہور کی طرف سے ملک برکت علی آپ سے

ملنے کے لیے بمبئی حاضر ہوں گے۔ اور تفصیل سے زبانی سب کچھ عرض کریں گے۔

آپ پہلے بھی اُس وقت لاہور تشریف لائے تھے جب تحریکِ شہید گنج ایک نہایت نازک مرحلے سے گذر رہی تھی۔ اور آپ ہی کی کوشش سے وہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تھا۔ اب شہید گنج کی بازیابی کا دعوےٰ بھی ایک بہت نازک مرحلے پر پہنچ گیا ہے یقین کیجیئے گا کہ آپ کے یہاں تشریف لانے اور ان امور پر عدالتِ عالیہ کے روبرو بحث کرنے سے صرف پنجاب نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان آپ کے احسان مند ہوں گے۔ جو تاریخ آپ پسند فرمائیں گے، عدالت کو وہ تاریخ مقرر کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب ملک برکت علی نے عدالتِ عالیہ سے یہ درخواست کی تھی۔ کہ مزید بحث کے لیے بیرونِ پنجاب سے کسی قانون دان کو بلانے کی ضرورت محسوس ہوگی تو آنریبل چیف جسٹس نے بخوشی اِس امر کی اجازت عطا کر دی تھی۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ کی تشریف آوری سے ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تحریک میں نئی جان پڑ جائے گی۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس نیاز مندانہ گذارش پر توجہ فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول

میں یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ابتداً میں جب ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد کا دعوےٰ دائر کیا گیا تھا۔ تو ملک برکت علی اور ڈاکٹر محمد عالم پیروی کرتے تھے۔ اسی دوران میں ڈاکٹر محمد عالم نے تو مجلسِ اتحادِ ملت کے ٹکٹ اور مسجد شہید گنج کے نام پر اپنی الیکشن بھی جیت لی تھی۔ لیکن جب وہ اسمبلی کے ایوان میں داخل ہوئے تو تمام دعدے وعید فراموش کر کے کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اُن کے اس فعل سے مسلمان سخت برافروختہ ہوئے۔ چنانچہ جب مسجد کی اپیل ہائی کورٹ میں پہنچی تو مدعیوں نے ڈاکٹر عالم سے مختار نامہ واپس لے لیا۔ اور اب تنہا ملک برکت علی پیش ہو رہے تھے۔

کرسمس کی تعطیل شروع ہوئی۔ تو ملک برکت علی بمبئی روانہ ہوئے تاکہ مسٹر جناح سے مل کر زبانی گفتگو کریں۔ اُن کے ارشاد کی تعمیل میں راقم التحریر بھی اُن کے ہمراہ بمبئی گیا۔ مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی۔ تو انھوں نے فرمایا۔ کہ وہ اس سے قبل فروری ۱۹۳۶ء میں ایک ثالث یا جج بن کر لاہور گئے تھے۔ تاکہ سکھوں اور مسلمانوں میں مصالحت کرا سکیں۔ اُن کی اسی حیثیت کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں نے بھی بڑی گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا تھا اب اُسی جھگڑے میں ایک فریق کا وکیل بن کر لاہور جانا اُن کے لیے مناسب نہیں۔

اِس کے بعد اُنھوں نے مشورہ دیا کہ بمبئی کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر ایف جے کولٹ مین کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ تو بہتر ہو گا۔ مسٹر

کولٹ میں تعطیل کی وجہ سے ماتھیران گئے ہوئے تھے۔ جو بمبئی سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک خوش گوار اور صحت افزا مقام ہے اس لیے ہمیں اُن کے انتظار میں چند روز ٹھہرنا پڑا۔ جب وہ بمبئی آئے تو ہم نے اُن سے معاملہ طے کیا۔ اور واپس لاہور آ گئے۔

۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو شہید گنج کی اپیل پر عدالتِ عالیہ میں مزید بحث ہوئی۔ اور مسٹر کولٹ میں پیش ہوئے۔ ۲۶ جنوری کو عدالتِ عالیہ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اور اپیل خارج کر دی۔ چیف جسٹس ینگ اور جسٹس بھڈے نے متفقہ فیصلہ کیا۔ کہ جہاں تک قبضۂ مخالفانہ کا تعلق ہے۔ مسجد کو عام جائداد غیر منقولہ سے الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے مسلمانوں کا شہید گنج میں نماز پڑھنے کا حق مدت ہوئی ساقط ہو چکا ہے۔ جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اپنا فیصلہ الگ لکھا۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے بعد لاہور کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل گیا اور جلوس پر جلوس نکلنے لگے۔ سر سکندر کو اندیشہ تھا کہ کہیں پھر سول نافرمانی شروع نہ ہو جائے۔ اُن میں خود اتنی جرأت نہیں ہوئی۔ کہ مسلمانوں کے لیڈر بن کر سامنے آتے۔ اور براہِ راست اپنی قوم سے خطاب کرتے۔ انھوں نے کوشش کی۔ کہ کسی طرح علامہ اقبال سے ایک اخباری بیان دلوا دیا جائے۔ کہ ابھی پریوی کونسل کا مرحلہ باقی ہے اس لیے مسلمانوں کو پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

اس غرض سے انھوں نے نواب ممدوٹ۔ نواب مظفر خاں اور

میاں امیرالدین کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ کہ یہ تینوں اصحاب کہہ سُن کر اِس قسم کا اخباری بیان جاری کرائیں۔ نواب ممدوٹ اور میاں امیرالدین ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہلے پہنچ گئے۔ ابھی وہ کھل کر اپنا مدعا و مقصود زبان پر نہیں لائے تھے۔ صرف تمہید باندھ رہے تھے کہ نواب مظفر خاں کی موٹر کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اُنہیں دیکھ کر فوراً اُٹھے اور اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے اُس وقت سید نذیر نیازی بھی وہاں موجود تھے۔ اُنھوں نے اندر جاکر عرض کیا۔ کہ وہ تینوں اصحاب باہر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نواب مظفر خاں کا نام لے کر فرمایا "کہ یہ شخص بیس سال کے بعد آج میرے مکان پر آیا ہے۔ مسجد اس نے خود گروائی ہے اور اب مجھ سے بیان دلوانا چاہتا ہے۔" پھر فرمایا۔ کہ "جب تک یہ شخص بیٹھا ہے میں باہر نہیں جاؤں گا۔"

سید نذیر نیازی نے باہر آکر چپکے سے نواب ممدوٹ کے کان میں یہ بات کہہ دی۔ اِس کے بعد یہ تینوں اصحاب رخصت ہو گئے۔ اور سر سکندر کی یہ تجویز کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے مسلمانوں کا اضطراب رفع کرنے کی صورت پیدا کی جائے بروئے کار نہ آسکی۔

۳۰ جنوری کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تاکہ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے جو تشویشناک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس پر غور کیا جائے۔ چودھری خلیق الزماں اور راجہ محمود آباد کی رائے تھی

کہ سر سکندر کی وزارت کو بطور احتجاج مستعفی ہو جانا چاہیے۔ لیکن میاں احمد یار خاں دولتانہ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ استعفے سے "ڈیڈ لاک" پیدا نہیں ہوگا۔ بلکہ پنجاب اسمبلی کے دوسرے عناصر مل کر متبادل وزارت بنا لیں گے۔ تاہم لیگ کونسل نے اس بات کا اعلان کیا۔ کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔ اس لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اجلاس خصوصی عنقریب اس مسئلہ کا تصفیہ کرنے اور آئندہ کے طرز عمل پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ یکم فروری کو ہندوستان بھر میں "یوم شہید گنج" منایا جائے۔ اور مسلمان جگہ جگہ جلسے کر کے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تائید کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے اس بارے میں کسی قدر مختلف تھی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ قانون جس کی رو سے خانۂ خدا کی تقدیس ضائع ہوتی ہے اور مسجد بھی قبضۂ مخالفانہ میں جا کر بارہ سال کے بعد اپنی حرمت کھو بیٹھتی ہے بالکل غلط ہے۔ اس قانون کو ختم کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کریں۔ تاکہ مساجد کی حفاظت و صیانت کا کلی بندوبست ہو سکے۔

ملک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت اور مشورے سے ذیل کا مسودہ قانون مرتب کر کے اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔

تحفظِ مساجد کا بل:- "ہرگاہ کہ اس قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ جن مساجد کو شرعِ محمدیؐ کے تحت باضابطہ وقف قرار دیا جا چکا ہے۔ اُن پر شرعِ مذکور کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اور اس ضمن میں دعوے کیا گیا ہے۔ کہ بارہ سال کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد مساجد بھی اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ ہرگاہ کہ یہ ضروری ہے۔ کہ اس نوع کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے۔ اور قانون کی وضاحت کی جائے۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعے سے مندرجۂ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے

(۱) اس ایکٹ کا نام تحفظِ مساجدِ اسلامی پنجاب ایکٹ ۱۹۳۸ء ہو گا۔[1]

(۲) ا:- یہ ایکٹ صوبۂ پنجاب میں فوراً نافذ کیا جائے گا۔ اور اس کا اثر راجع بہ ماضی ہو گا۔[2] جو تمام قسم کے مقدمات پر حاوی ہو گا۔ مثلاً دعاوی اپیلیں یا دوسری جملہ کارروائیاں خواہ اُن کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یا ہنوز زیرِ تحقیقات ہیں۔

ب: اگر اس ایکٹ کے وضع ہونے سے پہلے کسی مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور وہ فیصلہ اس ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اُس فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ اور وہ فیصلہ اس ایکٹ کی دفعات کو کسی طرح بھی ساقط یا کمزور نہیں کر سکے گا۔

ے۱ PUNJAB MUSLIM MOSQUES PROTECTION ACT 1938

ے۲ RETROSPECTIVE

(۳) قطع نظر اِس سے کہ پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون یا ایکٹ میں کوئی بات اِس امر کے خلاف درج ہے، ایک اسلامی مسجد جسے شرعِ محمدیؐ کے تحت باقاعدہ وقف قرار دیا جا چکا ہے، اپنی حیثیت برقرار رکھے گی۔ خواہ اُس کا متولی، محافظ یا قابض کوئی شخص ہو۔ اور اُس شخصِ مذکور کا قبضہ کسی نوعیت کا ہو۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لیے اِس مسجد پر، ہر حالت میں صرف شرعِ محمدیؐ کا اطلاق ہو گا۔ بلا لحاظ اِس سے کہ ایسی عدالتی کارروائی میں جہاں مسجد کی حیثیت زیرِ بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے۔

تشریح:۔ ایک اسلامی مسجد جسے شرعِ محمدیؐ کے تحت وقف قرار دیا جائے، عام انسانی ضروریات کے استعمال سے الگ کر دی جاتی ہے۔ اور اُسے سراسر اور کلیتہً خدائے ذوالجلال کی عبادت کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے۔ اُس پر لفظِ جائداد اُن معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ جن معنوں میں یہ لفظ قانونِ میعادِ ہند یا پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں مستعمل ہے۔

بجز اس کے کہ:۔

ا: حقِ شفع کی رُو سے قانونِ رائج الوقت کے تحت جائداد حاصل کی جائے۔

اور

ب: قانونِ فوجداری کی غرض کے لیے جس میں تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری دونوں شامل ہیں۔

اغراض و اسباب

اپیل اوّل - نمبر ۴۴۲ بسال ۱۹۳۶ء به عنوان "مسجد شہید گنج وغیرہ بنام شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی وغیرہ" منفصلہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ کی اکثریت نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ اگرچہ شرع محمدی کے تحت ایک مسجد، جسے خانۂ خدا کے طور پر وقف کیا جا چکا ہے، ہمیشہ مسجد ہی رہتی ہے۔ اور اپنی حرمت و تقدیس تاقیامت برقرار رکھتی ہے۔ خواہ اس مسجد کا متولی کوئی شخص ہو۔ اور اس کا قبضہ کسی نوعیت کا ہو۔ لیکن ازبسکہ قانونِ میعادِ ہند بشمول پنجاب لاز ایکٹ نے شرعِ محمدی کے اس حصے کو ترمیم و تبدیل کر دیا ہے۔ لہٰذا برٹش انڈین قانون، بحالتِ موجودہ کے تحت ایک مسجد بھی بارہ سال کے قبضۂ مخالفانہ کے بعد اپنی مقدس حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ اور عام دنیاوی جائداد کی مانند اس شخص کی ملکیت بن جاتی ہے۔ جو بارہ سال سے اس پر قابض چلا آ رہا ہے۔ اور وہ شخص اس مسجد کو ہر غرض کے لیے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ خواہ وہ غرض انتہائی درجہ ناپاک کیوں نہ ہو۔

اگرچہ آنریبل مسٹر جسٹس دین محمد نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور اپنے فیصلے میں لکھا ہے۔ کہ قانونِ میعادِ ہند۔ یا پنجاب لاز ایکٹ نے اس ضمن میں شرعِ محمدی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اور بدیں وجہ جب مسجد کو عام دنیاوی اغراض سے الگ کر کے محض خدائے واحد کی عبادت کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے۔ تو قانون رائج الوقت کے تحت بھی اس کی حرمت تقدیس

ابد الآباد تک قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضروری خیال کیا گیا ہے۔ کہ قانون کو واضح اور مستحکم بنانے کی غرض سے مجلس قانون ساز ایک ایسا توضیحی اعلان کرے۔ جس میں اس امر کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالکل صاف کر دیا جائے۔ کہ جب مسجد کو شریعِ محمدی کے تحت باقاعدہ وقف قرار دیا جاتا ہے۔ تو وہ مسجد شریعِ مذکور کے مطابق اپنی مقدس حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ اور اپنے جملہ حقوق و واجبات کے لیے اُس مسجد پر، ہر حالت میں صرف شریعِ محمدیؐ کا اطلاق ہونا چاہیئے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ایسی عدالتی کارروائی میں جہاں مسجد کی حیثیت زیر بحث ہے، فریقین کی نوعیت کیا ہے۔ فرید براں۔ اِس امر کو بالکل واضح کر دینا چاہیئے۔ کہ مسجد پر عام معنوں میں لفظِ جائداد استعمال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر پنجاب کے کسی موجودہ رائج الوقت قانون میں لفظِ جائداد کہیں استعمال ہوا ہے۔ تو مسجد پر وہ لفظ مستعمل نہیں ہو گا۔ ماسوا اِس کے کہ۔

ا۔ حق شفع کی رُو سے قانون رائج الوقت کے تحت جائداد حاصل کی جائے۔ اور

ب۔ قانونِ فوجداری کی غرض کے لیے۔ جس میں تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری دونوں شامل ہیں۔ تاکہ مسجد کی حرمت و تقدیس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔

اس مسودۂ قانون کو راجع بہ ماضی قرار دیا گیا ہے۔ تاکہ اُس وسیع، روز افزوں اور حق بجانب اضطراب کو رفع کیا جائے۔ جو مسجد شہید گنج کے

انہدام سے لے کر اب تک بڑی شدت سے جاری ہے۔ اور جسے اگر دانشمندانہ تدبر۔ اور مجلس قانون ساز کے دلیرانہ اقدام سے اس وقت رفع نہ کیا گیا۔ تو نہ صرف اس صوبے بلکہ پورے ہندوستان کے امن امان کو شدید صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ اور اندیشہ ہے۔ کہ اس طرح انجام کار پوری مملکت ایک خطرناک اور غیر مختتم خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ جب اس نوع کی صورت حال درپیش ہو۔ تو مجلس قانون ساز پر فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ آگے بڑھے۔ اور ایک ایسا قانون وضع کرکے ملک کے امن و امان کو محفوظ کرے۔ جس کی رو سے ملک معظم کی مسلمان رعایا کو واضح ترین الفاظ میں مطمئن کیا جا سکے۔ کہ اس ضمن میں اس کے مذہبی عقائد و شعائر کی مکمل حفاظت کی گئی ہے۔ اور یہ کہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ آں جہانی نے اسی موضوع پر جن واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اپنی مسلمان رعایا کو یقین دلایا تھا۔ اور جن الفاظ کا اعادہ ملکہ آں جہانی کے جانشین تخت شاہی سے بار بار کرتے رہے ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔"[1]

فروری کے اوائل میں یہ بل مرتب کر لیا گیا تھا۔ جس کا پورا خاکہ علامہ اقبال نے تجویز کیا تھا۔ لیکن عبارت ملک برکت علی کی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ کہ اس نوع کا بل ملک برکت علی تیار کر رہے ہیں

---

[1] اصل مسودہ قانون انگریزی میں تھا۔

ہیں۔ انہی دنوں ایک روز ملک صاحب نے بِل کا ٹائپ کیا ہوا انگریزی مسودہ مجھے دیا۔ کہ اس کا اردو میں ترجمہ کر دوں۔ ملک صاحب کا مکان اور پنجاب مسلم لیگ کا دفتر یعنی غلام رسول خاں کا مکان بالکل آمنے سامنے تھے۔ اس لیے جب میں شام کو دفتر کا کام ختم کر کے اُٹھا۔ تو میں نے انگریزی کا مسودہ اور اُس کا ترجمہ دونوں ملک صاحب کے دفتر میں جا کر اُن کی میز پر رکھ دیئے۔ خود ملک صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

رات کو آٹھ نو بجے کے قریب ملک صاحب کا ملازم میرے مکان پر آیا کہ ترجمہ دے دیجئے۔ میں نے کہا۔ کہ انگریزی کا مسودہ اور ترجمہ دونوں ملک صاحب کے دفتر کی میز پر رکھ آیا ہوں۔ وہ کہنے لگا۔ کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ ملک صاحب نے ترجمہ کے لیے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں نے ٹیلیفون پر بات کی۔ تو ملک صاحب نے جواب دیا۔ کہ اُن کی میز پر کوئی کاغذ نہیں ہے میں اُسی وقت اُن کے ہاں پہنچا۔ اور میز کے علاوہ دفتر کا ایک ایک کونہ تلاش کر مارا۔ لیکن انگریزی کا مسودہ اور ترجمہ دونوں غائب تھے سخت حیرت ہوئی کہ دو ڈھائی گھنٹے کے عرصہ میں یہ چیز کہاں غائب ہو گئی غنیمت ہے۔ کہ ملک صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ موجود تھا۔ اس لیے دوبارہ ٹائپ کرنے اور ترجمہ کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔

چند روز کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اصل ٹائپ کیا ہوا مسودہ اور میرا ترجمہ دونوں یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ راز اب تک نہیں کھل سکا کہ وہ کون پُراسرار شخص تھا۔ جس نے دو گھنٹے کے اندر ملک صاحب

کے دفتر کی میز سے کاغذ اُڑا کر یونینسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اُس زمانے میں ملک برکت علی، غلام رسول خاں اور علامہ اقبالؔ کے مکانوں کے اِردگرد یونینسٹ پارٹی کے بعض گماشتے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ علامہ اقبالؔ کا دولت کدہ تو مرجع خاص و عام تھا۔ اور وہاں کی فضا ہی کچھ ایسی تھی۔ کہ کوئی بات ڈھکے چھپے انداز میں نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ کہا جاتا تھا بیچ کھیت اور کھلے بندوں کہا جاتا تھا۔ لیکن ملک برکت علی اور غلام رسول خاں کے ہاں بھی کسی قسم کی احتیاط نہیں برتی جاتی تھی ہر قسم کے لوگ آتے اور ہر نوع کی گفتگو ہوتی تھی۔

ملک صاحب نے پنجاب اسمبلی میں تحفظِ مساجد کا بل پیش کرنے کا نوٹس دے دیا۔ خانۂ خدا کی بے حرمتی ایسی چیز تھی۔ جس پر کوئی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے بہت سے مسلمان ممبر اس بل کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ سر سکندر ایک مخمصے میں گرفتار تھے۔ اگر بل ایوان میں پیش ہوا۔ اور اُنھوں نے اس کی مخالفت کی۔ تو خود اُن کی پارٹی کے مسلمان ممبر اُن سے کٹ جائیں گے۔ اور اگر اُنھوں نے بل کی تائید و حمایت کی تو وزارتی پارٹی کے غیر مسلم ممبروں کے علیحدہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ لکھتے ہیں۔ کہ سر سکندر کے کامیاب دورِ حکومت میں صرف یہی ایک ایسا وقت آیا تھا جب اُن کی وزارت ڈانواں ڈول ہوتی نظر آتی تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل چونکہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مسجد شہید گنج کے قضیے کا حل تلاش کرنے کے لیے مسلم لیگ کا ایک اجلاسِ خصوصی منعقد کیا

جائے گا۔ اس لیے ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے ذیل کا خط علامہ اقبال کو لکھا:-

"۱۰ ہیسٹنگز روڈ

نئی دہلی

ڈیئر سر محمد اقبال!

اطلاعاً عرض ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس ماہ حال کی ۲۰ تاریخ کو دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اُن اہم امور میں سے جن پر اس اجلاس میں غور کیا جائے گا ایک یہ بھی ہے۔ کہ لیگ کے خاص اجلاس کے لیے مناسب مقام کا فیصلہ کیا جائے۔ اس لیے مجھے یہ معلوم کرنے کی بے حد خواہش ہے۔ کہ آیا آپ یہ پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ کہ خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہو۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیا پراونشل مسلم لیگ خاص اجلاس کے لیے ضروری انتظامات کر سکے گی؟ بصورت اثبات آپ مجھے ایک رسمی دعوت نامہ ارسال فرما دیں۔ تاکہ میں اُسے کونسل کے سامنے پیش کر سکوں۔ مجھے بنگال سے رسمی دعوت نامہ موصول ہو چکا ہے اور اگر اجلاس دہلی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو اہل دہلی انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ پنجاب کی صورت حال کے متعلق بھی مفصل اطلاع دیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

"آپ کا مخلص ...... ایم اے جناح

مسٹر جناح کے اس خط کے جواب میں۔ ڈاکٹر صاحب کے حسب ارشاد ذیل کا

خط غلام رسول خاں نے ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو لکھا!

ڈیر مسٹر جناح

مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی طرف سے ذیل کا خط لکھنے کی ہدایت

ہوئی ہے۔

آپ کا خط ڈاکٹر صاحب موصوف کو ۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو ملا۔

اُن کی صحت کی خرابی ہم سب نیاز مندوں کے لیے وجہ اضطراب

بنی ہوئی ہے۔ اور وہ خود آپ کو خط لکھنے سے معذور ہیں۔ آپ کے

خط کے جواب میں اُن کا ارشاد یہ ہے۔

کل پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ایک عام اجلاس لاہور میں منعقد

ہوا۔ جس میں صوبے کے تمام اضلاع کے نمائندے شامل ہوئے

اور پراونشل مسلم لیگ کے ارکان کی ایک بڑی تعداد نے اس

میں حصہ لیا۔ آپ نے سر محمد اقبال کو جو خط لکھا تھا۔ وہ اس

اجلاس میں پڑھا گیا۔ اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ آل

انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور ہی میں منعقد ہو اور اس

کے لیے ایک رسمی دعوت نامہ بھیج دیا جائے۔ لہٰذا ہماری

درخواست ہے کہ شہید گنج کے متعلق لیگ کا اجلاس خصوصی

ایسٹر کی تعطیلات میں لاہور ہی میں منعقد کرنے کے لیے اس خط ہی کو

دعوت نامہ تصور کیا جائے۔

جہاں تک پنجاب کی صورتِ حال کا تعلق ہے۔ سر محمد اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ:

۱:- شہید گنج کے متعلق غالباً پریوی کونسل میں اپیل کی جائے گی۔ لیکن لوگوں کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ یہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ کسی برطانوی عدالت کی طرف رجوع بے سود ہے۔

۲:- ملک برکت علی نے تحفظِ مساجد کے متعلق پنجاب اسمبلی میں جو بل پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے مسلمانوں میں اس پر کافی جوش پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت تک یونینسٹ پارٹی کے پچیس[5] ارکان نے سر سکندر کی ہدایات کے برعکس اخبارات میں اپنے اس عزم کا اعلان کر دیا ہے۔ کہ وہ اس بل کی تائید کریں گے۔ اور اس بل کو انھوں نے اپنا بل بنا لیا ہے۔ نیز صوبے کے تمام ووٹر مناسب قرار دادیں منظور کر کے اپنے اپنے نمائندوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس بل کی پوری حمایت کی جائے۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ جب یہ بل منظوری کی غرض سے اسمبلی میں پیش ہو گا تو قانون کی صورت اختیار کرے گا۔

۳- شہید گنج کی سول نافرمانی کی تحریک روز بروز تقویت پکڑ رہی ہے۔ عوام پر امن ہیں۔ اور بے تابی سے آل انڈیا مسلم لیگ

کے اجلاسِ خصوصی کے اہم فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو پنجاب کے تقریباً تمام مسلم ادارے لیگ کی رہنمائی میں سرگرمِ عمل نظر آئیں گے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ آپ کو یقین دلاتی ہے۔ کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے لیے تمام ضروری انتظامات کرنے کی ذمہ دار ہے۔

آپ کا مخلص

غلام رسول خاں۔ آنریری سیکرٹری

پنجاب پراونشل مسلم لیگ

(بنامِ ڈاکٹر سر محمد اقبال)"

اس میں کوئی شک نہیں، کہ ملک برکت علی کے بل نے پنجاب بھر میں جوش و خروش کی ایک لہر طاری کر دی تھی۔ اپنے اور بیگانے دونوں بڑے اضطراب سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن سر سکندر نے تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے گورنر کو مشورہ دیا۔ کہ بل اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ گورنر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی کو کام میں لا کر اعلان کر دیا۔ کہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

۱۶ر مارچ ۱۹۳۸ء کو سر سکندر نے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں اپنے اس رویے کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر گورنر کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر سر سکندر کے ہم نوا بن چکے تھے

یہاں تک کہ اِن تمام ممبروں نے اسمبلی کی رُکنیت سے استعفے لکھ کر سر سکندر کے حوالے کر دیئے تھے۔

میں نے سر سکندر حیات کو مختلف جلسوں میں بولتے ہوئے سُنا تھا۔ وہ اُردو اور انگریزی - دونوں زبانوں میں بڑی شُستہ اور منجھی ہوئی تقریر کرتے تھے لیکن جس اعتماد، وثوق اور تیقن سے وہ ۱۶ مارچ کو اسمبلی کے ایوان میں تقریر کر رہے تھے - یہ رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکیاسی مسلمان ممبروں کے استعفے اُن کی جیب میں تھے۔ دونوں مسلمان وزیر یعنی میاں عبدالحی اور ملک خضر حیات ٹوانہ اُن کے دستِ بازو تھے - اور قطع نظر سیاسی عقائد سے تمام ہندو اور سکھ ممبر اُن کی پُشت پر تھے - اس لیے اگر آج بھی اُن کی تقریر میں اعتماد اور وثوق پیدا نہ ہوتا۔ تو پھر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

سر سکندر نے اپنی تقریر میں ملک برکت علی کے بِل پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا - کہ اگر آج مسلمان اسمبلی میں خاص قانون بنوا کر شہید گنج پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو کل کو ہندو بھی یہ مطالبہ کریں گے کہ جن مندروں پر مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں قبضہ کر لیا تھا وہ اُن سے واپس لے کر ہندوؤں کے حوالے کیے جائیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہندوستان کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے - اگر پنجاب کے مسلمانوں نے اپنے صُوبے کی اقلیت سے اچھا سلوک نہ کیا تو سات صوبوں میں مسلمانوں کی حالت سخت خراب ہو جائے گی - تیسرا اعتراض یہ تھا کہ صوبے

کی سب سے بڑی عدالت جو فیصلہ کر چکی ہے۔ اُس کو مجلسِ قانون ساز کے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔

سر سکندر نے اپنی تقریر کے دوران میں کئی دفعہ ملک برکت علی کی طرف دیکھ کر کہا "اگر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی اکثریت کو میرے اِس طرزِ عمل سے اختلاف ہے۔ تو میں اور میرے دونوں مسلمان وزیر ابھی مستعفی ہونے کو تیار ہیں۔۔۔۔ میں اِس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میرے اور میرے دونوں مسلمان وزیروں کے مستعفی ہونے سے شہید گنج مسلمانوں کو واپس مل سکتی ہے۔ تو ہم ابھی استعفا دینے کو تیار ہیں۔"

ملک برکت علی سب کچھ سُن رہے تھے۔ اور بار بار یونینسٹ پارٹی کے اُن مسلمان ممبروں کی طرف دیکھتے تھے جنھوں نے ابھی چند روز ہوئے اخباروں میں اعلان کیا تھا کہ وہ تحفظِ مساجد کے بل کی حمایت میں جانیں لڑا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک برکت علی چاروں طرف سے نرغۂ اعدا میں گھر گئے تھے۔ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سر سکندر کو مبارکباد کے تار بھیجے تھے۔ کانگرسی اور مہاسبھائی ہندو۔ اکالی اور غیر اکالی سکھ۔ نیشنلسٹ اور یونینسٹ مسلمان سبھی سر سکندر کی حمایت میں آوازیں بلند کر رہے تھے۔

اگلے ہی روز ملک برکت علی نے اخبارات کو ایک طویل بیان دیا۔

جس میں سر سکندر کے تینوں اعتراضوں پر بحث کی۔ پہلے فرمایا۔ کہ "اگر مغلوں نے اپنے دورِ حکومت میں بعض مندروں پر قبضہ کر کے اُن کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ تو اوّل ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُس زمانہ میں قانونِ میعاد یا قبضۂ مخالفانہ کی قسم کا کوئی قانون رائج نہیں تھا۔

دوم :- ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا مغل بادشاہوں نے وہ قبضہ اپنے شہنشاہانہ اختیارات کے ذریعے سے کیا تھا یا ہندوؤں نے خود بخود اپنی رضامندی سے اُن عبادت گاہوں کو مغل بادشاہوں کے حوالے کر دیا تھا۔

سوم :- جب بادشاہتیں اور حکومتیں بدل جاتی ہیں تو کوئی حکومت اپنی پیش رو حکومت کے اعمال و افعال کا محاسبہ نہیں کیا کرتی۔ ہر حکومت یہ دیکھتی ہے کہ اُن املاک کا حق محفوظ ہونا چاہیے۔ جو اُس حکومت کے آغاز میں موجود تھیں۔ اسی طرح آج ہندوستان کی برطانوی عدالتوں کو اس سے قطعاً کوئی غرض نہیں۔ کہ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں فلاں فلاں املاک کی کیا حیثیت تھی۔ اِن عدالتوں کو صرف اِس بات سے غرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ برطانوی حکومت کے قیام کے وقت کیا صورتِ حال تھی۔

ظاہر ہے کہ مسجد شہید گنج جولائی ۱۹۳۵ء تک بحیثیت ایک مسجد کے موجود تھی۔ سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں بھی بہت سی مسجدوں کو مسمار کر دیا تھا۔ میں نے جو اپیل پیش کیا ہے۔ اُس کا تعلق اِن مسمار شدہ مساجد کے ساتھ بالکل نہیں۔ ہاں وہ تمام مسجدیں۔ جن کا انہدام برطانوی حکومت کے زمانے میں ہوا۔ یا جو قانونِ میعادِ ہند کی رُو سے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر

اغیار کے قبضے میں چلی گئیں۔ یقیناً میرے بل کے تحت آتی ہیں۔

اگر برطانوی حکومت کے زمانے میں مسلمانوں نے کوئی مندر یا گوردوارہ مسمار کر دیا تھا۔ یا کسی مندر یا گوردوارہ کو مسجد میں تبدیل کر لیا تھا۔ تو وہ مندر اور گوردوارہ اسی اصول کے تحت یقیناً ہندوؤں اور سکھوں کو واپس مل جانا چاہیے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں فخر سے اس بات کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جب سے برطانوی حکومت قائم ہوئی ہے۔ ایسی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ کہ مسلمانوں نے کسی مندر یا گوردوارے کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کی ہو۔ یا اس مندر اور گوردوارے کو قبضہ مخالفانہ کے تحت اپنی جائداد میں تبدیل کر لیا ہو۔

رہا یہ اعتراض کہ صوبے کی سب سے بڑی عدالت جو فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ اس کو مجلسِ قانون ساز کے زور سے توڑ دینا کسی قاعدے سے جائز نہیں۔ سر سکندر حیات کو چاہیے۔ کہ قانون کے اسرار و رموز کا مطالعہ کریں۔ انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ قانون سازی کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی ایکٹ کو راجع بہ ماضی بنا کر نہ صرف لوگوں کے حقوق و واجبات میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ بلکہ عدالتوں کے فیصلوں پر بھی خطِ تنسیخ کھینچا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی جہاں دستور میں یہ شق درج ہے کہ کوئی ریاست کسی واقعہ کے بعد اس واقعہ کے متعلق قانون منظور نہیں کر سکتی سپریم کورٹ نے ایک اپیل الموسومہ بہ "کالڈر بنام بل"[1] میں فیصلہ صادر کرتے

---

[1] CALDER VS BULL

ہوئے لکھا تھا۔ کہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ کوئی ایکٹ منظور کر کے عدالت کے فیصلے کو منسوخ کر دے۔ خواہ اس طرح اُس فریق کو، جس کے حق میں عدالت نے فیصلہ صادر کیا تھا اپنے حق سے محروم ہونا پڑے۔

جہاں تک برطانوی قانون کی تاریخ کا تعلق ہے۔ ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ کہ دار العوام نے قانون منظور کر کے عدالتوں کے فیصلوں کو منسوخ کر دیا۔ مثال کے طور پر۔ میں صرف ایک واقعہ الموسوم بہ "کوئین بنام ملز"[ل] کا حوالہ دیتا ہوں اس اپیل میں انگلستان کی سب سے بڑی عدالت یعنی دار الامراء نے جو فیصلہ صادر کیا تھا۔ اُسے پارلیمنٹ نے ایک خاص ایکٹ کے ذریعے سے منسوخ کر دیا تھا یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا اقدام سراسر غیر معمولی حالات میں جائز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا۔ کہ راجع بہ ماضی قانون ہمیشہ اور ہر حالی میں غیر منصفانہ ہوتا ہے۔ غلط اور قانون سازی کے رموز سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ شہید گنج کا مسئلہ یقیناً غیر معمولی نوعیت کا حادثہ ہے۔ اُس کا تصفیہ جبھی ہو سکے گا کہ مجلسِ قانون ساز ایک جرأت مندانہ اقدام کرے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مسجد شہید گنج کا قضیہ اب آل انڈیا مسلم لیگ کے لیے ایک عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا تھا۔ سر سکندر نے ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو ثابت کر دیا تھا۔ کہ بلا استثنا یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلمان ممبر اُن کی پشت پر تھے۔ اِدھر گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے ۱۱ مارچ کو اپنے اجلاس امرتسر میں ایک قرارداد

ل THE QUEEN VS MILLS

منظور کر کے اعلان کر دیا تھا۔ کہ شہید گنج کے مسئلہ پر مسلمانوں سے کسی قسم کی مفاہمت یا مصالحت نہیں ہو سکتی۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ ہمارے خلاف صادر ہو چکا تھا۔ اندریں حالات کامیابیٔ مقصد بر آمدی کے تینوں راستے بند ہو جانے کے بعد اب مسلم لیگ یہ سوچ رہی تھی کہ اس الجھن سے نکلنے کی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

پندرھواں باب

خاتمہ

ملک برکت علی نے جب سے مسجد شہید گنج کے مقدمے کی پیروی شروع کی تھی پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو روز بروز فروغ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پھر جب انھوں نے تحفظِ مساجد کا بل پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ تو پورے صوبے کے مسلمان عوام میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبے میں لوگ رضاکارانہ طور پر مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے لگ گئے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر دفتر میں روزانہ بیسیوں آدمی آتے تھے۔ بعض اپنے شہر کی مقامی شاخ کے لیے مشورے طلب کرتے تھے۔ بعض لیگ کی پالیسی اور پراپگنڈے کے طور طریق سمجھنا چاہتے تھے۔ اور بعض ہمیں اپنے ضلع کا دورہ کرنے کی دعوت دینے آتے تھے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی مالی حالت سخت خراب ہو جانے کی وجہ سے ہم نے بہت سا کام ترک کر رکھا تھا۔ اب کہ تحریک میں خود بخود

ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ ہم نے محسوس کیا۔ کہ اگر حالات کی مساعدت سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ تو یہ ساری بیداری رائیگاں جائے گی۔ لیکن دِقت یہ تھی۔ کہ اس کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس قدر روپیہ درکار تھا۔ وہ ہمارے پاس نہیں تھا۔

ایک روز ملک برکت علی دفتر میں تشریف لائے۔ غلام رسول خاں۔ ملک زمان مہدی۔ خلیفہ شجاع الدین اور راقم التحریر بھی وہاں موجود تھے۔ ملک صاحب نے ایک ایسی عجیب و غریب خبر سنائی۔ کہ ہم سب حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگے۔ کہنے لگے۔ کہ "مالی مشکلات نے ہمیں سخت پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے ان پریشانیوں کا حل یہ تجویز کیا ہے۔ کہ نواب ممدوٹ (نواب شاہنواز خاں مرحوم) کو پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر بنا دیا جائے"۔

یہ تجویز حقیقت سے اس قدر بعید معلوم ہوتی تھی۔ کہ ہم نے اس کو مذاق تصور کیا۔ لیکن جب ملک صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ کہ علامہ اقبال بھی اس تجویز کو منظور فرما چکے ہیں۔ تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا پڑا۔

میں نے اور غلام رسول خاں نے سخت مخالفت کی۔ نواب ممدوٹ یونینسٹ پارٹی کے زبردست رکن اور سر سکندر کے خاص الخاص آدمی تھے اُن کا مکان یونینسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر رہ چکا تھا۔ ادھر ۱۹۳۷ء کی الیکشن میں انھوں نے قصور اور فیروزپور میں خود ملک برکت علی کو ناکام بنانے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک اُن کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے میں انھیں

ملک برکت علی کے ہاں دیکھ رہا تھا۔ اور اُن کی اِس آمد و رفت کا راز خود میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب ملک صاحب نے یہ تجویز پیش کی۔ تو گویا آنکھوں کے آگے سے پردہ اُٹھا۔

زمان مہدی خاں اور خلیفہ شجاع الدین اِس بارے میں غیر جانبدار تھے لیکن میں اور غلام رسول خاں اپنی بات پر اَڑے رہے۔ کہ نواب صاحب کو کسی صورت میں لیگ کا صدر نہیں بنایا جائے گا۔ ملک برکت علی اپنی یگانۂ روزگار قابلیت کے باوجود بعض باتوں میں بالکل سادہ لوح واقع ہوتے تھے۔ مثلاً مردم شناسی کا اُنھیں بہت کم ملکہ تھا۔ جب اُنھوں نے دیکھا۔ کہ ہماری مخالفت کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتی۔ تو کہنے لگے۔ کہ "علامہ اقبال کی رہنمائی۔ اور اُن کے گراں قدر مشوروں سے ہم بدستور مستفید ہوتے رہیں گے نواب صاحب کو تو صرف اِس لیے صدر بنایا جا رہا ہے۔ کہ لیگ کی مالی مشکلات رفع ہو جائیں۔ یوں بھی نواب صاحب کے خیالات بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اگر وہ لیگ کے صدر بن گئے۔ تو اُن کی کوشش سے اسمبلی کے بہت سے یونینسٹ ممبر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے"!

جب اُن کا اصرار بڑھا۔ اور اُنھوں نے یہ بھی کہا۔ کہ وہ نواب صاحب کو یقین دلا چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص اُن کی مخالفت نہیں کرے گا۔ تو ہم نے بادلِ ناخواستہ یہ تجویز قبول کر لی۔ لیکن ہمیں رہ رہ کر غیر شعوری طور پر احساس ہو رہا تھا۔ کہ نواب ممدوٹ کی صدارت یقیناً کسی نہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ بننے والی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اجلاسِ لکھنؤ کے موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک نیا دستورِ اساسی منظور کیا گیا تھا۔ جس کی رو سے ہر پراونشل لیگ کے تحت لیگ کی ضلع اور تحصیل وار شاخیں قائم کی جانی ضروری تھیں۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اعلان کیا تھا۔ کہ ہر صوبے کی لیگ کو چاہیئے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء تک اپنے الحاق کی باضابطہ درخواست مرکزی لیگ کے دفتر میں ارسال کردے۔ چنانچہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح نے علامہ اقبالؒ کو ذیل کا گشتی مراسلہ ارسال کیا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ

کوچہ بلی ماراں دہلی

۱۲ فروری ۱۹۳۸ء

جنابِ مکرم۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے گزشتہ سالانہ اجلاس میں اس امر کا فیصلہ ہوا تھا۔ کہ آئندہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اراکین اور مندوبین کے تمام انتخابات نئے آئین کی دفعات کے مطابق ہوں۔ اور ۲۰ جنوری ۱۹۳۸ء تک اس کی اطلاع دفتر آل انڈیا مسلم لیگ میں پہنچ جائے۔

کونسل کے آخری اجلاس منعقدہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں مذکورہ بالا میعاد کی توسیع ۳۱ مارچ تک کی گئی تھی۔

میرے خیال میں یہ امر بے حد ضروری ہے۔ کہ یہ تمام انتخابات جس قدر جلد ممکن ہو عمل میں آجانے چاہئیں۔ تاکہ صوبائی لیگیں

اس اجلاسِ خصوصی میں شامل ہو سکیں۔ جو آئینِ جدید کے مطابق فی الفور ہونے والا ہے۔ اور جس میں مسئلہ شہید گنج کے متعلق آخری طریقِ عمل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

لہٰذا میری تجویز ہے کہ ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء سے قبل ہی تمام صوبائی لیگیں اپنے الحاق کی درخواستیں ارسال کر دیں۔ جن میں صدر۔ سیکرٹری اور تمام عہدیداروں کے نام بھی درج ہوں۔ نیز کونسل کے منتخب شدہ اراکین کے ناموں کی فہرست ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء اور مندوبین کی فہرست ۳۱ مارچ تک پہنچ جانی چاہئیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی پراونشل مسلم لیگ اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے الحاق کی درخواست اور نمائندگان کے ناموں کی فہرست۔ مقررہ وقت پر لیگ کے مرکزی دفتر کوچہ بلیماراں دہلی کو بھیج دے گی۔ تاکہ لیگ کے آئندہ اجلاسِ خصوصی میں جس میں نہایت اہم معاملات پر بحث و تمحیص ہو گی آپ کے صوبے کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے۔

براہِ مہربانی اپنے صوبے کی منظم شدہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگوں کی فہرستیں مع اسمائے عہدیداران ارسال فرمایئے۔ نیز اُن اضلاع کے نام بھی تحریر فرمائیں۔ جن میں ابھی تک لیگ کی شاخیں قائم

نہیں ہوسکیں۔ اور اس امر کی اطلاع بھی بہم پہنچائیں۔ کہ ایسے اضلاع میں کب تک شاخیں قائم ہو جانے کا امکان ہے۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

صدر آل انڈیا مسلم لیگ۔"

ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق غلام رسول خاں نے اس خط کا حسب ذیل جواب ۱۷ فروری ۱۹۳۸ء کو ارسال کیا۔

"ڈیر مسٹر جناح

آپ کی گشتی چٹھی نمبر ۵۶۶۔ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کے جواب میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے یہ تحریر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

(۱) مذکورہ بالا گشتی چٹھی میں آپ نے جو ہدایات دی ہیں انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب اقدامات کیے جارہے ہیں۔

(۲) جہاں تک لیگ کے اجلاس خصوصی کا سوال ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ اجلاس لیگ کے نئے آئین کے مطابق کر رہے ہیں مگر آپ کو اس امر کا پورا احساس ہو گا۔ کہ اس خاص اجلاس میں جو مسئلہ زیر بحث آئے گا۔ وہ بے حد اہم ہے۔ اور تمام مسلمانانِ ہند پر بالعموم اور مسلمانانِ پنجاب پر بالخصوص اثر انداز ہو گا۔

یہ امر اس بات کا متقاضی ہے۔ کہ کھلے اجلاس میں اہلِ بصیرت
مسلمانوں کی بڑی سے بڑی اکثریت اس پر بحث کرے۔ آل انڈیا
مسلم لیگ کے آئین کی رو سے پنجاب سے ۴۰ سے زیادہ مسلمان
اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اور وہ بھی اس صورت
میں کہ یہ تمام ممبر وہاں پہنچ جائیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں۔
کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے احساسات بھی۔ پنجاب کے
مسلمانوں کی طرح شدت سے مجروح ہوئے ہیں یا نہیں۔ لیکن
اگر لیگ سول نافرمانی کا فیصلہ کرلے تو مناسب یہی معلوم ہوتا
ہے۔ کہ اس فیصلہ کا انحصار انہی لوگوں پر رکھا جائے جن
پر اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا بوجھ ڈالا جائے گا۔
آپ جانتے ہیں کہ آئینِ جدید کی رو سے یہ امر ممکن نہیں
اس لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ خاص اجلاس پرانے آئین ہی کے
تحت ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء سے پہلے منعقد کر لیا جائے۔ کیونکہ پرانے
آئین کی رو سے ہر مسلمان ایک روپیہ ادا کر کے بحث میں حصّہ
لے سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ۳۱ مارچ بہت قریب
ہے تو پھر ہماری یہ تجویز ہے۔ کہ آپ نئے آئین کے نفاذ کو
خاص اجلاس تک ملتوی کر دیں۔ اور یہ اجلاس ۳۱ مارچ کے
بعد مناسب تاریخوں میں منعقد کر لیا جائے۔ اگر یہ دونوں تجویزیں
آپ کو منظور نہ ہوں۔ تو پھر ہماری درخواست ہے کہ آپ خاص

اجلاس کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس منعقد کریں جس میں ہر بالغ مسلمان کو شامل ہونے کی اجازت ہو ظاہر ہے کہ یہ کانفرنس بھی لیگ کے زیر اہتمام اور آپ ہی کے زیر صدارت منعقد ہو گی۔

آپ کا مخلص

غلام رسول آنریری سیکرٹری

پنجاب پراونشل مسلم لیگ

(برائے ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ)

مسٹر جناح کی طرف سے اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ انھوں نے ۲ر مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر صاحب کے نام وہ خط ارسال کیا۔ جو گذشتہ باب میں درج کیا جا چکا ہے۔ اور جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا تھا۔ کہ آیا وہ لیگ کے اجلاسِ خصوصی کا لاہور میں منعقد ہونا پسند کریں گے یا نہیں۔ اور جس کے جواب میں غلام رسول خاں نے ڈاکٹر صاحب کے حسب ہدایت لکھا تھا کہ اجلاسِ خصوصی یقیناً لاہور میں منعقد ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ مدت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو۔ اُن کو یقین تھا کہ پنجاب میں لیگ کی تحریک بھی عوام کے دلوں میں گھر کر سکے گی۔ کہ مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان اجلاس لاہور میں منعقد کیا جائے۔ جہاں ہندوستان کے ہر صوبے سے بڑے بڑے مسلمان لیڈر آ کر شرکت کریں۔ عام لوگوں میں کسی سیاسی

تحریک کو مقبول بنانے کے لیے اس قسم کے جلسے جلوسوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

ابھی اکتوبر ۱۹۳۷ء کے اجلاس لکھنؤ کی تیاریاں بھی شروع نہیں ہوئی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ۲ جون ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ کہ

"۔۔۔۔ میری رائے میں یہ بہتر ہوگا۔ کہ لیگ کا سالانہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں کرنے کی بجائے پنجاب میں منعقد کیا جائے۔ لاہور میں اگست کے مہینے کا موسم اچھا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں وسط اکتوبر بہتر ہوگا۔ جبکہ یہاں موسم کافی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس تجویز کی اہمیت پر اچھی طرح غور فرمائیں گے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کا اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور اگر آپ نے لیگ کا آئندہ اجلاس لاہور میں کیا۔ تو مسلمانانِ پنجاب میں سیاسی بیداری پھیلنے کی پختہ توقع ہے" [1]

پورے دو مہینے کے بعد اا اگست ۱۹۳۷ء کو انھوں نے پھر اسی موضوع پر مسٹر جناح کو تحریر فرمایا۔ کہ

"۔۔۔۔ لیگ کے مرکزی دفتر دہلی نے مسٹر غلام رسول خاں کو اطلاع دی ہے۔ کہ مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ اجلاس کی تاریخوں کا ہنوز تعین نہیں ہوا۔ اندریں حالات مجھے اندیشہ ہے کہ یہ

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

اجلاس غالباً اگست یا ستمبر میں منعقد نہیں ہو سکے گا۔ میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ اکتوبر کے وسط یا آخر میں لیگ کے اس اجلاس کا انعقاد لاہور میں کیجئے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ اور مجھے اس امر میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کہ اگر مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ تو یہ واقعہ لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں موڑ کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اور اس طرح ہم عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو سکیں گے"۔[1]

بالآخر جب ۱۶، ۱۷ اکتوبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو وہاں بھی یہ تحریک آگئی۔ کہ آئندہ اجلاس لاہور میں ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب ۳۰، اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بڑے اصرار سے مسٹر جناح کو لکھتے ہیں۔

"...... مجھے امید ہے۔ کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس منعقد ہونے سے قبل آپ کم از کم دو ہفتے پنجاب کا دورہ ضرور کریں گے"۔[2]

۱۰، نومبر ۱۹۳۷ء کو یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کی شکایت کرتے ہوئے بڑے افسوس سے مسٹر جناح کو تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"...... یہ لوگ اب چاہتے ہیں۔ کہ لیگ کا آئندہ اجلاس

---

[1]، [2] اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

فروری کے بجائے اپریل میں ہونا چاہیئے۔ وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے۔ کہ وہ پنجاب میں اپنی زمیندارہ لیگ کے پاؤں مضبوط کرنے کے درپے ہیں۔" سلہ

یہ تمام باتیں ظاہر کر رہی ہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب شدت سے اس امر کے خواہش مند تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس جلد از جلد لاہور میں ہو تاکہ لیگ کے زیر اہتمام رابطہ عوام کی تحریک پوری سرگرمی سے شروع کی جاسکے۔ اب کہ ۲ر مارچ ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح نے ڈاکٹر صاحب سے یہ استفسار کیا کہ آیا وہ لیگ کے سالانہ اجلاس کا انعقاد لاہور میں پسند کریں گے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے اس تجویز کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور فوراً غلام رسول خاں سے جواب لکھوایا۔ کہ یہ اجلاس یقیناً ایسٹر کی تعطیلات کے موقع پر لاہور میں منعقد ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس جواب کی روشنائی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نواب ممدوٹ نے جن کو ہم بدقسمتی سے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر بنا چکے تھے، خفیہ اور چپکے چپکے مسٹر جناح کو ذیل کا خط لکھا۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔

غالباً آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ مجھے پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اور سر محمد اقبال کی خواہشات کا احترام کرتے

سلہ - اقبال کے خطوط جناح کے نام (شیخ محمد اشرف)

ہوئے ہیں نے یہ عہدہ قبول کر لیا ہے۔ ایک جلسے میں جس میں میں موجود نہ تھا، یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے انعقاد کے لیے لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے میرا یہ فرض ہے۔ کہ میں آپ پر واضح کر دوں۔ کہ مسلم لیگ اور شہید گنج کی تحریک کے بہترین مفاد اِس امر کے متقاضی ہیں کہ لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں نہ ہو۔

مسلم لیگ پنجاب میں ابھی تک ابتدائی منازل میں ہے۔ اور بعض مخالف قوتیں اُس کی روز افزوں ترقی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہیں۔ اگر لیگ کا خاص اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ تو پنجاب کے مشتعل مسلمانوں کی طرف سے آپ پر بے حد دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور آپ کو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ جو غالباً آپ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوگا۔ اور مجھے ڈر ہے۔ کہ یہ چیز کامیابی کے ساتھ لیگ کے خلاف استعمال کی جائے گی۔

علاوہ ازیں سکھوں نے بھی لاہور میں انہی ایام میں جب لیگ کا خاص اجلاس منعقد کرنے کا خیال ہے۔ ایک بہت بڑا دیوان منعقد کرنے کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دی ہیں۔ اور بجا طور پر ایک فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اُمید بلکہ یقین ہے۔ کہ آپ اِس نازک مرحلہ پر بھی

زبردست قابلیت اور بے مثال جرأت سے کام لے کر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔ تاکہ شہید گنج کے اہم مسئلہ پر ایک پُرسکون فضا میں بحث و تمحیص ہو سکے۔ میں اِس خط کی ایک نقل آپ کے بمبئی کے پتہ پر بھی بھیج رہا ہوں۔

آپ کا مخلص

شاہنواز خاں"

نواب ممدوٹ نے یہ خط سر سکندر حیات کے ایما اور تحریک پر لکھا تھا سر سکندر ہرگز اس بات کے حامی نہ تھے۔ کہ مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو اب قدرت نے خود بخود ایسے سامان مہیا کر دیئے تھے۔ کہ پراونشل مسلم لیگ کا صدر، سر سکندر کا ایک ساختہ و پرداختہ آدمی تھا۔ چنانچہ اب اُنہیں اس بات کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جاوید منزل کا طواف کریں۔ یا مطلب براری کے لیے غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کے مکانوں پر جا کر دستک دیں۔ اب تو پنجاب مسلم لیگ کا صدر اُن کے چشم و ابرو کے اشارے پر سب کچھ نثار کر دینے کو آمادہ تھا۔

نواب ممدوٹ نے اپنے اِس خط کے شروع میں لکھا ہے۔ کہ "ایک جلسے میں جس میں میں موجود نہ تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس کے لیے لاہور کی طرف سے دعوت دی جائے"۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ اُس زمانے میں لیگ کے تمام جلسوں کے ایجنڈے میں خود تیار کرتا تھا۔ اور پھر ہر ایجنڈا پراونشل لیگ کے جنرل سیکرٹری

غلام رسول خاں کے دستخط سے جاری کیا جاتا تھا۔

جب ڈاکٹر صاحب نے غلام رسول خاں کو جلسہ کرنے کا حکم دیا۔ تو میں نے ایجنڈا مرتب کیا تھا۔ اور اُس کی ایک نقل باقاعدہ نواب ممدوٹ کو بھی بھیجی گئی تھی۔ نواب صاحب نے یقیناً سر سکندر سے مشورہ کیا ہوگا۔ اور پھر باہمی طور پر طے ہوا ہوگا۔ کہ وہ جلسہ میں شریک نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نواب ممدوٹ اُس جلسہ میں تشریف لاتے۔ اور لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کی تجویز کے خلاف رائے دیتے۔ تو ایک شخص بھی اُن کی بات سننے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اُنھیں پہلے سے اس کیفیت اور صورتِ حال کا علم تھا۔ اِسی لیے اُنھوں نے عمداً اور جان بوجھ کر جلسہ میں شرکت سے گریز کیا۔

ہمیں نواب ممدوٹ کے اِس خط کا ہرگز کوئی علم نہیں تھا۔ بلکہ ہم تو اِس خیال سے مطمئن تھے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں ہماری دعوت یقیناً قبول کرلے گی۔ اور پھر ہمیں لیگ کے اجلاس کی تیاریوں میں شب و روز منہمک ہوجانا پڑے گا۔ صرف یہی نہیں ہم نے تو ۶ مارچ کے جلسے کے بعد چند سب کمیٹیاں بنا کر کام کی ابتدا بھی کردی تھی۔

یہ کیفیت تھی جب، نواب ممدوٹ کے خفیہ خط سے قطعاً بے خبر، ہم لوگ ۲۰ مارچ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی پہنچے۔ ۱۹ مارچ کی شام کو ملک برکت علی، غلام رسول خاں، ملک زماں مہدی اور راقم السطور

مسٹر جناح سے ملے۔ تاکہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں تفصیلات پر گفتگو ہو سکے۔ مسٹر جناح نے ہنس کر فرمایا۔ کہ "پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر تو لاہور میں اجلاس منعقد کرنے کے خلاف ہے۔ آپ کس منہ سے مجھ کو دعوت دیتے ہیں"

یہ کہہ کر اُنھوں نے نواب ممدوٹ کا خط ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اُس وقت ہماری جو کیفیت ہوئی۔ اُس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ سب سے زیادہ صدمہ ملک برکت علی کو ہوا۔ جن کے غلط انتخاب کی وجہ سے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ بہرحال ۲۰ مارچ کو لیگ کونسل نے فیصلہ کر دیا۔ کہ مسجد شہید گنج کے بارے میں مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی کلکتہ میں ہوگا۔ اِس خبر سے علامہ اقبال کو سخت رنج ہوا کیونکہ وہ مدت سے یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ کہ اجلاس لاہور میں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ اب اُس امید کے بر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

دہلی جانے سے قبل ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کا ایک ضروری اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا تھا تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے نوّے ۹۰ ممبر منتخب کئے جائیں۔ صوبے کی کم و بیش ہر شاخ کے نمائندے جلسے میں موجود تھے۔ چنانچہ نہایت خوش اسلوبی سے نوّے آدمیوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ یونینسٹ پارٹی کے کسی آدمی نے اب تک مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اور نہ اِس پارٹی کا کوئی رکن اب تک کسی ضلع کی مسلم لیگ کا ممبر بنا تھا۔ اِس لیے اِن نوّے آدمیوں میں ایک بھی یونینسٹ شامل

نہیں تھا۔

اِسی دوران میں صوبے کی تمام شاخوں کو لکھ دیا گیا تھا۔ کہ مسلم لیگ کے اجلاسِ خصوصی کے لیے مندوبین منتخب کر کے اُن کی فہرستیں پراونشل لیگ کے دفتر میں جلد از جلد بھیج دیں۔ چنانچہ اس ہدایت پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ اور تمام ضلعی شاخیں اپنے اپنے ہاں مندوبین کے انتخاب میں مصروف ہو چکی تھیں۔

مجھے یہاں ایک نہایت تکلیف دہ اور افسوسناک بات کا ذکر کرنا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اُس کا ذکر نہ کر لیا جائے۔ ماضی کی اس داستان کو آگے بڑھانا میرے لیے بالکل ناممکن ہے۔ جب سے پنجاب میں سر سکندر حیات خاں کی وزارت قائم ہوئی تھی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کا ذاتی رویہ ہمارے متعلق بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اُن کی امداد و اعانت اور تائید و حمایت کلیتہً سر سکندر کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ جہاں تک اُن سے ہو سکتا تھا۔ وہ ہر موقع پر سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اِس دوران میں ایسے کئی مواقع پیش آئے۔ کہ ہم راستی پر تھے۔ اور سر سکندر کا رویہ غلط تھا۔ لیکن نواب زادہ صاحب مرحوم نے ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا۔ ہم اس چیز کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اور بارہا ہم نے بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا تھا۔ کہ یہ تمام باتیں مسٹر جناح کے گوش گذار کر دینی چاہئیں۔ لیکن پھر اس خیال سے خاموش رہے۔ کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ سر دست مسٹر جناح کے تفکرات میں اضافہ نہ کیا جائے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کے خاندان کے تمام لوگ اور جملہ عزیز و اقارب

کرنال میں رہتے تھے جنہیں آئے دن حکومتِ پنجاب کی امداد و اعانت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سر سکندر بڑے زیرک اور ہوشیار آدمی تھے۔ اُنھوں نے نواب زادہ مرحوم کے اس کمزور پہلو کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ خود لیاقت علی خاں کے بڑے بھائی نواب زادہ سجاد علی خاں، پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونینسٹ پارٹی کے رُکن تھے۔ سر سکندر اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کے درمیان ہر قسم کا نامہ و پیام اُنھی کے توسّل سے ہوتا تھا۔ ہمیں ایک ایک بات کا علم تھا۔ لیکن مصلحت کی مجبوریوں نے ہماری زبان و قلم پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔

اسی سلسلہ میں مَیں یہاں ایک ضروری واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جب علامہ اقبال کی مسلسل کوششوں کے باوجود سر سکندر اور اُن کی جماعت نے مسلم لیگ کے قرطاسِ رکنیت پر دستخط نہ کیے۔ تو ڈاکٹر صاحب بالکل مایوس ہو گئے۔ اور انھیں یقین ہو گیا۔ کہ اب یونینسٹ پارٹی سے کسی قسم کے اشتراک و تعاون کی توقع رکھنا خیالِ خام ہے۔ اِدھر پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بالکل ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے یہ محسوس کر کے کہ عوام کو حقیقت سے آگاہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں ذیل کا بیان غلام رسول خاں سے لکھوایا۔ اور حکم دیا کہ اسے فوراً اخبارات کو بغرضِ اشاعت بھیج دیا جائے۔

علامہ اقبال کا بیان:۔

"۱۴، ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آنریبل سر سکندر حیات خاں نے یونینسٹ

پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں یہ اعلان کیا تھا۔ کہ واپس پنجاب جانے کے بعد وہ اپنی جماعت کا ایک اجلاس منعقد کریں گے۔ اور اُس میں اپنی جماعت کے اُن مسلمان ممبروں کو جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں۔ لیگ کے دستور پر دستخط کرنے اور اُس کے رکن بننے کی تلقین کریں گے۔ یہ ارکان لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے تحت رہیں گے۔ اور اسمبلی کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیں گے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے۔ اور اس مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی۔ کہ لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔

"نام نہاد سکندر جناح پیکٹ کا اہم حصّہ صرف یہی ہے۔ اور اس پیکٹ کی باقی شقوں سے ہمیں فی الحال کوئی واسطہ نہیں۔

"جب مذکورہ بالا اعلان اخباروں میں شائع ہوا۔ تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی۔ کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اب دور ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ لہٰذا میں نے مسٹر غلام رسول خاں سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو

ہدایت کی۔ کہ وہ سر سکندر کے پاس لیگ کی نوّے درخواست ہائے رکنیت بھیج دیں۔ تاکہ وہ اُن پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے دستخط کروالیں چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے ہفتے میں سر سکندر حیات خاں کے پاس بھیج دی گئی تھیں۔ لیکن ہمیں اِن کے متعلق کوئی جواب موصول نہ ہُوا۔ اِس لیے یاددہانی کرائی گئی۔ مگر پھر بھی مُہرِ سکوت نہ ٹوٹی۔ اور تا حال سر سکندر نے ایک درخواست بھی دستخط کروا کر واپس نہیں بھیجی۔ مجھے ملک برکت علی نے اطلاع دی ہے۔ کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔ اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن نے یہ بیان کیا۔ کہ رکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کر لیے گئے ہیں۔ اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ سکندر جناح پیکٹ کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔

"اس مقام پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصل صورتِ حال کو واضح کر دیا جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ جس کا اہم ترین حصّہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے، اُن کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔

ملک برکت علی ایم۔ ایل۔ اے نے مجھے بتایا ہے کہ جب مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں بحث ہوئی تھی تو مسٹر جناح کی توجہ سر سکندر کے اس دعوے کی طرف بھی منعطف کی گئی تھی۔ مسٹر جناح نے صاف کہا کہ سکندر جناح پیکٹ کے متن کے علاوہ سر سکندر سے اُن کی کوئی زبانی افہام و تفہیم نہیں ہوئی۔

" مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس پیکٹ کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں اور اِس وجہ سے عوام میں یونینسٹ پارٹی کے رویے کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ پورے چار مہینے گذر چکے ہیں۔ مگر یہ ہیجان و اضطراب کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ مسلمان عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔

" میں اعلان کرتا ہوں۔ کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اِس لیے میں یہ بیان شائع کر رہا ہوں۔ تاکہ مسلمانانِ پنجاب کو معلوم ہو جائے۔ کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اب یہ توقع رکھنا کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد، یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے۔ ایک اُمید موہوم ثابت ہو رہی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ

کا دروازہ ہر اُس مسلمان کے لیے کھلا ہے۔ جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہے۔ اور میں نہایت خوشی سے اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے متعدد مسلمان ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دیئے ہیں۔"[1]

یہ بیان بڑا زبردست اور معرکۃ الآرا تھا۔ جس کی زد براہِ راست مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی چپقلش پر پڑتی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے دو مختلف کشتیوں میں سوار ہونے کے بعد جو منافقت آمیز طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا۔ اس بیان نے اُس کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی۔ اگر یہ بیان اُس وقت شائع ہو جاتا۔ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ نتائج کیا ہوتے۔ لیکن یہ بات تو پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مسٹر جناح نے چند سال انتظار کرنے کے بعد، جو قدم ۱۹۴۴ء میں اُٹھایا تھا۔ وہی قدم اقبال نے پوری جرأت و ہمت سے ۱۹۳۸ء ہی میں اُٹھا لیا تھا۔

غلام رسول خاں اور ملک برکت علی کی رائے تھی۔ کہ اشاعت سے پہلے اس بیان کی ایک نقل مسٹر جناح کو بھی بھیج دینی چاہیئے۔ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے۔ کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک نقل مسٹر جناح کو دہلی بھیج دی گئی۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں بھی وہیں تھے۔ انھوں نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا۔ کہ سر سکندر حیات سے یوں بگاڑ پیدا کر لینا

---

[1] اصل بیان انگریزی میں تھا۔

اچھا نہیں - چنانچہ مسٹر جناح کا جواب آگیا - کہ سر دست یہ بیان شائع نہ کیا جائے -

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اپنے ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اجلاس میں پانچ ممبروں کی ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی - جس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں اور سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے - اس سب کمیٹی کا یہ کام تھا - کہ الحاق کی اُن درخواستوں کا فیصلہ کرے - جو ہندوستان کے مختلف صوبوں کی مسلم لیگوں کی طرف سے مرکزی دفتر میں موصول ہو رہی تھیں - پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو باضابطہ اپنے الحاق کی درخواست مرکزی دفتر کو ارسال کر دی تھی -

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ پنجاب کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جو نوے ۹۰ ممبر منتخب ہوئے تھے - اُن میں سر سکندر کی پارٹی کا ایک آدمی بھی شامل نہیں تھا - سر سکندر کو اِس واقعہ سے سخت تشویش لاحق ہو گئی تھی - اگر یہ صورتِ حال قائم رہتی - تو گویا آل انڈیا مسلم لیگ سے سر سکندر حیات اور اُن کے رفقا یک قلم خارج کر دیئے جاتے - یہ جو کچھ ہُوا تھا - بالکل لازمی اور طبعی تھا - اس میں بُغض و عناد کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا - جب تک سر سکندر اور اُن کی جماعت کے لوگ مسلم لیگ کے ممبر نہ بن جاتے - انھیں قاعدے اور قانون کی رُو سے لیگ کونسل کے لیے منتخب نہیں کیا جا سکتا تھا -

اِدھر آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا - کہ پنجاب پراونشل

مسلم لیگ کے نوّے آدمیوں کی فہرست کو مسترد کرکے خود اپنی مرضی سے اور لوگوں کو نامزد کردے۔ ہاں ایک طریقہ باقی تھا۔ وہ یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق منظور کرنے سے انکار کردے اس صورت میں جبکہ پنجاب اپنی صوبائی لیگ کے وجود ہی سے محروم ہو جاتا آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کو اختیار تھا۔ کہ اپنی مرضی سے پنجاب کے نوّے آدمی کونسل کے لیے نامزد کردے۔

اب سر سکندر اور اُن کے ساتھیوں نے بڑی شدّ و مد سے دوڑ دھوپ شروع کی۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست مسترد کرا دی جائے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں اُن کی اپنی نامزدگی کا دروازہ کھُل سکے۔

نواب ممدوٹ۔ میر مقبول محمود۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ اور سیّد افضال علی حسنی نے دہلی پہنچ کر ڈیرہ لگا دیا۔ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں سے صبح و شام ملاقاتیں ہونے لگیں۔ آخر کار یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اور جس مہم پر نکلے تھے۔ اُسے فتح کر کے واپس آئے۔

لاہور میں کئی روز سے یہ افواہ پھیل رہی تھی۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ یہ افواہ میں نے بھی سُنی۔ غلام رسول خاں ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین وغیرہ نے بھی سُنی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب تک بھی یہ افواہ پہنچ گئی۔ ہم حیران تھے۔ کہ اس کی بنیاد کیا ہے۔ جب اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کی۔ تو معلوم ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے یہ بات

مشہور کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ لیگ کے الحاق یا عدم الحاق کی اطلاع ہم سے بالا بالا یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں کیونکر پہنچ سکتی ہے۔

انہی دنوں ایک روز میں اور غلام رسول خاں ریلوے روڈ پر ایک دوست کے ہاں شادی کی دعوت میں شریک ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ابھی تمام مہمان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔ کہ "آپ پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری ہیں؟"

میں نے جواب دیا "نہیں۔ میں جائنٹ سیکرٹری ہوں۔ سیکرٹری وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ غلام رسول خاں۔ فرمائیے۔ کیا کام ہے آپ کو؟"

بولے "میں نے سُنا ہے کہ آپ کی لیگ کے الحاق کی درخواست نامنظور ہو گئی ہے"

میں نے عرض کیا "اس قسم کی افواہ بہت دنوں سے پھیل رہی ہے لیکن ہمارے پاس تو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی"

وہ کہنے لگے "آپ میری بات کو بالکل درست سمجھئے۔ میں نے خود میر مقبول محمود سے سُنا ہے"

میں اُن کو لے کر غلام رسول خاں کے پاس چلا گیا۔ وہ کئی روز سے بھرے بیٹھے تھے۔ فوراً بول اُٹھے "یہ یونینسٹ پارٹی کے لوگ جھوٹ بکتے ہیں۔ ہماری درخواست کا ابھی کوئی جواب نہیں آیا"

میں نے غلام رسول خاں کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ کہ "زبانِ خلق کو

نقارۂ خدا سمجھنا چاہیئے ۔ یہ جو کئی روز سے مشہور ہو رہا ہے ۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ صداقت ہے "

کہنے لگے " پھر میں کیا کروں ۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا "

اُسی شام آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری کی طرف سے ہمیں باضابطہ اطلاع موصول ہو گئی کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی ۔

اُس اطلاع کا مضمون حسب ذیل تھا ۔

" جناب عالی !

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اُس نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی درخواست پر غور کیا ہے ۔ کمیٹی کی رپورٹ سے آپ کی درخواست سے متعلقہ اقتباسات آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں ۔ یہ رپورٹ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۳ ر اپریل ۱۹۳۶ء میں بمقام دہلی پیش ہو کر منظور ہو چکی ہے ۔

آپ کا مخلص

لیاقت علی خاں

آنریری سیکرٹری ۔ آل انڈیا مسلم لیگ

موعودہ اقتباس

" مختلف صوبوں کی الحاق کی درخواستوں پر غور وخوض اور فیصلہ کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کا اقتباس یہ ہے۔

پنجاب کے معاملہ میں کمیٹی کو افسوس ہے کہ وہ الحاق منظور کرنے سے معذور ہے۔ دیگر امور کے علاوہ کمیٹی کی رائے ہے کہ وہ قواعد وضوابط جن کے تحت اس لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے خلاف ہیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے وضع کردہ آئین کی دفعہ ۳۳ میں یہ لکھا گیا ہے کہ لیگ پنجاب کی کسی دوسری مسلم ایسوسی ایشن کا الحاق اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ ہماری رائے میں یہ دفعہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کی روح کے منافی ہے۔ پرانے آئین میں اس قسم کی دفعہ ضرور تھی۔ لیکن نئے آئین میں اس کو حذف کر دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ بذاتِ خود ایک مکمل جماعت ہے۔ جو مسلمانوں کی تمام ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ لہذا آل انڈیا مسلم لیگ کسی دوسرے مسلم ادارے کو اپنی شاخ کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتی۔ در حقیقت ملک میں مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیئے۔ اور وہ جماعت مسلم لیگ ہے۔

دوسرے اہم اعتراضات دفعات ۵-۶-۷ سے متعلق ہیں
ان دفعات کی رُو سے ہر مسلمان (بشرطیکہ مقررہ فیس ادا
کر دے اور پراونشل کونسل یا پنجاب مسلم لیگ۔ اس کی درخواست
منظور کرے) پراونشل مسلم لیگ کا ممبر بن سکتا ہے۔ دوسرے
لفظوں میں ان قواعد کی رُو سے پراونشل مسلم لیگ کی رکنیت
براہ راست درخواست کرنے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن
یہ امر ہمارے نئے آئین کے بنیادی اصول کے سراسر خلاف ہے
کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کے تحت ہر رکن کے
لیے کسی ابتدائی لیگ کی رکنیت ضروری ہے۔ اور وہ
پراونشل مسلم لیگ میں صرف کسی ابتدائی یا ضلع لیگ کے
نمائندے کی حیثیت سے شامل ہو سکتا ہے۔ فی الواقع
پراونشل مسلم لیگ کی بلاواسطہ رکنیت کی اب اجازت
نہیں ہے۔ اور ہماری رائے یہ ہے۔ کہ اس قسم کے آئین
ضوابط کے تحت معرض وجود میں آنے والی لیگ کا الحاق نہیں
کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بات آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین و ضوابط
کے بالکل منافی ہے۔"[1]

دستخط

لیاقت علی خاں

آنریری سیکرٹری۔ آل انڈیا مسلم لیگ

---

[1] اصل خط انگریزی میں تھا۔

یہ خط ۵ اپریل کو ہمارے دفتر میں پہنچا۔ غلام رسول خاں نے اُسی وقت علامہ اقبالؒ۔ ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین وغیرہ کو اطلاع کر دی۔ ہمارا فوری ردِ عمل یہ تھا۔ کہ ہمیں بطور احتجاج مسلم لیگ سے مستعفی ہو جانا چاہیئے تاکہ نواب زادہ لیاقت علی خاں اپنی پسند کے آدمیوں کی مدد سے پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخ چاہیں قائم کر لیں۔ لیکن پھر غور کرنے کے بعد فیصلہ ہوا۔ کہ یہ روّیہ قومی مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لیے جملہ نقائص کو رفع کر کے الحاق کی نئی درخواست فی الفور ہی بھیج دینی چاہیئے۔

جن نقائص کی بنا پر ہماری درخواست مسترد کی گئی تھی۔ وہ محض اصطلاحی تھے۔ اگر نیت بخیر ہوتی۔ تو ہمیں ہدایت کی جا سکتی تھی۔ کہ ان نقائص کو رفع کر کے نئی درخواست بھیج دو۔ لیکن وہاں تو ارادہ یہی تھا کہ الحاق نہ ہونے پائے۔ تاکہ سر سکندر حیات کے آدمیوں کو لیگ کونسل میں داخل کرنے کا راستہ صاف کیا جا سکے۔

ملک برکت علی نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۶ اپریل کو ایک طویل خط مسٹر جناح کو لکھا۔ جو ملک صاحب کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔

مسٹر غلام رسول خاں بیرسٹر ایٹ لاء نے ابھی ابھی مجھے وہ خط دکھایا ہے۔ جو اُنھیں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے موصول ہوا ہے۔ اِس خط میں اُس سب کمیٹی کی رپورٹ کے اقتباس بھی درج ہیں۔ جو الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے

کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ اِن اقتباسات میں وہ وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ جن کی بنا پر مذکورہ سب کمیٹی نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

سب کمیٹی نے ہمارے دستور کی دو شقوں پر اعتراض کیا ہے اوّل یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کسی دوسری مسلم ایسوسی ایشن کا الحاق بھی اپنے ساتھ کر سکتی ہے۔ دوم یہ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی رکنیت براہ راست بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ دونوں شقیں چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کے منافی قرار دی گئی ہیں۔ اس لیے میری گذارش ہے کہ ان میں نہایت آسانی سے ترمیم و تنسیخ کی جا سکتی ہے تاکہ ہمارا آئین جزواً و کلاً ان اصولوں پر مرتب ہو جائے۔ جن پر آل انڈیا مسلم لیگ کا دستور وضع کیا گیا ہے۔ مسٹر غلام رسول خاں نے بہت جلد پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے دونوں اعتراضوں کو رفع کر کے نئی درخواست بھیج دی جائے۔

آپ کی خدمت میں یہ عریضہ لکھنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں نہایت ادب سے عرض کروں۔ کہ ان دو معمولی فروگذاشتوں کی آڑ لے کر ہمارے الحاق کی درخواست کو مسترد کر دینا کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہماری صوبائی لیگ۔ آل انڈیا

مسلم لیگ کی ایک باقاعدہ اور ملحقہ شاخ ہے اور اُس کا یہ الحاق کوئی نیا نہیں۔ بلکہ ۱۹۱۶ء سے چلا آ رہا ہے۔ ایسی پرانی شاخ کے لیے صرف یہی کافی تھا۔ کہ اُسے مذکورہ بالا دو قابلِ اعتراض شقوں کو رفع کرنے کی ہدایت کر دی جاتی نہ یہ کہ محض ایک اصطلاحی عذر کی بنا پر الحاق ہی سے انکار کر دیا جاتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ کہ الحاق اس شرط پر منظور کر لیا جاتا۔ کہ ہم دونوں شقیں رفع کر کے اپنے آئین کو درست کر دیں۔

ہمیں اور لیگ کے تمام کارکنوں کو سب سے زیادہ تکلیف جس بات سے ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لوگ کئی روز سے شور مچا رہے تھے۔ کہ ہماری لیگ کا الحاق نہیں ہو گا۔ آخر کار اُن کی بات درست نکلی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ نے وہی کیا جو یونینسٹ پارٹی چاہتی تھی۔ ہم نہایت اخلاص اور وفاداری کے ساتھ گذشتہ بائیس سال سے آل انڈیا مسلم لیگ کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی رنج ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ ناروا سلوک صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اُن لوگوں کو مطمئن کیا جائے۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بدترین دشمن ہیں اور جو آج بھی اِس صوبے میں مسلم لیگ کی جڑیں کاٹنے میں صبح و شام مصروف رہتے ہیں۔

ہم نے مخالفت کے بدترین طوفان کے باوجود لیگ کی خدمت

سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ اور یہ سب کچھ کسی شخص کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے نہیں کیا۔ بلکہ ہمارے پیش نظر صرف قومی خدمت کا نصب العین تھا۔ الحمدللہ۔ آج ہم فخر و انبساط سے اپنی شبانہ روز محنت کے نتائج دیکھ رہے ہیں کہ سارا پنجاب یونینسٹ پارٹی سے متنفر۔ اور مسلم لیگ کا حامی و مددگار ہے۔ اگر گذشتہ انتخاب میں لیگ کے زیادہ نمائندے اسمبلی میں منتخب نہیں ہو سکے۔ تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شہری اور دیہاتی حلقوں کو نہایت ہوشیاری، بلکہ مکاری سے ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا گیا ہے۔ تاہم اِن رکاوٹوں کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ آج رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور انشاءاللہ آئندہ عام انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کو ختم کر کے رکھ دیا جائے گا۔

ہم محسوس کر رہے ہیں۔ کہ آپ کو ابھی تک یہ امید ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کا لیڈر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ ہم ہر ممکن طریقے سے آپ پر یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں۔ کہ سر سکندر حیات کبھی پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائیں گے۔ اُن کی چال صرف یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں کسی نہ کسی طرح اپنا اثر و رسوخ قائم رکھیں۔ اور دوسری طرف پنجاب میں لیگ کا سر کچلتے رہیں۔ ستم ہے کہ ہمارے پیہم انتباہ کے باوجود وہ آپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور

اب تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کھیل میں گویا ہم لوگوں کو قربانی کا بکرا بننا پڑے گا۔ ہم ہرگز ہرگز اپنے آپ کو قربانی کے بکرے کی حیثیت دینا گوارا نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اِس بات پر آمادہ ہیں کہ پنجاب مسلم لیگ کو توڑ کر یہ اعلان کر دیں کہ ہماری جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ شاخ نہیں ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو ہم ابھی اس قسم کا اعلان کرنے کو تیار ہیں۔ سر سکندر اور اُن کے احباب بڑی خوشی سے لیگ کو سنبھال لیں۔ ہمیں حاشا و کلّا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ الحاق کرنے والی سب کمیٹی کی مذکورہ بالا رپورٹ موصول ہونے کے بعد ہمارا پہلا ردِّ عمل یہی تھا۔ کہ ہم فوراً اپنی علیحدگی کا اعلان کر کے لیگ کو سر سکندر اور اور اُن کے احباب کے حوالے کر دیں۔ لیکن پھر سوچ کر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ پہلے آپ کو اپنے خیالات و عزائم سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔

اگر آپ کو اب ہماری چنداں ضرورت نہیں رہی۔ تو ہمیں اب سے قطعاً کوئی شکایت نہیں۔ لیکن ہم یہ تو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ ہماری اُس لیگ کا الحاق نامنظور کر دیا جائے۔ جو گذشتہ ربع صدی سے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک ملحقہ شاخ چلی آرہی ہے۔ اور جس کے ممبروں کی فہرست میں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایسے عظیم المرتبت اور ہندوستان گیر شہرت کے آدمی کا نام نامی بھی

موجود ہے۔

سب کمیٹی کی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ "علاوہ دیگر امور کے پنجاب مسلم لیگ کا آئین آل انڈیا مسلم لیگ کے خلاف ہے۔"

یہ الفاظ یعنی "علاوہ دیگر امور کے" ہمارے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔

میں اِس موقع پر خاموش رہنا بزدلی سمجھتا ہوں۔ کونسل کے ممبروں کی جو فہرست ہم نے بھیجی تھی۔ اُسے نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ اور اُن لوگوں کو لیگ کونسل میں نامزد کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے لیگ کے بدترین دشمن ہیں۔ اور جو آج بھی لیگ کے پروگرام اور اصولوں کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ خوش ہیں کہ معاہدہ کی بنیادی شرط پوری کئے بغیر یعنی اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی قائم کئے بغیر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی ہے۔ یقین کیجئے گا کہ آپ اُن لوگوں پر اعتماد کر رہے ہیں۔ جو اعتماد کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کی رائے پر کوئی اختیار نہیں۔ آپ بڑی خوشی سے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن خدارا ہمیں قربانی کا بکرا نہ بنایئے۔ ازراہِ کرم مجھے مطلع فرمایئے گا۔ کہ ہماری موجودہ پوزیشن کیا ہے۔ ہماری لیگ کے الحاق کی درخواست کا استرداد کوئی معمولی واقعہ نہیں کہ ہم خاموشی سے اِس ذلت کو برداشت کر لیں۔ ہمارا حق ہے کہ اپنا سینہ چیر کر

آپ کو دکھا ہیں۔ تاکہ آپ ہمارے حقیقی جذبات سے آگاہ ہو سکیں
براہ کرم میرے تلخ و ناملائم الفاظ کو معاف کر دیجئے گا۔ ہمارے
ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے۔ وہ اِس قدر تکلیف دہ ہے کہ
معمولی صبر و ضبط سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

آپ کا مخلص

برکت علی"

غلام رسول خان نے ۱۲ راپریل کو پنجاب مسلم لیگ کونسل کا جلسہ کر کے سب کمیٹی کے دونوں اعتراض رفع کر دیئے۔ اور اصلاح شدہ آئین کے مسودے کے ساتھ الحاق کی نئی درخواست دہلی بھیج دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اِس سارے ہنگامے کے دوران میں نواب ممدوٹ نے اپنی شکل بھی نہیں نہ دکھائی۔ وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اور اُن کا فرض تھا کہ اس جدّ و جہد میں ہمارے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوتے۔ لیکن از بسکہ ہماری درخواست کے مسترد کرائے جانے میں سب سے بڑا دخل اُنھی کو تھا۔ وہ اِس موقع پر ہمارے قریب تک نہ آئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاسِ خصوصی ۱۸/۱۹ اپریل کو کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ ہمارا ارادہ وہاں جانے کا نہیں تھا۔ جب پنجاب پراونشل لیگ کا وجود ہی باقی نہیں رہا تھا۔ تو آل انڈیا لیگ کے جلسے میں شرکت بے معنی سی بات تھی۔ لیکن چونکہ اِس اجلاس میں شہید گنج کے مسئلہ کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اِس لیے پنجاب بھر میں جوش و خروش پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت سے لوگ

کلکتہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہر ضلع سے مندوبین کی فہرستیں ہمارے دفتر میں پہنچ رہی تھیں۔ اور لوگ بڑے اصرار سے ڈیلی گیٹ کے ٹکٹ طلب کر رہے تھے۔ مجبوراً اِن تمام لوگوں کو اطلاع دینی پڑی۔ کہ لیگ کا الحاق چونکہ منظور نہیں ہُوا۔ اس لیے کوئی شخص ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے کلکتہ نہیں جا سکتا۔ اس خبر سے چاروں طرف مایوسی پھیل گئی۔

۱۴ اپریل کو گیارہ بجے کے قریب غلام رسول خاں اور ملک نورالٰہی میرے مکان پر آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ تیار ہو جاؤ۔ آج شام کی گاڑی سے کلکتہ جانا ہے۔

میں نے تعجب سے پوچھا۔ کہ یہ فیصلہ کب ہُوا۔ کیونکہ گذشتہ شام تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا۔

غلام رسول خاں نے بتایا۔ کہ "آج صبح ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا ہے کہ کلکتہ جا کر اپنی جنگ خود لڑو۔ یہاں گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم اب ڈاکٹر صاحب ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو۔"

پہلے ہم ایک ضروری کام سے روزنامہ احسان کے دفتر میں گئے۔ اور وہاں سے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ ملک برکت علی بھی وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب آنکھیں بند کیے ہوئے پلنگ پر لیٹے تھے۔ غلام رسول خاں نے عرض کیا۔ کہ "ہم لوگ شام کو کلکتہ جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ضرور جاؤ۔ اور اپنے حق کے لیے آخر تک لڑو۔ ہمارے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔"

ملک برکت علی نے کہا "اگر ہماری نئی درخواست بھی منظور نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا ؟"

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ لیکن اُنھوں نے کسی قدر جوش سے فرمایا "کچھ فکر نہیں۔ درخواست منظور ہو یا نامنظور جس اصول پر ہم نے اب تک کام کیا ہے۔ آئندہ بھی جاری رہے گا"

جب ہم رخصت ہونے لگے۔ تو فرمایا "کسی کی پرواہ نہ کرنا"

ملک برکت علی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ غلام رسول خاں۔ پیر تاج الدین ملک زمان مہدی اور راقم السطور ۱۴ر اپریل کی شام کو کلکتہ روانہ ہوئے۔ راجہ عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری لیگ کا الحاق نامنظور ہو جانے کے باوجود پنجاب سے بہت سے لوگ کلکتہ جا رہے تھے سہارنپور کے سٹیشن پر نواب اسمٰعیل خاں بھی ہماری گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ بھی کلکتہ جا رہے تھے۔ نواب صاحب الحاق کی درخواستوں کا فیصلہ کرنے والی سب کمیٹی کے صدر تھے۔ جب اُن سے پنجاب کے بارے میں ہماری مفصل گفتگو ہوئی۔ تو انھیں تمام حالات سُنکر سخت افسوس ہوا۔ غلام رسول خاں کے پاس الحاق کی نئی درخواست موجود تھی۔ نواب صاحب نے اُسی وقت اس پر بڑے زوردار الفاظ میں لکھدیا۔ کہ الحاق فوراً منظور ہو جانا چاہیئے۔

۱۶ر اپریل کی صبح کو ہم کلکتہ پہنچے۔ اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہوئے۔ اُسی روز دوپہر کو ایک بجے الحاق کی نئی درخواست جس پر نواب اسمٰعیل خاں کی سفارش درج تھی۔ ہم نے آل انڈیا مسلم لیگ

کے دفتر میں پہنچادی۔

۱۷ اپریل کو ساڑھے گیارہ بجے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اس لیے ۱۶ ر کی شام کو ہم نے اکٹھے بیٹھ کر مشورہ کیا۔ کہ اس اجلاس میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہماری درخواست پھر مسترد کر دی جائے گی۔ غلام رسول خاں تختہ یا تختہ کے قائل تھے۔ آخر کسی قدر سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگر درخواست منظور نہ ہو تو راقم التحریر وہیں اجلاس میں کھڑے ہو کر بحث کا آغاز کرے۔ اور اگر بحث طول کھینچ لے۔ تو ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین مدد کریں۔

۱۷ ر کو وقت مقررہ پر کونسل کا جلسہ شروع ہوا۔ پیر تاج الدین اور راقم التحریر سٹیج کے عین سامنے پہلی بنچ پر بیٹھ گئے۔ باقی چاروں اصحاب پچھلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ سر سکندر حیات تشریف نہیں لائے تھے۔ لیکن اُن کی پارٹی کے کم از کم ایک درجن ممبر ہال میں موجود تھے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پہلے گذشتہ اجلاس کی رپورٹ سنائی پھر صوبائی لیگوں کے الحاق کی درخواستوں کا معاملہ زیرِ بحث آیا۔ تو کئی ایسی لیگوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ جن کا وجود محض کاغذی تھا۔ اور جن کا کوئی آئین بھی نہیں تھا۔ صوبہ سرحد کی بھی ایک نام نہاد لیگ کا الحاق منظور کیا گیا حالانکہ خود آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے اُسی وقت تسلیم کیا۔ کہ اس لیگ کا وجود صرف کاغذی ہے۔ اور اُس کا کوئی دستور بھی تا حال وضع نہیں کیا گیا۔ لیکن جب پنجاب کی طرف سے الحاق کی نئی درخواست پیش

ہوئی۔ تو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔

میں اِس موقع کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں نے اُسی وقت کھڑے ہو کر سوال کیا کہ "ہماری درخواست کے نامنظور کئے جانے کی وجہ کیا ہے؟"

نواب زادہ صاحب نے کسی قدر تحکمانہ انداز میں فرمایا "بیٹھ جاؤ۔"

میں نے عرض کیا "میں سکول کا طالب علم نہیں ہوں۔ اور نہ آپ سکول ماسٹر ہیں۔ کہ مجھے یوں بیٹھ جانے کا حکم دیں۔"

اِس پر وہ بگڑ کر بولے: "کیا لاہور سے ہماری بے عزتی کرنے یہاں آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا "میں آپ کی بے عزتی کرنے تو نہیں آیا۔ لیکن اپنی بے عزتی کرانے بھی نہیں آیا۔"

میرے پاس الہ آباد کے بیرسٹر ظہور احمد بیٹھے تھے۔ وہ میرا کوٹ کھینچ کر کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ لیکن خلیفہ شجاع الدین پیچھے بیٹھے کہہ رہے تھے۔ نہیں بولنے دو انھیں۔

مسٹر جناح یہ سب کچھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر پوچھا "چاہتے کیا ہو؟"

میں نے عرض کیا "پنجاب مسلم لیگ کا الحاق۔"

فرمایا "تم میں سے ایک آدمی یہاں آ کر اپنا معاملہ پیش کرے۔"

چنانچہ ملک برکت علی نے پلیٹ فارم پر جا کر تقریر شروع کی۔ اُن کی

تقریر ختم ہوئی۔ تو پورا ایوان ہمارا ہم خیال اور معاون بن گیا تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے چوبیس گھنٹے کی مہلت طلب کی۔ اور فرمایا کہ سر سکندر آج شام کی گاڑی سے کلکتہ آ رہے ہیں۔ کل صبح اس بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

شام کو ہمیں پیغام ملا۔ کہ دوسرے روز صبح آٹھ بجے مسٹر اصفہانی کے مکان پر جہاں مسٹر جناح مقیم تھے۔ ہم حاضر ہوں۔ تاکہ سر سکندر کی موجودگی میں معاملات طے کئے جائیں۔ سر سکندر کے ساتھ۔ اُن کے دونوں مسلمان وزیر اور تمام پارلیمنٹری سیکرٹری اور پرائیویٹ سیکرٹری آئے تھے۔ اس کے علاوہ نواب ممدوٹ بھی اُن کے ہمرکاب تھے۔

مسٹر جناح نے فرمایا۔ کہ پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے گی۔ جسے مرتب و منظم کرنے کے لیے ایک ۳۵ آدمیوں کی آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کی جاتی ہے۔ اور اس آرگنائزنگ کمیٹی میں دونوں فریقوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو گی۔

غلام رسول خاں نے یہ پوچھنے کی کوشش کی۔ کہ ہمارے الحاق کی درخواست کا کیا حشر ہوا۔ لیکن مسٹر جناح نے جواب دیا۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ پھر انھوں نے ملک برکت علی سے کہا۔ کہ آرگنائزنگ کمیٹی کے لیے اپنے آدمیوں کی ایک فہرست تیار کریں۔ ملک صاحب نے ایک کاغذ پر اٹھارہ آدمیوں کے نام لکھ دیئے۔

یہ مجلسِ مشاورت کم و بیش دو گھنٹے جاری رہی اور بعض معاملات پر سر سکندر سے ہماری تیز و تند گفتگو بھی ہوئی۔

اسی شملہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے آرگنائزنگ کمیٹی کی مکمل اور باضابطہ فہرست ہمارے پاس بھیجی۔ تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ کہ اُس میں ہماری پارٹی کے صرف دس آدمیوں کے نام درج تھے۔ پچیس[۲۵] آدمی سر سکندر حیات کے تھے۔ غلام رسول خاں غصے سے بے تاب ہو گئے۔ لیکن میں نے اُنھیں سمجھایا۔ کہ اب چاہے ہمارا ایک بھی آدمی شامل نہ کیا جائے۔ کم از کم مجھے نہ تعجب ہو گا نہ افسوس۔

آرگنائزنگ کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ سر سکندر حیات خاں۔ صدر

۲۔ نواب ممدوٹ (نواب سر شاہنواز خاں)

۳۔ خان بہادر نواب سعادت علی خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۴۔ ملک خضر حیات خاں ٹوانہ۔ وزیر بلدیات

۵۔ میاں عبدالحیٔ۔ وزیرِ تعلیم

۶۔ خان بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ چیف پارلیمنٹری سیکرٹری۔

۷۔ سیّد افضال علی حسنی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۸۔ خان بہادر میاں مشتاق احمد گورمانی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری۔

۹۔ میر مقبول محمود۔ پارلیمنٹری سیکرٹری۔

۱۰۔ سیّد امجد علی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری۔

۱۱۔ میاں غیاث الدین ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)

۱۲۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ۔

۱۳- نواب سر محمد حیات خاں نون یونینسٹ ایم-ایل-اے
۱۴- راجہ فتح خاں یونینسٹ ایم-ایل-اے-
۱۵- خان بہادر نواب مظفر خاں یونینسٹ ایم-ایل-اے
۱۶- خان بہادر نواب فضل علی - یونینسٹ ایم-ایل-اے
۱۷- راجہ غضنفر علی خاں - پارلیمنٹری سیکرٹری
۱۸- کیپٹن سر شیر محمد خاں - ایم-ایل-اے (مرکزی اسمبلی)
۱۹- خان بہادر شیخ کرامت علی یونینسٹ ایم-ایل-اے
۲۰- چوہدری محمد یٰسین یونینسٹ ایم-ایل-اے
۲۱- شیخ صادق حسن- امرتسر
۲۲- مولانا غلام رسول مہر- ایڈیٹر روزنامہ انقلاب-
۲۳- شیخ فیض محمد- پارلیمنٹری سیکرٹری-
۲۴- خان بہادر مولوی غلام محی الدین قصوری- یونینسٹ ایم-ایل-اے-
۲۵- خان بہادر چوہدری ریاست علی- یونینسٹ ایم-ایل-اے-
۲۶- علامہ اقبال-
۲۷- ملک زمان مہدی خاں-
۲۸- خلیفہ شجاع الدین-
۲۹- غلام رسول خاں-
۳۰- ملک برکت علی-
۳۱- پیر تاج الدین-

۳۲ - مولانا مرتضٰے احمد خاں میکش - ایڈیٹر روزنامہ احسان -

۳۳ - مولانا ظفر علی خاں -

۳۴ - میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا -

۳۵ - عاشق حسین بٹالوی -

اب کلکتہ میں مزید قیام بے سود تھا - چنانچہ ۱۹ اپریل کی شام کو ہم واپس روانہ ہوئے - کلکتہ سے لاہور تک کا طویل اور صبر آزما سفر اچھی خاصی کوفت میں کٹا - غلام رسول خاں کے مزاج میں غصہ زیادہ تھا وہ راستے میں بار بار کہتے تھے - کہ اب پنجاب میں مسلم لیگ کو ختم سمجھو - کبھی کہتے - افسوس ہماری دو سال کی محنت رائیگاں گئی - کبھی کہتے ہم لاہور جا کر ڈاکٹر صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے -

ملک زمان مہدی کو بظاہر مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی - وہ کہتے تھے - کہ میں تو لاہور پہنچ کر سیدھا اپنے گاؤں چلا جاؤں گا - میری زمینداری کے بہت سے کام رکے پڑے ہیں -

خلیفہ شجاع الدین اور ملک برکت علی غالباً یہ سوچ رہے تھے - کہ ہائی کورٹ کھلنے پر انہیں کون کون سی اپیلوں میں پیش ہونا پڑے گا -

میں اس خیال سے خوش تھا - کہ چلو ہر روز کی دانتا کلکل ختم ہوئی - اب اطمینان سے بیٹھ کر کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کروں گا -

۲۱ اپریل کو صبح نو بجے ہم لاہور پہنچے - ابھی گاڑی پلیٹ فارم پر اچھی طرح رکنے بھی نہ پائی تھی کہ ہم نے اخبار فروش لڑکے کو چلاتے ہوئے سنا - وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا - کہ ڈاکٹر اقبال فوت ہو گئے -

اس خبر سے ہم پر ایک بجلی سی گر گئی۔ اور تمام ساتھی دم بخود و پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سٹیشن سے باہر آکر اپنے گھروں کو واپس جانے کی بجائے ہم سیدھے جاوید منزل گئے۔ اور اس شخص کے جسدِ خاکی کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو آخری مرتبہ روشن کیا۔ جس کے ساتھ اس کے نیاز مندوں نے علم و ادب کی نہضتِ ثانیہ اور ملک و ملت کی حیاتِ تازہ کی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ؁

ضمیمہ ۱

آل انڈیا مسلم لیگ کا مینی فسٹو

جو

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت شائع کیا گیا تھا

(اصل مینی فسٹو انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اُس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے)

جب منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان ہوا تو مسلمان لیڈروں نے محسوس کیا۔ کہ مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن کا وجود ضروری ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

لیگ نے حتمی طور پر ۱۹۱۲ء میں اپنا نصب العین اور دستور العمل وضع کیا۔ اور اپنے دستورِ اساسی میں تبدیلی کر کے مندرجہ اغراض و مقاصد کو اُس میں شامل کیا۔

ا۔ ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت کا قیام۔ جس میں مسلمانوں کے لیے ضروری اور موثر تحفظات موجود ہوں۔

ب۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی اور دیگر حقوق و مفاد کی نگہداشت کرنا۔ اور انہیں فروغ دینا۔

ج۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان اتفاق و اتحاد اور دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا۔

د۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات کو قائم رکھنا۔ اور استوار کرنا۔

میثاقِ لکھنؤ: ابتدا سے لے کر اب تک لیگ نے نہایت خلوص و صداقت سے ان بنیادی اصولوں کی پیروی کی ہے جب تک ہمارے اصلاحات نافذ رہیں۔ لیگ نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا۔ اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کا فرض ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے تعاون و اعانت بالخصوص اُس عظیم المرتبت انسان، مہاراجہ محمود آباد مرحوم کی بے لوث خدمات، پُرجوش حُبِ وطن اور عزم بالجزم نے لیگ کو ایسی قوت و توانائی اور اقتدار بخشا۔ جس سے وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اور اس نے ۱۹۱۶ء میں "کانگرس لیگ پیکٹ" جسے عرفِ عام میں میثاقِ لکھنؤ کہا جاتا ہے مرتب کیا۔ یہ میثاق ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ میں ایک بہت بڑی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سنگِ میل: ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس میثاق کو ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ میثاق ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے باہمی اشتراک و تعاون کے جذبے اُن کے فکر و عمل کی

وحدت اور جدوجہد کی یگانگت کا ایسا بیّن ثبوت ہے۔ جس سے یہ دونوں قومیں اس ملک میں ایک ذمہ دارانہ حکومت کے حصول کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن اس میثاق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے تصفیے کا حرفِ آخر سمجھ لینا صحیح نہیں۔ اور نہ اس میثاق کے بانیوں نے اس کو حرفِ آخر سمجھ کر وضع کیا تھا۔ لکھنؤ پیکٹ کے بعد ملک کو جن نئے حالات و کوائف سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اِس میثاق کو حرفِ آخر تصور نہیں کیا جا سکتا۔

قومی مطالبہ

سنہ ۱۹۲۰ء میں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ ہوا تھا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک۔ یہ قومی مطالبہ روز بروز تقویت اختیار کرتا رہا ہے۔ کہ ملک میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اس مطالبے میں مسلمان بھی پوری طرح برادرانِ وطن کے ہم نوا رہے ہیں۔ اور انھوں نے ہمیشہ محبِ وطن ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہندوؤں کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن اقلیت ہونے کی وجہ سے وہ اِس اصول کے حامی ہیں۔ کہ آئندہ جو سیاسی اور دستوری نظام یہاں رائج کیا جائے گا۔ اُس میں اُن کے حقوق کی حفاظت کے لیے ضروری تحفظات موجود ہونا چاہیئیں۔

تحفظات کی ضرورت

ممکن ہے۔ ایک نو آموز۔ اور حقائق سے بے خبر سیاست دان مسلمانوں کے اِس مطالبے کو فرقہ داری سے تعبیر کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ جو لوگ

دُنیا کی آئینی اور دستوری تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ اِس نکتہ سے یقیناً واقف ہوں گے۔ کہ ہر ملک میں قومی حکومت کی پائیداری اور استحکام کی اوّلین شرط یہ ہے۔ کہ اقلیتوں کی خیر سگالی اور اُن کا دلی تعاون حاصل کیا جائے۔ جب تک حکومت کو یہ خیر سگالی اور دلی تعاون حاصل نہیں ہوگا۔ اقلیتیں بخوشی اور بہ رضا و رغبت اکثریت پر اعتماد نہیں کر سکتیں۔

نصب العین

ملک میں وقتاً فوقتاً جو سیاسی مذاکرے، مشورے اور مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں لیگ نے ہمیشہ اس نصب العین کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ کہ ہندوستان میں جلد از جلد ایک ذمہ دارانہ حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ لیگ آج بھی پورے استقلال کے ساتھ اس نصب العین کی حامی اور مؤید ہے۔

نیا دستور

لیگ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ کہ گول میز کانفرنس کے نتیجہ کے طور پر برطانوی حکومت نے ہندوستان کے باشندوں پر وہ دستور ٹھونس دیا ہے۔ جو گورنمنٹ آف ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے وضع کیا گیا ہے۔ لیگ نے اس دستور کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اُس کی وضاحت اُس قرارداد میں کر دی گئی ہے۔ جو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۱/۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس کے الفاظ یہ ہیں:

"درحالیکہ مسلم لیگ۔ فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل اوارڈ) کو اُس وقت تک کے لیے قبول کرتی ہے۔ جب تک کہ متعلقہ فرقوں کے

درمیان اس فیصلے کا کوئی بدل منظور نہیں کیا جاتا۔ لیگ پوری شدت سے اس آئین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں باشندگانِ ہند کی مرضی کے خلاف۔ اور اس امر کے علی الرغم کہ ملک کی متفرق جماعتیں اور انجمنیں اس ایکٹ کے خلاف ناراضی کا اظہار کر چکی ہیں۔ ہندوستان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

" لیگ کا خیال ہے۔ کہ اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو اس وقت ہندوستان میں قائم ہے۔ آئین کے اُس جزو پر جس کا تعلق صوبائی نظم و نسق کے ساتھ ہے، عملدرآمد کرنا مفید ہوگا ہر چند کہ اس جزو میں بعض ایسے حد درجہ قابلِ اعتراض پہلو موجود ہیں۔ جنھوں نے وزارت اور مجلسِ قانون ساز کو حکومت اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں کے حقیقی اختیارات سے محروم کر دیا ہے

" لیگ کی یہ حتمی رائے ہے۔ کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے مرکز میں جس قسم کی رجعت پسندانہ حکومت قائم کرنے کے لیے ایک آل انڈیا فیڈریشن کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ناقص ہے۔ یہ مجوزہ فیڈریشن۔ برطانوی ہند کے مفاد کے لیے حد درجہ مہلک، نقصان دہ اور رجعت پسندانہ ہے۔ اور اس فیڈریشن کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ ہندوستان جس دیرینہ اور عزیز نصب العین یعنی مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے لیے کوشاں ہے اُس کے راستے

میں روڑے اٹکا کر اس کے حصول کو غیر معین عرصے کے لیے معرضِ التواء میں ڈال دیا جائے۔ لہٰذا لیگ اِس فیڈریشن کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔

"لیگ کی رائے میں برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ فیڈریشن کی سکیم کو نافذ کرنے سے پہلے اپنی اوّلین فرصت میں اس سکیم کے تمام پہلوؤں پر نظرِ ثانی کرے۔ ورنہ لیگ کو یقین ہے کہ یہ سکیم ملک کے باشندوں کو امن و اطمینان سے بہرہ ور نہ کر سکے گی۔ اور اگر اس کے برعکس حکومت نے اِس سکیم کو زبردستی لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ تو اِس کے نتائج بڑے خطرناک ثابت ہوں گے کیونکہ یہ سکیم ہر اعتبار سے ہندوستان اور اُس کے باشندوں کے مفاد کے لیے ناقابلِ عمل ہے۔"

صوبائی خود مختاری

لیکن از بسکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا وہ جزو جس کا تعلق صوبائی خود مختاری سے ہے، آئندہ سال کے دوران میں نافذ کیا جانے والا ہے۔ لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ اِس جزو سے جیسا کچھ بھی وہ ہے، فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

الیکشن بورڈ

اپنے اِس فیصلے کے پیشِ نظر لیگ نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کر کے ایک مرکزی الیکشن بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جسے اِس بات کا اختیار ہو گا۔ کہ مختلف صوبوں میں پراونشل بورڈ قائم کرے۔ اور اُن کا الحاق اپنے ساتھ کرے۔

"ہرگاہ کہ آئینِ جدید کے نفاذ کے ساتھ۔ اِس ملک میں جو پارلیمنٹری نظامِ حکومت رائج ہوگا۔ اُس میں ایسی پارٹیوں کا قیام ضروری فرض کر لیا گیا ہے۔ جو اِس قسم کی واضح حکمتِ عملی اور ایسے لائحہ عمل پر کاربند ہوں۔ کہ رائے دہندوں کی سیاسی تربیت کر سکیں اور اسی نوع کے عزائم و مقاصد رکھنے والی دیگر جماعتوں سے تعاون میں سہولت بہم پہنچا سکیں۔ اور آئینِ نو سے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول کا اہتمام کر سکیں۔

"ہرگاہ کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو تقویت پہنچانے اور صوبائی حکومتوں میں اُن کے لیے مناسب اور مؤثر حصّہ حاصل کرنے کے لیے یہ امر ضروری ہے۔ کہ مسلمان ایک ایسی جماعت کی صورت میں منظم ہو جائیں۔ جو ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔

"لہٰذا قرار دیا جاتا ہے۔ کہ آئندہ صوبائی انتخابات میں حصّہ لینے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ مناسب تدابیر اختیار کرے۔ نیز مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی صدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں۔ اور اس بورڈ کے ارکان کی کم از کم تعداد ۳۵ ہو۔ اور اُسے اختیار حاصل ہو۔ کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیشِ نظر مختلف صوبوں میں صوبائی الیکشن بورڈ قائم کر کے مرکزی بورڈ سے اُن کا الحاق کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب تدابیر و ذرائع اختیار کرے۔"

اِس قرارداد کی رُو سے مجوّزہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اب اِس مرکزی بورڈ کی پالیسی اور پروگرام کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

خود غرض جتھے

جب سے مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اجرا اور اُن پر عملدر آمد شروع ہُوا ہے متعدد طاقتوں نے زور پکڑ کر اُبھرنا شروع کر دیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اِن اصلاحات کے تحت جس قدر اقتدار و اختیار میسّر آسکتا تھا۔ اُس پر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دو قسم کے لوگوں نے باہمی اشتراک و تعاون سے قابو پا لیا ہے۔ ان میں سے ایک تو رجعت پسند اور قدامت پرست لوگوں کا عنصر ہے۔ اور دوسرا عنصر ایسے خود غرض افراد پر مشتمل ہے۔ جن کا تنہا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بن پڑے اور جہاں بن پڑے ہر حیلے بہانے سے اپنے لیے اعزاز و مناصب حاصل کیے جائیں۔

چونکہ یہ طرزِ عمل خود حکومت کے لیے مفید تھا۔ اس لیے حکومت نے ہمیشہ ان افراد کی سرپرستی کی۔ اور انھیں امداد و اعانت سے تقویت پہنچائی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ان خود غرض جتھوں نے نہ صرف تعلیم یافتہ۔ ترقی پسند اور آزاد خیال لوگوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلکہ عوام کو بھی بے دردی سے لوٹا۔ اس طرح رجعت پسند عناصر اور شہنشاہیت پسند طاقتوں کے امتزاج سے عوام دوہرے غلبے کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اِس غلبہ کو پاش پاش کیا جائے۔

صدر کا انتباہ

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر نے نہایت مناسب طریقے سے مندرجہ ذیل الفاظ میں موجودہ سیاسی

صورتِ حال پر تبصرہ کیا ہے۔

" آج ہمیں نئے مسائل در پیش ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں۔ کہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کو مغربی تعلیم سے آراستہ کرکے اُسے سرکاری ملازمتوں کے حصول کے قابل بنایا جائے نہ یہ سوال در پیش ہے۔ کہ تعلیم یافتہ افراد میں عہدِ وکٹوریہ کی روشن خیالی کیونکر پیدا کی جائے۔ اس کے برعکس دورِ حاضر کے واقعات ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے معاشرتی حالات میں بنیادی انقلاب پیدا کرنے کی بہترین تدابیر کیا ہیں۔ تاکہ ان لوگوں کو اس خوفناک تنگدستی افلاس اور پس ماندگی کے گڑھے سے نکالا جا سکے۔ جس میں یہ رگر چکے ہیں۔ اور اِس طرح انھیں مہذب معاشرے کے ابتدائی رموز سے آشنا کرکے آزاد ملک کے آزاد شہری بننے میں مدد دی جا سکے۔

" ہمارا فرض ہے۔ کہ حالات میں تبدیلی پیدا کریں۔ دنیا کے دیگر ممالک لیکن اپنے ہاں اِس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے احساس سے مدت ہوئی آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور اگر یہ تبدیلی جلد از جلد رونما نہ ہوئی۔ تو یقین کیجئے کہ ہمارا معاشرتی نظام۔ ایک کرم خوردہ ستون کی طرح دھم سے نیچے آگرے گا۔ اور اس کے گرتے ہی ایک ایسی تباہی آئے گی۔ جس سے صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں۔ بلکہ وہ

تمام طبقے بھی مٹ جائیں گے۔ جنہیں آج دولت، ذات پات اور جاگیرداری نے سماج میں نمایاں حیثیت عطا کر رکھی ہے۔

"جس معاشرتی نظام کے تحت ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں اُس کی بنیادیں آج سے صدیوں پیشتر رکھی گئی تھیں۔ اور آئینِ فطرت کے مطابق یہ بنیادیں آج بالکل کمزور ہو چکی ہیں۔ ہماری ذاتی غرض مندی اِس اَمر کی مقتضی ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہمارا فرض ضرور ہے۔ کہ اب ایک نئی عمارت کو نئی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے اِس فرض کی بجا آوری تمام طبقوں پر یکساں عائد ہوتی ہے جن میں تعلیم یافتہ افراد، سرمایہ دار اور زمیندار، برابر کے شریک ہیں ہماری یہ کوشش جبھی بار آور ہو سکتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ایثار اور قربانی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ ایسے معاشرتی نظام کی عمارت، کسی سلطنت کی تعمیر سے زیادہ شاندار، نہ بلحاظ باوقار اور زیادہ منصفانہ ہو گی۔"

باایں ہمہ ہمارا فرض ہے۔ کہ اِس امر کو بالکل واضح کر دیا جائے۔ کہ مسلم لیگ ہر ایسی تحریک کی مخالف ہے۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ ذاتی اور شخصی جائداد کو ضبط کر لیا جائے۔

نمائندوں کا فرض

ہم توقع کرتے ہیں۔ کہ جو لوگ مختلف مجالسِ قانون ساز میں ہمارے نمائندے بن کر جائیں گے۔ وہ

مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے۔

اوّل یہ کہ موجودہ صوبائی نظامِ حکومت اور مجوزہ مرکزی آئین کو جلد از جلد ختم کر کے اُس کی بجائے ایک جمہوری اور مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

دوم یہ کہ اِس درمیانی وقفے میں مسلم لیگ کے نمائندے اپنی اپنی مجلسِ قانون ساز میں اِس امر کی انتہائی کوشش کریں۔ کہ قومی زندگی کے جملہ شعبوں میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے موجودہ آئین سے جس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اُس سے حتی الامکان دریغ نہ کیا جائے۔

پارٹی کا جواز

جب تک ملک میں جداگانہ انتخاب کا اصول رائج ہے مجلسِ قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اس پارٹی کو اِس امر کا اختیار ہوگا۔ کہ وہ کسی ایسے فریق یا متعدد فریقوں کے ساتھ تعاون کرے۔ جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

مسلمانوں سے درخواست

لیگ مسلمانوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنی قومی یگانگت کو برقرار رکھیں۔ اور اس قومی یگانگت کو کسی اقتصادی پروگرام کے نعرے یا کسی اور قسم کے نعرے سے متاثر ہو کر کمزور نہ کریں۔

پروگرام کا خاکہ

آئندہ انتخابات کے لیے مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے جو پروگرام وضع کیا ہے۔ اُس کی چند بڑی بڑی شقیں درج ذیل ہیں:-

۱:- جہاں تک اُن اُمور کا سوال ہے- جن کا تعلق مذہب سے ہے- مسلمانوں کے تمام مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائے گی- اور اس ضمن میں جمعیت العلمأ ہند اور مجتہدوں کے مشورے کو اہمیت دی جائے گی-

۲- جابرانہ اور تشدد آمیز قوانین کو منسوخ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی-

۳- ایسے تمام احکام و اقدامات کی مخالفت کی جائے گی- جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں- اور جو اِس ملک کے باشندوں کی بنیادی آزادی کو سلب کرنے کا موجب ہیں- اور جن سے اس ملک کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا دروازہ کھلنے کا احتمال ہے-

۴- مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے گراں بار اخراجات میں کمی کی جائے گی- اور قومی ترقی کے مختلف شعبوں کے لیے معتدبہ رقوم مہیا کی جائیں گی-

۵- ہندوستان کی فوج کو قومی فوج بنایا جائے گا- اور موجودہ فوجی مصارف میں تخفیف کی جائے گی-

۶- ملکی صنعت و حرفت کو جس میں گھریلو صنعتیں بھی شامل ہیں، فروغ دیا جائے گا-

۷- ہندوستان کی اقتصادی خوش حالی کے لیے شرحِ سکہ، شرحِ مبادلہ، اور قیمتوں میں ضروری ترمیم کی جائے گی-

۸- دیہاتی آبادی کی معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاح کی جائے گی-

۹- دیہاتی آبادی کے زرعی قرضے کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی-

۱۰- ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دیا جائے گا-

۱۱۔ اُردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی۔
۱۲۔ مسلمانوں کی مجموعی حالت کو بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔
۱۳۔ ٹیکسوں کے بوجھ کو کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

ضمیمہ ۲

مسٹر جناح کی وہ تقریر۔ جو انھوں نے پنجاب اسمبلی کے
انتخابات کی مہم کا آغاز کرتے وقت ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۶ء
کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں زیر صدارت ملک
زمان مہدی خاں مرحوم کی تھی [1]

جناب صدر اور حضرات! گذشتہ چند مہینوں میں مجھے کئی مرتبہ لاہور آنے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ اس صوبے کے مسلمان سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت پس ماندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا صوبہ افسری صوبہ ہے۔ جس سے میری یہ مراد ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام شعبوں پر دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ آپ کے صوبے کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اور اُن کے پیشِ نظر۔ خود پرستی کے علاوہ اور کوئی مطمح نظر نہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ آپ کے رہنماؤں کا لائحہ عمل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہ وہ عوام الناس کی جہالت اور بے خبری کا پورا پورا فائدہ

---

[1] اصل تقریر انگریزی میں تھی۔

اٹھائیں - اور جہاں دوسرے تعلیم یافتہ اور اہل الرائے مسلمانوں سے تعاون کا مسئلہ درپیش ہو۔ وہاں خاموشی سے کنّی کاٹ کر الگ ہو جائیں -

حضرات! آپ اِس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے - کہ آپ کو چند رجعت پسند رہنماؤں کی ایک ایسی ٹولی کو زیر و زبر کرنا ہے - جس کی پشت پر ضمیر فروش پریس کا پراپیگنڈہ، حکومت کی چشمِ التفات اور لاعلم رائے دہندوں کے ووٹ ہیں -

پریس کا ایک حصّہ - ہمارے لائحہ عمل اور مطمحِ نظر کو پبلک کے سامنے ہمیشہ غلط نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے - وہ دبی زبان سے یہ امر بھی تسلیم کر لیتے ہیں - کہ اُنھیں مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں - لیکن اس کے باوجود وہ ہم پر دھڑتے سے یہ الزام لگاتے ہیں - کہ ہم مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی غرض سے فرقہ وارانہ پارٹیوں کی تشکیل کر رہے ہیں - اور اُن کا اپنا اِدعا یہ ہے - کہ وہ بذاتِ خود بڑے ہی قوم پرست اور فرقہ داری کی لعنت سے کوسوں دُور ہیں - لیکن کیا میں اِن حضرات سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں - اور کیا وہ ایمانداری سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی اِس لیے غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے - کہ اس کے ارکان کی فہرست میں دو ہندوؤں کے نام بھی ہیں - جو موقع بہ موقع اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں ؟ کیا کوئی شخص ایمان داری سے اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ "غیر فرقہ وارانہ جماعت" کی موجودگی میں بھی - ہندوؤں اور سکھوں کی علیحدہ علیحدہ پارٹیاں موجود ہیں ؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہ غیر مسلم پارٹیاں کیوں یونینسٹ پارٹی ایسی

غیر فرقہ وارانہ جماعت میں مدغم نہیں ہو چکی ؟ میں یونینسٹ پارٹی کے ارکان کو چیلنج کرتا ہوں۔ کہ وہ ایمان داری سے اُن ہندو اور سکھ ارکان کے نام شائع کریں۔ جن کی امداد اُنھیں حاصل ہے۔ تاکہ پنجاب کے لوگ اُن کی اِس تعلّی کو باور کر لیں کہ اُن کے زُمرے میں غیر مسلم ارکان کا مضبوط عنصر شامل ہے۔

حضرات! میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ اور کوئی شخص اِس چیز کا متمنی نہیں۔ کہ ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے ساتھ باہمی تعاون کی ایک ہی لڑی میں پرو دیا جا سکے۔ میں اس بات کے لیے بھی تیار ہوں۔ کہ انتخابات کی کشمکش سے پہلے ہی ہم اُن ہندوؤں اور سکھوں۔ نیز دوسری جماعتوں سے جن کے مفاد ہمارے ساتھ مشترک ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے باوجود تعاون کر سکیں۔ لیکن آپ یاد رکھیں کہ جب تک جداگانہ انتخاب کی شِق موجود ہے۔ اِن پارٹیوں کی تشکیل فرقہ دارانہ اصولوں ہی پر ہو سکتی ہے۔ اور ہمیں ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی قوم ہی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا ہوگا۔ خدارا ہمیں ایسی "غیر فرقہ دارانہ" پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ جن کے عناصر رجعت پسند ہندو اور رجعت پسند مسلمان ہوں۔ اس کے برعکس ہمیں ایسی غیر فرقہ وارانہ پارٹیوں کی ضرورت ہے۔ جو آزاد خیال، ترقی پسند اور محبِ وطن قومی خادموں پر مشتمل ہوں۔ جو وطنِ عزیز کی خدمت اور اپنے بھائیوں کی بہبود کے لیے ہر قسم کے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکیں۔

میرے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی اپنے بلند بانگ دعاوی کے باوصف۔ کس قماش کی غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے؟ آپ میں سے

کتنے لوگ ہیں جو اس پارٹی کی "غیر فرقہ دارانہ" نعتی کو ایک لمحہ کے لیے بھی باور کرنے کو تیار ہیں؟ عوام کا اعتماد حاصل کرنے اور ان کی خدمت میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے اس پارٹی نے کون سا عملی اقدام کیا ہے؟ آیئے۔ اب میں آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد سے متعارف کراؤں۔ جس کے تحت صوبوں میں پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ پارلیمنٹری بورڈ کا مطمح نظر۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ ہے کہ

نئی اصلاحات کے تحت۔ جس نوع کے پارلیمنٹری نظام کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ ملک میں ایسی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ جن کا پروگرام اور پالیسی بالکل بیّن اور واضح ہو۔ اور جو

(۱) اپنے رائے دہندوں کو سیاسی آراء و افکار سے مطلع کر سکیں۔

(۲) یک جہت اور ہم خیال پارٹیوں سے تعاون کر سکیں۔ اور

(۳) نئے آئین سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے علاوہ مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل کا محرک۔ ایک یہ جذبہ بھی تھا کہ نئے آئین کے تحت صوبائی حکومتوں سے پورے طور پر متمتع ہونے کے لیے مسلمانانِ ہند کو وحدت کی لڑی میں منسلک کیا جائے۔ اس لیے ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ لابدی تھا۔ کہ مسلمانانِ ہند ایک مرکزی جماعت سے وابستہ ہو کر اپنی تنظیم کریں۔ لہٰذا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے مجھے اس امر کا اختیار دیا ہے۔ کہ میں صوبائی انتخابات لڑنے کے لیے ایک مرکزی الیکشن

بورڈ کی تشکیل عمل میں لاؤں۔ جس کے کم سے کم ۳۵ ارکان ہوں۔ اور جو مقامی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر صوبے میں ایک پراونشل الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لانے کے مجاز ہوں گے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مجوزہ مرکزی بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء کو آپ کے شہر لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس لحاظ سے آپ کا شہر آل انڈیا مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت کا مالک رہے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کا مصداق نہیں۔ بلکہ آپ کی قوم کے بہترین دماغوں نے اس پر مدتوں غور و خوض کیا۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنا مقصود ہے۔ تو انھیں ایک ہی پرچم کے نیچے اور ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کرنا اشد ضروری ہے۔

اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نے مسلمانانِ ہند کی ایک مرکزی جماعت کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس کی شاخیں مختلف صوبوں میں مضبوط بنیادوں پر قائم کی جارہی ہیں۔ مرکزی جماعت کے بنیادی اصولوں کا صوبائی بورڈوں پر پورا تصرف ہوگا۔ اور جو ارکان لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلیوں میں داخل ہوں گے اُن کے لیے اُن مواعید کا احترام لازم ہوگا۔ جو لیگ سے پیمانِ وفا باندھنے سے اُن پر عائد ہوں گے۔ اس طرح ہم اسمبلیوں میں ایسے کھرے آدمی بھیجنے کے قابل ہو سکتے ہیں جو ذاتی اغراض سے بالا رائے دہندوں کے صحیح نمائندے اور مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے سامنے اپنے تمام افعال کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے

کہ یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن یقین کیجئے۔ کہ اگر ہم اس مہم میں کامیاب ہو گئے۔ تو صرف پنجاب ہی کے مسلمان نہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی اس سے زبردست فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

اب آپ ذرا اپنے صوبے کی کیفیت سن لیجئے۔ کیا کبھی آپ نے غور فرمایا کہ آپ کے رہنما اس تنظیم ملت المسلمین کی کڑی بننے سے کیوں گریز کرتے ہیں سچی بات اگرچہ کڑوی ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ اگر وہ لیگ کی رکنیت قبول کر لیں۔ تو اس صورت میں انھیں لیگ کی پالیسی اور پروگرام کا زہر بھرا جام جو بد قسمتی سے حکومت کی چشم التفات کی چاشنی سے معرا ہے نوش کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے سے اُن کی من مانی کارروائیوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کابینہ کی تشکیل کے قصر رفیع کا انہدام بھی ہوتا ہے۔ جس کی دیواریں قریبی رشتہ داروں اور اپنے سیاسی حلیفوں کو وزارتیں دینے پر مشتمل ہوں گی۔ اور جس کی بنیادیں گورنر کے اشارۂ چشم و ابرو کے گیچ اور گارے سے تعمیر ہوں گی۔ اس کے برعکس ہمارے پیش نظر ایسی کابینہ کی تشکیل ہے۔ جس کی قوت کا راز رائے عامہ کے احترام اور فرائض کو ایمانداری سے ادا کرنے میں پنہاں ہو گا۔

میں نے چند اخباروں میں یہ بیان جو یونینسٹ پارٹی کے چند ارکان نے دیا تھا، پڑھا ہے۔ کہ میں اُن لوگوں کو۔ جو لیگ کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوتا نہیں چاہتے۔ رجعت پسندوں، کاسہ لیسوں اور خواجہ تاشوں کے ٹولے سے

تعبیر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ نواب چھتاری اور سر محمد یوسف جب تک لیگ کے رکن رہے۔ میں نے ان کی رجعت پسندی اور ٹوڈی ازم سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ لیکن جونہی انھوں نے لیگ کی غلامی کا جوا گلے سے اتار پھینکا۔ میں نے فوراً ان کے گلے میں رجعت پسندی اور کاسہ لیسی کا پٹہ ڈال دیا۔

حضرات! میں اس الزام کی صحت سے انکار کرتا ہوں۔ اور اس قسم کے لغو اور لچر بیانات کو درخور اعتنا قرار نہیں دیتا۔ میں رجعت پسند عناصر کے خلاف نہیں۔ اور نہ ان لوگوں سے کوئی خاص پرخاش رکھتا ہوں۔ جن کی کتاب زندگی کا عنوان رجعت قہقہری اور کاسہ لیسی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں نے نواب چھتاری کا، جنھوں نے اپنی مرضی سے بعد میں استعفٰے دیا، بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ میں آج پھر سر سکندر حیات خاں کو بورڈ کے حلقہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس صورت میں وہ پارٹی کی اجازت کے بغیر من مانی وزارتوں کے ڈھکوسلے کھڑے کرنے کے قائل نہ رہیں گے۔ اور انھیں مرکزی بورڈ کے اصولوں کا احترام کرنا ہوگا۔

میں بہانگ دہل کہتا ہوں کہ میں اس مجوزہ وزارت کے خوشگوار خوابوں کو درہم برہم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی بنیاد آج ہی سے یعنی انتخابات کی کامیابی اور رائے دہندگان کی متفقہ آواز سے قبل ہی رکھ لی گئی ہے۔ میں ہندو اور سکھ حضرات کو بھی اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو انھیں اپنے ان ارکان سے لاحق ہے۔ جو یونینسٹ پارٹی کے اغراض مشئومہ کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر

اور اپنی قوم کی نمائندگی کو بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔

میں اس حقیقت کو پھر ایک بار آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے پیشِ نظر ایسی مسلم حکومت کا قیام نہیں۔ جو ہندوؤں اور سکھوں کو کچل دینا چاہتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے۔ کہ دُنیا کی کوئی حکومت جس کی بنیاد ظلم اور ناانصافی پر رکھی گئی ہو۔ ہرگز ہرگز پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اگر آئندہ پنجاب کی حکومت میں مسلمانوں کو ایک کثیر اور فیصلہ کُن عنصر کی حیثیت حاصل ہونے والی ہے تو یقین کیجئے۔ کہ یہ عنصر ہمیشہ حق و انصاف اور مُروّت و شفقت کے اصولوں پر عمل پیرا رہے گا۔ مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان حق و صداقت کے راستے سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں بھٹکنے پائیں گے پنجاب کے بہادر مسلمانوں کا خطاب ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن ہے اور وہ بلاشبہ مسلمانانِ ہند کا دایاں بازو کہلانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے ہر معرکے میں ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر جدّ و جہد میں شرکت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انھیں روایات کے پابند رہیں گے۔ اور آج جبکہ ہمیں ایک نیا معرکہ درپیش ہے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک لمحے کے لیے بھی مایوس نہیں کریں گے۔

خدارا اِس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے۔ کہ ابھی ایسے بہت سے مرحلے باقی ہیں۔ جن کی اہمیت ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے یکساں ہوگی۔ اسلامیانِ ہند کا بدن ابھی بہت سے ناسوروں سے رِس رہا ہے اور اُن کے اِندمال کے لیے ہر صوبے کے مسلمانوں کو حتی المقدور مرہم کا سامان بہم پہنچانا ہوگا۔ مجھے بنگیے

کہ آل انڈیا اہمیت کے مسائل جن سے مسلمانوں کی قومی و سیاسی بقاوابستہ ہے آپ ایک مرکزی جماعت کی مدد کے بغیر کس طرح نپٹا سکتے ہیں؟ کیا اسلام کا جمہوری نظام آپ کو اس امر کی دعوت نہیں دے رہا۔ کہ مسلمانانِ ہند کی ایک مرکزی نمائندہ جماعت ہو جس کی صدا ہندوستان کے مسلمانوں کی متفقہ آواز کہی جا سکے؟

حضرات! ہمارے پیشِ نظر اس قسم کی ایک نمائندہ جماعت کا بلند تصور ہے جو آزاد خیال۔ ترقی پسند اور ایثار پیشہ افراد پر مشتمل ہو۔ اور جو آزادیٔ وطن کی مساعی میں ہمسایہ اقوام کا ہاتھ بٹا سکے۔ تاکہ ہندوستان کے ماتھے پر غلامی کا جو سیاہ ٹیکہ لگا ہوا ہے وہ دُھل جائے۔

میں ہندوؤں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ اُنھیں بھی اپنی جماعتوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ تاکہ اُن کی جماعتوں کے خود غرض اور خود ساختہ رہنماؤں کا وجودِ نامسعود باقی نہ رہے۔ اور وہ سچے اور دلی جوش سے مسلمانوں سے تعاون کر سکیں۔ اس صورت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جو نمائندے صوبائی اسمبلیوں میں جائیں گے وہ خلوصِ قلب اور پوری ایمانداری سے ایک ایسے معاہدے پر پہنچنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جو ہندوستان کی تمام قوموں کو متفق کر دے اور اس طرح آئے دن کی باہمی سر پھٹول اور ہندو مسلم جھگڑوں کے مناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میں سر سکندر حیات خاں سے پوچھتا ہوں۔ کہ اگر وہ اہلِ پنجاب کی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر خدمت کرنے کے لیے اس قدر ہی بے تاب تھے۔ تو آج سے پہلے کہاں تھے؟ کیا اُنھوں نے ریزرو بینک کی ملازمت اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے قبول کی تھی؟ اس بلند مقصد کے لیے انھوں نے اِس سے پہلے کیوں استعفا

نہ دبا؟ میں پوچھتا ہوں کہ نواب مظفر خاں کی جگہ سر سکندر حیات کو قلمدانِ وزارت سنبھالنے کی کیوں ضرورت لاحق ہوئی؟

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اِن تمام سوالوں کا جواب صرف اس قدر ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے خودغرض ارکان جن کے سامنے سوائے جاہ و منصب کے حصول کے اور کوئی مقصد نہیں، وزارت کی پری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور حیرت ہے۔ کہ اِس جاہ پرست ٹولے کو حکومتِ پنجاب کی کھلے بندوں امداد حاصل ہے۔

میں اِس ضمن میں ہز ایکسیلینسی گورنر پنجاب کی خدمت میں بھی، جو یہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں رہتے، اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کہ وہ اور اُن کی حکومت پنجاب کے لوگوں پر اس امر کو واضح کرنے میں تساہل سے کام نہ لیں۔ کہ جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے۔ حکومت مکمل طور پر غیر جانبدار رہے گی۔ اور انہیں اُس عہد کا پورا پورا پاس ہے۔ جو مرکزی حکومت نے ابھی چند ہی روز ہوئے اسمبلی کے ارکان کو دیا تھا۔

حضرات! سب سے آخر میں میں آپ سے پُرزور درخواست کرتا ہوں کہ اپنے ووٹوں کی قدر و قیمت پہچانیئے۔ اور اس بات کو یاد رکھیئے۔ کہ آپ کے ووٹوں کی دوہری قیمت ہے۔ پہلے تو آپ کے ووٹوں سے صوبائی اسمبلیوں کے ارکان منتخب ہوں گے۔ پھر آپ کے منتخب کردہ نمائندوں کے ووٹوں سے فیڈرل اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عمل آئے گا۔

اس لیے میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں۔ کہ سچے مسلمان کی حیثیت سے

آپ کا فرض ہے کہ ذاتوں۔ برادریوں اور قرابت داریوں کے پست تصور سے بلند رہ کر صرف اُن لوگوں کو ووٹ دیجئے۔ جو ایک واضح، بیّن اور روزِ روشن کی طرح نمایاں پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا حلف اُٹھا چکے ہیں۔ اس کے بعد میں آپ سے درخواست کروں گا۔ کہ اگر آپ مسلمانوں کو باہمی تنظیم کی لڑی میں منسلک دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ تو مسلم لیگ کی رُکنیت قبول کیجئے۔ اور صرف اُن اُمیدواروں کو ووٹ دیجئے جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جو اسمبلی کے اندر۔ اپنے اعمال کے لیے مرکزی جماعت کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ باقی جس قدر اُمیدوار ہیں وہ بھیڑوں کے اُس گلّے کی مانند ہیں جس کا کوئی نگہبان اور رکھوالا نہ ہو۔ یہ لوگ اپنے اعمال و افعال کے لیے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ اور اُن کے رو برو جلبِ منفعت اور ہوسِ جاہ کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں۔

میری آخری اور پُر زور درخواست یہ ہے کہ آپ مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ہر ممکن مدد کریں۔ کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی سب سے پرانی، سب سے بڑی اور سب سے خدمت گذار جماعت ہے ؛

ضمیمہ ۳

سکندر جناح پیکٹ کے متعلق پروفیسر گلشن رائے کا بیان
مطبوعہ سول اینڈ ملٹری گزٹ - لاہور
مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء

سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ایک اول درجے کا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ یونینسٹ پارٹی نے سر سکندر حیات خاں کے زیر قیادت گذشتہ انتخابات میں مسلم لیگ کا مقابلہ کیا تھا۔ جب اپریل ۱۹۳۶ء میں۔ سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی کی نئے سرے سے تشکیل کی تھی۔ تو یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ اس پارٹی کا پروگرام۔ عوام کی اقتصادی اصلاح پر مبنی ہے ایسی اعلان کی رُو سے پارٹی نے ایک پروگرام کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا جو سراسر غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر مرتب کیا گیا تھا۔ اور جس کا تقاضا تھا کہ تمام فرقہ وارانہ معاملات کو پسِ پُشت ڈال دیا جائے۔

سر فضلِ حسین مرحوم نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ جدید اصلاحات نے ماحول کو بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ اور اس تبدیل شدہ ماحول میں اگر خالص فرقہ وارانہ

پالیسی پر عمل کیا گیا تو گورنر کو آئے دن مداخلت کا موقع ملتا رہے گا۔ اور اِس طرح گویا صوبائی خود مختاری ایک سراسر مذاق بن کر رہ جائے گی۔ سر فضلِ حسین مرحوم کی خواہش تھی۔ کہ وہ خود پنجاب پر حکومت کریں۔ اور یہ جبھی ممکن تھا کہ انھیں صوبے کے تمام فرقوں کی تائید و حمایت حاصل ہو۔ تاکہ وہ ایک متحدہ محاذ بنا کر گورنر کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت سر فضلِ حسین کی پشت پر تھی۔ زراعت پیشہ ہندوؤں کی حمایت بھی انھیں حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں سکھوں کے ایک طبقے کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

سر فضلِ حسین اور مسٹر جناح کا جھگڑا۔

شہری ہندو سر فضلِ حسین کے مخالف تھے۔ لیکن اس کے باوجود مرحوم اِس کوشش میں مصروف تھے۔ کہ کسی طرح راجہ نرندر ناتھ اور اُن کے شہری رفقاء کو اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔ مرحوم کو یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں میں سے احرار اور سکھوں میں سے اکالی۔ اُن کے خلاف ہیں۔ باایں ہمہ اُنھیں امید تھی کہ وہ نیز اکالی سکھوں اور شہری ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اِس مقصد کے لیے وہ یہاں تک آمادہ تھے۔ کہ فرقہ وارانہ پروگرام کو نظر انداز کر کے صرف اقتصادی پروگرام کو اپنا مطمحِ نظر بنایا جائے۔ اِدھر مسٹر جناح کا اصرار تھا۔ کہ مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے انتخابات کی جنگ لڑی جائے۔ لیکن سر فضلِ حسین نے یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اِس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر اُنھوں نے مسلم لیگ سے، جو ہندو سبھا

کی طرح ایک خالص فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ قطعاً کیا نوشہری ہندو اور سکھ اُن کے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ اس کے علاوہ بہت ممکن تھا کہ زراعت پیشہ ہندو بھی اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ اندریں حالات انھوں نے کسی قدر درشت لہجہ اختیار کر کے۔ مسٹر جناح سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ وہ پنجاب سے تشریف لے جائیں۔ اِس مقصد کو بر روئے کار لانے کے لیے کہ تمام فرقوں پر مشتمل ایک اکثریت رکھنے والی غیر فرقہ وارانہ پارٹی قائم کرنی چاہیئے۔ انھوں نے مسٹر جناح کی ناراضی مول لینے سے بھی دریغ نہ کیا۔

وزارتی پارٹی کی مضبوط پوزیشن

اگرچہ اس واقعہ کے چند ماہ بعد سر فضلِ حسین کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اُن کے پیروؤں نے گذشتہ انتخابات میں اُن کی پالیسی پر پوری طرح عمل کیا۔ اور مسلم لیگی اُمیدواروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے صرف دو اُمیدوار کامیاب ہو سکے۔ جن میں سے ایک تو انتخابات کے نتیجہ کا اعلان ہوتے ہی یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس وقت پنجاب اسمبلی میں تنہا ملک برکت علی۔ مسلم لیگ کی نمائندگی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال یہ ہے۔ کہ یونینسٹ پارٹی میں بیاسی [۸۲] مسلمان اور سات ہندو ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ سات اچھوت۔ سات شہری ہندو۔ چھ انڈی پنڈنٹ ہندو۔ سترہ سکھ اور چار مسیحی۔ اینگلو انڈین اور یورپین ممبر شامل ہیں۔ اس طرح گویا مشترکہ وزارتی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۳۲۔ اور

حزبِ مخالف کے ارکان کی تعداد ۳۴ ہے۔ موجودہ وزارت کی پشت پر مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کے علاوہ ہندو اور سکھ ممبروں کی اکثریت بھی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ کہ اس وقت یونینسٹ پارٹی کی پوزیشن بے حد مضبوط ہے اور اس مضبوط پوزیشن ہی کا نتیجہ ہے کہ گورنر، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی آڑ لے کر، وزارت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ وزراء اپنی صوابدید کے مطابق اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے مجاز ہیں اور اس طرح ہم پنجاب میں حقیقی صوبائی خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک غیر کانگرسی حکومت بھی خود مختاری سے متمتع ہو سکتی ہے۔

جدید پیکٹ کا اثر

یونینسٹ پارٹی کو اس وقت جو اطمینان بخش پوزیشن حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سکھوں اور شہری ہندوؤں کی اکثریت اِس پارٹی کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ نظر بظاہر ایک غیر جانبدار شخص کو بھی توقع رکھنا چاہیئے۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات خاں اپنی پارٹی کے استحکام کی خاطر سے اور گورنر کی مداخلت کے امکان کو کم سے کم کرنے کے لیے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ جس سے اُن کے غیر مسلم شرکاء بدک کر اُن سے علیحدہ ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موصوف نے مسٹر جناح سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی رُو سے وہ پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو مشورہ دیں گے۔ کہ وہ مسلم لیگ کے قرطاسِ رکنیت پر دستخط کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔ سر سکندر نے اس بات کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ کہ پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی یا بالفاظِ دیگر موجودہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر آل انڈیا مسلم لیگ

کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے تحت کام کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کا قبضہ ہو جائے گا۔

لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ موجودہ معاہدے کی شرائط کی رو سے پنجاب پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو اپنے دائرہ عمل میں ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو گی۔ لیکن با ایں ہمہ اس امر سے بھی انکار محال ہے۔ کہ یہ پراونشل بورڈ بہت بڑی حد تک مرکزی بورڈ کے تابع فرمان ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ آئندہ اس مرکزی بورڈ کا آئین کس قسم کا ہوگا؟۔ کیا موجودہ بورڈ کی طرح آئندہ بھی لیگ کا صدر ہی۔ اس بورڈ کے ممبروں کو نامزد کیا کرے گا۔ یا ان ممبروں کا انتخاب آل انڈیا مسلم لیگ کی مجموعی رائے سے ہوگا؟ ہمیں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کہ مستقبل میں جو نظام رائج کیا جانے والا ہے۔ اس میں آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کی تمام صوبائی لیگوں کے ایک مرکزی نمائندہ ادارے کی صورت اختیار کرے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مجوزہ آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل میں ہندوستان کے ہر صوبے کے ممبروں کا انتخاب کس اصول کے مطابق کیا جائے گا۔ کیا ہر چھوٹا بڑا صوبہ مساوی تعداد میں ممبر بھیج سکے گا۔ یا ہر صوبے کی مسلم آبادی کے تناسب سے ممبروں کی تعداد مقرر ہوگی۔ یا یہ اصول مدنظر رکھا جائے گا۔ کہ جس صوبے میں مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد زیادہ ہے وہ صوبہ زیادہ نمائندے بھیجنے کا مجاز ہوگا۔ اور جہاں ممبروں کی تعداد کم ہے وہ قطع نظر مسلم آبادی

کے تناسب کے نمائندے بھی کم تعداد میں بھیج سکے گا ؟

یہ تمام سوالات بے حد اہم اور غور طلب ہیں

فرقہ وارانہ قراردادیں

بہر حال کچھ بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ میں پنجاب کے مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا پنجاب کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ اُن قراردادوں کو اپنے صوبے میں عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ جن کو مرکزی لیگ نے منظور کیا ہے؟ کیا پنجاب کے مسلمان اُن قراردادوں کو جامۂ عمل پہناتے وقت اپنے غیر مسلم رفیقوں کا تعاون حاصل کر سکیں گے؟ میں ایک مثال دے کر اپنے نقطۂ نگاہ کو واضح کرتا ہوں۔ امسال آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ میں ایک قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ "برطانوی حکومت کو چاہیئے کہ مسجد شہید گنج کو از سرِ نو تعمیر کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ ورنہ مسلمانانِ ہند اور برطانوی حکومت کے درمیان تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔"

میں پوچھتا ہوں۔ کہ مسلم لیگ کی اِس قرارداد پر برطانوی حکومت کیونکر عمل کر سکتی ہے؟ کیا سر سکندر حیات خاں۔ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور اُن کی خالصہ نیشنل پارٹی کے سکھ ممبروں کو اپنے ساتھ ملا سکیں گے؟ اگر سر سکندر اور پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی (یعنی یونینسٹ پارٹی کا مسلمان عنصر) نے اِس قرارداد پر عمل نہ کیا۔ تو کیا اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمنٹری بورڈ اُن کے خلاف ضابطے کی کارروائی کرنے پر مجبور نہیں ہو گا۔؟ میں نے یہ محض ایک مثال پیش کی ہے۔ ورنہ اس بات کا قوی اِمکان

ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم لیگ۔ اِس نوع کی متعدد قراردادیں منظور کرے گی۔ جن سے پنجاب کے ہندو اور سکھ متفق نہیں ہوں گے؟

مذہبی امور میں اٹانومی عملی نقطۂ نگاہ سے اگر غور کیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کی یونینسٹ پارٹی کے مسلم لیگی ممبر صرف وہی کام کر سکیں گے۔ جن کے لیے اُن کو پارٹی کے غیر مسلم گروہوں کا تعاون حاصل ہوگا۔ اندریں حالات اگر آل انڈیا مسلم لیگ یہ چاہتی ہے کہ موجودہ یونینسٹ پارٹی، جس کا جزوِ اعظم مسلمانوں پر مشتمل ہے، پنجاب پر حکومت کرے تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے۔ کہ مذہبی معاملات میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو مکمل اٹانومی عطا کر دی جائے۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک مرکزی جماعت کی حیثیت سے صرف اس لیے منظم کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی امور کی نگہداشت کی جائے۔

مسلم لیگ کے ممبر ہرگز توقع نہیں کر سکتے۔ کہ اُنھیں پنجاب یا بنگال کی مجلسِ قانون ساز میں کبھی قطعی اکثریت بھی حاصل ہوگی۔ مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی عنصر ہمیشہ مسلم لیگ کا مخالف رہے گا۔ صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ۔ پارٹی کو اگر اتنی بات میں کامیابی ہو بھی گئی۔ تو بھی صوبے پر حکومت کرنے کے لیے اُسے غیر مسلموں کا دلی تعاون حاصل کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ اور اس تعاون کی اُسے خاص قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ وہ قیمت یہ ہے۔ کہ مسلم لیگ پارٹی کو وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ ایک سراسر غیر فرقہ دارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہوگی۔

اُلجھنیں:۔ غیر فرقہ دارانہ پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ

آل انڈیا مسلم لیگ کا اپنی صوبائی شاخوں پر کوئی ضابطہ اور اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اگر ایک آل انڈیا جماعت اپنی صوبائی شاخوں پر ضابطہ اور اختیار قائم نہیں رکھ سکتی۔ تو پھر ایسی آل انڈیا جماعت کا فائدہ ہی کیا ہے؟ بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ ان صوبوں کی مجالسِ قانون ساز میں لیگ کو قطعی اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ تو بھی مسلم لیگ اقلیتوں کی مرضی کے بغیر یا اُن کے علی الرغم۔ کسی فرقہ وارانہ پالیسی کو نافذ کرنے کے قابل نہیں ہو گی۔ اور اگر اُس نے ایسا کیا تو گورنر اپنے اختیاراتِ خصوصی کے استعمال پر مجبور ہو گا۔ اور اس طرح صوبائی خود مختاری کے اندر جگہ جگہ دراڑیں پڑ جائیں گی۔

جدید آئین کی رُو سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اقلیتوں کی رضامندی اور گورنر کے تعاون کے بغیر کسی نوع کی فرقہ وارانہ پالیسی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اندریں حالات۔ بہترین طریق کار یہ ہے۔ کہ ایک غیر فرقہ وارانہ پالیسی وضع کی جائے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ پارلیمنٹری امور کی انجام دہی کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ جماعتوں کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبروں پر اثر

اب ایک اور نقطۂ نگاہ سے غور فرمائیے۔ سر سکندر کو پنجاب اسمبلی میں بہت بڑی اکثریت کی امداد حاصل ہے۔ کیونکہ سر چھوٹو رام۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور راجہ نریندر ناتھ کے گروہ اُن کی پشت پر ہیں۔ ہمارے مسلمان دوست بار بار یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے۔ کہ ہندوؤں کو چاہیے کہ ہندو سبھا سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اب کہ سر سکندر حیات خاں اور اُن کی پارٹی کے مسلم ارکان

لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کو ہندو سبھا میں شریک ہونے سے یہ ہمارے دوست کیونکر منع کر سکتے ہیں؟ کیا سکندر جناح پیکٹ نے جس کی رُو سے یونینسٹ مسلمانوں کو لیگ میں شامل ہونا پڑے گا، سر چھوٹو رام اور یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبروں کی پوزیشن کو بہت بڑی حد تک کمزور نہیں کر دیا؟ آئندہ صورتِ حال یہ ہوگی۔ کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر ایک بیرونی جماعت کے احکام کی پابندی کرنے پر مجبور ہوں گے۔ سر چھوٹو رام اگر چاہیں گے بھی۔ تو یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کو اپنا نقطۂ نگاہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکیں گے۔ تاوقتیکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کی ہدایات صادر نہ ہوں۔ اندریں حالات خود اپنی پارٹی میں سر چھوٹو رام اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشن اس قدر کمزور ہو جائے گی۔ کہ انہیں امداد و اعانت کے لیے لامحالہ یونینسٹ پارٹی سے باہر کسی اور جانب دیکھنا پڑے گا۔

یونینسٹ پارٹی

جب اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سکندر جناح پیکٹ مرتب ہوا تو اُس کے بعد یہ سوال بہ شدت اور تواتر سے بار بار سامنے آنا شروع ہوا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کی اصل حیثیت کیا ہے۔ کیا یہ ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی ہے یا صرف اُس کولیشن کا نام ہے جو پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے چودھری چھوٹو رام کے زراعت پیشہ جاٹ گروپ کے ساتھ مل کر قائم کی ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے دو تمہیدی بلکہ بنیادی باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ سر سکندر حیات خاں نے اپنے یوم وفات تک اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی قائم نہیں کی تھی۔ اگرچہ اُن کے بعض حامی جن میں میر نور احمد صاحب پیش پیش ہیں۔ آج بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ

پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود تھی۔ اور یونینسٹ پارٹی صرف اُس کولیشن کا نام تھا جو مذکورہ بالا مسلم لیگ پارٹی اور چودھری چھوٹو رام کے گروپ کے اشتراک سے رُونما ہوئی تھی۔

اگر اِس روایت کو درست اور اس تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سر سکندر حیات خاں کے انتقال کے بعد، مارچ ۱۹۴۴ء میں قائد اعظم نے لاہور آ کر کیوں ملک خضر حیات ٹوانہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کر دو؟

میری گذارش یہ ہے کہ سر سکندر نے اپنی زندگی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی قائم نہیں کی تھی۔ اور اُن کی اِس کوتاہی کا خمیازہ اُن کے جانشین کو بھگتنا پڑا۔ جب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود ہی نہیں تھا تو کولیشن کیوں کر ظہور میں آسکتی تھی؟ کولیشن صرف پارلیمنٹ کی دو یا دو سے زیادہ پارٹیوں سے مل کر بنتی ہے۔ پارلیمنٹ سے باہر کولیشن ایک مستقل اور جداگانہ پارٹی کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اگر پارلیمنٹ ٹوٹ جائے تو کولیشن بھی ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ پارٹیاں جن پر کولیشن مشتمل ہو پارلیمنٹ کے باہر بھی اپنا اپنا جداگانہ وجود برقرار رکھتی ہیں۔ مثلاً گذشتہ جنگِ عظیم میں برطانیہ کی ٹوری پارٹی اور لیبر پارٹی نے مل کر ایک کولیشن وزارت بنائی تھی۔ لیکن اس کولیشن کا وجود صرف پارلیمنٹ کے اندر تھا۔ جنگ کے بعد جب پارلیمنٹ ٹوٹ گئی تو کولیشن بھی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن ٹوری پارٹی اور لیبر پارٹی دونوں اپنی اپنی جگہ بدستور قائم رہیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے اگر یونینیسٹ پارٹی کے آئین اور دستور پر ایک نظر ڈالی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ جماعت ایک مستقل اور قائم بالذات سیاسی پارٹی تھی۔ جس کا دائرہ عمل اسمبلی کی چار دیواری تک محدود نہ تھا بلکہ کانگرس اور مسلم لیگ کی طرح اسمبلی سے باہر بھی اُس کا وجود کارفرما تھا۔ اور کانگرس اور لیگ کی طرح اُس کی ممبری کا دروازہ بھی ہر شخص کے لیے کھُلا تھا۔

آئندہ چند صفحات میں یونینیسٹ پارٹی کا آئین اور اُس کے قواعد و ضوابط درج کیے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ یہ پارٹی ایک مستقل اور جداگانہ پارٹی تھی جو اپنے اصول اور طریق کار کے لحاظ سے ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی۔ اور مسلم لیگ کی حریف تھی اور جس کے دروازے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، اچھوتوں اور مسیحیوں پر یکساں کھُلے تھے۔

پنجاب یونینسٹ پارٹی کے قواعد و ضوابط

پہلا باب

تمہید

نام عقیدہ اور اغراض و مقاصد

۱۔ (الف) اس پارٹی کا نام پنجاب یونینسٹ پارٹی یا اتحاد پارٹی ہوگا۔
۲۔ (ب) پارٹی کا عقیدہ اور اغراض و مقاصد جدول الف میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

فرائض

۲۔ پارٹی وقتاً فوقتاً ایسا نظام قائم کرے گی۔ اور ایسے طریقے استعمال میں لائے گی جنھیں وہ اپنے مقاصد کو ترقی دینے اور اپنے پروگرام کو جو پارٹی کے عقیدہ کا تابع ہوگا چلانے کے لیے ضروری خیال کرے۔ اگر اس قسم کا کوئی شبہ پیدا ہو، یا کوئی نزاع اٹھ کھڑا ہو۔ کہ آیا فلاں مسئلہ پارٹی کے پروگرام، اغراض و مقاصد یا عقیدہ کے دائرہ میں آتا ہے۔ یا نہیں، تو مرکز سے رجوع کیا جائے گا اور وہی

اس نزاع کا فیصلہ کرے گا۔

پارٹی کا نظام

۳ - (الف) پارٹی کے نظام میں حسب ذیل ادارے شامل ہوں گے:-

۱ - لاہور میں صوبائی مرکز جسے مرکز کے نام سے پکارا جائے گا۔

۲ - ہر تحصیل میں ایک شاخ جس کے ماتحت مفصلہ ذیل ادارے ہوں گے، جو اس کے دائرہ اختیار میں سمجھے جائیں گے۔

(الف) ساڑھے سات ہزار سے تیس ہزار تک آبادی رکھنے والے ہر قصبہ اور شہر اور ہر ذیل میں شاخہائے ماتحت۔

(ب) پانچ سو سے ساڑھے سات ہزار تک آبادی رکھنے والے ہر گاؤں یا قصبہ میں حتی المقدور شاخہائے مقامی۔

۳ - ہر شہر میں جس کی آبادی تیس ہزار یا اس سے زیادہ ہو ایک شاخ ہوگی۔ جس کے ماتحت ہر میونسپل وارڈ میں وارڈ کمیٹی۔ اور حتی الامکان ہر محلہ۔ کوچہ یا آبادی میں شاخہائے ماتحت۔

(ب) مرکز کی منظوری کے ساتھ جہاں ضروری معلوم ہوگا۔ ایک یا ایک سے زیادہ تحصیل کی شاخ یا دوسری شاخوں کے درمیان اشتراک پیدا کرنے یا ایک ضلع کی شاخ یا کوئی اور مقامی نظام قائم کرنے کے لیے جس سے کام خوش اسلوبی اور کفایت شعاری سے چل سکے، مقامی حالات کے مطابق انتظامات کئے جائیں گے۔

(ج) باستثنائے اُن امور کے جو اِن قواعد و ضوابط کی رُو سے اُن کے دائرہ عمل میں نہیں آتے۔ مرکز کی ہدایت اور نگرانی کے مطابق مختلف مقامی شاخیں۔ شاخہائے ماتحت۔ تحصیل اور شہر کی شاخیں اپنے اپنے حلقہ میں پارٹی کی جملہ سرگرمیوں کی ذمہ دار ہوں گی۔

رکنیت

۴۔ (الف) اس پارٹی کی رکنیت کا دروازہ ہر شخص پر کھلا ہے۔ جس کی عمر ۱۲ سال سے زیادہ ہو۔ اور پارٹی کا عقیدہ اختیار کر کے رکنیت کی اُن ذمہ داریوں کو قبول کرے۔ جن کا ذکر شق ب میں کر دیا گیا ہے۔ اُسے مرکز کی مجلس انتظامیہ کی اکثریت یا شاخ یا شاخ ماتحت یا مقامی شاخ متعلقہ کی اکثریت کے فیصلے سے رکن بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اُن خاص شرائط کو جو ازروئے دفعات ذیل مرکز اور مختلف شاخوں کی رکنیت کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں، پورا کر سکے۔

(ب) پارٹی کے ارکان کی ذمہ داریاں حسب ذیل ہوں گی

۱۔ پارٹی کے عقیدہ اور اغراض و مقاصد کو ترقی دینا اور اس کے پروگرام کو جامہ عمل پہنانا۔

۲۔ پارٹی انفرادی طور پر ارکان یا گاؤں۔ قصبہ۔ شہر اور صوبہ کی ترقی کے لیے جو تحریک کرے اس میں حتی المقدور عملی طور پر دلچسپی لینا۔

۳۔ مختلف گروہوں کے مابین صلح و آشتی اور یک جہتی کے جذبات کو

ترقی دینا۔

۴۔ حتی المقدور پارٹی کے مختلف جلسوں میں جن میں اُسے مدعو کیا جائے شریک ہونا۔

۵۔ اگر اُسے ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، تو پارٹی کے نامزد کیے ہوئے رُکن کے حق میں (اگر کوئی ایسا رُکن ہو) ووٹ دینا۔

۶۔ حسب شرح ذیل سالانہ چندہ ادا کرنا۔

(الف) جو لوگ دس روپیہ یا اس سے زیادہ مالگذاری ادا کرتے ہیں۔ اُن کے لیے مالگذاری پر دو پیسہ فی روپیہ چندہ (آبیانہ مقامی ٹیکس اور مقامی محصولات اس سے مستثنیٰ ہوں گے)۔

(ب) حیثیت ٹیکس یا انکم ٹیکس ادا کرنے والوں کے لیے ایک آنہ فی روپیہ۔

(ج) جن لوگوں پر شق الف یا شق ب منطبق نہیں ہوتی اور جو ایسے شہر اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ جن کی آبادی ساڑھے سات ہزار سے زیادہ ہے۔ اُنھیں چار آنہ سالانہ چندہ ادا کرنا ہوگا۔

اس قاعدہ میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ مختلف شاخیں اپنے اپنے حلقہ میں چندہ کی شرح یا چندہ مقرر کرنے کے اصول میں تبدیلی کر سکتی ہیں۔ وہ کسی شخص یا اشخاص کے گروہ یا رقبہ کو معیّن عرصہ کے لیے جسے وہ مناسب خیال کریں۔ کلاً یا جزواً مستثنیٰ بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن اُن کا یہ فعل مرکز کی منظوری کے تابع ہوگا۔

تشریح

اس دفعہ کے ماتحت شاخہائے متعلقہ کو اختیار ہو گا کہ وہ فصل کے موقع پر یا خاص خاص تقریبات مثلاً بیاہ شادیوں، عید، بیساکھی وغیرہ بہ جنس یا نقد کی صورت میں چندہ وصول کر سکیں ؛

دوسرا باب

شاخہائے مقامی

(پانچ سو سے ساڑھے سات ہزار تک آبادی رکھنے والے گاؤں اور قصبوں کے لیے)

رُکنیت

۵ - متذکرہ بالا قاعدہ نمبر ۴ کے مطابق ہر شخص جو متعلقہ گاؤں یا قصبہ میں رہتا ہے۔ یا جائداد رکھتا ہے۔ مقامی شاخ کا رُکن بن سکتا ہے۔

فرائض

۶ - مقامی شاخ حسب ذیل کام کی ذمہ دار ہو گی :

(الف) پارٹی کے عقیدہ اور اغراض و مقاصد کو اپنے مقامی حلقہ میں پھیلانا، مقبول عام بنانا اور اُس کے پروگرام کو چلانا۔

(ب) لوگوں کو پارٹی کا رُکن بنانا اور چندہ فراہم کرنا۔

(ج) اپنے حلقہ میں یک جہتی اور صلح اور آشتی کے جذبات کو ترقی دینا اور اس مقصد کے لیے ملحقہ رقبہ کی دوسری شاخوں سے تعاون کرنا۔

(د) ذیل کی شاخ ماتحت یا تحصیل کی شاخ کو جن اعداد و شمار اور اطلاعات کی ضرورت ہو، وہ پوری صحت کے ساتھ اور فوراً فراہم کرنا۔ اور پارٹی کے پروگرام کے متعلق ذیل کی شاخ ماتحت یا تحصیل کی شاخ کی جانب سے جو ہدایات نافذ ہوں اُن پر پوری طرح عمل کرنا۔

(ھ) مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ کسی معین دن کو ایسے وقت اور مقام پر جس کی اطلاع ارکان کو پہلے دے دی گئی ہو۔ مقامی شاخ کا جلسہ منعقد کرنا۔ تاکہ ارکان ایسے اہم مسائل پر جن کا تعلق جائز شکایات کو دور کرنے یا متعلقہ گاؤں یا قصبہ کے سُود و بہبود سے ہو بحث کر سکیں۔ اور رقبہ متعلقہ میں پارٹی کے پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے عملی تدابیر اختیار کی جا سکیں۔

(و) شق بالا میں جس ماہانہ جلسہ کا تذکرہ ہے۔ اُس کے انعقاد سے تین دن کے اندر اندر ذیل کی شاخ ماتحت کو اس کی اطلاع بھیجنا۔

(ز) جلسوں کی روئداد۔ حسابات اور خط و کتابت کو ہر طرح مکمل باقاعدہ اور محفوظ رکھنا۔

(ح) محتاجوں، مصیبت زدوں، مسکینوں اور آبادی کے پست طبقہ کی دستگیری اور حفاظت کرنا۔

مجلسِ انتظامیہ

۷ - (الف) ہر مقامی شاخ پارٹی کے ارکان میں سے ہر تیسرے سال مجلسِ انتظامیہ منتخب کیا کرے گی، جو اُس کی نگرانی اور ہدایت کے مطابق وہ تمام فرائض جن کا ذکر قاعدہ بالا میں آیا ہے، ادا کرے گی۔

(ب) مجلسِ انتظامیہ کے ارکان عموماً پانچ ہوں گے۔ اُن کی تعداد نو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ جو ارکان بحیثیت عہدہ شریک ہوں گے وہ اُن کے علاوہ ہوں گے۔

(ج) رقبہ متعلقہ کی مقامی مجالس (میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، مثال ٹاؤن کمیٹی وغیرہ) کے تمام ارکان بحیثیتِ عہدہ رُکن سمجھے جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ پارٹی کے ممبر ہوں۔

عہدیدار

۸ - (الف) ہر مقامی شاخ اپنے ارکان میں سے ہر تیسرے سال ایک صدر، ایک یا دو نائب صدر (اگر ضروری ہو) اور ایک سیکرٹری منتخب کیا کرے گی۔ سیکرٹری عام طور پر خزانچی کے فرائض بھی انجام دیگا۔ باستثنائے ایسے مقامات کے جہاں کے مقامی حالات کا اقتضا یہ ہے کہ یہ دونوں عہدے دو علیحدہ علیحدہ اشخاص کے سپرد کئے جائیں۔

(ب) جو گاؤں بالکل پاس پاس واقع ہیں۔ وہاں اگر ضرورت ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عہدہ دار ایک سے زیادہ شاخ میں کام کرے۔

تیسرا باب

ذیل کی شاخ ماتحت

رکنیت

۹ - ہر ذیل کے دیہات کو تحصیل کی شاخ متعلقہ مرکز کے مشورہ اور منظوری کے مطابق کئی حصّوں پر منقسم کر دے گی۔ ہر حصّہ ہر تیسرے سال ذیل کی شاخ میں اپنا ایک نمائندہ بھیجا کرے گا۔

(۱) پانچ سو سے کم آبادی رکھنے والے دیہات کو ذیل کی شاخ کی مناسب نمائندگی دی جائے گی۔

(۲) ممکن ہوا، تو مقامی شاخ کے پانچ سو ارکان کی جانب سے ذیل کی شاخ میں کم از کم ایک رکن ہوا کرے گا۔

(۳) ہر گاؤں یا چھوٹا قصبہ جس کی آبادی دو ہزار یا اس سے زیادہ ہو ذیل کی شاخ میں کم از کم ایک رکن بھیجے گا۔

فرائض

۱۰ - ذیل کی شاخ ماتحت کے فرائض یہ ہوں گے۔

(الف) چندہ کی فراہمی کا انتظام، اُس کی فراہمی میں مدد دینا اور اُس کے مناسب صرف کی نگرانی کرنا۔

(ب) ذیل کے اندر یعنی شاخہائے مقامی اور دوسرے رقبہ میں پارٹی کا پروگرام چلانے کی ذمہ داری۔

مجلسِ انتظامیہ

۱۱۔ (الف) ذیل کی شاخ اپنے روزانہ فرائض و وظائف ادا کرنے کے لیے ایک مجلسِ انتظامیہ منتخب کرے گی۔ جس کے ارکان سات سے گیارہ تک ہوں گے۔

(ب) تخصیل کی شاخ ذیل کی مجلسِ انتظامیہ میں دو ارکان سے زیادہ مقرر نہیں کرے گی۔ تاکہ ہر متعلقہ مفاد کی نمائندگی ہو سکے۔

عہدیدار

۱۲۔ ذیل کی شاخ ماتحت ہر تیسرے سال اپنا صدر، سیکرٹری اور اس قسم کے دوسرے عہدیدار منتخب کیا کرے گی۔ جن کا وجود ادائے فرائض کے لیے ضروری معلوم ہو۔

چوتھا باب

قصبوں کی شاخ ماتحت

رُکنیت

۱۳ - قاعدہ چار کے ماتحت قصبہ کی شاخ کے ارکان میں چند حسبِ ذیل اشخاص شامل ہوں گے۔

(۱) قصبہ کے ہر وارڈ کے تین نمائندے۔ اگر قصبہ میں مقامی مجالس کے انتخاب کی خاطر وارڈ نہ بنائے گئے ہوں، تو مرکز ٹاؤن کمیٹی کے مشورہ سے قصبہ کو پانچ یا آٹھ حصوں میں تقسیم کرلے گا۔ جن سے قصبہ کی شاخ میں تین نمائندے بیے جائیں گے۔

(۲) مقامی مجلس کے تمام وہ ارکان جو پارٹی کے رُکن ہوں۔

(۳) مرکز استعداد اور مختلف گروہوں کی نمائندگی کے اصول کی بنا پر تین ارکان تک مقرر کریگا۔

فرائض

۱۴ - اس کے فرائض وہی ہیں، جو مقامی شاخ کے فرائض ہیں اور جن کا تذکرہ قاعدہ ۶ میں آچکا ہے۔

مجلسِ انتظامیہ

۱۵۔ ہر تیسرے سال قصبہ کی شاخ کی جانب سے ایک مجلسِ انتظامیہ منتخب کی جائے گی۔ جو اُس کی ہدایت اور نگرانی سے اپنے فرائض ادا کرے گی اس مجلس کے ارکان پانچ سے نو تک ہوں گے۔

عہدیدار

۱۶۔ اس کے عہدہ داروں کی تعیین بھی ذیل کی شاخ کے عہدہ داروں کی طرح ہوگی جس کا تذکرہ قاعدہ ۱۲ میں آچکا ہے۔

پانچواں باب

تحصیل کی شاخ

رُکنیت

۱۷۔ تحصیل کی شاخ کی مجلسِ عمومی میں قاعدہ ۴ محولہ بالا کے ماتحت حسبِ ذیل ارکان شامل ہوں گے۔ جس کا انتخاب ہر تیسرے سال کیا جائے گا۔

(۱) تحصیل میں جو ذیلی وار شاخیں ہیں، اُن میں سے ہر ایک کے

دو دو نمائندے۔

(۲) مقامی مجلس کا ہر منتخب شدہ رکن جو تحصیل میں رہتا ہو۔ یا تحصیل کے کسی حلقہ کے رائے دہندگان کی فہرست میں اُس کا نام شامل ہو۔

(۳) مرکز استعداد اور تمام گروہوں (جن میں زرعی مزدور بھی شامل ہیں) کی مناسب نمائندگی کے اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پانچ ارکان تک خود نامزد کرے گا۔

فرائض

۱۸۔ مقامی شاخوں کے فرائض کے علاوہ جن کا ذکر قاعدہ ۶ میں آچکا ہے تحصیل کی شاخ حسبِ ذیل فرائض بھی ادا کرے گی۔

(الف) تحصیل میں ذیلی وار شاخوں کا قیام و نظم اور اُن میں اتحاد و اشتراک پیدا کر کے کام چلانے کا انتظام۔

(ب) مرکز کی جانب سے جو پروگرام بھیجا جائے اُسے خاص مقامی حالات کے مطابق مناسب ترمیم یا اضافہ کے بعد اپنے لیے اور مقامی شاخوں کے لیے اختیار کرنا۔ لیکن اس قسم کی تمام تبدیلیوں کے لیے مرکز کی منظوری شرط ہے۔

(ج) شاخہائے ماتحت کی جانب سے اپنے ماہانہ مکتوب میں جو نکتے پیش کیے جائیں اُن پر غور کرنا اور جن امور کا فیصلہ مقامی طور

پر ہو سکے۔ اُن کا فیصلہ کرنا اور باقی کے لیے مرکز سے رجوع کرنا۔

(د) مرکز میں ایک ماہانہ مکتوب بھیجنا۔ جو تحصیل بھر کی تمام شاخہائے ماتحت اور شاخہائے مقامی کی سرگرمیوں کی روئداد پر مشتمل ہو۔

(ھ) مرکز کے مشورہ اور اعانت سے تحصیل کے لوگوں کی سیاسی تعلیم کا انتظام کرنا۔ اور اقتصادی تجاویز کی ترتیب۔

(و) اپنے اور شاخہائے ماتحت کے حسابات کی سالانہ جانچ پڑتال کا انتظام کرنا۔

(ز) مہینہ بھر میں کسی مقررہ تاریخ پر جب کہ لوگوں کو جمع کرنے میں سہولت ہو۔ مثلاً ایسی تاریخ پر تمام ذیلدار اور سفید پوش جمع ہوں۔ جلسے کا انتظام کرنا۔

مجلسِ انتظامیہ

۱۹۔ (الف) ہر تحصیل کی شاخ تیسرے سال مجلسِ انتظامیہ منتخب کرے گی۔ جو اُس کی ہدایت اور نگرانی سے اپنے روزانہ فرائض ادا کیا کرے گی۔

(ب) مجلسِ انتظامیہ کے ارکان عام طور پر سات سے گیارہ تک ہُوا کریں گے۔ اگر مرکز کی جانب سے اور مختلف گروہوں کی مناسب نمائندگی کے اصول کو مدِنظر رکھ کر دو رکن بحیثیت عہدہ مقرر کیے جائیں، تو وہ ان ارکان کے علاوہ ہوں گے۔

عہدہ دار

۲۰ - ہر تحصیل کی مجلسِ عامہ ہر تیسرے سال ایک صدر ایک یا ایک سے زیادہ نائب صدر ایک سیکرٹری اور اگر ضرورت ہو، تو اس کا ایک نائب اور ایک سیکرٹری مقرر کیا کرے گی۔

چھٹا باب

شہر کی شاخ

(تیس ہزار سے زیادہ آبادی کے قصبوں کے لیے)

رکنیت

۲۱ - شہر کی شاخ کے ارکان قاعدہ ۴ کے ماتحت حسبِ ذیل ہوں گے:-

(۱) ہر وارڈ کی سب کمیٹی کے پانچ نمائندے۔

(۲) شہر کی میونسپل کمیٹی کے وہ تمام ارکان جو پارٹی کے رکن ہیں۔

(۳) مرکز استعداد اور مختلف گروہوں کی مناسب نمائندگی کے اصول کے پیشِ نظر پانچ ارکان تک خود نامزد کرے گا۔

فرائض

۲۲ - شہر کی شاخ کے فرائض جہاں تک کہ وہ شہر کے حالات پر منطبق ہوتے

ہیں۔ وہی ہیں جو تحصیل کی شاخ کے فرائض ہیں جس کا تذکرہ قاعدہ ۱۰ میں آچکا ہے۔

مجلسِ انتظامیہ

۲۳۔ شہر کی شاخ ہر تیسرے سال ایک مجلسِ انتظامیہ منتخب کیا کرے گی۔ جس کی نگرانی اور ہدایت سے وہ اپنے فرائض انجام دے گی۔ اس کے ارکان سات سے گیارہ تک ہوں گے۔

عہدہ دار

۲۴۔ عہدہ دار وہی ہوں گے۔ جو تحصیل کی شاخ کے ہیں اور جن کا ذکر قاعدہ ۲۰ میں آچکا ہے۔

ساتواں باب

مرکز

رُکنیت

۲۵۔ پارٹی کا مرکز لاہور میں ہوگا اور اس کے ارکان میں قاعدہ ۴ کے ماتحت حسب ذیل اشخاص شامل ہوں گے۔

(الف) دو دو نمائندے ہر تحصیل کی شاخ اور ہر شہر کی شاخ

سے نامزد کیے جائیں گے۔

(ب) کونسل آف سٹیٹ، سنٹرل اسمبلی یا صوبہ کی اسمبلی کے تمام موجودہ اور سابقہ ارکان۔ یا نئے آئین کے ماتحت اِن مجالس کی جگہ جو مجالس قائم ہونے والی ہیں۔ اُن کے ارکان ؛

(ج) مرکز مندرجہ بالا ارکان کے علاوہ تیس سے زیادہ مزید ارکان کو شامل نہیں کرے گا۔

فرائض

۲۶۔ مرکز کے فرائض حسبِ ذیل ہوں گے :۔

(الف) تحصیل کی شاخوں کے فرائض (مرقومہ قاعدہ ۱۸) جس حد تک مرکز پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ اُن کے علاوہ مرکز کے فرائض حسبِ ذیل ہوں گے۔ البتہ تحصیل کی شاخوں کی طرح مرکزی مجلس کا اجلاس ہر مہینے میں ایک مرتبہ منعقد ہوا کریگا۔

(۱) وقتاً فوقتاً ایسے انتظامات کرنا اور ایسی تدابیر بغرضِ عمل میں لانا، جو پارٹی کے عقیدہ اور اغراض و مقاصد کو پھیلانے اور مقبولِ عام بنانے اور اُس کے پروگرام کو چلانے کے لیے ضروری ہوں ؛

(۲) تحصیل اور شہر کی شاخوں، اور مختلف شاخہائے ماتحت اور مقامی شاخوں کی ہدایت اور نگرانی کا مناسب انتظام اور اُن کی سرگرمیوں میں اشتراک و اتحاد پیدا کرنا۔

(۳) صوبہ کے اندر ترقی پسند رائے عامہ کو نشوونما دینا اور حلقہ ہائے انتخاب کی سیاسی تعلیم۔

(۴) وقتاً فوقتاً پارٹی کا پروگرام مرتب کرنا۔

(۵) جن اہم مسائل سے پارٹی کو دوچار ہونا پڑے گا۔ اُن کی مناسب تحقیق و تدقیق کا انتظام

(۶) پارٹی کی انتخابی سرگرمی کا انتظام کرنا۔

مجلسِ انتظامیہ

۲۷۔ (الف) مرکز کے فرائض اُس کی نگرانی میں اور اُس کی حکمتِ عملی کے ماتحت ایک مجلسِ انتظامیہ اور اس قسم کی دوسری سب کمیٹیاں جو وقتاً فوقتاً قائم کی جائیں گی، انجام دیں گی۔

(ب) مجلسِ انتظامیہ ہر تیسرے سال مرتب کی جائے گی۔ اُس میں ہر ضلع کا ایک رکن شامل ہوگا۔

(ج) متعلقہ ضلع کی تحصیلوں اور شہروں کی شاخوں کے نمائندے مقررہ وقت اور مقام پر جس کی اطلاع پہلے دے دی جائے گی، جمع ہو کر ضلع بھر میں سے مرکزی مجلسِ انتظامیہ کے لیے ایک نمائندہ کا انتخاب کریں گے۔

(د) مجلسِ انتظامیہ کے ارکان (جن میں انتظامی دفاتر کے ارکان شامل نہیں) عام طور پر تیس سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ انہیں

خاص مقاصد اور خاص کمیٹیوں کے مزید ارکان شامل کرنے کا اختیار ہوگا ؎

عہدہ دار

۲۸ - (الف) مرکز کے عہدہ داروں میں ایک تو صدر ہوگا۔ جو پارٹی کے لیڈر کے نام سے پکارا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ نائب صدر اور سات سیکرٹری۔ جن میں خزانچی اور لیڈر کا پرسنل اسسٹنٹ بھی شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ اگر ضروری معلوم ہوا، تو اسسٹنٹ سیکرٹری بھی رکھے جائیں گے۔

(ب) صدر۔ نائب صدر۔ تمام سیکرٹری (اور کسی سیکرٹری کی غیر حاضری میں اُس کا اسسٹنٹ) بحیثیت عہدہ مجلسِ انتظامیہ کے رکن سمجھے جائیں گے۔

(ج) اِن عہدہ داروں کو ہر تیسرے سال پارٹی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جس میں ہر تحصیل اور ہر شہر کی شاخ کا ایک ایک نمائندہ ہوگا، منتخب کیا جائے گا ؛

آٹھواں باب
شرائط عمومی
کورم

۲۹ - (الف) مختلف جلسوں کے لیے مرکز کی رائے اور مشورے سے

مختلف شاخیں کورم مقرر کریں گی۔

(ب) مرکز کے عام جلسوں اور مجلس انتظامیہ کے جلسوں کے لیے مرکزی مجلس انتظامیہ کورم مقرر کرے گی۔ جس پر پارٹی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر نظر ثانی کی جا سکے گی:

فنڈ

۳۰۔ (الف) مرکز اور مختلف شاخیں پارٹی کے لیے فنڈ کی فراہمی، قبضہ اور اُسے خورد برد ہونے سے بچانے کا انتظام کریں گی۔ روپیہ ایسے بنکوں یا اداروں یا اشخاص کے پاس امانت رکھا جائیگا۔ جن کے متعلق مرکز منظوری دے دے۔ بجٹ بنانے اور منظور کرنے اور مختلف شاخوں اور عہدہ داروں کے اختیارات منظوری کے متعلق بعد میں ہدایات نافذ کی جائیں گی۔

(ب) حتی الامکان شاخوں کے جمع کیے ہوئے روپے میں سے اسّی فی صدی اُس علاقے میں خرچ کیا جائیگا۔ جہاں وہ شاخ مصروفِ عمل ہے۔ باقی روپے میں سے دس فیصدی مرکز کے اخراجات اور دس فی صدی متعلقہ تحصیل یا ذیل کی شاخ پر صرف کیا جائیگا:

ضمنی قوانین۔ قوانین کی تعبیر

۳۱۔ (الف) مرکز تمام صوبے کے لیے اور شاخیں اپنے اپنے علاقے کی

منظوری کے ساتھ اپنے اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے ضمنی قوانین بنا سکیں گی۔ یہ قوانین پارٹی کے قواعد وضوابط کے منافی نہیں ہوں گے۔

(ب) اِن قواعد کے مطالب کے متعلق جب کوئی شبہ پیدا ہو یا اختلاف رونما ہو جائے یا کوئی ایسا نکتہ پیش آئے جس کے لیے ان قواعد میں کوئی دفعہ نہیں ملتی، تو مرکز سے رجوع کیا جائے۔ اس معاملہ میں مرکز کا فیصلہ اُس وقت تک قطعی ہوگا۔ جب تک پارٹی کا مرکزی اجتماع اُسے رد نہ کرے۔ یا اُس میں کوئی ترمیم نہ کر دے۔

کثرت رائے کی بنا پر فیصلے

پارٹی کے لیڈر کے اختیارات التوا و تعطل

۳۲۔ تمام مسائل کا فیصلہ حاضر ارکان کی کثرت رائے سے ہوگا۔ البتہ

(الف) اگر کسی ممبر سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے کہ اُس کا پارٹی میں رہنا پارٹی اور صوبہ کے مقاصد کے لیے مضر معلوم ہو، تو ایسے موقع پر متعلقہ شاخ کے $\frac{2}{3}$ اور مرکز کے $\frac{2}{3}$ ارکان کی کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے گا۔

(ب) پارٹی کے لیڈر کو اختیار ہوگا کہ وہ کسی فیصلہ کو عمل میں

لانا مرکز کے آئندہ اجلاس عمومی پر ملتوی کر دے۔ جو تین مہینے کے بعد منعقد ہوگا۔ اس جلسہ کے شرکا کی کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوگا۔ اُسی کے مطابق کارروائی کی جائے گی۔

ترمیم

۳۳۔ پارٹی کے عقیدہ یا کسی قاعدہ کی ترمیم کے لیے کم از کم تین مہینے کا تحریری نوٹس دینا پڑے گا۔ اسے پارٹی کے عام اجتماع کے سامنے پیش کر دیا جائیگا۔ اور ۲/۳ حاضر ارکان کی کثرت سے مجوزہ ترمیم کو منظور کر کے اُسے مختلف تحصیلوں اور شہروں کی شاخوں کے پاس بھیج دیا جائے اور اگر ان کی اکثریت نے اس ترمیم کو قبول کر لیا، تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

مرکزی مجلس انتظامیہ کے ہنگامی یا خاص اختیارات

۳۴۔ (الف) اگر کوئی ہنگامی یا خاص ضرورت پیش آئے۔ تو مرکزی مجلسِ انتظامیہ ۲/۳ ارکان کی رائے سے کسی یا تمام شاخوں کے متعلق ان قواعد کا استعمال زیادہ سے زیادہ چھ مہینے تک کے عرصے کے لیے روک دے گی۔

خاص عارضی انتظام

۳۵۔ ان قواعد کے نفاذ کی تاریخ سے ایک سال تک صوبے میں

باقاعدہ شاخیں۔ ماتحت شاخیں اور مقامی شاخیں اور مقامی شاخیں وغیرہ قائم کی جا سکتی ہیں۔ جہاں ضروری معلوم ہو۔ ان قواعد کو عمل میں لانے کے لیے عارضی مجلس انتظامیہ، عارضی عہدہ دار اور عارضی کمیٹیاں اور شاخیں مقرر کر سکتی ہے ؛

متفرق

۳۶۔ (الف) پارٹی کے ہر رکن کو حق حاصل ہوگا۔ کہ وہ کسی ایسے مسئلہ کے متعلق جس کا تعلق پارٹی کے عقیدہ، مقاصد یا پروگرام سے ہو۔ یا ایسی کسی شکایت کو دور کرنے کی خاطر جو پارٹی کے عقیدہ یا مقاصد یا پروگرام کے ماتحت آتی ہو۔ پارٹی کے لیڈر۔ مرکز اور تحصیل، ذیل اور شہر کی شاخوں یا دوسری متعلقہ شاخوں کو مخاطب کر سکے۔

۳۷۔ (الف) حتی الامکان ایسے معاملات میں پہلے تحصیل یا شہر کی متعلقہ شاخ کے سیکرٹری کو مخاطب کرنا چاہیے اور ضروری معلوم ہو۔ تو پھر مرکز کے سیکرٹری کو لکھا جائے ؛

اتحاد پارٹی

مسلک اور اغراض و مقاصد

۱- اتحاد پارٹی کا مسلک :-

(الف) عملی طور پر جہاں تک جلد ممکن ہو۔ تمام آئینی ذرائع سے کام لے کر ہندوستان کے لیے نوآبادیات درجہ حاصل کرنا۔

(الف) ۱- سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں کے لیے معزز حیثیت کا انتظام کرانا۔

(ب) صوبۂ پنجاب میں حقیقی معنوں میں صوبجاتی خود اختیاری حکومت قائم کرنا۔

(ج) اقتصادی مفاد کو بلا امتیاز مذہب و ملت و سکونت سیاسی پارٹیوں کے قیام کی صحیح بنیاد تسلیم کرنا۔

(د) سب لوگوں کے سامنے مساوی تسہیلات و مواقع مہیا کرنا اور پسماندہ طبقات اور علاقوں کا (خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی) خاص طور پر خیال رکھنا۔

۲- پارٹی کے قیام کے مقاصد :-

(الف) قومی خودداری اور عزت نفس کا نشو و نما۔

(ب) مرکز یعنی حکومت ہند میں کفایت شعاری پر زور دینا۔

(ج) فوج میں ہندوستانی عنصر کو کم کیے بغیر فوجی مصارف کی تخفیف پر اصرار کرنا۔
(د) صوبے کی اشد ضرورتوں کے لیے انکم ٹیکس کو مرکزی حکومت سے آزاد کرانا
(ہ) محصولات بحری (کسٹم اور ڈیوٹی) کے متعلق ایسی پالیسی پر اصرار کرنا جس سے
زراعتی اجناس کے پیدا کرنے والوں اور صنعت کے کارخانہ داروں کی بہترین
حوصلہ افزائی بھی ہو اور عام گاہک کے مفاد کو بھی نقصان نہ پہنچے۔
(و) سرمایہ داروں، بڑے زمینداروں اور ارباب زر کے مفاد کو نامناسب
نقصان پہنچائے بغیر عوام کے مفاد کی اعانت کرنا۔
(ز) صوبے کی زراعتی اور صنعتی زندگی کی جدید تعمیر اور اقتصادی تنظیم کا کام
اس طریق پر شروع کرنا کہ بیروزگاری کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔
(ح) صوبے کے تجارتی مفاد کا مطالعہ اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کرنا۔
(ط) نظامِ تعلیم کی تمام شاخوں کو نئے سانچے میں ڈھالنا۔
(ی) پسماندہ طبقات کی حفاظت کے اصول کے ماتحت قانون انتقال اراضی
پنجاب کی حمایت کرنا۔
(ک) صنعت وحرفت کو ترقی دینا اور دیہاتی علاقوں میں گھریلو صنعتوں پر زور
دینا تاکہ وہ صنعتیں دیہاتی آبادی کے لیے مزید آمدنی کا ذریعہ بن جائیں۔
(ل) پیداوار اراضی کو منڈی میں لانے کے طریقوں کو بہتر بنانا جس میں منڈیوں
کے قابلِ اعتراض رسوم ومعلومات کی اصلاح بھی شامل ہے۔
(م) دیہاتی اقوام میں حقیقی روشن خیالی کی روح پیدا کر کے اور ہر گاؤں کو صحیح
معاشرتی اور قومی زندگی کا ایک مرکز بنا کر دیہات کی حالت کو سدھارنا۔

(ن) (۱) نظم و نسق حکومت کو کثافتوں سے پاک کرنا۔

(۲) ٹیکس کے بوجھ کو جائز اور منصفانہ طور سے مختلف طبقوں پر تقسیم کرنا۔

(۳) نظم و نسق حکومت کے تمام زائد اخراجات کو دور کر دینا تاکہ مفید عام سرگرمیوں کے لیے روپیہ مہیا کیا جا سکے۔

(۴) پائدار قومی اتحاد کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے ہر قوم کی مذہبی اور کلچرل جثیت کو محفوظ کر دینا۔ اگر کوئی قوم دوسری قوم سے جبراً اپنی مرضی منوانے کا حق ظاہر کرے، تو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دینا اور تصادم کی حالت میں اصول رواداری کے ماتحت تمام اختلافات اور مناقشات کا تصفیہ کرانا۔

۳۔ اس پارٹی کے نزدیک قانون اصلاحات ۱۹۳۵ء نہایت غیر اطمینان بخش ہے۔ لیکن چونکہ یہ قانون طویل تحقیقات اور جد و جہد کے بعد اب ملک میں نافذ ہو چکا ہے۔ اس لیے پارٹی نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس قانون سے بہترین نتائج حاصل کرے۔ پارٹی کو اس معاملے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے۔ کہ آیا یہ آئین بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے قومی جد و جہد کی اجازت دیگا یا نہیں۔ لیکن پارٹی نے مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے سر توڑ کوشش کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ اس کام میں جس قدر زیادہ قومی قابلیت، دیانت، محنت اور یک جہتی صرف ہوگی، اسی قدر کامیابی حاصل ہوگی۔

یونینسٹ پارٹی
کا
الیکشن مینی فسٹو

یونینسٹ پارٹی کا آئین اور قواعد وضوابط آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب اِس پارٹی کا وہ مینی فسٹو ملاحظہ فرمایئے جو ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت شائع کیا گیا تھا۔ یہ مینی فسٹو سر فضل حسین نے مرتب کیا تھا اور اُنہی کے غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ اصل مینی فسٹو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ لیکن بعد کو یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے اُس کا اردو میں ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ جب سر فضلِ حسین کے انتقال کے بعد سر سکندر حیات خاں ریزرو بنک آف انڈیا کی ملازمت سے مستعفی ہو کر واپس پنجاب تشریف لائے اور یونینسٹ پارٹی کی عنانِ قیادت اُن کے ہاتھ میں چلی گئی تو انھوں نے اِس مینی فسٹو کو جزواً و کلاً تسلیم کر لیا تھا۔

مینی فسٹو کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھنے کے بعد بتایئے کہ کیا پنجاب کے کسی مسلمان کو اس پروگرام سے اختلاف ہو سکتا تھا؟

قومی خودداری کو بحال کرنا۔ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنا۔

دیہاتی آبادی کو سود اور قرض کے بارِ گراں سے نجات دلانا۔ افلاس اور غربت کا قلع و قمع کرنا۔ تعلیم کی سہولتیں عام کرنا۔ بے کاری رفع کرنا۔ ملک کی آزادی کے لیے جدّ و جہد کرنا۔ فرقہ وارانہ اتحاد کی موزوں تجویزیں سوچنا۔ کیا ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جس سے مسلم لیگ کو بحیثیت سیاسی جماعت کے یا کسی مسلم لیگی کارکن کو بحیثیت فرد کے اختلاف کا یارا ہو سکتا تھا؟

اندریں حالات میں پوچھتا ہوں کہ اگر سر سکندر حیات خاں، سکندر جناح پیکٹ کے بعد، اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کر لیتے تو کیا اس پارٹی کا ایک رکن بھی اس مینی فسٹو کے تعمیری پروگرام کی تکمیل کے راستے میں حائل ہونے کی جرأت کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں!

یونینسٹ پارٹی میں اکیاسی مسلمان ممبر تھے۔ اگر ان اکیاسی ممبروں کو مجموعی طور پر مسلم لیگ پارٹی کا لیبل دے دیا جاتا تو صرف ایک اور ممبر کا اضافہ ہو جاتا یعنی ملک برکت علی کا۔ کیا ملک صاحب اِس مینی فسٹو کے تعمیری پروگرام کے مخالف تھے؟ کیا ملک صاحب پنجاب کے پس ماندہ مقروض۔ غربت زدہ عوام کی جملہ تکلیفیں رفع کرنے کے حامی نہ تھے؟ کیا وہ قومی خودداری بحال کرنے اور فرقہ وارانہ اتحاد کے معاون نہ تھے؟ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ اگر اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے اکیاسی ممبر متفقہ طور پر کوئی فیصلہ کرتے تو تنہا ملک صاحب کیوں کر اُس فیصلے کو تبدیل کرنے کے مجاز تھے؟

میری حتمی رائے ہے کہ اگر سر سکندر حیات خاں، لکھنؤ سے واپس آ کر تھوڑی سی جرأت اور تدبر سے کام لیتے اور پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کر لیتے تو اُن کی وزارت کو قطعی کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہ تھا۔ اِس ضمن میں سر سکندر کو غالباً سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ اگر انھوں نے مسلم لیگ پارٹی قائم کی تو مبادا چھوٹو رام اُن کا ساتھ چھوڑ جائیں۔

اگرچہ یہ تئیس سال کی پُرانی بات ہے۔ لیکن میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ سر سکندر حیات خاں کا یہ اندیشہ چنداں وقیع نہیں تھا۔ چودھری چھوٹو رام کسی صورت میں بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ شاید کچھ تھوڑا سا حیص بیص کرتے لیکن انجام کار سر سکندر کے کابینہ میں یقیناً شریک رہتے۔ اس کے سوا اُن کے لیے اور کوئی چارۂ کار تھا نہیں۔

چودھری چھوٹو رام کے ساتھ پنجاب اسمبلی میں صرف آٹھ ہندو جاٹ تھے جو رہتک۔ گوڑگانوہ، اور حصار کے اضلاع سے منتخب ہو کر آئے تھے۔ انہی آٹھ ممبروں کے زور پر چودھری چھوٹو رام نے اپنے لیے وزارت حاصل کی۔ اپنے ایک ہم وطن جاٹ، رائے بہادر چودھری لال چند کو پنجاب پبلک سروس کمشن کی ممبری دلوائی۔ اور اپنے ایک نوعمر ساتھی چودھری ٹکا رام کو پارلیمنٹری سکرٹری بنوایا۔ یہ تمام سودا انھوں نے صرف آٹھ ممبروں کا لیڈر بن کر چکایا تھا۔ چودھری چھوٹو رام یقیناً اتنے بیوقوف نہیں تھے کہ اس ساری دُنیاوی منفعت اور عروج سے محض اس لیے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جاتے کہ سر سکندر نے مسلم لیگ پارٹی قائم کی

ہے۔

پنجاب اسمبلی میں آٹھ اچھوت ممبر بھی تھے جنھیں وزارت اور پارلیمنٹری سکریٹری شپ کا ملنا تو کجا یہ شکایت تھی کہ اچھوتوں کو پولیس اور فوج میں سپاہی تک بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ کیا یہ چودھری چھوٹو رام کی انتہائی خوش نصیبی نہ تھی کہ انھوں نے صرف آٹھ ہندو جاٹوں کے لیڈر بن کر اتنا فائدہ اٹھایا جو عام حالات میں کوئی دوسرا شخص ہرگز نہیں اٹھا سکتا تھا؟ اس لیے میری رائے بدستور یہی ہے کہ اگر سرسکندر حسبِ وعدہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کر لیتے تو چودھری چھوٹو رام کبھی کابینہ سے الگ نہ ہوتے۔

سوال یہ ہے کہ اگر سرسکندر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو انھوں نے لکھنؤ میں وعدہ کیوں کیا تھا؟

سرسکندر جب تک زندہ رہے، ہم برابر اپنی زبانِ قلم اور زبانِ دہن سے یہ تقاضا کرتے اور شور مچاتے رہے کہ خدارا سکندر جناح پیکٹ پر عمل کر کے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کیجیے۔ لیکن اس ضمن میں ہماری سب سے زیادہ مخالفت جن لوگوں نے کی وہ راجہ غضنفر علی خاں۔ شیخ کرامت علی۔ میر مقبول محمود۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ نواب مظفر خاں۔ سید افضال علی حسنی وغیرہ تھے۔ انھوں نے ہمارے راستے میں قسم قسم کی رکاوٹیں کھڑی کیں۔ ہمارے خلاف ہر نوع کی اتہام تراشی اور بہتان طرازی کی۔ یہ لوگ سرسکندر کے رفیق، مشیر اور

صلاح کار تھے۔ نظر بظاہر اُن کا فرض تھا کہ قوم کے وسیع مفاد کے پیشِ نظر سر سکندر کو صحیح مشورہ دیتے۔ لیکن اُنھوں نے ہمیشہ اُنھیں غلط راستے پر ڈالا۔

اگر سر سکندر مسلم لیگ۔ پارٹی قائم کر دیتے تو صوبے کے نظم و نسق میں کوئی خلل نہ پڑتا۔ اور نہ کوئی آئینی بحران پیدا ہوتا۔ معاملات یکسوئی اختیار کر لیتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ تلخ اور افسوسناک واقعات بھی رونما نہ ہوتے جو اُن کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے اور جنھوں نے پنجاب ہی کو نہیں بلکہ پورے ہندوستان کو آخر کار اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بہرحال اب اس کا ذکر بے سود ہے ؎

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

مینی فسٹو

(۱) پنجاب کے رائے دہندوں کے سامنے عنقریب صوبہ کی مجلسِ قانون ساز کے لیے جدید آئین کے ماتحت نمائندے منتخب کرنے کا مسئلہ پیش ہو گا۔ جدید مجلسِ قانون ساز پروونشل لیجسلیٹو اسمبلی کہلائے گی اور باعتبار بعض اہم خصوصیات کے موجودہ لیجسلیٹو کونسل سے مختلف ہو گی۔

ترکیب اور اختیارات کے لحاظ سے موجودہ اور مجوزہ جدید مجلسِ قانون ساز کے درمیان زیادہ نمایاں اور اہم اختلافات حسبِ ذیل ہوں گے :-

(الف) موجودہ کونسل میں چودہ سرکاری ممبر ۹ نامزد و غیر سرکاری ممبر اور ۱۷ انتخاب شدہ ممبر ہیں۔ جدید کونسل میں ممبروں کی مجموعی تعداد ۱۷۵ ہوگی اور سب کے سب انتخاب شدہ ہوں گے۔ نامزد اور سرکاری ممبر کوئی نہ ہوگا ؛

(ب) موجودہ زمانہ میں صوبہ کی حکومت صیغہ جات کی دو قسموں میں منقسم ہے جو محفوظہ اور منتقلہ کہلاتی ہیں۔ اوّل الذکر میں زیادہ اہمیت رکھنے والے صیغے مثلاً صیغہ فنانس۔ صیغہ قانون و انتظام صیغہ مال (لینڈ ریونیو) وغیرہ شامل ہیں اور ان کی حکمتِ عملی اور بجٹ پر لیجسلیٹو کونسل کا مؤثر اقتدار نہیں ہے۔ دوسری طرف صیغہ جات منتقلہ وزراء کے ماتحت ہیں۔ جن پر کونسل کو اقتدار حاصل ہے۔ جدید آئین کے ماتحت صیغہ جات محفوظہ اور صیغہ جات منتقلہ کی یہ تقسیم منسوخ ہو جائے گی۔ اور تمام صیغہ جات گورنر کی بعض خاص ذمہ داریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وزراء کے ماتحت کر دیئے جائیں گے اور ان پر جدید مجلسِ قانون ساز کو اقتدار حاصل ہوگا۔

(ج) موجودہ آئین کی صوبجاتی کیبنٹوں نے بعض صریحی سہولتوں اور مشکلوں کے ماتحت کام کیا۔ عملی طور پر ان کے ارکان کا نصف حصہ نامزد تھا اور اس طرح کونسل کے روبرو جوابدہ نہ تھا۔ ایک طرف سرکاری

اور نامزد بلاک کی موجودگی اور مجلسِ قانون ساز میں مفادِ مختلفہ کے تعیّن نے وزرا کے لیے کسی ایسی اہم تجویز کا بروئے کار لانا جسے ارکانِ حکومت کی تائید حاصل نہ تھی۔ عملی طور پر غیر ممکن بنا دیا۔ دوسری وزرا جو مختلف پارٹیوں سے لیے گئے تھے اور جن کے پروگرام بعض صورتوں میں کلیتہً متضاد تھے۔ باوجود اس امر کے کہ منتخب ممبروں کی اکثریت ان میں سے بعض کی مخالفت کرتی وہ سرکاری اور نامزد بلاک کی امداد سے اپنے عہدوں پر برقرار رہ سکتے تھے۔ جدید آئین کے ماتحت اس صورتِ حالات کے تغیر پذیر ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ گورنر جدید آئین کے ماتحت نو ربد منتخب ممبروں میں سے سب سے زیادہ تائید وحمایت رکھنے والے لیڈر کو وزارتِ عظمیٰ قبول کرنے اور گورنر کی منظوری کے لیے ایسے دیگر اشخاص کو جنھیں وہ اپنی کابینہ میں بحیثیت وزرا شامل کرنا پسند کرے چُننے کی دعوت دے گا۔ بعد ازاں یہ وزارت حکمت ہائے عملی کی تشکیل کرے گی اور صوبہ کی حکومت کا کام چلائے گی اور وہ اس وقت تک برسرِ اقتدار رہے گی۔ جس وقت تک اسے ممبروں کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے گا اور جب اس کے خلاف عدمِ اعتماد کا ووٹ پاس ہو جائے گا، تو وہ مستعفی ہو کر اپنے عہدوں سے دست بردار ہو جائے گی۔

(د) بعد ازاں جدید مجلسِ قانون ساز کے منتخب ممبروں سے مجوزہ جدید

فیڈرل اسمبلی کے لیے نمائندے منتخب کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا اور اس طرح بالواسطہ انتخاب بلاواسطہ انتخاب کی جگہ لے لے گا جو موجودہ اسمبلی کے لیے بذریعہ رائے دہندگان عمل میں لایا جاتا ہے:

(۲) امورِ متذکرہ صدر بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور مندرجہ ذیل اہم لحاظات کے متقضی ہیں:-

(۱) دولتِ برطانیہ کے ماتحت پنجاب کی حکومت پہلی بار پنجابیوں کے ہاتھوں میں آ رہی ہے - اس کی کامیابی و ناکامیابی کا انحصار ابتداءً ہمیں پر ہوگا -

(۲) رائے دہندوں کو اس بات کا قطعی موقع حاصل ہے کہ ان کی آواز سنی جائے اور ان کی جائز شکایات رفع کی جائیں - حق رائے دہندگی کے ساتھ اب تغافل روا نہیں رکھا جا سکتا - نہ اس سے بے التفاتی کی جا سکتی ہے اور نہ آئندہ مسائلِ متعلقہ کا لحاظ کئے بغیر محض اپنے یا اپنی ذات برادری یا اپنے خاندان کے مفاد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے -

(۳) جدید مجلسِ قانون ساز کے سامنے آنے والا کام جماعتی طریق پر شدید انضباط اور مستحکم ارتباط کا طالب ہوگا - کوئی منفرد ممبر خواہ وہ کیسا ہی عظیم المرتبت اور صاحبِ رسوخ ہو محض باختیار خود کوئی کام نہ کر سکے گا - آئندہ اختیارات مجلسِ قانون سازی کی اکثریت رکھنے والی جماعت کے ہاتھوں میں ہوں گے - اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے حقوق

تسلیم کیے جائیں اور ہمارا پروگرام عمل میں آئے تو ہمیں نہ صرف موزوں شخص بلکہ موزوں جماعت کے حق میں ووٹ دینا چاہیے:

(۳) دیگر ممالک کا تجربہ اور تاریخ کا فتویٰ جماعتی اصول کے مطابق انتخابات کی مہم چلانے کی اہمیت پر یکساں زور دیتے ہیں - اس تجویز کی معقولیت بدیہی ہے - ذمہ دار حکومت کے معنی یہ ہیں کہ مجلس قانون ساز میں اکثریت رکھنے والی جماعت حکمران ہو گی - جو امیدوار کسی خاص پروگرام یا پارٹی کی بنا پر انتخاب کے لیے کھڑے نہیں ہوتے وہ تذبذب میں رہتے ہیں - بخلاف ازیں دوسرے لوگ جو کسی واضح پروگرام کی بنا یا کسی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوتے ہیں، وہ اعلان کر دیتے ہیں کہ ان کا مقصدِ سعی کیا ہے - پس ذمہ دارانہ حکومت کا فن کسی ایسے تعمیری پروگرام کی تیاری پر موقوف ہے جو اپنے ذاتی عقائد سے مطابقت رکھنے کے سلسلہ ہی ووٹ دہندوں کی اکثریت کے لیے بھی قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور مجلس قانون ساز کے کثیر التعداد ممبروں کو اپنا حامی بنا سکے - پس ضروری ہے کہ ایسے پروگرام کی بنیاد مصالحت کی سپرٹ پر ہو۔ ورنہ یوں تو ہر ممبر اپنی انفرادی حیثیت میں بیک جنبش قلم ایک ایسا خیالی پروگرام مرتب کر سکتا ہے - جو راتوں رات زمین پر آسمانی سلطنت کے لے آنے کا مدعی ہو یا عجیب و غریب انتخابی وعدے کرے - جو ہر شخص کی خواہش ساحرانہ طور پر پوری کرنے کے ضامن ہوں - لیکن اگر وہ اپنے پروگرام کی حمایت میں صوبہ کے معقول عناصر کی اکثریت کی تنظیم نہیں

کرسکتا، تو وہ اور اُس کی پارٹی ناکام رہے گی یا محض ظنی کامیابی کا دعویٰ کرے گی۔ نظر بر آں عملی سیاسیات اور تعمیری تدبّر کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف پروگراموں اور پارٹیوں کے اضافی محاسن و معائب پر غور کرتے وقت مندرجہ ذیل اُمور کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا جائے:۔

(الف) کوئی خاص پروگرام یا پارٹی کس حد تک ان اصولوں اور حکمت عملیوں کی مؤید ہے جن سے متعلقہ رائے دہندوں کے بہترین مفاد وابستہ ہیں؟

(ب) وہ متوقع تعداد کیا ہے جو متعلقہ پارٹی کے لیڈر مجلسِ قانون ساز میں حاصل کر سکتے ہیں۔ یا مجلس قانون ساز میں اُن کے حامیوں کی تعداد کا صاحب اقتدار بن جانا ممکن ہے۔

(۴) مثلاً پنجاب کا مسئلہ لازمی طور پر ایک اقتصادی مسئلہ ہے۔ صوبہ کی آبادی ۵۷ فیصدی مسلمانوں ۲۸ فیصدی ہندوؤں اور ۱۳ فیصدی سکھوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۹۰ فیصدی کا گزارہ بلا واسطہ یا بالواسطہ زراعت پر ہے۔ لیکن وہ ایک طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے سے نیز بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ زراعت پیشہ ہیں یا غیر زراعت پیشہ دیہاتی ہیں یا شہری۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ ایک پنجابی کی اوسط آمدنی اُس خرچ سے کم ہے۔ جو قید خانجاتِ پنجاب میں ایک قیدی کے لباس و خوراک پر آتا ہے۔ مزید برآں ۸۰ فیصدی مالکانِ اراضی قرض میں مبتلا ہیں، جو مالیہ اراضی کا چالیس گنا ہے اور جس کا سالانہ سود صوبہ کے مجموعی مالیہ اراضی کے دس گنے کے قریب ہوتا ہے۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں

کمی واقع ہو جانے سے اقتصادی تکلیف اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بے روزگاری کا دور دورہ ہے۔ گریجوایٹ سڑکوں پر جوتیاں صاف کرتے دیکھے گئے ہیں۔ روزگار نہ ملنے کے باعث ہونہار نوجوانوں کے خودکشی کرنے کی دردناک داستان ایک ایسی آواز ہے۔ جس سے کوئی وطن پرست پنجابی تغافل نہیں کر سکتا ہے۔ یہ ہے پنجاب کا اصل مسئلہ۔ افلاس اور فاقہ کشی کا مسئلہ جو پنجاب کو گھور رہا ہے اور بہترین پنجابیوں کی نہایت مخلصانہ اور اجتماعی مساعی کا طلبگار ہے۔ وہ شہریوں اور دیہاتیوں زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ غرض تمام طبقوں پر یکساں اثر انداز ہے۔ سرکاری ملازمت میں زیادہ سے زیادہ تقریباً فی ہزار ۳ شخص کھپ سکتے ہیں۔ ۹۹۷ پھر بھی باقی رہتے ہیں۔ علاوہ بریں ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ مطالبات کا جلد طے ہونا ضروری ہے۔ اگر اقتصادی عدم مساوات اور گرسنگی کے دردہائے روح فرسا کا بروقت علاج نہ کیا گیا۔ تو اُن کی علامات خون خرابے کی شکل میں رونما ہو جائیں گی۔ ملک روٹی چھینتا ہے اور کوئی وطن پرست تعمیر کوش پارٹی اس اہم مسئلہ کو بہ درستی ہوش و حواس طلتوی یا نظر انداز کرنا برداشت نہیں کر سکتی۔

(۵) صوبہ میں سیاسی افکار کے پانچ بڑے بڑے مشرب ہیں جن کے درمیان پنجابی رائے دہندہ کو انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ مشرب حسب ذیل ہیں :۔

(الف) وہ اشخاص جن کا فوری پروگرام محض تباہ کن ہے۔ وہ موجودہ

حکومت کے مخالف ہیں - وہ کہتے ہیں - کہ ہم موجودہ آئین و حکومت سے نا مطمئن ہیں اور دونوں کے ساتھ کوئی سروکار نہ رکھیں گے - اگر یہ گروہ کونسلوں میں داخل ہونے پر رضامند بھی ہو جائے - تو اس کا مقصد صرف تباہ کرنا ہوگا - وہ اسی طریق پر گامزن رہنا چاہتے ہیں - حتیٰ کہ خاطر پسند آئین اور حکومت آسمان سے ٹپک پڑیں - وہ اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہیں کہ سیاسیات میں ان نقائص کی اصلاح ہی مناسب ہوتی ہے - جن کا خاتمہ ممکن نہیں ہوتا :

(ب) وہ رجعت پسند جو کسی قسم کی تبدیلی سے خواہ وہ کتنی فائدہ مند ہو ڈرتے ہیں اور حکام وقت کی کورانہ پرستاری کرنے کے ذریعہ ذاتی کاربرآری کے معتقد ہیں یہ لوگ وقت اور حالات کے ساتھ آشنی نہیں رکھتے - یہ بات بھولے ہوئے ہیں کہ کاسہ لیسی اور خوشامد کا زمانہ گذر چکا ہے اور زمانہ حال کو زمانۂ ماضی نہیں بنایا جا سکتا :

(ج) اربابِ دولت کے نمائندے جو بہانگِ بلند سیاسی آزادی کا وعظ کرتے ہیں - لیکن ناواجب اقتصادی کا بجوئی کی مداومت کے حامی ہیں وہ رائے دہندے کو وزارت کی تشکیل یا تخریب کا آزادانہ حق دینے کو تیار ہیں - بشرطیکہ وہ بے چون و چرا اپنے آپ کو ان کے اقتصادی فصد لینے والے نشتر کے حوالہ کر دے ۔

(د) اشتراکیین جو اثر انگیز نعروں کے ذریعہ اپیل کر کے ہر شخص کو اس

کی ذاتی جائداد سے محروم کر دینے کے خواہش مند ہیں۔ وہ سوسائٹی کے نظام پر سرمایہ دار جماعتوں کی گرفت اور اپنے غیر معتدل نظریات کی کوتاہیوں کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ ان کو یاد نہیں کہ تدریجی ترقی ہی اصلاح کی سب سے زیادہ یقینی بنیاد ہوتی ہے۔ فی الحال ان کے سامنے کوئی پروگرام نہیں ہے:۔

(۵) عملی طور پر ترقی پسند لوگ جو موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے ہیں اور موجودہ مشینری کا بہترین استعمال کرنے کے لیے تیار ہیں اور حالات کو بہتر بنانے کی جد وجہد جاری رکھیں گے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ہمیں موجودہ نسل کے لیے حاضر الوقت سہولتوں سے حسب امکان بہترین فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تاکہ وہ آئندہ نسل کے واسطے عمدہ مواقع پیدا کرنے کی بہتر صلاحیت رکھ سکے۔ یہ ہے وہ گروہ جس سے نیشنل یونینسٹ پارٹی تعلق رکھتی ہے:۔

(۶) نیشنل یونینسٹ پارٹی کا پروگرام ایک کھلا راز ہے۔ اس کے مسلک اور پروگرام کا تفصیلی بیان ضمیمہ الف میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پارٹی ایک عمدہ عملی اور مفید مسلک کی حامی ہے۔ جیسا کہ اس کی بڑی بڑی مدات کے بیان سے معلوم ہوگا:۔

(الف) قومی خودداری کا قیام جس کو ۱۹۱۹ء میں شدید صدمہ پہنچا تھا اور جو بعد ازاں پستی کی طرف مائل رہی ہے۔ اس مد کے ماتحت پارٹی اپنے آپ کو اس وعدہ کا پابند کرتی ہے کہ وہ تمام آئینی ذرائع

سے کام لے کر درجۂ نوآبادیات کے جلد از جلد حصول، حقیقی صوبجاتی خود مختاری کے قیام، حریت خیال اور آزادی تقریر، اور پبلک زندگی میں پاکیزگی کی حوصلہ افزائی اور حکام اور باشندگانِ صوبہ کے درمیان مناسب تعلقات کی برقراری کے لیے کام کرے گی۔

(ب) سب لوگوں کے لیے مساوی مواقع اور آسانیاں مہیا کرنا۔ پس افتادہ طبقوں اور علاقوں کے لیے خاص طور پر سعی و جہد کرنا۔ اس ضمن میں پارٹی اپنے آپ کو اس وعدہ کا پابند کرتی ہے کہ وہ دیہاتی اور شہری باشندوں کی بہبود کے لیے ایک ہمہ گیر تعمیری پروگرام کو عمل میں لائے گی۔ جس میں حسب ذیل امور شامل ہوں گے :-

دیہات اور شہروں میں حالاتِ زندگی کی اصلاح۔ پس افتادہ طبقوں کے تحفظ کے لیے قانون انتقال اراضی کی حمایت۔ نظم و نسق حکومت کے اخراجات میں اس طریق سے کمی کر کے کہ اس کی عمدگی میں خلل واقع نہ ہو۔ مفید عام سرگرمیوں کو ترقی دینا۔ مختلف طبقوں کے درمیان ٹیکس کو درست اور منصفانہ طور پر تقسیم کرنا اور بطریق مناسب صوبہ کی تعلیمی، مجلسی اور تمدنی زندگی کو نشو و نما دینا۔

(ج) صوبہ کی از سرِ نو اقتصادی تنظیم پارٹی کے پروگرام کی اہم مد ہے۔ اس سلسلہ میں پارٹی اپنے آپ کو اس وعدہ کا پابند کرتی ہے کہ وہ زرعی اور صنعتی ترقی، گھریلو دستکاری کی حوصلہ افزائی، فی کس آمدنی اور پیداوار میں بیشی، قرض میں تخفیف، بے روزگاری کے دفعیہ اور

زرداروں اور بے زروں، زمینداروں اور کاشتکاروں، مالکوں اور مزدوروں کے معقول مطالبات کو منصفانہ طور پر طے کرنے کے لیے کام کرے گی۔

(د) پارٹی کا پروگرام ہر فرقہ کو اس کی مذہبی اور تمدنی آزادی کا یقین دلاتا ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے، جو قومی اتحاد کو پائدار رکھ سکتی ہے۔ وہ کسی فرقہ کا دوسروں سے بجبر اپنی بات منوانے کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتی۔ تصادم کی صورت میں پارٹی رواداری، مصالحت اور انصاف کے اصولوں پر تصفیہ کرانے کی حامی ہے۔ پارٹی کا مسلک اقتصادی ہم آہنگی کو اتحاد عمل کی مستحکم ترین بنیاد تسلیم کرتا ہے اور نام نہاد فرقہ وارانہ مناقشات کو نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے مسائل سمجھتا ہے۔ اِن حالات میں یہ امر مفہوم ہے کہ پارٹی کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے ممبروں کو آزادی حاصل ہے کہ شاذ صورتوں میں وہ ایسے خالص فرقہ وارانہ مسائل کے زیر بحث آنے پر جن کے تعلق میں پارٹی نے کوئی متحد طریق عمل تجویز نہ کیا ہو جس راستہ پر چاہیں گامزن ہوں۔

(ھ) جہاں تک اصلاحات سے کام لینے کا تعلق ہے پارٹی خیال کرتی ہے کہ جدید آئین نہایت غیر اطمینان بخش ہے۔ لیکن وہ اُس کی واضح کوتاہیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی اس کے بائیکاٹ یا تباہی میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتی۔ نظر بر آں وہ اس خیال کی حامی ہے کہ نفع رسانی کا جو کچھ موقع میسر ہے اس سے بہترین کام لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ

آئینی ترقی کی خاطر ملک کی دوسری تعمیر کوش اور ترقی پسند پارٹیوں سے مل جائے گی۔

مگر یہ پروگرام کسی لحاظ سے بھی جامع نہیں ہے اور نہ اس مبحث پر ختم کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ان تمام وطن پرست پنجابیوں کے لیے ایک قسم کی اپیل ہے جو صوبہ کے بہترین مفاد کی خاطر باہم اشتراکِ عمل کرنے کے لیے پارٹی کے مسلک کے ساتھ بلحاظ خیالات اتحاد رکھتے ہیں۔ پارٹی کے مسلک میں کوئی تعمیری ترمیم پارٹی کے اندر کی جا سکتی ہے اور انفرادی حلقہ جات انتخاب کی ضروریات کے مطابق پارٹی کی منظوری سے خاص فقرات کا اضافہ بھی ممکن ہے۔

(۷) یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ آجکل کونسل میں نیشنل یونینسٹ پارٹی سب سے بڑی واحد پارٹی ہے۔ وہ جدید مجلسِ قانون ساز میں سب سے بڑی پارٹی ہونے اور جدید آئین کے ماتحت صوبہ کی عنانِ حکومت سنبھالنے کی توقع رکھتی ہے۔ وہ پارٹی کے مسلک کی حدود کے اندر مختلف خیالات رکھنے والوں کے لیے وسیع میدان بہم پہنچاتی ہے۔ ان حالات میں ان رائے دہندوں کو جو اس پروگرام کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں۔ ان مختلف امیدواروں سے جو ان کی امداد کے طالب ہوں۔ یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آیا وہ اس مسلک اور اس پروگرام کی تائید کرتے ہیں۔ جو امیدوار ایسا نہیں کرتا۔ وہ ان کی امداد کا مستحق نہیں ہے۔ انھیں صرف اس امیدوار کو ووٹ دینا چاہیے جو یونینسٹ پارٹی کے مسلک اور پروگرام کا مؤید ہو۔

(۸) نیشنل یونینسٹ پارٹی کوئی نئی پارٹی نہیں ہے۔ وہ ۲۰ سال سے زائد عرصہ سے کام کر رہی ہے اور باوجود صریحی مجبوریوں کے اس نے مفید نتائج حاصل کئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مدآت اس کی بعض بلاواسطہ یا بالواسطہ بڑی بڑی کامیابیوں کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں:-

(الف) ایکٹ مالیہ زمین کی ترمیم ایسے طور پر ہوئی ہے۔ جس سے معمولی بندوبست کی میعاد کم از کم ۴۰ سال مقرر ہو گئی ہے اور حکومت کا حصہ زیادہ سے زیادہ خالص پیداوار کا ۲۵ فیصدی قرار پایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا ہے کہ کسی خاص سرکل میں سابقہ بندوبست کی تشخیص کے چہارم سے زائد مالیہ نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اس ترمیم سے پہلے حکومت زیادہ سے زیادہ خالص پیداوار کے ۵۰ فیصدی کا مطالبہ کر سکتی تھی اور مالیہ میں اضافہ کی مقدار کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔

(ب) ریگولیشن آف اکاؤنٹس بل پاس کیا گیا۔ جس نے مقروضین کو ساہوکاروں کی بعض بے قاعدگیوں کے خلاف حفاظت بہم پہنچائی۔

(ج) قانون انتقال اراضی پنجاب میں دو نہایت اہم ترمیمات اُن رخنوں کے انسداد کی غرض سے کی گئیں۔ جو لاہور ہائی کورٹ کے بعض رولنگز سے پیدا ہو گئے تھے۔ ان رولنگز کی رو سے قانون انتقال اراضی کے منشا کے خلاف فروخت اراضی کی اجازت اس صورت میں تھی۔ جب کہ کسی زراعت پیشہ شخص کو دیوالیہ قرار دے دیا گیا ہو۔ علاوہ بریں بصورت اجرائے ڈگری بھی بہ رولنگز انتقال اراضی کی اجازت

دیتے تھے ۔

(د) دو نہایت اہم مسودات قانون ایک قرضہ سے نجات دلانے اور دوسرا مقروضین کی حفاظت کرنے کے لیے پاس ہو چکے ہیں ۔

(ہ) دو اہم کمیٹیاں نظم و نسق کے اخراجات میں تخفیف اور جدید ذرائع آمدنی تجویز کرنے کے لیے مقرر کی گئیں ۔ تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ کی تخفیف اخراجات میں کی گئی ۔ جس کا ایک معتدبہ حصہ مستقل ہے ۔ ایجنٹ فیس تمباکو فروشی اور تقریبات پر ڈیوٹی عائد کرنے کا بل پاس کیے گئے اور قانون انتقال جائداد کو شہری علاقوں میں نافذ کیا گیا ۔ تاکہ مزید آمدنی حاصل ہو سکے ۔

(و) پارٹی نے جیل اور پولیس کی اصلاح اور ملازمان سرکاری میں رشوت کے انسداد کی بہت سی معقول تجاویز کی حمایت کی ہے ۔

(ز) رفاہِ عام کا کام جن میں دیہات سدھار بھی شامل ہے ۔ آپ اپنے منہ سے بول رہا ہے ۔ اور ہر ایسے شخص پر اظہر من الشمس ہے جو صوبہ کی حالت قبل از اصلاحات کا مقابلہ آج کل کی حالت سے کر سکتا ہے ۔ جو اصلاحات رائج کی گئی ہیں ۔ ان میں بہتر صفائی ، بہم رسانی آب ، طبی امداد ، تعلیم ، سڑکیں اور قرض کی سہولتیں شامل ہیں ۔ دیہاتی شفاخانے انسانوں اور حیوانوں کے لیے سارے صوبہ میں قائم کر دیئے گئے ہیں ۔ مزید برآں جدید انٹرمیڈیٹ کالج ، کتب خانے ، ریڈنگ روم ، نائٹ سکول ، دیہات کے مابین سڑکیں اور تحریک

امداد باہمی کی اصلاح اس پارٹی کے کارنامے ہیں ؛

(ح) اچھوت طبقہ کے طلباءؔ :- تمام امدادی سکولوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اچھوت طبقہ کے طالب علموں کو داخل کریں ورنہ وہ اپنا زرِ امداد کھو بیٹھیں گے۔ سمال ٹاؤن کمیٹیوں اور پنچایتوں کا باقاعدہ تقرر کرکے اور میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں نمائندگان عوام کو زیادہ اختیارات دے کر لوکل سیلف گورنمنٹ کی بنیاد کو زیادہ وسیع کر دیا گیا ہے۔ علاوہ صنعتی ترقی کا نمایاں طور پہ آغاز ہو چکا ہے۔ پارٹی کے ممبر ذمہ دارانہ عہدوں مثلاً صوبہ کی گورنری، حکومت ہند کی اگزیکٹو کونسل کی ممبری، پنجاب میں مجلسِ قانون ساز کی صدارت اور ممبری اور وزارت پر جلالت شان کے ساتھ ممتاز رہ چکے ہیں جس سے ہندوستانیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ سلطنت کے بلند ترین عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں۔ حق بجانب ثابت ہو گیا ہے ؛

(ط) ۱۹۲۴ء میں آبیانہ ۷۵ لاکھ روپیہ کی حد تک بڑھا دیا گیا تھا۔ لیکن یونینسٹ پارٹی ۶۰ لاکھ روپیہ سے زائد کی کمی کرانے میں کامیاب ہو گئی آبیانہ میں مزید ۲۷½ لاکھ سالانہ کی کمی حاصل ہو گئی ہے ؛

یہ کارنامے آپ اپنے منہ سے بول رہے ہیں اور تمام منصف مزاج پنجابیوں کی طرف سے مستحق تحسین ہیں۔ تاہم یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ ہر وہ مقصد جس کا حصول ممکن تھا۔ حاصل ہو گیا ہے۔ مالی مشکلات اور مروجہ آئین کی واضح خامیاں پارٹی کے اختیارات میں شدید رکاوٹ

ڈالتی رہیں ۔ علاوہ ازیں کونسل کا تجربہ اکثر ممبروں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور ان میں سے بعض نے کبھی کبھی مناسب انضباط کے فقدان کا اظہار کیا ۔ لیکن یہ نقائص تجربہ حاصل ہونے اور پارٹی کی سرگرمیوں میں رائے دہندوں کے نگراں کارانہ دلچسپی لینے سے اصلاح پذیر ہو جائیں گے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جدید آئین کے ماتحت آنے والی ذمہ داریاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ پارٹی کے ممبران جملہ صوبجاتی مسائل کو دیہاتیوں اور شہریوں، زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ لوگوں پر اثر انداز ہوں، کشادہ دلانہ نقطہ نظر سے دیکھیں ۔ پارٹی کے نظر ثانی شدہ مسلک میں اس کا مناسب لحاظ رکھا گیا ہے ۔ ان پر عمل درآمد کرنا لازمی طور سے ان ممبروں کے ذمہ ہے ۔ جو پارٹی میں شامل ہوں ۔

آئندہ پروگرام نہ صرف افراد اور خاندانوں بلکہ ساتھ ہی غربا، عوام، محتاج اور پس افتادہ لوگوں کی جسمانی، روحانی، اخلاقی، دماغی اور اقتصادی بہتری کا حامی ہے ۔ یہ ہے ترقی کا وہ معزز کام جس سے ہمیں بلا لحاظ ذات، رنگ اور مذہب کے سروکار رکھنا چاہیئے ۔ ارباب فکر ہندوستانی جو نسخہ ہندوستان کی بہتری کے لیے تجویز کرتے ہیں ۔ وہ یہی گھر کے اندر "ترقی" کرنے کا نسخہ ہے ۔ جس سے اس کے باشندوں کو غیر ممالک میں عزت کا مرتبہ مل سکتا ہے ۔

اپنی تقریر کے دوران میں جو حضور ملک معظم نے مجتمع وفود کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :-

"میں بحیثیت شہزادہ ویلز ایک نشانِ امتیاز لگایا کرتا تھا جس پر قدیم مقولہ "میں خدمت کرتا ہوں" لکھا ہوا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت سے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ کیونکہ بادشاہ خدمت کرنے سے بہتر کوئی اور کام انجام نہیں دے سکتا۔" اپنی نسل کے لوگوں کی طرح میں نے بھی جنگ کی ہولناکیاں دیکھی ہیں اور میں ان تکلیفوں اور مصیبتوں سے بھی بخوبی واقف ہوں، جو سانحے مابعد میں آئیں۔ میں محاذِ جنگ پر لوگوں کی تکالیف سے آگاہ ہوا۔ اسی طرح میں ان اشخاص کی تکلیفوں کو محسوس کرتا ہوں۔ جنہیں بدقسمتی سے اپنے کسی ذاتی قصور کے بغیر بے روزگاری کے طویل زمانے دیکھنے پڑے۔"

"پس میں آپ کی ان دعاؤں میں کہ مستقبل اس ملک کے لیے امن اور خوش حالی لائے۔ نہ صرف نہایت خلوص کے ساتھ شریک ہوتا ہوں بلکہ آپ کو اس امر کا یقین بھی دلانا چاہتا ہوں کہ میری مسلسل کوشش دنیا بھر میں قیامِ امن کی ترقی اور اس ملک اور دیگر ممالک میں تجارتی اور صنعتی سرگرمی کے احیاء کے لیے ہوگی۔ کیونکہ اسی طرح لوگوں کو کام کرنے کا موقع مہیا ہو سکتا ہے۔ جس سے بہرہ اندوز ہونا ہر شہری کا حق ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ اس کام میں تمام طبقوں اور فرقوں کی طرف سے میری امداد اور حوصلہ افزائی اسی طرح ہوگی۔ جس طرح میرے والد کی ہوئی تھی۔"

پنجاب "اتحاد پارٹی" کی تحصیلوں سے متعلق معیاری پروگرام

مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہوگا:-

(۱) اجناس کا انتظام۔ یعنی اس بات کا مکمل انتظام کرنا کہ رائج الوقت اجناس کی کاشت یکے بعد دیگرے درست طور پر عمل میں آتی ہے۔ اور اس بات کو معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کرنا کہ یہ روش کس حد تک مفید اور قابلِ عمل ہے۔

(۲) منڈی میں اس بات کا مکمل انتظام کرنا کہ اجناس کو مہیا کرنے والا غلّے کو منڈی میں لانے سے بہترین فائدہ حاصل کر سکے۔ اس سے منڈی کی اصلاح لازم آتی ہے۔ یعنی منڈی کی مندرجہ ذیل امور میں اصلاح کرنا:-

(ا) منڈی میں جو بٹے استعمال وزن کے لیے ہیں وہ یکساں نہیں۔ مثلاً ایک من میں چالیس سے زیادہ سیر گنے جاتے ہیں۔ اس رواج کو اب قائم نہیں رہنا چاہیے۔

(ب) وزن قانونی معیار کے مطابق درست نہیں اُن کو درست کرنا چاہیے۔

(ج) وزن کرنے میں بھی بہت کچھ ترقی کی جا سکتی ہے۔ قابلِ اعتبار مشینوں کو استعمال میں لانا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

(د) منڈی کے محاصل اور ٹیکس یہ سب غیر معیّن اور غیر اختیاری ہیں اور اُن کی تقسیم پر اجناس کے مہیا کرنے والے کو کوئی قابو نہیں۔ یہاں بھی اصلاح ضروری ہے۔

(ہ) ہر روز منڈی کی شرح اور نرخوں کا تعیّن کرنا۔ یہ ایک بھی پکارتی ہوئی خرابی ہے اور اس کا جلد از جلد تدارک کرنا چاہیئے۔ ان معاملات پر پبلک کی رائے دریافت کرنی چاہیئے اور اصلاحی تجویز کو پختہ بنانے میں سعی بلیغ سے کام لینا چاہیئے۔

(۳) مزارعین اور زراعتی مزدور سارا سال برسرِ کار نہیں رہتے اور جب فصلوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ بیکار رہ جاتے ہیں۔ یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ اس بے روزگاری کے عرصہ میں اُن کو گھریلو صنعتوں میں لگا دینا چاہیئے تاکہ اُن کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ گھریلو صنعتوں کی دیکھ بھال کرنی چاہیئے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کون سے مزدور بے کار ہیں اور وہ کونسی صنعتیں ہیں، جو آسانی سے مزدوروں اور صرف کنندگان کے فائدے کے لیے رائج کی جا سکتی ہیں۔

(۴) ان تین کاموں کے علاوہ زمینداروں کے قرضہ کے مسئلے کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے اور قرضداروں کو اُن کی قانونی پوزیشن سے آگاہ کرنا چاہیئے یعنی اُن کو قانون کی اُن دفعات سے باخبر رکھا جائے جو اُن کے حق میں نافذ

ہیں اور اُن کی حفاظت کرتی ہیں ؛

(۵) حکومت کے اداروں میں زیادہ راستبازی اور سلامت روی پیدا کرنا۔ رشوت خوری اور بددیانتی جو شدید مصائب ہیں۔ پبلک اُن کو جاری رکھنے میں بری الذمہ نہیں ؛

(۶) اُن فائدہ مند سرگرمیوں کو ترقی دینا جو تعلیم، ڈاکٹری۔ حفظانِ صحت۔ زراعت تحریک امداد باہمی۔ دیہات کی بہبودی۔ اقتصادی۔ سماجی۔ ذہنی بیداری اور دیہات میں دینیات کو فروغ دینا۔ یہ مقاصد ایک ماہرین کی کمیٹی کے ذریعے سے حاصل کرنے چاہئیں اور اُن اُمور کے متعلق سادہ لٹریچر مہیا کرنا چاہیئے ؛

(۷) تحصیل میں لوکل سیلف گورنمنٹ کی سرگرمیوں کو ترقی دینا یعنی وہ سرگرمیاں جو ڈسٹرکٹ بورڈوں۔ پنچایتوں اور دیہاتی شہری کمیٹیوں سے تعلق رکھتی ہیں ؛

(۸) مویشیوں کو پالنے اور اُن کی درست طور پر پرورش کرنے کی سعی کرنا۔ اراضی کا تحفظ اور بہتر بیج مہیا کرنا ؛

(۹) مالکان اور مزارعان میں خوشگوار تعلقات قائم کرنا اور اُن کے جائز حقوق کا تحفظ ؛

(۱۰) اس غرض سے اعداد و شمار فراہم کرنا کہ کن مقامات میں زمین کا لگان یا دیگر ٹیکس زیادہ ہیں تاکہ اُن کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۱۱) اُن زمینداروں کی فہرست مرتب کرنا۔ جن کی اراضی پانی کے جمع ہونے، شورہ یا دریا بُرد ہونے کی وجہ سے بے قدر یا کم ہوگئی ہیں ؛

پنجاب "اتحاد پارٹی" کا شہری پروگرام

" اتحاد پارٹی کے شہروں کے لیے معیاری پروگرام کی پہلی قسط مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہوگی :-

(۱) مقامی خود اختیاری حکومت کے تمام شعبوں میں اصلاح اور تنظیم خصوصاً

(ا) حفظانِ صحت کا بہتر انتظام - جس میں گندے پانی ، کوڑا کرکٹ کو دور کرنے کا بندوبست - بدروؤں اور سڑکوں کی تعمیر و درستی اور اچھے دودھ کی بہم رسانی شامل ہیں ؛

(ب) زچگاں اور بچوں کی فلاح کے لیے زیادہ موزوں انتظام اور تمام لوگوں بالخصوص غربا کے لیے شدہ اور طبی امداد ؛

(ج) غریبوں اور امیروں کے درمیان ٹیکس کی مناسب تقسیم اور حسبِ حیثیت ٹیکس عائد کرنا ؛

(د) تعلیم میں مناسب اصلاح ؛

(۲) گھریلو صنعتیں اور عورتوں کے لیے گھریلو صنعتوں کی غور و پرداخت ؛

(ب) مسئلہ بیروزگاری ؛

(ج) گداگری کا انسداد یا اس کو کم کرنے کی کوشش کرنا ؛

(۳) شہر کے اندرونی کاروبار اور دیگر شہروں کے ساتھ تجارتی معاملات کی اطلاع بہم پہنچانے کے لیے اطلاعی دفاتر قائم کرنا ؛

(۴) صنعتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ؛

(۵) مقامی خود اختیاری حکومت اور دیگر سرکاری محکموں میں رشوت ستانی کی مخالفت کرنا اور قومی عزت کے احساس کا معیار بلند کرنا ؛

(۶) (ا) مالی امداد بالخصوص :-

(ا) اندراج یعنی رجسٹری ؛

(ب) نگہداشت ؛

(ج) آہستہ آہستہ ترقی کرنے والی خود اختیاری جمعیت ؛

(iا) مذہبی مقامات اور معبدوں کی حفاظت ؛

(۷) محلوں کا بندوبست - سرکاری انتظامات کے علاوہ امن، صلح اور یقین دین کو برقرار رکھنے کے لیے پرائیویٹ کوششوں میں اضافہ۔ محلوں کی پنچایت - اور ریڈنگ روم قائم کرنے کے امکانات ؛

(۸) قرضہ اور محلہ دار باہمی تعاون ؛

(۹) جسمانی ورزش اور قوم کی جمالیاتی روایتوں کو زندہ کرنا۔ جدید اور قدیم یعنی ملکی تفریحات کو شہر کے معیارِ تمدن کو بڑھانے اور قوم کی ذہنی حالت کو بہتر کرنے کے لیے تفریح اور تعلیم و تربیت کی نظر سے فروغ دینا ؛

(۱۰) ملک کی تعمیری خدمت کے لیے نوجوانوں کی تربیت کرنا۔ والنٹیر کور کا مرتب کرنا اور ابتدائی امداد فراہم کرنا ؛

(ب) ووٹروں کی تربیت کے لیے اُن کی معلومات میں اضافہ کرنا اور اتحاد پارٹی کے پروگرام اور اغراض و مقاصد کو مقبولِ علم بنانا ؛

(۱۱) حقیقی قومی احساس پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ فرقہ وارانہ رواداری اور خوشگوار تعلقات پیدا کرنا۔ پسماندہ اور غریب طبقوں کی امداد اور دلجوئی کرنا اور دیگر پارٹیاں جو اس قسم کا پروگرام اور مقاصد رکھتی ہوں تعاون کرنا۔

اقبال اکیڈمی پاکستان

اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	احمد میاں اختر جونا گڑھی	۵٫۵۰
اقبال کے خطوط عطیہ کے نام	ضیاءالدین احمد برنی	۳٫۵۰
اقبال ایرانیوں کی نظر میں	عبدالحمید عرفانی	۸٫۷۵
مکتوبات اقبال	نذیر نیازی	۵٫۵۰
اسلامی تصوف اور اقبال	نورالدین	۶٫۵۰
اقبال اور حیدر آباد دکن	نظر حیدر آبادی	۵٫۰۰
اسرار و رموز پر ایک نظر	محمد عثمان	۳٫۵۰
اقبال اور سیاسیات ملی	رئیس احمد جعفری	۵٫۵۰
علم الاقتصاد	علامہ اقبال	۵٫۵۰
اقبال اور جمالیات	نصیر احمد ناصر	۱۲٫۰۰
انوار اقبال	بشیر احمد ڈار	۱۲٫۰۰
مکاتیب اقبال بنام گرامی	محمد عبداللہ قریشی	۱۲٫۰۰
اسلام اور سائنس	ڈاکٹر رفیع الدین	۲٫۵۰
فلسفہ تاریخ کیا ہے؟	,,	۰٫۵۰

تقسیم کنندگان

آئینہ ادب — چوک مینار انارکلی لاہور

طباعت سرورق رہبر پریس لمیٹڈ، لاہور